مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد ششم

برِعظیم میں فارسی ادب سے متعلق مضامین

مرتبہ
مظہر محمود شیرانی

★

مجلسِ ترقیٔ ادب

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد ششم

برِعظیم میں فارسی ادب سے متعلق مضامین

مرتبہ
مظہر محمود شیرانی

مجلس ترقیٔ ادب
کلب روڈ، لاہور

طبع اول : دسمبر ۱۹۷۲ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : پروفیسر حمید احمد خاں
ناظم مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ - ریلوے روڈ ، لاہور

طابع : محمد زرین خاں

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
عرض مرتب	۱

☆ ☆ ☆

عرضِ مرتّب

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی کی چھٹی جلد پیشِ خدمت ہے ۔ اس جلد میں برعظیم پاکستان و ہند میں فارسی ادب سے متعلق آٹھ مقالات شامل ہیں ۔ مقالات کی ترتیب میں ان کے موضوعات کی تاریخی تقدیم و تاخیر کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ ان میں سے پہلے پانچ مضامین مختلف کتابوں پر تنقید و تبصرہ کے طور پر لکھے گئے تھے ۔ اگرچہ نقد و نظر کو تخریبی طریق کار بھی سمجھا جاتا ہے اور ناقدین و مبصرین کی حوصلہ شکنی کے لیے ''تخریب کار دونان و تعمیر کار ہوش مندان است'' کا مقولہ رائج کیا گیا لیکن ، جیسا کہ ان مضامین کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے ، حافظ صاحب کے ہاں تنقید کے معنی صرف تخریب نہیں بلکہ اس کا منتہائے مقصود بے عیب تعمیر ہے ۔ یوں سمجھیے کہ ان کے ہاں تخریب صرف تعمیری اغراض کی خاطر ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے مفر نہیں :

گفت رومی ہر بنای کہنہ کآبادان کنند
می ندانی اول آن بنیاد را ویران کنند

اس جلد کا پہلا مضمون ڈاکٹر اقبال حسین صاحب لیکچرار پٹنہ کالج کے انگریزی مقالے ''ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا'' پر تبصرے کے طور پر لکھا گیا تھا ۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے امیر خسرو سے پہلے کے چھ فارسی شعرا کا تذکرہ کیا ہے ۔ حافظ صاحب نے کتاب کا خیر مقدم ان الفاظ میں کیا ہے :

''قدیم شعرائے ہند پر قلم اٹھانا کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مترادف ہے اور ڈاکٹر اقبال حسین اس سنگلاخ اور بنجر زمین میں اپنی تیشہ زنی اور جگرکاوی پر مستحقِ مبارکباد ہیں ۔''

ساتھ ہی وہ مقالے کے انگریزی زبان میں لکھے جانے پر معترض بھی ہیں ۔ بڑے دکھ کے ساتھ لکھتے ہیں :

''یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ خالص مشرقی موضوعات پر بھی

ہمارے نونہال ، ہندوستانی یونیورسٹیوں کے ناروا اور غیر مفید ضوابط کی بنا پر ، انگریزی زبان میں اپنے مقالے لکھنے پر مجبور کیے جاتے ہیں ، جن سے ملکی زبانوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی ۔"

بعد ازاں انھوں نے مقالے کی تشنگی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مضمون میں مفید مشورے دیے ہیں اور قیمتی معلومات مہیا کی ہے ۔ مضمون کے اختتام پر ڈاکٹر اقبال حسین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"یہ بعض اختلافی اور اضافی امور ، جو ہم نے گذشتہ صفحات میں درج کیے ، ان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کی مساعی کی قرار واقعی شناخت سے قاصر ہیں ، بلکہ یہ مقصد ہے کہ مقالے کی دوسری اشاعت کے وقت ہماری ان گزارشات پر بھی غور کر لیا جائے ۔"

پیش نظر جلد کا دوسرا مقالہ شمس العلما عبدالغنی کی کتاب "ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب" پر تنقید کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ مضمون انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے اور اپنے وطن ٹونک (راجپوتانہ) جانے کے بعد سپرد قلم کیا تھا ۔ اسی بنا پر وہ اس تنقید کو تشنہ محسوس کرتے تھے ۔ چنانچہ جب پروفیسر ابراہیم ڈار نے یہ تنقید پڑھنے کے بعد ان کے نام اپنے خط میں شمس العلما عبدالغنی سے ہمدردی کا اظہار کیا تو اس کے جواب میں انھوں نے ڈار صاحب کو لکھا :

"مجھ پر طعن کرنے سے پہلے کتاب کا مطالعہ کر لو ۔ اگر میں کسی لائبریری کے نزدیک ہوتا تو یہ تنقید مضاعف ہوتی ۔"

اس کے باوجود یہ تنقید نہایت مفصل اور معلومات افزا ہے ۔ اس کا طریق کار خود حافظ صاحب کے الفاظ میں سنیے ؛ کتاب کے تعارف پر چند صفحے لکھنے کے بعد فرماتے ہیں :

"اب ہم اصل کتاب کی طرف ، جو انگریزی میں ہے ، رجوع کرتے ہیں اور جن بیانات میں ہمیں شمس العلما سے اختلاف ہے ان کا ترجمہ نما خلاصہ بقید صفحہ مع اپنی تنقید کے سطور ذیل میں درج کرتے ہیں ۔"

تنقید کے اختتام پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ

''جس قدر کام پروفیسر نے کیا ہے ، اس سے کہیں زیادہ وہ چھوڑ گئے ہیں''
حافظ صاحب نے اپنے مضمون میں اس دور کے بعض غیرمعروف شعرا و ادبا کے ضمن میں قابلِ قدر اطلاعات فراہم کی ہیں ۔ اس کے بعد رقم طراز ہیں :

''اس سے بھی اہم اور قیمتی کام ہندی فرہنگ نگاروں کا ہے ۔ اساتذہ کے مطالعے کے وقت قدم قدم پر الفاظ کے معنی کی تلاش رہتی ہے ۔ اس غرض سے ایک بڑی جماعت ان فرہنگ نویسوں کی پیدا ہوگئی ۔''

پھر ہندوستان کے قدیم فرہنگ نگاروں کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں :

''اس مواد کی اساس پر مغلیہ دور میں وہ لغات تیار ہوئے ہیں جو آج بھی فارسی لغات کے واسطے سند کا حکم رکھتے ہیں اور یہی ایرانی آغا ، جو ہر موقع پر ہم ہندیوں پر ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہیں ، ضرورت کے وقت ان ہندی لغات نگاروں سے استفادہ کرتے ہیں ۔ خواہ وہ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی ہوں یا ملک الشعرا بہار یا کوئی اور ، کتاب مشہور برہان قاطع کو اپنا مشعل راہ بنائے بغیر انھیں چارہ نہیں ۔ فی الحقیقت ہم ہندیوں کے واسطے یہ بجا فخر کا موقع ہے کہ مغرور ایرانی خود اپنی زبان کے بارے میں ہمارے منت کش ہیں ۔''

اس تنقید کے تتمے کے طور پر پروفیسر ابراہیم ڈار (مرحوم) نے بھی شمس العلما کی کتاب پر ایک مضمون لکھا جو رسالہ 'اُردو' کے اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ع کے شمارے میں شائع ہوا ۔ شمس العلما نے اپنے بعض دوستوں کے اصرار پر حافظ صاحب کی تنقید کا جواب لکھا جو رسالہ 'معارف' کے ضمیمے کے طور پر ایک کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا ۔ ڈار صاحب نے شمس العلما کا جواب تبصرہ پڑھنے کے بعد ایک خط میں حافظ صاحب سے دریافت کیا کہ کیا شمس العلما کا جواب ان کی نظر سے گزرا ہے ؟ ساتھ ہی ان کی علالت کے پیش نظر اپنی طرف سے شمس العلما کے جواب کا جائزہ لینے کی پیش کش کی ۔ حافظ صاحب نے ٹونک سے مورخہ ۲۷ جنوری سنہ ۱۹۴۶ع کو ڈار صاحب کے نام خط میں لکھا :

''شمس العلما کا تبصرہ میں نے نہیں دیکھا ۔ اگر آپ بھیج دیں گے تو میں دیکھ لوں گا لیکن میری یہ حالت نہیں کہ جواب دے سکوں . . .

بیماری نے بالکل کُھلا دیا ہے ، بے حد ضعیف ہو چکا ہوں ، مجھ میں اور قبر میں بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے ۔ اگر آپ جواب کی ضرورت سمجھتے ہیں تو جواب دے دیجیے لیکن چھپوائیے کا کہاں ؟ میرے خیال میں 'اُردو' ہی مناسب رہے گا ۔ اشاعت سے پیش تر اگر ایک نظر وہ جواب مجھے بھی دکھا دیں تو ممنون ہوں گا ۔ ممکن ہے کہ میں کوئی مشورہ بھی دے سکوں . . . یہ بھی یاد رہے کہ زبان اور لہجہ نرم اور مناسب ہونا چاہیے ۔"

لیکن حافظ صاحب کو ڈار صاحب کا تحریر کردہ جواب دیکھنے کی مہلت نہ ملی اور وہ وسط فروری سنہ ۱۹۴۶ع میں رحمتِ حق سے ہم کنار ہوگئے ۔ ڈار صاحب کا یہ جواب ناتمام صورت میں 'اورینٹل کالج میگزین' کے ماہ اگست و نومبر سنہ ۱۹۴۸ع اور فروری ، مئی ، اگست اور نومبر سنہ ۱۹۴۹ع کے شماروں میں چھ قسطوں میں شائع ہوا[1] ۔ ڈار صاحب کا یہ مضمون اپنی اہمیت و مناسبت کے پیش نظر ، زیر نظر جلد میں بطورِ ضمیمہ شائع کیا جا رہا ہے ۔

تیسرا مضمون دیوان معین‌الدین کے موضوع پر ہے ۔ اس دیوان کو کسی مغالطے یا سلف پرستی کے جذبے کے تحت حضرت معین‌الدین چشتی اجمیری علیہ الرحمۃ سے منسوب کر دیا گیا ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں ۔ حافظ صاحب نے اپنی ژرف نگاہی سے کام لے کر نہایت ہی مدلّل انداز میں یہ ثابت کیا کہ یہ دیوان در حقیقت ہرات کے مشہور واعظ مولانا معین‌الدین فراہی کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہے اور خواجہ اجمیر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔ ان کے دلائل مختصراً درج ذیل ہیں :

۱۔ تاریخ خواجہ صاحب کی شاعری اور ان کے دیوان سے ناواقفِ محض ہے ۔

۲۔ اس دیوان کی زبان خواجہ صاحب کے عہد کی زبان ہرگز نہیں بلکہ

۱۔ ڈار صاحب کی وفات کے بعد 'پروفیسر ڈار پبلیکیشن کمیٹی' بمبئی کے زیر اہتمام مضامینِ ڈار کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا تھا ۔ یہ مضمون اس مجموعے میں بھی شامل ہے ۔

متاخرین کی زبان معلوم ہوتی ہے ۔

۳۔ اس دیوان میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی رو سے اس کا تعلق خواجہ صاحب سے قائم کیا جائے ۔

۴۔ دیوان سے اس قدر ظاہر ہے کہ اس کا قائل کوئی واعظ ہے ۔

مولانا معین‌الدین تصانیفِ کثیرہ کے مالک ہیں ۔ حافظ صاحب نے ان کی سات کتابوں کا نام لیا ہے ۔ ان میں ایک کتاب 'معارج النبوۃ' ہے ۔ حافظ صاحب نے اس کتاب میں ایسی متعدد غزلیں ڈھونڈھ نکالیں جنھیں مولانا معین‌الدین نے اپنے نام کی صراحت کے ساتھ درج کیا ہے اور یہی غزلیں اس دیوان میں بھی موجود ہیں جنھیں خواجہ معین‌الدین چشتی سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ حافظ صاحب اپنے مضمون کے اختتام پر لکھتے ہیں :

"ممدوح (مولانا معین الدین واعظ) کثیر التعداد تصانیف کے مالک ہیں ۔ اگر ان کی تالیفات میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین واثق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا اس میں پتا لگ جائے گا بلکہ اس کے علاوہ اور سینکڑوں نئی غزلیں ہاتھ آئیں گی جو دیوان کے حجم کو المضاعف کر دیں گی ۔"

حافظ صاحب کی وفات کے بعد اتفاق سے پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب کو بمبئی کی کریمی لائبریری میں "مُلا" معین فراہی کی ایک اور کتاب 'تفسیر اسرارالفاتحہ' دستیاب ہوئی ۔ اس میں بھی "مُلا" معین نے اپنی عادت کے مطابق جابجا اپنے اشعار نقل کیے ہیں ۔ چنانچہ پروفیسر ڈار صاحب نے اس کتاب میں سے (حافظ صاحب کی درج کردہ غزلوں کے علاوہ) بیس نئی غزلیں تلاش کیں جو مروجہ دیوانِ معین الدین میں بھی ملتی ہیں ۔ ڈار صاحب کے اس مضمون[1] کا کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ اضافہ کردیا گیا ہے ۔

'خزائن‌الفتوح' کو حضرت امیر خسرو کی مشکل ترین تصنیف کہا جا سکتا

۱۔ ڈار صاحب کا یہ مضمون رسالہ 'اُردو' کراچی شمارۂ جولائی سنہ ۱۹۵۰ع میں شائع ہوا ۔ بعد ازاں بمبئی سے شائع ہونے والے مجموعے مضامینِ ڈار میں بھی شامل کیا گیا ۔

ہے ۔ سید معین الحق صاحب نے اس کتاب کو مرتّب کر کے علی گڑھ یونیورسٹی کی انجمنِ تاریخ کے سلسلۂ مطبوعات میں سنہ ۱۹۲۷ء میں شائع کرا دیا لیکن وہ کتاب کے مختلف مخطوطات کے مقابلے کے بعد ایک قابلِ اعتماد متن پیش کرنے کے اہم کام کو فراموش کر گئے ۔ اس کے علاوہ لاپرواہی کے سبب متن میں اغلاط کثیر تعداد میں در آئیں ۔ حافظ صاحب نے 'خزائن الفتوح' کی اس اشاعت پر بطورِ تبصرہ ایک مضمون سپرد قلم کیا جو اس جلد کا چوتھا مضمون ہے ۔ اس تبصرے میں انھوں نے کتاب کے متن میں اغلاط کی افراط کی نشان دہی کی اور بطور نمونہ بعض اقتباسات کی تصحیح کا کام انجام دیا ۔ آخر میں اپنی رائے کا اظہار بدیں الفاظ کرتے ہیں :

"ہم نے اپنی عمر میں اس سے زیادہ مغلوط کتاب نہیں دیکھی . . . ابھی کل کی بات ہے اسی علی گڑھ سے امیر خسرو کی مثنویاں قابل ہاتھوں سے ترتیب پا کر شائع ہوئی ہیں اور دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں ، لیکن اس سلسلے کے مرتّبین سب کے سب پرانے بزرگ تھے ۔ علی گڑھ میں اب نئی نسل کا دور دورہ ہے اور شاید یہ سب سے پہلا کام ہے جو ان مجددین نے . . . انجام دیا ہے . . . وہ ایک چھوٹی سی تالیف کو صحت کے ساتھ چھاپنے سے قاصر رہے ہیں ۔ ہمیں اپنے صحیح علمی فقدان کا ماتم کرنا چاہیے ۔"

'خزائن الفتوح' جیسی پر تکلف اور مصنوعی نثر کا انگریزی ترجمہ ظاہر ہے اس کے مرتّب کرنے سے بھی مشکل کام ہے ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے استاد پروفیسر محمد حبیب صاحب نے اپنے آکسفورڈ کے قیام کے دوران میں ، پروفیسر مارگولیوتھ کے زیرنگرانی 'خزائن الفتوح' کے انگریزی زبان میں ترجمے کا کام سرانجام دیا ۔ ولایت سے ہندوستان واپس آنے پر حبیب صاحب نے اپنے بعض شاگردوں کی معیت میں اس ترجمے پر نظر ثانی کی اور سنہ ۱۹۳۱ء میں اسے شائع کرادیا ۔ لیکن حافظ صاحب کے بیان کے مطابق "خسرو ان حضرات کے بس میں نہیں آئے" چنانچہ انھوں نے ایک طویل تنقیدی مضمون میں اس ترجمے کی زبان ، تاریخ اور جغرافیے کی فاحش غلطیوں کی نشان دہی اور درستی کی ۔ ساتھ ہی پروفیسر حبیب صاحب کے بعض نظریات کی خامی کی طرف بھی اہل علم حضرات

کی توجہ منعطف کی ۔ حافظ صاحب اپنی تنقید کے آخر میں فرماتے ہیں :

''اگر سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنا ہمارے فرائض میں داخل ہے تو ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ پروفیسر حبیب نے ایک ایسی کتاب کے ترجمے کا اقدام کیا ہے جس کے سمجھنے کی انھوں نے مطلق کوشش نہیں کی ہے اور مترجم کے فرائض کی طرف سے سراسر بے اعتنائی برتی ہے ... ہمیں پروفیسر صاحب کی اس بے باک جسارت پر تعجب آتا ہے کہ وہ اس ترجمے کو ، جس کی کوئی سطر اسقام سے پاک نہیں ، بڑے وثوق اور اطمینان سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر کوئی شخص اہتمام کے ساتھ غلط نویسی کا التزام کرتا اور اپنی پوری کوشش عمل میں لاتا تب بھی پروفیسر حبیب کے اس کارنامے سے بازی نہیں لے جا سکتا ۔ آخر اس اغلاط کی کھتونی کو منظر عام پر لانے میں کون سی مصلحت ان کو نظر آئی ۔

جس طرح ان کا ترجمہ اپنے علمی فقدان کا مرثیہ خواں ہے اسی طرح ان کے آراء اور نظریے بھی تاریخی واقعات و اشخاص کے متعلق غیر ناقدانہ ہیں جو یقیناً اصل مآخذ پر مبنی نہیں ۔ ان میں سے بعض کی گزشتہ سطور میں تردید کی گئی ہے ۔ اگر پروفیسر صاحب فارسی عربی مواد سے خود براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی غیر منتقدانہ رائیں غیر مسلم اہل قلم سے مستعار لیں گے ، جو ان کے ہاں ، بہ وجہِ ناواقفیت ، قابلِ معافی ہو سکتی ہیں مگر مسلم یونیورسٹی کے ایک مسلمان پروفیسر کے لیے ان کا اعادہ قطعاً ناقابلِ معافی ہے ۔''

پروفیسر ابراہیم ڈار (مرحوم) حافظ صاحب کی اس کڑی تنقید کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ایک سطحی نظر سے دیکھنے والے کو یہ بات کھٹکے گی کہ آخر شیرانی صاحب نے اتنی ساری محنت کیوں گوارا کی ، لیکن وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں کتابوں کے معیار کو بلند کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اس قسم کی غلط کوششوں کا احتساب کیا جائے ورنہ ہر کہ و مہ کتابوں کا مرتّب بننے کے شوق میں علم کا خون روا

رکھے گا اور ہمارا علمی معیار ، جو پہلے ہی بہت بلند نہیں ہے ، اور بھی پست ہو جائے گا۔''

اس جلد کے چھٹے مقالے میں حافظ صاحب نے ایک کم نام شاعر ''شہابی'' کی دلچسپ مثنوی ''عروۃالوثقیٰ'' تالیف سنہ ۸۵۹ھ سے ہمارا مفصل تعارف کرایا ہے ۔ اس مثنوی کا واحد (معلومہ) مخطوطہ خود حافظ صاحب کے کتاب خانے میں موجود تھا ، جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے ۔ حافظ صاحب نے یہ مضمون ادارۂ معارف اسلامیہ کے دوسرے اجلاس منعقدہ لاہور مورخہ ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲- اپریل سنہ ۱۹۳٦ع کے لیے لکھا تھا جو بعد ازاں ادارۂ ہذا کی روئداد مطبوعہ لاہور (سنہ ۱۹۳۸ع) میں شائع ہوا ۔

ساتواں مقالہ ایک نسبۃً کم معروف شاعر ''صلائی'' کے حالات اور اس کی شاعری کے تبصرے پر مشتمل ہے اور اس میں بعض تاریخی اشارے بھی ملتے ہیں ۔

آٹھواں اور آخری مضمون جہانگیر اور شاہجہاں کے دور کے مشہور شاعر مولانا ابوالبرکات منیر لاہوری کے سوانح حیات کے موضوع پر ہے ۔ اس سے پہلے منیر کے حالاتِ زندگی پر اتنا جامع مضمون نہیں لکھا گیا تھا ۔ حافظ صاحب کا منیر کی نظم و نثر پر تبصرہ کرنے کا ارادہ بھی تھا جس کا اظہار انھوں نے مضمون کے آخر میں کیا ہے لیکن یہ ارادہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا ۔

(مرتّب)

ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا

(۴۲۱ھ تا ۶۷۹ھ)

(از ڈاکٹر اقبال حسین صاحب ایم۔اے، بی۔ایل، پی ایچ۔ڈی لکچرر پٹنہ کالج)

(از اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۸ع)

یہ مسرت کا مقام ہے کہ ہندوستان کے قدیم شعرائے فارسی کے متعلق تحقیقات کا شوق ملک میں پیدا ہونے لگا ہے، اور زیادہ خوشی اس امر کی ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے سند یافتہ اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر وحید مرزا پروفیسر عربی لکھنؤ یونیورسٹی نے حضرت امیر خسرو کی حیات و مصنّفات پر ایک عالمانہ تبصرہ بزبان انگریزی تالیف کیا جس کو پنجاب یونیورسٹی نے اپنے مصارف سے طبع کیا۔ سید یوشع جونیر لکچرر فارسی مدراس یونیورسٹی نے 'فتوح السلاطین' تالیف ۷۵۰ھ کا دیباچہ بنام 'عصامی نامہ' حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اب ڈاکٹر اقبال حسین ایم۔اے، بی۔ایل، پی ایچ۔ڈی لکچرار فارسی پٹنہ کالج نے امیر خسرو کے پیش رووں پر ایک انگریزی مقالہ سپردِ قلم کیا ہے جو مع دیباچہ و انڈکس وغیرہ چھوٹی تقطیع کے دو سو چونتیس صفحات پر شامل ہے اور اس وقت ہمارے زیر تبصرہ ہے۔ اس رسالے کی تعریف میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مقالہ ھذا ہمارے ملک کے مشہور استاد ڈاکٹر عظیم‌الدین کی رہبری اور سرڈینی سن راس اور ڈاکٹر ہادی حسن کے قیمتی مشوروں کے ساتھ تیار ہوا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے واسطے پیش کیا گیا اور منظور ہوا اور اسی یونیورسٹی نے اسے طبع کیا۔ قدیم شعرائے ہند پر قلم اٹھانا کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مترادف

ہے اور ڈاکٹر اقبال حسین اس سنگلاخ اور بنجر زمین میں اپنی تیشہ زنی اور جگر کاوی پر مستحق مبارکباد ہیں ۔

یہ ہمارے ملک کی بد قسمتی ہے کہ خالص مشرقی موضوعات پر بھی ہمارے نونہال ہندوستانی یونیورسٹیوں کے ناروا اور غیر مفید ضوابط کی بنا پر انگریزی زبان میں اپنے مقالے لکھنے پر مجبور کیے جاتے ہیں جن سے ملکی زبانوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی ۔ ہمیں رنج بھی ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے جب ہم مقالہ نگار کو سلطان شمس‌الدین التتمش کے پورے نام ''السلطان‌الاعظم شمس‌الدنیا والدین ابوالمظفرالتتمش'' کے ترجمے کے ساتھ بعبارتِ ذیل کشمکش میں مصروف پاتے ہیں :

"The mighty sultan, sun of the empire and the faith, conquest laden Iltutmish."

اگر ڈاکٹر صاحب نے ''ابوالمظفر'' کا ترجمہ 'کانکوئسٹ لیڈن' (فتح سے لدا) کر دیا تو اس میں ڈاکٹر صاحب کا کیا قصور ہے ۔ قصور ان ضوابط کا ہے جو ہمیں انگریزی لکھنے اور پھر متعارف انگریزی لکھنے پر مجبور کرتے ہیں ــــ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا ۔

مقالۂ ھذا میں چھ شاعروں ــــ ابو عبداللہ النکتی ، ابوالفرج رونی ، مسعود سعد سلمان ، تاج‌الدین ریزہ ، شہاب سہمرہ اور عمید سنّامی ــــ کا مذکور ہے ، اور جس قدر ذرائع معلومات ان شعرا کے لیے میسر ہیں ، ڈاکٹر اقبال حسین نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا ہے اور سارے مواد کو ایک خوش اسلوبی کے ساتھ جمع کر دیا ہے ۔ اہل پنجاب کے لیے شاید یہ اطلاع موجبِ اطمینان ہو کہ ڈاکٹر صاحب کی فہرست کے ان چھ شعرا میں سے چار پنجاب سے علاقہ رکھتے ہیں ۔ یعنی ابو عبداللہ النکتی ، ابوالفرج رونی ، مسعود سعد سلمان اور عمید سنّامی ۔

ڈاکٹر صاحب نے شاید ہندوستان زائی کی شرط قائم کر کے اس عہد کے دیگر شعرا کو اپنی فہرست سے خارج کر دیا ہے ، تاہم ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حمیدالدین مسعود بن سعد شالی کوب ، جو بقول عوفی[1] ''احرارِ خطۂ لوہور (لاہور)''

۱- ملاحظہ ہو لباب‌الالباب ، حصہ دوم ، صفحہ ۱۱-۱۲۰ ، طبع لیڈن (مرتّب)۔

سے تعلق رکھتا ہے ، اور مولانا سراج منہاج لوہوری المولد کا ادخال تو ان کی فہرست میں ضروری تھا ، بلکہ ہم تو یہ بھی کہیں گے کہ ایسے بیرونی شعرا جن کی شاعری ہندوستان کی سرزمین میں پرورش اور نشو و نما پاتی ہے ، ہندی نژاد شعرا کے ساتھ ساتھ ہندیت کے استحقاق میں دوش بدوش ہیں ۔ اگر قطب‌الدین ایبک ، التتمش ، بلبن اور بابر کا شمار سلاطینِ ہند میں ہو سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ وطنیت کے تنگ خیال کی بنا پر ان شعر گویوں کو ہندی شاعروں کے طبقے سے خارج رکھا جائے ۔ اسی خیال نے شاید انھیں ملتان کے تمام شعرا کو ، جو ناصر الدین قباچہ کے دربار سے متعلق تھے (مثلاً شمس‌الدین محمد کاتب بلخی ، فضلی ، ضیاؤالدین سجزی وغیرہم) ، اپنی فہرست میں شامل کرنے سے باز رکھا ہے ۔ قباچہ کو علم و فضل و شعر و سخن سے خاص دل بستگی تھی اور اس کے دربار میں اچھے اچھے فضلا و شعرا جمع تھے اور اس کثرت سے تھے کہ مجدالدولہ سید الافاضل نے ایک علیحدہ تذکرہ ان کے ذکر میں تالیف کیا اور 'نمونہ' کلام بھی کثرت سے دیا تھا[1] ۔

جس قدر شعرا ڈاکٹر صاحب نے لیے ان کے تعلق میں بھی تمام مباحث کے ساتھ کافی داد نہیں دی گئی ۔ ابوالفرج کے دیوان کو اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جاتا تو اس عہد کے سیاسی و تاریخی و دیگر مسائل پر نئی روشنی پڑتی ۔ وہ افغانوں اور جاٹوں (جت) کو مشرک لکھ رہا ہے جس سے ظاہر ہے کہ افغان اور جاٹ اس وقت تک من حیث‌القوم مسلمان نہیں ہوئے تھے ۔ اس کے ہاں سب سے پہلے دہلی ، میرٹھ (میرت) اور بدایوں (بودادوں) کا ذکر آتا ہے ۔

ابوالفرج کے باپ کا نام مسعود ہے مگر یہ کون سا مسعود ہے ؟ ایک مسعود رازی ہے جسے سلطان مسعود شہید نے اس جرم میں کہ اس نے سلجوقیوں کی بڑھتی طاقت کے توڑنے کا ایک قصیدے میں مخلصانہ مشورہ دیا تھا :

مخالفانِ تو موران بدند مار شدند
برآر زود ز موران مار گشتہ دمار

۱- عوفی کے الفاظ ہیں : ''تمامت این افاضل را اجلّ محترم مجدالدولہ والدین سیّد الافاضل والکتّاب دام فضلہ در دیوان ذکر کردہ است و اشعار ایشان بتمام و کمال آوردہ ۔'' (لباب‌الالباب ، حصہ دوم ، صفحہ ۲۱۸) - مرتّب ۔

اور جو مسعود کو برا معلوم ہوا، اسے ہندوستان میں جلاوطن کر دیا ۔ بعد میں ایک قصیدے کی بنا پر ۴۳۱ھ میں اگرچہ قصور معاف کردیا اور تنخواہ جہلم (جیلم) کے معاملے پر مقرر کردی مگر حکم دیا کہ ہندوستان ہی میں رہے اور غزنی نہ آنے پائے ۔ ادھر خود ابوالفرج اپنے باپ کو 'مسعودی' کے نام سے یاد کرتا ہے اور امیر سیف‌الدولہ محمود سے اپنے نام پر اس کی تنخواہ کی بحالی کا مستدعی ہے، چنانچہ:

کز وجوهی که داشت مسعودی
کند آنرا ملک بدان تمکین

صفحہ ۲۵ پر سیف‌الدولہ محمود کے ایک جشن کے سلسلے میں مسعود سعد سلمان کے دیوان سے ایک تاریخ دے کر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ابوالفرج نے اس کی تاریخ نہیں دی ۔ مگر ابوالفرج نے جو ایک تاریخ دی تھی، ڈاکٹر صاحب نے اس پر بھی نظر التفات نہیں ڈالی، وھو ھذا:

خسروا بنده را بلوهاور
در مدیح تو شعرهاست متین
هر یکی کرده راوی انشاد
در سنه اربع ستة و ستین

آخری لفظ کی قرأت میں اختلاف ہے ۔ سبعین اور تسعین بھی قلمی نسخوں میں ملتا ہے جس میں تسعین تو صریحاً غلط ہے ۔ 'ستة' کی جگہ 'مایہ' بھی ملتا ہے جس سے مراد ۴۷۰ھ یا ۴۶۶ھ ہو سکتا ہے ۔

بعض موقعوں پر غیر ضروری مباحث داخل کر دیے گئے ہیں؛ مثلاً صفحات ۱۵، ۲۷ و ۲۸ پر سلطان ابراہیم غزنوی کے جلوس و وفات کے سنین کے تعلق میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ابراہیم ۴۵۰ھ یا ۴۵۱ھ میں تخت نشین ہوا ۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ اس کا سال جلوس ۴۵۰ھ ہے ۔ اگرچہ متعدد مآخذ گنا دیے مگر یہ فیصلہ نہیں کیا کہ اس کی تخت نشینی کا صحیح سال کیا ہے ۔ ابراہیم کے جلوس کے لیے سب سے قدیم اور معتبر مورخ ابوالفضل بیہقی

ہے ۔ اس نے یہ تاریخ بدیں الفاظ دی ہے[1] :

''روز دو شنبہ نوزدھم صفر سنہ احدی و خمسین و اربعمائہ ۔''

(۱۹ صفر ۴۵۱ھ مطابق ۶ اپریل ۱۰۵۹ع)

اسی طرح ابراہم کی وفات کے لیے ہر دو روایت ۴۸۲ و ۴۹۲ھ تحریر کرنا اور موخرالذکر سال کی تصدیق کے لیے برٹش میوزیم کے سکّوں کی شہادت پیش کرنا ہمارے نزدیک تحصیل ِ حاصل ہے کیونکہ آج ایسا کوئی شخص موجود نہیں جو ابراہیم کی وفات ۴۸۲ھ میں تصور کرتا ہو ۔

صفحہ ۱۶ : ابوالفرج رونی کی وفات کے متعلق مختلف اقوال دینا کہ 'صحف ِ ابراہیمی' میں ۴۸۹ھ ، 'مرآت عالم' میں ۴۸۲ھ ، 'نشتر عشق' میں ۴۹۰ھ ، جن میں آخری تاریخ ڈاکٹر کی نگاہ میں صحت کے زیادہ قریب ہے ۔ اور کہ وہ ۴۹۲ھ کے بعد تک زندہ رہا ، ہمارے نزدیک تصویر کا نیم رخ دکھانا ہے ۔ اگر ہم ڈاکٹر صاحب کی جگہ ہوتے تو اس استدلال کو جہاں انھوں نے ختم کیا ہے وہاں سے یوں شروع کرتے کہ سلطان مسعود ثالث ۴۹۲ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور ابوالفرج رونی نے اس کی مدح میں سولہ سترہ کے قریب قصائد اور چند قطعات لکھے جو اس کے دیوان میں موجود ہیں ۔ اس لیے ابوالفرج کو مسعود کے جلوس سے بدرجۂ اقل چند سال بعد تک زندہ رہنا چاہیے ۔ وہ مسعود کی تاج پوشی کے موقع پر قصیدہ لکھتا ہے ۔ دوسرے قصیدے میں شاہ موصوف کے اک دنتے ہاتھی کی طرف تلمیح ہے :

بشکل پیل یک دندش نگہ کن

نعم چون پیل یک دندش هزار است

''یک دند'' : اک دنتا ۔ 'دند' پنجابی شکل ہے ہندی 'دانت' کی ۔

ایک قصیدہ یورش ِ قنوج کے ذکر میں ہے ۔ شاہ موصوف ہندوستان میں 'موہند' کے قریب سے ، جو کوہ سوالک میں ایک درے کا نام ہے ، گزرتا ہوا بیشۂ ہرمایہ (؟) کو عبور کر کے 'سنکت' ہوتا ہوا قنوج پہنچتا ہے اور 'ملہی' والیٔ قنوج سے کچھ پیل و مال پر صلح کر کے واپس ہوتا ہے ۔ ایک دعائیہ قصیدے میں

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ بیہقی ، طبع ایران ، سنہ ۱۳۲۴ شمسی ، صفحہ ۳۷۸ ۔ (مرتّب)

فتح قنوج اور نشاط عید کی مبارکباد دی جاتی ہے ۔ ایک قصیدہ اس وقت لکھا ہے جب مسعود افغانوں اور جاٹوں کو عید قربان کے ایام میں سزا دیتا ہے ۔ ایک قصیدہ اس وقت نظم کیا جب غزنیں میں بارگاہ خلافت سے بادشاہ کے لیے 'عہد ولوا' آیا ہے اور شہر میں عام خوشیاں منائی جا رہی ہیں (ہمارے قیاس میں خلیفہ‌المستظہر کی یہ سفارت مسعود کے پاس ۴۹۴ھ سے قبل نہیں پہنچ سکتی) ۔ ایک قصیدہ کسی جدید عمارت کی تعریف میں ہے جو مسعود نے اپنے لیے بنوائی ۔ موسم سرما کی آمد پر ایک اور قصیدہ پش کیا گیا ہے جس میں شاعر بادشاہ کو غزنیں کے سرد سیر سے ہندوستان کے گرم سیر کی طرف جانے اور قنوج و بنارس فتح کرنے کی تحریص کرتا ہے ۔ ایک دعائیہ قصیدہ کسی غزو کی مبارکباد میں تحریر ہوا ہے جس کی خوشی میں جشن بھی منایا جاتا ہے ۔ دو قصیدے غالباً لاہور میں مسعود کی دوبارہ آمد پر مرقوم ہوئے ہیں ۔ ظاہر ہے یہ اور دیگر قصائد ابوالفرج نے خاص خاص موقعوں پر لکھے ہوں گے جن کے لیے ایک مدت درکار ہے ۔ ادھر مسعود کے باپ ابراہیم کی تعریف میں ابوالفرج کے ہاں کل چھ سات قصیدے ملتے ہیں جس سے بظاہر یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ابراہیم کے مقابلے میں ابوالفرج کی شاعری کا زمانہ مسعود کے عہد میں زیادہ گزرا ہے ۔ اگرچہ اور توجیہیں موافق و مخالف لائی جا سکتی ہیں مگر ان واقعات کی بنا پر یہ استدلال قابل قبول ہوگا کہ مسعود کی شان میں یہ قصیدے شاعر نے کئی سال کے عرصے میں لکھے ہوں گے ۔ اس لیے ابوالفرج کو مسعود کی تخت نشینی سے ، جو ۴۹۲ھ میں ہوتی ہے ، کئی سال بعد تک زندہ رہنا چاہیے ۔

اس مدت کی حد بندی کے لیے ہم دو تاریخیں پیش کرتے ہیں : (۱) شاعر نے سلطان مسعود کی شان میں جشن آبان کے موقع پر ، جب 'ایام عید' بھی تھے ، ایک قصیدہ لکھا ہے :

شاہ را روی بخت گلگون باد
جشن آبان برو ہمایون باد

آبان اور عید کی تلمیح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جشن ۱۰ آبان ۴۷۱ یزدجردی کو منایا گیا ہوگا جو ۱۱ ذی‌الحجہ ۴۹۵ھ کے مطابق ہے ۔ (۲) ایک اور قصیدے میں (ع : آمد آن تیر ماہ سرد سخن) جو خواجہ ابو سعد بابو کی

مدح میں ہے ، شاعر نے فارسی مہینے 'تیر' اور 'روزہ کشائی و عید' کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ قصیدہ ہذا ایسے سنہ میں لکھا گیا ہوگا جب تیر اور رمضان اکٹھے آئے ہیں - ۱۰ تیر ۴۷۳ یزدجردی کو تاریخ یکم رمضان ۴۹۷ھ واقع ہوتی ہے - ان تاریخوں سے تو ثابت ہوتا ہے کہ ابوالفرج رونی ۴۹۷ھ تک تو زندہ ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر پانچویں صدی کے اختتام تک بقید حیات ہو - ہمارے نزدیک یہ استدلال بہ نسبت اُس استدلال کے ، جس میں زیادہ تر متأخر تذکرہ نگاروں کے اقوال و آرأ منقول ہیں ، زیادہ قرین صحت اور فیصلہ کن ہے -

صفحہ ۲۷ : ابوالفرج کے پہلے ممدوح ابراہیم کے ذکر میں ڈاکٹر صاحب نے اس کے خطابات اور تاریخ جلوس و وفات پر بحث کرنے کے سوا اور کوئی کام کی بات نہیں کہی -

صفحہ ۲۹ : ابوالفرج کے دوسرے ممدوح علاءالدین مسعود کے تذکرے میں بھی کوئی بات نہیں پیدا کی - وہی تاریخِ جلوس و وفات اور خطابات پر بحث ہے - زیادہ زور اس بات پر صرف ہوا ہے کہ تاریخ 'روضۃالصفا' میں 'جلال‌الدولہ' جو اس کا خطاب درج ہے ، بالکل غلط ہے - اس کے لیے سکّوں تک کی شہادت پیش ہوئی ہے -

صفحہ ۳۱ : تیسرا ممدوح سیف‌الدولہ ہے - ڈاکٹر صاحب اگر چاہتے تو اس کے متعلق خواجہ مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی کے دیوان کے مطالعے سے ہندوستان میں اس کے کارناموں کی تفصیل دے سکتے تھے - (۴) خواجہ منصور بن سعید بن احمد بن حسن میمندی - (۵) ثقۃ‌الملک طاہر بن علی بن مشکان - (۶) ابو نصر پارسی - (۷) خواجہ ابو سعد بابو - (۸) ابوالقاسم خاص - (۹) ابو رشد رشید خاص - (۱۰) عبدالحمید بن احمد بن عبدالصمد - (۱۱) محمد بہروز پر ڈاکٹر صاحب نے کام کے اور قیمتی نوٹ لکھے ہیں - (۱۲) نجم‌الدین ابا حلیم زریر شیبانی کو ڈاکٹر صاحب ، سلطان مسعود بن ابراہیم کے عہد کا سپہ سالار مانتے ہیں حالانکہ وہ سلطان ابراہیم کے عہد میں تھا - وہ ایک ادنیٰ سپاہی کے درجے سے ترقی کرتے کرتے سپہ سالار ہند بن گیا - اس کے کارنامے دور محمودی کی یاد دلاتے ہیں - وہ ایک طرف بنارس (بانرسی) اور دوسری طرف سومنات پہنچا ہے - تھانیسر (تانیسر) کو مغلوب اور قنوج کو زیر کر چکا ہے - میرٹھ (میرت)

اس کے حلقۂ اثر میں ہے اور النکی والیٔ دہلی کی سزا دہی کے لیے ، جس نے میرٹھ پر تاخت کی تھی ، تیاری میں مصروف ہے ۔ اتنے میں سلطان ابراہیم کی آمد کی خبر پہنچتی ہے ۔ زریر کی تقصیر کا ہمیں علم نہیں مگر وہ باغی و غدار قرار دیا جاتا ہے اور ایک قلعے میں پناہ لیتا ہے جہاں سے محاصرے کے بعد گرفتار ہو کر ابراہیم کے سامنے لایا جاتا ہے اور موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے ۔

یہاں ہم کچھ اشعار ، جو اباحلیم کے انجام پر روشنی ڈالتے ہیں ، خواجہ مسعود کے دیوان[1] سے نقل کرتے ہیں :

بگو بدان کہ خلافِ خدایگان خواهد
کہ کارنامۂ بی مغز را یکی برخوان

نگاه کن کہ چو بر خویشتن بہ پیچد ازوی
چگونہ روی بدو داد محنت و حرمان

شدش فراش آن حال کامد از جاجرم
نمد قبائی پوشیده پارهٔ خلقان

براه مرکب او بود پیر لاشہ خری
ز چوب کرده رکاب و زلیف کرده عنان

همہ فراغت او آنکہ گرم خفتی شب
همہ تنعم او آنکہ سیر خوردی نان

لباس خوبش پشم و بساط نرمش خاک
سلیح و آلت خاشاک و نان[2] او انبان

بفتر دولت و اقبال شهریار اجل
بقدر و رتبت بگذاشت تارک از کیوان

چو یافت از ملک شرق زور و زهرهٔ شیر
بدو سپرد ملک مرغزار هندستان

۱۔ ملاحظہ ہو دیوان مسعود سعد سلمان ، مرتبہ آقای رشید یاسمی ، صفحہ ٣٧٠-٣٧١ ، طبع طهران ، ١٣١٨ ہجری شمسی ۔ (مرتب)

۲۔ دیوان مرتبہ آقای رشید یاسمی میں "خون او" ۔ (مرتب)

ز رزم جویان دادش چهل هزار سوار
چو تیغ آخته قد و چو نیزه بسته میان

ولایتی که بدو داد خسرو عالم
هزار رای فزون بود در نواحی آن

بطول بود ز مهیاره تا باسا مرو
بعرض بود ز کشمیر تا به سیبستان

چو مار پیچان بودی ز حد تیغش رای
چو برگ لرزان بودی ز نوک تیرش خان

چو از قبائل نسبت همی بشیبان کرد
شدند بر فلک از مفخرش بنی شیبان

بدان سپاه و بدانخواسته فریفته شد
بگشت در سر بیهوش و مغز او عصیان

به نیم ساعت کفران ز هر چه نعمت داشت
همی[۱] نشاندش آری چنین کند کفران

طلوع بودش چون نجم و نجم نام و نسب[۲]
غروب باشد آری پس از طلوع بدان

بقرب خسرو شد محترق چنین باشد
هر آن ستاره که با آفتاب کرد قران

کدام حصن ز هند او حصار خواست گرفت
که نه بدولت سلطان براوی شد زندان

چو فوجی از سپه شاه روی داد بدو
همه نشاط وی اندوه گشت و سود زیان

غریو موکب خسرو چو گرد حصن بخاست
گرفت سخت گریبان بخت او خذلان

۱- مرتبه رشید یاسمی میں ''تهی'' (مرتب) -
۲- مرتبه رشید یاسمی میں ''نام ویست'' (مرتب) -

سعادت ملک او را فروکشید ز حصن
بغل دو دست و همی خواست زینهار و امان
شکوه شاه بخم کرد چون کمان پشتش
گلوی او بزه اندر کشید همچو کمان

(دیوان مسعود سعد سلمان، صفحہ ۱۴۴، طبع ایران، ابوالقاسم خوانساری ۱۲۹۶ھ)

ابراہیم کے حسرت ناک انجام کے بعد ایالتِ ہند غالباً سیف الدولہ محمود کے سپرد ہوتی ہے جو ابراہیم کا خلف اکبر تھا۔

انوری پر ابوالفرج کے اثر کے متعلق کافی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے مگر ایک بات رہ گئی: انوری نے ابوالفرج کے تتّبع میں جو قصیدے لکھے ہیں، ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

صفحہ ٦٧ سے صفحہ ۱۳٦ تک مسعود سعد سلمان کا تفصیلی مذکور ہے۔ اس شاعر کے باب میں جو اطلاع ڈاکٹر صاحب نے دی ہے اس سے کہیں زیادہ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی اپنے مضمون میں، جو خواجہ مسعود پر لکھا ہے، دے چکے ہیں۔ ان بیانات کی تکرار اور دوبارہ چھان بین کی بجائے اگر ڈاکٹر صاحب مسعود کے ہاں ایسے امور پر، جو ہند و غزنہ کے تعلقات اور ہندوستانی معاملات سے متعلق ہیں، توجہ دیتے تو ان کے لیے نیا زمینہ اور ہمارے لیے معلومات کا جدید ماخذ بن جاتا۔

مسعود کے والد سلمان کے ذکر میں ایک امر قابل اضافہ ہے کہ وہ ۴۲۷ھ میں بہ عہد سلطان مسعود شہید، جب شہزادہ مجدود والیٔ ہند مقرر ہوتا ہے، مستوفی کے منصب پر سرفراز ہوکر ہندوستان آتے ہیں، تب سے یہ خاندان اس سرزمین میں آباد ہوگیا۔ تاریخ بیہقی میں آتا ہے:

”و وی را (شہزادہ مجدود) سہ حاجب با سپاہ دادند و بو منصور پسر ابوالقاسم علی نوکی از دیوان ما باوی بدبیری رفت و سعد سلمان بہ مستوفی، و حل و عقد سرہنگ محمد بستد“ (صفحہ ٦۲۲)۔

صفحہ ۸٦: محمد بھیلیم (Mohammad Bhylim) یہ نام پڑھ کر ہر شخص چونک اٹھے گا۔ ’طبقات ناصری‘ میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ محمد باہلیم ہے۔ مگر فخر مدبر نے کتاب ’آداب الحرب‘ میں، جو بہ عہدِ سلطان شمس الدین

التتمش تصنیف ہوتی ہے ، محمد باحلیم مذکور ہے اور یہی شکل صحیح ہے۔ 'آداب الحرب' میں سلطان بہرام شاہ اور محمد باحلیم کی جنگ کا قصہ بھی تفصیلاً مرقوم ہے۔ ولایتِ ملتان (مولتان) کے ایک گاؤں 'کیکور' کے پاس ، جس کے ایک طرف دلدل اور پانی تھا ، یہ جنگ واقع ہوئی۔ محمد باحلیم کا اکثر لشکر اس دلدل میں تلف ہوگیا۔

صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶ : چالندر۔ ڈاکٹر نے اپنے مقالے میں جہاں کہیں اس شہر کا ذکر کیا ہے 'چالندر' با جیم فارسی لکھا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ کس مقام کا نام ہے۔ ہم سمجھتے ہیں مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی کی تقلید میں انہوں نے یہ قرأت اختیار کی جو غلط ہے۔ لیکن مرزا ایرانی ہیں اور ہندوستان کے جغرافیے سے ناواقف۔ صحیح نام 'جالندھر' ہے جو پنجاب کے ضلع جالندھر کا صدر مقام ہونے کے علاوہ لدھیانہ اور امرتسر کےدرمیان شمال مغربی ریلوے کا اسٹیشن اور صوبہ پنجاب کا مشہور و معروف شہر ہے۔

مسعود سعد سلمان کے تذکرے میں ڈاکٹر صاحب بڑی حد تک مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے فاضلانہ رسالے 'مسعود سعد سلمان' کے ممنون ہیں جس کا پروفیسر براؤن نے انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ مگر اس ممنونیت کا اظہار نہیں کیا گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ بغیر ایسے رہبرِ کامل کے مسعود سعد سلمان کے سفرِ حیات کی منازل اور ان کے نشیب و فراز طے کرنا ڈاکٹر صاحب کے لیے نہایت دشوار ہو جاتا۔ تاہم مرزا کی طرف ان کا رویہ حریفانہ ہے۔ وہ مرزا کے رسالے کا اسی وقت زیادہ ذکر کرتے ہیں جب اس سے اختلاف منظور ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اکثر وہ اپنا راستہ گم کر جاتے ہیں۔ ہم یہاں بخوف طوالت اس بے راہ روی کی ایک آدھ مثال پر قناعت کرتے ہیں۔

(۱) صفحہ ۱۰۰ :

عفو سلطان نامدار رضی
بر شب من فگند نور قمر

اس شعر کی سند پر مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے یہ رائے قائم کی کہ خواجہ مسعود کو پہلی قید سے ، جو دہسالہ تھی ، سلطان ابراہیم غزنوی نے اپنی زندگی ہی

میں رہا کر دیا تھا اور ہر شخص ان کی رائے کے ساتھ اتفاق کرے گا۔ خود شاعر کے اپنے بیان سے زیادہ کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے ، مگر ہمارے ڈاکٹر اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”سلطان رضی سے مرزا محمد خاں کی مراد سلطان ابراہیم ہے ، اگرچہ بعض غیر مشہور تاریخوں میں سلطان ابراہیم کو 'سلطان رضی' کے نام سے یاد کیا گیا ہے مگر رضی اس موقع پر اسم صفت کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے اور سلطان ابراہیم مراد نہیں ، نہ اس کے بے شمار سکّوں پر یہ خطاب پایا جاتا۔“ (صفحہ ۱۰۰)

ڈاکٹر اس حد تک تو سچے ہیں کہ ابراہیم کے سکّوں میں یہ نام (رضی) نہیں ملتا ، اور ملتا بھی کہاں سے ؟ جب اس کی زندگی میں یہ خطاب اس کے لیے استعمال ہی نہیں ہوا۔ ہمارے ڈاکٹر اس لفظ کے حقیقی مفہوم سے نا آشنا ہیں اور اسی لیے غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے۔ متوفی سلاطین کے لیے ضابطہ تھا کہ سرکاری دفاتر اور تاریخوں میں خاص خاص ناموں سے یاد کیے جاتے تھے۔ فارسی میں یہ قاعدہ بنو سامان کے عہد سے رائج ہے۔ احمد بن اسمٰعیل سامانی کو 'امیر شہید' ، نصر بن احمد کو 'امیر سعید' ، نوح بن نصر کو 'امیر حمید' ، عبدالملک کو 'امیر سدید' ، سلطان محمود کو 'امیر ماضی' ، ہمایوں کو 'جنت آشیانی' ، اکبر کو 'عرش آشیانی' اور عالم گیر کو 'خلد مکانی' کہتے تھے۔ اسی طرح ابراہیم بن مسعود غزنوی وفات کے بعد 'سلطان رضی' کے نام سے یاد کیا گیا۔ مسعود کے شعر بالا میں 'سلطان رضی' سے مراد یقیناً ابراہیم غزنوی ہے اور مرزا محمد کا نظریہ بالکل صحیح ہے۔

ڈاکٹر کا یہ مقولہ کہ 'رضی' غیر متعارف تاریخوں میں آتا ہوگا ، پایۂ اعتبار سے ساقط ہے کیونکہ اکثر معتبر تاریخوں میں اس کا استعمال ہو رہا ہے۔ 'طبقات ناصری' سے ایک مثال عرض ہے :

”و تخت سلطنت بہ 'سلطان رضی' ابراهیم علیه الرحمۃ رسیده بود۔“ (صفحہ ۲۳)

(۲) صفحہ ۲۵ تا ۲۸ : مسعود سعد سلمان نے کسی ابوالفرج کے خلاف

ایک قطعہ لکھا ہے[1] جس کا پہلا شعر ہے :

بوالفرج شرم نامدت کہ بہ خبث[2]
بہ چنین حبس و بندم افگندی

اس سے ظاہر ہے کہ یہ ابوالفرج ہمارے شاعر کو قید میں ڈلواتا ہے۔ اس ابوالفرج کے متعلق مسعود کے تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ اکثر نے شاعر مشہور ابوالفرج رونی کا نام لیا ہے۔ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے مسعود کے دیوان سے دو ابوالفرج تلاش کیے۔ پہلا یہی ابوالفرج رونی اور دوسرا ابوالفرج نصر بن رستم جو نائب دیوان ہند ہے۔ یہ مسعود کی قید ثانی کا ذکر ہے جو واقعہ سلطان مسعود کے دور میں پیش آتا ہے۔ مرزا نے اول کو تو اس بنا پر خارج کر دیا کہ مسعود کے قطعات سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں شاعروں میں گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور دوم کو یوں بری کر دیا کہ سلطان سابق کے عہد میں وفات پا چکا تھا ، جیسا کہ اس کے مرثیے سے ، جو خود خواجہ مسعود نے لکھا ہے ، ثابت ہوتا ہے۔ یہ مرثیہ مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں۔

ہمارے ڈاکٹر ان امور کو جاننے کے باوجود ایک نہایت عجیب اور نرالے استدلال سے ابوالفرج نصر بن رستم کو مسعود کی قید کا مجرم گردانتے ہیں۔ قطعہ مذکورہ کے آخری شعر میں وہ مسعود کی ایک دھمکی :

زود خواہی درود بی شبہت
بر تخمی کہ خود پراگندی

نقل کرکے کہتے ہیں کہ مسعود کی یہ دھمکی بالآخر اپنا رنگ لائی ، جیسا کہ اشعار آیندہ سے ، جو شاعر نے ابوالفرج نصر بن رستم کو لکھے ہیں ، ظاہر ہوتا ہے :

ای کینہ ور زمانۂ غدار خیرہ سار
بر خیرہ تیرہ کردہ بما بر تو روزگار

بر بندگان اگر بہ ستیز است کار تو
بر خواجۂ عمید چرائی ستیزہ کار

۱۔ ملاحظہ ہو دیوان مسعود سعد سلمان ، مرتّبہ رشید یاسمی ، صفحہ ۶۳۵ (مرتّب)۔

۲۔ مرتّبہ رشید یاسمی میں ''بجہد'' (مرتّب)۔

بر نصر رستم از چہ ستمکار گشتہ ای
در مہتری نبود ستمگر بہ ہیچ کار
آن بوالفرج کہ داد جہان را ز غم فرج
اکنون ہم از جہان تو برآری ہمین دمار[1]

مگر ڈاکٹر صاحب یہ بیان نہیں کرتے کہ اس دھمکی نے آخرکار کیا گل کھلایا۔ قصہ مختصر ان اشعار اور قطعے کی بنا پر، نیز اس بنا پر کہ مطبوعہ دیوان میں ابوالفرج نصر بن رستم کا نام قطعۂ مذکورہ کی سرخی میں درج ہے، ڈاکٹر کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ ابوالفرج نصر بن رستم ہے جو ابو نصر پارسی کی تباہی اور اس کے متوسلین کی (جن میں مسعود سعد سلمان بھی شامل ہے) قید و بند کا بانی کار تھا۔

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ابیاتِ بالا کی روشنی میں کس طرح اس خلافِ توقع نتیجے پر پہنچے۔ ان اشعار سے برخلاف اس کے کہ مسعود کی کسی دھمکی کی ایما مترشح ہو، ابوالفرج نصر بن رستم کے ساتھ شاعر کی دلی ہمدردی اور غمخواری ثابت ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفرج اپنے عہدۂ امارت سے معزول ہوگیا ہے اور شاعر اس کی تسلی اور دل دہی میں یہ قصیدہ لکھتا ہے۔ ابتدا میں زمانے کو خطاب کرتا ہے کہ تیری بے باکیوں نے ہماری اوقات تلخ کر دی ہے، خیر ہم غریبوں کو تو جتنا چاہے ستا لے مگر خواجہ عمید نصر بن رستم پر کیوں ظلم روا رکھتا ہے۔ اس نے تو اپنے دور امارت میں کبھی ستم سے کام نہیں لیا، وہی ابوالفرج جس نے دنیا کو ظلم سے نجات دی اور 'تو اب بھی بدستور دنیا کی ہلاکت میں مصروف ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنے ممدوح کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ 'چاند کو گھٹنے سے شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ گھٹنے ہی سے بڑھنا اس کو نصیب ہوتا ہے اور چودھویں کا چاند بن جاتا ہے۔ گردش فلکی ہمیشہ نحوست میں نہیں رہے گی۔ سعادت کی طرف بھی کروٹ بدلے گی۔ آخر ایک دن تیری مراد بر آئے گی اور دنیا تیری ترقی پر ناز کرے گی۔ چنانچہ:

ای چون مہ چہاردہ در کاہش و کمی
مہ را ز کاستن نبود ہیچ ننگ و عار

۱۔ دیکھیے دیوان مسعود سعد سلمان، مرتبہ رشید یاسمی، صفحہ ۲۷۷-۲۹۰۔ (مرتب)۔

مه ار همه تمام نکاهد از انچه هست
آخر برآید از فلک ارچه لزار و زار
آخر فزون شود کو فزونی ز کاستیست
وز پستی آردش به بلندی ده و چهار
این گردش فلک نه همه بر نحوست است
آخر سعادتیست در این اختر و مدار
آخر بکام دل برسی و هوای دل
آخر زمانه با تو کند باز افتخار

(دیوان مسعود ، صفحہ ۱۰۰ ، طبع ابوالقاسم خوانساری ، ۱۲۹۶ھ)

یہ اشعار ڈاکٹر صاحب کے منقولہ بالا اشعار کے عین بعد آتے ہیں اور قصیدہ اس دعا پر ختم ہوتا ہے :

عزّ و بقات باد و سرت سبز و تن درست
دلشاد و شاد کام و تن آباد و شاد خوار
مسپار دل بانده و گیتی همی سپر
مگذر تو از جهان و جهان خوش همی گذار

(صفحہ ۱۰۱)

مطبوعہ دیوان میں قطعہ مذکور کا ابوالفرج نصربن رستم کے نام کے ذیل میں دیا جانا کوئی معتبر سند نہیں[1] ۔ یہ دیوان بالکل غیر منتقدانہ حالت میں طبع ہوا ہے ۔ متن بےحد سقیم ہے اور سرخیوں میں بھی کئی موقعوں پر غلط اندراج ہیں ۔ قطعے کے متعلق دیوان کی تنہا شہادت کافی نہیں اور قطعہ اپنی سرخی کی تائید میں بھی نہیں ۔ لیکن جب میرزا محمد اطلاع دے چکے کہ ابوالفرج نصر بن رستم سلطان ابراہیم کے عہد میں وفات پا چکا اور مسعود نے اس کا مرثیہ بھی لکھا ، اس

۱۔ جناب رشید یاسمی نے اپنے مرتبہ دیوان مسعود سعد سلمان میں قطعہ مذکور پر نصر بن رستم کا نام نہیں دیا (صفحہ ۶۳۵) اور عنوان ''شکوہ از سعایت ابوالفرج'' درج کیا ہے ۔ لیکن اشاریے میں یہ سعایت ، نصر بن رستم کے کھاتے ہی میں ڈالی ہے (مرتّب) ۔

واضح اور صاف اطلاع کے بعد ڈاکٹر صاحب کا نصر ابن رستم کو اس کی وفات سے کئی سال بعد ظہور پذیر ہونے والے حبس مسعود سعد سلمان کے لیے ماخوذ کرنا بالکل بےمعنی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یا تو مرزا کے بیان کی تردید کر کے ثابت کرتے کہ ابوالفرج معلوم ، مسعود کی قید دویم کے وقت زندہ موجود تھا یا بجائے قطعے کی سرخی پر اعتبار کرنے کے دیوان مسعود کے مخطوطات کی ورق گردانی کرتے اور یہ دکھاتے کہ وہ مرثیہ وجود ہی نہیں رکھتا[1]۔ میرزا محمد کا اس مرثیے کے اشعار نہ دینا ان کی ثقاہت پر حرف نہیں لاتا اور نہ ہی ان کے بیان کی اہمیت کو گھٹاتا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے دعوے کے واسطے بھی کوئی معقول وجہ یا قرینہ موجود ہے؟ دیوان میں رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفرج نصر بن رستم 'عمید ملک' 'سالار' اور 'صاحبِ دیوانِ ہند' (وزیر دیوان ہند) ہے۔ مسعود نے اس کی شان میں آٹھ نو[2] قصیدے لکھے ہیں۔ وہ اس کو نہایت ادب اور احترام کے ساتھ خطاب کرتا ہے۔ اپنا سرپرست اور مربیّ تسلیم کرتا ہے۔ اس کا لہجہ نہایت مخلصانہ اور نیازمندانہ ہے اور شاعر پر اس کے احسانات مسلّم۔ ان قصائد میں کسی ناخوشگوار واقعے کی طرف تلمیح تک نہیں جس کی بنا پر مسعود اس ممدوح کے خلاف اپنے ابرو پر شکن لاتا یا شکایت سے لب آشنا کرتا۔ یہی نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے زوال دولت کے وقت بھی شاعر اس کے ساتھ وفادار رہا ہے ، جیسا کہ ابیات بالا سے ظاہر ہے۔ پھر مراتب زندگی اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایک امیر کبیر اور سالار صاحبِ اقتدار اور دوسرا اس کا مداح اور متوسّل۔ ادھر قطعۂ بالا میں جس ابوالفرج کو شاعر نے خطاب کیا ہے وہ یقیناً شاعر کا ہم رتبہ

۱۔ مسعود سعد سلمان کے شائع شدہ دیوانوں میں مرثیۂ زیر بحث نظر نہیں آتا (مرتّب)۔

۲۔ دیوان مسعود سعد سلمان ، مرتّبہ آقای رشید یاسمی میں ابوالفرج نصر بن رستم کی مدح میں گیارہ قصیدے موجود ہیں۔ علاوہ ازیں چار شعر کا ایک قطعہ بھی ہے (مرتّب)۔

بلکہ کم رتبہ ہے ۔ بجائے اس کے کہ وہ شاعر کے ساتھ سلوک و احسان کرتا ، الٹے شاعر نے اس کے ساتھ سلوک کیے ہیں ۔ چنانچہ مسعود اسی قطعے میں کہتا ہے :

شد فراموش کز برای تو باز
من چہ کردم ز نیک پیوندی

یعنی میں نے اپنی شرافت سے تیرے ساتھ جو سلوک کیے تو نے سب کو نسیاً منسیا کر دیا ۔ کیا ایک رئیس اعظم اور امیر محترم کو اس طرح سے خطاب کیا جا سکتا ہے ؟ یہ شعر بھی قابل غور ہے :

تا من اکنون ز غم ھمی گریم
تو بہ شادی ز دور می خندی

کہ میں تو غم میں رو رہا ہوں اور تو مجھے روتا دیکھ کر دور سے کھڑا کھڑا ہنس رہا ہے ۔ ہم دریافت کرتے ہیں کیا غم زدہ مسعود کا یہ نالہ ایک امیر والا جاہ کے خلاف فریاد خوانی کا پتا دیتا ہے یا ایک سنگ دل حریف کے برخلاف جو اپنے رقیب کو پامال ہوتا دیکھ کر جوشِ مسرت میں بغلیں بجانے لگتا ہے ؟ پورے قطعے کی زبان ، اس کا اسلوب بیان اور جذبات سب اس خیال کے موید ہیں کہ ان کا مخاطب ایک بے وفا دوست اور ہمسر ہے ، نہ کہ کوئی امیر جلیل القدر ۔ ہم ایک شعر اور نقل کرتے ہیں :

وین چنین قوتی تراست کہ تو
پارسی را کنی شکاوندی

اور اب تو تیرا حوصلہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ (ابو نصر) پارسی کی کرید میں لگ گیا ہے ۔ اس شعر سے بھی ہمارے خیال کی تائید مزید ہوتی ہے ۔

یہاں ایک اور امر کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے ؛ جب ایالتِ ہند عضد الدولہ شیرزاد کے سپرد ہوئی ، ابو نصر پارسی عمیدِ ملک اور نائب مقرر ہوا ۔ یہ وہی منصب ہے جس پر ہم ابوالفرج نصر بن رستم کو بھی سرفراز دیکھتے ہیں یعنی وہ عمید ملک اور وزیر دیوان ہند ہے ۔ ابوالفرج رونی اور مسعود کے قصائد سے یہ امر واضح ہے ۔ ظاہر ہے کہ دو شخص ایک وقت میں اسی ایک خدمت پر مامور نہیں ہو سکتے ۔ اس دقّت کو دور کرنے کے لیے لامحالہ ہمیں ان کے زمانوں

میں فرق ماننا پڑے گا ۔ ادھر شیرزاد کے دور کے منصب داروں کی فہرست میں ، جو مسعود کی مثنوی میں محفوظ ہے ، ابو نصر پارسی کا نام ملتا ہے[1] ، مگر ابو الفرج نصر بن رستم کا نام موجود نہیں ۔ اس سے بھی ان کے زمانوں میں تقدیم و تاخیر لازم آتی ہے ۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ ابو الفرج نصر بن رستم ، ابراہیم کے دور میں اور ابو نصر پارسی مسعود کے عہد میں نائبِ ہند تھے ۔ جب ان کا زمانہ مختلف لازم آ گیا تو ان وزیروں کا اسی ایک معاملے میں بحیثیت فریق مخالف حصہ لینا تقریباً دشوار ہے ۔ ان وجوہ کی بنا پر ہم ابوالفرج نصر بن رستم کو اس قطعے کا مخاطب تسلیم نہیں کر سکتے ۔

ہمارا ان دو مثالوں سے یہ دیکھنا مقصود تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے جہاں جہاں میرزا سے مختلف الرائے ہونے کی کوشش کی ہے ، مطلق کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ الٹے مشکلات میں گرفتار ہوگئے ۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس قطعے کا مخاطب کون سا ابوالفرج ہے ، ہم اس کے متعلق صرف اسی قدر کہیں گے کہ یا تو ہمیں ایک تیسرا ابوالفرج تسلیم کرنا پڑے گا یا پھر امین احمد رازی کا ہم نوا ہوکر ابوالفرج رونی پر شبہے کی نظریں دوڑانی پڑیں گی ۔ ڈاکٹر صاحب کو اعتراض ہے کہ امین احمد نے افسانہ تراش لیا ۔ ممکن ہے کہ افسانہ ہو مگر اس افسانے کے لیے گنجائش ضرور موجود ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ ابو الفرج رونی نے سعایت کی ہو ۔ ع

بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن

رشک و حسد شعرا کی عام خصوصیت ہے ۔ خود مسعود سعد سلمان اپنے پہلے حبس کے متعلق تو صاف صاف ایک شاعر ہی کو ملزم قرار دے رہا ہے ۔ وہ سلطان ابراہیم

۱۔ محوّلہ بالا مثنوی میں ابو نصر پارسی کی مدح میں بارہ شعر ہیں ۔ پہلا شعر یہ ہے :

خواجہ ابو نصر پارسی کہ جہان
ہیچ ھمتا نداردش ز مہان

ملاحظہ ہو دیوان مسعود سعد سلمان ، مرتّبہ رشید یاسمی ، صفحہ ۵۶۵ ۔
(مرتّب)

سے مخاطب ہے[1] :

همی ندانم خود را گناهی و جرمی
مگر سعایت و تلبیس دشمن مکار

زمن بترسد ای شاه خصم ناقص من
که کار مدح بمن باز گردد آخرکار

(دیوان ، صفحہ ۸٦)

ان اشعار کے ساتھ جب صاحبِ 'ہفت اقلیم' نے اس قطعے کو بھی دیکھا جس میں ابوالفرج کا نام مذکور ہے ، تو وہ قدرةً اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ابوالفرج رونی ہے جس نے غریب مسعود کو قید میں ڈلوایا ۔ اس لیے تذکرہ نگاروں کا یہ اعتقاد اس قدر گمراہ کن نہیں جس قدر ڈاکٹر صاحب سمجھے ہیں ۔ لاہور میں اس وقت چوٹی کے شاعر صرف دو تھے ، پہلا مسعود سعد سلمان اور دوسرا ابو الفرج رونی ۔ جب مسعود شکایت کرتا ہے کہ میرے ہم پیشہ شاعر نے بر بنائے رشک میری بدگوئی کی تا کہ منصبِ مداحی پر میری بازبحالی نہ ہو سکے ، تو ظاہر ہے کہ تذکرہ نگاروں کی نگاہیں قدرةً ابوالفرج رونی پر اٹھیں گی ۔

صفحہ ۱۱۱ : ڈاکٹر صاحب کا اعتقاد ہے کہ مسعود نے اگرچہ ملک ارسلان کی شان میں قصائد لکھے لیکن ان کو شاہی عنایت حاصل نہیں ہوئی ۔ البتہ اس کے جانشین بہرام شاہ کے دور میں مسعود سعد سلمان ندیمانِ خاص میں شامل ہے ۔ یہ بادشاہ شعرا کا بڑا قدردان تھا اور مسعود کا زمانہ اس کے دربار میں آسائش و راحت سے بسر ہونے لگا ۔

مگر دیوان پر سرسری نظر ڈالنے سے قضیہ بالکل برعکس معلوم ہوتا ہے ۔ بہرام شاہ کی تعریف میں قصائد کی تعداد چار[2] سے زیادہ نہیں ۔ ادھر ملک ارسلان کی

۱۔ دیوان مسعود سعد سلمان ، مرتّبہ رشید یاسمی ، صفحہ ۲۵۷ - ۵۹ (مرتّب)
۲۔ دیوان مسعود سعد سلمان مرتّبہ آقائے رشید یاسمی میں بہرام شاہ کی تعریف میں چھ قصائد ملتے ہیں ۔ دو زائد قصیدے ، جو اشاعتِ ابو القاسم خوانساری میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

شان میں چھ عدد غزلیات و قطعات کے علاوہ بارہ قصائد[1] ملتے ہیں ۔ ان قصائد میں اس کا انداز بڑی حد تک غیر سکلفانہ ہے ۔ کبھی وہ اپنے متعلق ، کبھی دوسروں کے متعلق عرض و معروض میں مصروف ہے ۔ ایک قصیدے میں وہ اپنے پرانے

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

موجود نہیں ، یہ ہیں :

صفحہ ۱۱۴ :

کوس ملک آواز نصرت برکشید
کفر و شرک از هول آن سر در کشید

صفحہ ۱۱۶ :

تا در جهان مکین و مکان باشد
بهرام شاه شاهِ جهان باشد (مرتّب)

۱۔ دیوان مسعود سعد سلمان میں غزل و قطعات کے علاوہ "ماه های فارسی" "نام روزهای فرس" اور "روزهای هفته" کے قریب قریب ہر ذیلی عنوان کے تحت ملک ارسلان بن مسعود کا نام موجود ہے ۔

جہاں تک ملک ارسلان کی مدح میں قصائد کا تعلق ہے ، دیوان مسعود مرتّبہ رشید یاسمی میں مرتّبہ ابو القاسم خوانساری سے مندرجہ ذیل پانچ قصائد زائد ہیں :

صفحہ ۱۱۰ :

ز سر گیتی پیر بوده جوان شد
کہ سلطان گیتی ملک ارسلان شد

صفحہ ۱۱۳ :

لوا و عهد خطاب خلیفہ بغداد
خدای عزّ و جل بر ملک خجستہ کناد

صفحہ ۲۲۸ :

بر [illegible] صفہ پادشاہ بگذر
و آرایش تخت و ملک بنگر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

دوست ابو نصر پارسی کی وفات کا ذکر کرتا ہے :

بو نصر پارسی ملکا جان پتو سپرد
زیرا سزای مجلس عالی جز آن نداشت (صفحہ ۲۱)

پھر اس کے اخلاق و محاسن بیان کر کے کہتا ہے کہ اس نے تریسٹھ سال کی عمر میں جان دی ۔ مرتے وقت اس کے آخری الفاظ شاہ کی مدح و ثنا میں تھے ۔ مرحوم مجھ پر خاص طور سے مہربان تھا ۔ ہم میں دوستی کا یہ سلسلہ چالیس سال سے قائم تھا ۔ اب بادشاہ کو چاہیے کہ اس کی اولاد کی عزیز داشت سے غافل نہ رہے ۔

ارسلانی قصائد میں شاعر ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی قید کے واقعے کی طرف تلمیح کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سلطان مسعود کے اواخر عہد سے تعلق رکھتا ہے ۔ ایک موقع پر کہتا ہے :

ای شاہ جہان فلک ندانست
آنگاہ کہ بر تنم جفا کرد
چون دید مرا بخدمت تو
دانست کہ آن جفا خطا کرد

(صفحہ ۶۳ ، دیوان)

دوسری جگہ کہتا ہے :

در انتظار رحمت و فضل تو ماندہ ام
ای کردہ روزگار ترا دولت انتظار
داند خدای عرش کہ گیتی قرار داد
کز رنج دل نیابم شبہا ہمی قرار

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

صفحہ ۲۳۰ :

ای ماہ دو ہفتہ منور
این ہفتہ منہ ز دست ساغر

صفحہ ۳۸۵ :

نگاہ کن بہ بزرگی و جاہ این ایوان
کہ بر گذشتہ بہ رفعت ز تارک کیوان (مرتب)

من بنده سال سیزده محبوس مانده ام
جان کنده ام زمحنت درحبس و درحصار

زین زینهار خوار فلک جان من گریخت
در زینهارت ای ملک زینهار دار

در سمچهای تنگ و خشن مانده مستمند
در بند های سخت بتر مانده سوگوار

(صفحہ ۳۹ ، دیوان)

اب وہ اپنی بے نوائی اور قرض کے متعلق گویا ہے :

دارم هزار دشمن و یک جان و نیم تن
لیکن گذشته وام من از هشت صد هزار

پیر ضعیف حالم و درویش عاجزم
بر پیری و ضعیفی من بنده رحمت آر

گیرم گناه کارم والله که نیستم
نه عفو کرده ای گنه هر گناه کار

ان گذارشات سے روشن ہے کہ ملک ارسلان کے ساتھ شاعر کے تعلقات بہت خوشگوار تھے اور اس کے ساتھ اس کی بہت توقعات وابستہ ہیں ۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے مسعود کا سال وفات ۵۱۵ھ مانا ہے - ڈاکٹر صاحب بر خلاف جمہور تقی کاشی کی تقلید میں ۵۲۵ھ لکھتے ہیں جس کے واسطے کوئی معقول وجہ موجود نہیں - بہرام شاہ ۵۱۲ھ میں تخت نشین ہوتا ہے ۔ اس کی مدح میں مسعود نے کل چار قصیدے لکھے ہیں جن سے قیاس ہوتا ہے کہ بہرام شاہ کے عہد میں ہمارا شاعر دیر تک زندہ نہیں رہا ۔ اس لیے جو لوگ اس کی وفات ۵۱۵ھ میں بیان کرتے ہیں ان کی رائے صحت کے قریب ہے ۔

مقالے کا جو حصہ مسعود کی شاعری اور اس کی خصوصیات سے تعلق رکھتا ہے ، ہماری رائے میں نہایت مفید اور قیمتی کار گزاری ہے ۔ اگرچہ اس میں بھی اضافے کی گنجائش محسوس ہوتی ہے ۔ عروضی نقطۂ نظر سے خواجہ مسعود کے ہاں بعض جدید اوزان ملتے ہیں اور ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن کو ہندو اثرات کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے ؛ مثلاً 'بارہ ماسہ' یا 'دوازدہ ماہہ' جسے خواجہ نے

'غزلیاتِ شہوریہ' کے نام سے یاد کیا ہے اور غزلیاتِ اسبوعیہ و ایامیہ اور شہر آشوب ۔ نظموں کی یہ قسمیں سر زمینِ پنجاب میں فارسی اور ہندی کے روابط کی یادگار ہیں اور فارسی شاعری کے مورخ کے لیے ان کا جائزہ لینا از بس ضروری ہے ۔ فارسی میں ان نظموں کی روشناسی سے یہ امر تو صاف روشنی میں آ جاتا ہے کہ خواجہ مسعود ہندی کی ان اقسامِ نظم سے یقیناً واقف تھے اور تذکرہ نگاروں کا یہ دعویٰ کہ خواجہ مسعود نے ہندی میں بھی ایک دیوان یادگار چھوڑا ، بے بنیاد نہیں معلوم ہوتا ۔

یہاں ہم ایک مغالطہ کا بھی ذکر کر دینا چاہتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب کو پیش آئی ؛ تاج ریزہ کے ذکر میں وہ لکھتے ہیں کہ :

"تقی اوحدی اور رضا قلی خاں نے انوری کے بعض اشعار تاج ریزہ کی طرف منسوب کر دیے ہیں ۔ مثلاً یہ قصیدہ :

افزود باز رونق ہر مرغزار گل
چون زیر یافت نالۂ ہر مرغزار گل

حالانکہ دیوان انوری میں موجود ہے ، تاج کے حوالے کر دیا ہے ۔"

(صفحہ ۱۶۰)

ہماری رائے میں یہ قصیدہ تاج کا ہے نہ انوری کا ۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ اہل مطبع نے کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ صرف یہی قصیدہ بلکہ تاج ریزہ کے کئی اور قصیدے کلیات انوری میں شامل کر لیے ۔ یہ غلطی قدیم ہے اور انوری کے بعض مخطوطات میں بھی موجود ہے ۔ تاج کے قصاید زبان کی سادگی و سلاست اور داخلی شہادت کی بنا پر انوری کے کلام سے ، جس کی خصوصیت تکلف ، دقتِ بیان اور حسنِ ادا ہے ، بہ آسانی پہچانے جا سکتے ہیں ۔ قصیدۂ بالا التتمش کے فرزند غیاث الدین محمد کی تعریف میں ہے اور اس کا نام متن میں موجود ہے ۔ اسی غیاث الدین کی مدح میں ایک اور قصیدہ ہے جو کلیات انوری میں صفحہ ۸۵ پر پایا جاتا ہے ۔ اس کا مطلع ہے :

ساقی بیا کہ وقت مئ لعل روشن است
میدان خاک تیرہ کنون سبز گلشن است

التتمش کا مدحیہ قصیدہ ، جو ڈاکٹر صاحب نے صفحہ ۱۵۱ - ۱۵۲ پر نقل کیا ہے ،

کلیات انوری میں صفحہ ۱۲۳ پر مع مطلع موجود ہے - یہی نہیں بلکہ کلیات انوری میں دو قصیدے (صفحہ ۸۳ اور صفحہ ۳۰۷) سلطان رکن الدین فیروز کی تعریف میں اور دو قصیدے (صفحہ ۸۷ و صفحہ ۱۳۶) نظام الملک قوام الدین محمد جنیدی کی شان میں ملتے ہیں - ان میں سے ایک قصیدے میں شاعر اپنی ہندی نژادی کے متعلق گویا ہے :

مولد و منشا ببین در خاک ہندستان مرا
نظم و نثرم بین کہ بر آب خراسان آمدہ است

(صفحہ ۸۹ ، کلیات انوری)

ایک اور قصیدہ غالباً شہزادی رضیہ سلطانہ کی شان میں لکھا ہے جب التتمش زندہ ہے :

راضی ز تو ای رضیۃ الدین
حق قادر ذوالجلال اکرم

(صفحہ ۲۸۱ ، کلیات انوری)

ہم نے کسی قدر تفصیل سے اس موضوع پر رسالہ اُردو (اپریل سنہ ۱۹۲۳ع) میں بحث کی ہے[1] جو صفحہ ۲۲۷ سے شروع ہوتی ہے ، لہذا یہاں اس مختصر پر قناعت کی جاتی ہے -

'سنام' کا تلفظ فی زمانہ بضم اول ہے - قدیم تلفظ بضم اول و تشدید دوم ہے - سب سے پہلے اس قصبے کا ذکر عثمان مختاری کے ایک قصیدے میں آتا ہے جب مسعود ثالث نے اس پر حملہ کیا :

خبر رسید کہ اندر نواحیٔ سُنّام
سر حصاری کو داشت با ستارہ قران

سنام ، ریاست پٹیالہ کی عملداری میں ، پٹیالے سے تینتالیس میل جانب مغرب ، نظام کرم گڑھ میں ، لدھیانہ جاکھل ریلوے پر واقع ہے - تاج ریزہ ، شہاب مہمرہ اور عمید سنامی کے سلسلے میں تمام ذرائع سے ضروری اطلاع فراہم کر لی گئی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ایک دراز عرصے تک ، ان شعرا پر جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے ، اس پر جدید اضافہ نہیں ہو سکے گا -

---

۱- دیکھیے مقالات حافظ محمود شیرانی ، جلد پنجم ، صفحہ ۳۵۹ (مرتّب) -

یہ بعض اختلافی اور اضافی امور ، جو ہم نے گزشتہ صفحات میں درج کیے ، ان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کی مساعی کی قرار واقعی شناخت سے قاصر ہیں ، بلکہ یہ مقصد ہے کہ مقالے کی دوسری اشاعت کے وقت ہماری ان گذارشات پر بھی غور کر لیا جائے ۔

شعرا کا کلام نقل کرتے وقت متن کی تصحیح میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا اور پروف تو بڑی عجلت سے پڑھے گئے ہیں جن کی وجہ سے غلطیاں جابجا نظر آتی ہیں ۔ چند مثالیں عرض ہیں :

صفحہ ۹ پر النکتی کا شعر :

بطراز قد و خرخری زلفین دراز
رستخیز ہمہ خوبان طراز و خزر است

بحالتِ موجودہ پہلا مصرع نہ صرف مہمل بلکہ خارج از وزن ہے ۔ وزن کی خاطر ہمیں "بطراز [ی] قد و خر [خیز] ی زلفین دراز" پڑھنا ہوگا ۔ لیکن دوسرے مصرع میں 'طراز' اور 'خزر' کا استعمال مقتضی ہے کہ پہلے مصرع میں بھی یہ الفاظ آنے چاہئیں ۔ اس صورت میں ہمیں مصرع اول میں یوں ترمیم کرنی ہوگی ۔

ع : "بطراز[ی] قد[ی] و [آن خزری زلف] دراز"

صفحہ ۱۵ پر انوری کا شعر :

ویحک ای صورت منصور نہ باغی نہ سرائی ۔ ۔ ۔ الخ

مصرع ہذا میں 'منصور نہ' کی جگہ 'منصوریہ' چاہیے جو شہر طوس کے ایک باغ و عمارت کا نام ہے ۔ اس کا ذکر معاصر تاریخوں میں بکثرت آتا ہے ۔ انوری نے کئی موقعوں[1] پر اپنے اشعار میں منصوریہ کا ذکر کیا ہے ۔ چنانچہ :

منصوریہ ہرگزت درآمد بضمیر
کاید بدرت موکب میمون وزیر

۱۔ دیوان انوری ، اشاعت سعید نفیسی ، صفحہ ۱ پر کتاب قصاید کا پہلا عنوان یہ ہے :

"برعقب صاحب ناصر الدین بہ منصوریہ رفت و بدین شعر بار خواست ۔"

(مرتب)

تاریخ جہانگشای جوینی (جلد سوم ، صفحہ ۳۴ و صفحہ ۱۰۴) میں بھی اس کا مذکور آتا ہے۔

پروف کی بعض غلطیاں ذیل میں بقیدِ صفحہ و سطر دی جاتی ہیں :

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲	۱	مسعود	سعد مسعود
۲۲	۷	کہ مسعود	کہ سعد مسعود
۲۵	۳	خیرہ ساز	خیرہ سار
۶۱	۴	بطالع	بطالعی
۶۲	۱۱	کہ	گہ
۶۳	۴	بیالاید	بپالاید
۷۷	۱	لہاور	لہاوور
۱۳۳	۳	برآمد	برآمد [ابر ؟]
۱۳۳	۱۲	عناد	عناء
۱۵۸	۵	نبات	بنات
۱۵۸	۱۶	عطرگر	عطرکز
۱۵۹	۲	بمن	یمن
۱۵۹	۳	روی و	زوولی
۱۶۸	۶	معانی	امانی
۱۶۸	۹	بگیرم	نگیرم
۱۶۹	۶	ستائی	ستانی
۱۶۹	۷	شد	شدہ
۱۶۹	۹	طبعم	طمعم
۱۷۱	۱	دم کوزۂ	دم کورۂ
۱۷۱	۵	بشبیہہ	بشبہ
۱۷۱	۱۲	اول	ز اول
۱۹۳	۱	چنگ بندد	چنگ و بندد
۱۹۳	۳	رشک او	رشک چنگ او

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۳	۵	خونیں	خونی
۱۹۴	۳	تیز تر	تیز پر
۱۹۴	۱۸	سوز پسر	سوگ پسر
۱۹۵	۹	میںازد	میسازد ؟

کتاب پر قیمت درج نہیں۔ مصنف سے پٹنہ کالج پٹنہ کے پتے سے مل سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب

(بہ زبانِ انگریزی)

مصنّفہ شمس العلما الحاج محمد عبدالغنی ایم - اے ، ایم - لٹ (کیمبرج)

صدر شعبۂ عربی و فارسی ، ناگ پور یونیورسٹی (سی - پی)

(از رسالہ 'اُردو' بابت ماہ جنوری ۱۹۴۳ء)

بہ قولِ جنابِ مصنّف ''یہ کتاب ہندوستان میں عہدِ قدیم سے آمدِ مغل تک فارسی زبان و ادب کے ارتقا پر ایک منتقدانہ جائزہ ہے -'' سر شاہ سلیمان نے ، جن کو اب مرحوم کہتے ہوئے ہمیں صدمہ ہوتا ہے ، اس پر تمہیدی کلمات لکھے ہیں اور گورنر بہادر صوبۂ متوسطہ نے ، جن کی خدمت میں مصنّف نے کچھ باب بہ غرضِ معائنہ بھیجے تھے ، اپنی خوشنودی اور مبارک باد کی چٹھی جواب میں بھیجی ، جس کو مصنّف نے کتاب کے ساتھ شائع کر دیا - ایسی سر برآوردہ ہستیوں کے پروانوں کے ساتھ جو کتاب چھپے گی ، ظاہر ہے کہ شان دار اور بلند پایہ ہوگی - چنانچہ اس کی طباعت اور کاغذ سے ہمارے خیال کی پوری پوری تائید ہوتی ہے - الہ آباد جرنل پریس اس کا طابع و ناشر ہے -

کتاب کا باب اوّل جو تمہیدی ہے ، اگرچہ مفید معلومات کا حامل ہے لیکن موضوع زیر بحث کا خیال کرتے ہوئے بہت کچھ غیر ضروری اور غیر متعلق کہا جا سکتا ہے - یہاں شمس العلما اسی قسم کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں جو ہمارے قدیم مورخین کرتے آئے ہیں کہ وہ لکھنا چاہتے ہیں اپنے عہد کی تاریخ مگر حضرت آدم سے شروع کرتے ہیں اور اپنے عہد تک پہنچتے پہنچتے ان کا زورِ قلم ختم اور جوشِ طبیعت ٹھنڈا ہو جاتا ہے - بعینہ یہی کیفیت اس تالیف

کی ہے کہ پروفیسر لکھنے بیٹھے تھے قبل از مغل فارسی ادبیاتِ ہند کی داستان مگر مقدمے میں ایسے مضامین چھیڑ بیٹھے جن سے نفسِ مضمون کو دور کا بھی تعلق نہیں؛ مثلاً عربوں کی فتحِ ایران کے بعد عربی اور فارسی کے روابط، فتح سندھ از عرب، عرب و ہند، فارسی کے معرّب الفاظ، عربوں پر فارسی کا اثر، ایسے الفاظ کی فہرست جو عربی نے فارسی سے مستعار لیے، عربی فارسی اشعار کے ترجمے، فارسی ضرب الامثال کے ترجمے، اشعار ملمع، عرب اور فتح سندھ، عرب سیاحوں کے بیانات وغیرہ وغیرہ:

طفیلی جمع شد چندان کہ جای میہماں گم شد

ہر شخص جان سکتا ہے کہ ان مطالب کو قبل از مغل فارسی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔

دوسرا باب 'غزنویوں سے قبل کا زمانہ' ہے۔ اس میں ساسانی دور میں شعر کا وجود، تیسری چوتھی صدی میں فارسی نثر کی کتابیں، شعرائے قدیم جو طاہری، صفاری اور سامانی عہد میں ہو گزرے ہیں، مذکور ہیں۔ اصل موضوع کا خیال کرتے ہوئے یہ باب بھی اتنا ہی بے محل اور بے موقع معلوم ہوتا ہے جتنا پہلا باب۔ اس کے علاوہ براؤن اور ایوی نیز دیگر مغربی مصنفین یہی زمین بار بار طے کر چکے ہیں۔

تیسرا باب خاص غزنویوں سے متعلق ہے۔ اس کے پہلے حصے میں صفحہ ۱۵۵ تا ۲۳۱ محمود اور اس کی سرپرستیٔ علماء و فضلا، بو علی سینا، ابو ریحان البیرونی اور اس کی تصنیفات، سالار مسعود غازی، مشاہیر شعرا، عنصری، فرخی، عسجدی، مختاری، زینتی، مسعود سعد سلمان، محمودی حملے، محمود کے القاب، فتحِ سومنات و دیگر امور متعلقہ، نیز محمود کے ادبی ذوق وغیرہ پر خیال آرائی کی گئی ہے۔

اسی باب کے دوسرے حصے میں بقیہ خانوادۂ غزنہ کے شعرا و فضلا کا ذکر ہے، جس میں آلِ محمود کی سرپرستیٔ ادب اور مشہور شعرا ابوالفرج رونی، سید حسن غزنوی، حکیم سنائی اور ان کے ہندی ابیات سے بحث ہے۔ یہ حصہ صفحہ ۲۶۳ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ بات نفس موضوع کا پس منظر ٹھہر سکتی ہے، تاہم کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا مسافر اپنی بالادوی سے باز آکر منزل مقصود کی طرف رجوع نہیں کرتا۔

چوتھا باب (صفحہ ۲۶۳ تا ۳۸۰) ہمیں غوریوں اور غلاموں کے ذکر و اذکار سے واقف کرتا ہے۔ ابتدا میں غوری عہد کے شعرا، رشید شہاب، نازکی مراغی، قاضی حمید بلخی، امام رازی وغیرہم کا مذکور آتا ہے۔ لیکن سب سے اہم مرتبہ خواجہ معین الدین چشتی کو بحیثیت شاعر دیا ہے۔ ان کا ذکر صفحہ ۲۷۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۲۹ پر ختم ہوتا ہے۔ صفحہ ۳۳۰ سے خاندانِ غلاماں کی طرف مراجعت ہوتی ہے اور کتاب صفحہ ۴۸۵ پر ختم ہوتی ہے۔ گویا اصل موضوع پر صرف ایک سو پچپن صفحے صرف کیے ہیں۔ ان صفحات میں خاندان غلاماں، ان کے عہد کے شعرا، ناصری، روحانی، تاج الدین دبیر دہلوی، شہاب مہمرہ، مصنّف طبقات ناصری، امیر فخرالدین عمید تونکی، علاءالدین غوری جہاں سوز اور ان کی شاعری سے بحث کی ہے۔ لیکن جہاں سوز کا ذکر یہاں بے موقع معلوم ہوتا ہے۔ اس کو غوریوں کی فصل کی ابتدا میں لانا چاہیے تھا۔

پانچواں باب، جو آخری باب ہے، صفحہ ۳۸۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۴۸۵ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں خلجی، تغلق اور خاندانِ غلاماں کے تین سلاطین معزالدین کیقباد اور بلابنہ (جمع بلبن) ہیں۔ اس عنوان میں مصنّف سے تقدیم و تاخیر سرزد ہوئی ہے۔ باب ھذا میں شمس العلما کے خمسہٗ متحیرہ امیر خسرو، خواجہ حسن، ضیاء برنی، بدرچاچ اور قاضی ظہیر دہلوی ہیں۔ خسرو پر اکتالیس، حسن پر چالیس اور ضیاء برنی پر انتیس صفحے صرف ہوئے۔ بدرچاچ اور قاضی ظہیر کے ساتھ ضد فضول کا سا سلوک روا رکھا ہے، اور کتاب ضیاء برنی پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

اب ہم اصل کتاب کی طرف، جو انگریزی میں ہے، رجوع کرتے ہیں اور جن بیانات میں ہمیں شمس العلما سے اختلاف ہے، ان کا ترجمہ نما خلاصہ بقید صفحہ مع اپنی تنقید کے سطور ذیل میں درج کرتے ہیں:

صفحہ ۸: کہتے ہیں کہ ہزاروں ایرانی خاندان، جو خراسان میں آباد تھے، ایران کے بادشاہ افراسیاب کے حکم سے اخراج کر دیے گئے۔

شمس العلما افراسیاب کو ایران کا بادشاہ بیان کرتے ہیں جو صحیح نہیں۔ تمام روایات کی رو سے افراسیاب توران کا بادشاہ ہے جو کیقباد و کیکاؤس و کیخسرو کیانی سلاطین سے معرکہ آرا رہا ہے۔ لیکن کیانی خاندان اساطیری عہد میں شمار ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۱ : برزویہ کو Barzauwaih لکھا ہے ، حالانکہ یہ لفظ بہ ضم سویم و سکون چہارم و تحریک یا باھاے مختفی ہے - فردوسی نے شاہنامے میں بہ تخفیف ھا لکھا ہے - چنانچہ :

پزشک سراینده برزوی بود
به پیری رسیده سخن گوی بود

(شاہنامہ ، صفحہ ۴۳ ، جلد چہارم ، طبع بمبئی ، ۱۲۷۵ھ)

صفحہ ۶۳ : دوسرے باب کے آغاز میں ، جو غزنوی دور کے ماقبل زمانے سے متعلق ہے ، شمس العلما بڑے جوش کے ساتھ اس الزامی قصے کی تردید میں مصروف ہیں جو دولت شاہ اور اس کے مقلد رضا قلی خاں نے عبداللہ بن طاہر کے خلاف لگایا ہے کہ نہ صرف اس نے افسانۂ وامق و عذرا کو دریا برد کرا دیا بلکہ عجمیوں کا تمام لٹریچر جہاں جہاں اس کی قلم رو میں دست یاب ہوا ، جلوا دیا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمین ایران سے شعر و سخن کا رواج موقوف ہو گیا -

شمس العلما دولت شاہ کی روایت کو بعید از قیاس تو مانتے ہیں لیکن طاہریوں کی بریت میں انھوں نے کوئی ثبوت یا دلیل بہم نہ پہنچائی - انھوں نے اس قدر کہا ہے کہ بنو طاہر ، بالخصوص عبداللہ بن طاہر اور خلیفہ المامون عباسی ، نہ صرف علوم و فنون کے سرپرست بلکہ خود بھی علم و فضیلت کی درخشندہ مثال تھے وغیرہ وغیرہ - اور اپنے دعوے کے ثبوت میں عبدالرحمٰن مغربی کا ایک اقتباس جو خلیفہ المامون کی علم دوستی ، حکمت اور فلسفے سے اس کی محبت اور قیصر روم سے علمی کتابوں کی طلب کے ذکر پر شامل ہے ، حوالۂ قلم کر دیا ہے - ہمارے نزدیک مامون کا ذوقِ علم طاہریوں پر سے الزام رفع نہیں کرتا - شمس العلما کو چاہیے تھا کہ یا تو اس الزام کی تردید کرتے یا یہ ثابت کرتے کہ ایران میں شعرگوئی عہدِ قدیم سے موجود نہیں تھی - مثلاً کہا جا سکتا تھا کہ دولت شاہ ایک غیر معتبر راوی ہے - وہ بنو سامان کے عہد کو فارسی شعر کا دور احیا کہتا ہے ، حالانکہ بنو طاہر کے زمانے میں فارسی شاعر موجود ہیں - خود عبداللہ بن طاہر (سنہ ۲۱۳ - ۲۳۰ھ) کے ایامِ حکومت میں فارسی کا سب سے پہلا صاحبِ دیوان شاعر حنظلہ بادغیسی (متوفی سنہ ۲۱۹ھ) موجود ہے - محمود وراق او فیروز مشرقی بھی اسی زمانے میں گزرے ہیں - عرب مصنفین جاحظ وغیرہ سے قطع نظر قدماے ایران

کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے کہ ساسانی عہد شاعری کے وجود سے خالی تھا ۔ نیز یہ کہ ایرانیوں نے شعرگوئی عربوں سے سیکھی ہے ۔ فخری گرگانی ویس و رامین (تالیف سنہ ۴۴۰ھ) کے دیباچے میں اصل پہلوی افسانے کی صراحت میں لکھتا ہے :

ندیدم زان نکوتر داستانی
نماند جز بہ خرم بوستانی

ولیکن پہلوی باشد زبانش
نداند ہرکہ برخواند بیانش

نہ ہر کس آن زبان نیکو بخواند
وگر خواند ہمی معنی نداند

فراوان وصف چیزی برشمارد
چو برخواند بسی معنی ندارد

شعر آیندہ قابل غور ہے :

کہ آنکہ شاعری پیشہ نبودست
حکیم چابک اندیشہ نبودست

کجا اند آن حکیمان تا بدانند
کہ اکنون چون سخن می‌آفرینند

محمد عوفی کا قول ہے : ''در عہد پرویز نوای خسروانی کہ آن را باربد در صحت آوردہ است ، بسیار است فاما از وزن شعر وقافیت و مراعات نظائر آن دوراست بدان سبب تعرض بیان آن کردہ نیامد تا نوبت بہ دور آخر الزمان رسید و آفتاب ملت حنیفی و دین مہدی سایہ بر دیار عجم انداخت و لطیف طبعان فرس را با فضلاء عرب اتفاق محاورہ پدید آمد و از انوار فضائل ایشان اقتباس کردند و بر اسالیب لغات عرب وقوف گرفتند و اشعار مطبوع آبدار حفظ کردند و بہ غور آن فرورفتند و بر دقائق بحور و دوائر آن اطلاع یافتند و تقطیع و قافیہ و ردف و روی وایطا و سناد و ارکان و فواصل بیاموختند وہم بران منوال نسائج فضائلی کہ نتائج طبع ایشان بود ، بافتن گرفتند ۔''

عوفی کی عبارت سے ثابت ہے کہ ایرانی نہ صرف شعر میں بلکہ جملہ فنون شعر میں عربوں کے شاگرد ہیں اور ان کی فضیلت کے قائل ہیں ۔ ناصر خسرو اقوام

عالم کی خصوصیات کے ذکر میں کہتا ہے :

سواران تازنده را نیک بنگر
درین پهن میدان ز تازی و دهقان

عربؑ بر رہِ شعر دارد سواری
پزشکی گزیدند مردان یونان

رہ هندوان سوی نیرنگ و افسون
رہ رومیان زی حسابست و الحان

مصور بکار است مر چینیان را
چو بغدادیان را صناعات الوان

منوچہری کا عقیدہ :

شاعری عباس کرد و حمزہ کرد و طلحہ کرد
جعفر و سعد و سعید و سید ام القری

انوری : شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکہ بود
اول شان امرء القیس آخر شان بونواس

افسانۂ وامق و عذرا کے تعلق میں کہا جا سکتا ہے کہ دونوں نام عربی الاصل معلوم ہوتے ہیں لہذا یہ قصہ بعد از اسلام تالیف ہوا ہو گا ، نہ قبل از اسلام ۔ متاخرین اس کے واسطے بڑی قدامت کے مدعی ہیں ۔ 'مجمل التواریخ' میں اس کو دارا بن داراب اور 'تاریخ گزیدہ' میں سکندر کے عہد کی تالیف بتایا ہے لیکن فہرست ابن ندیم میں اس افسانے کو سہل بن ہارون کتاب دارِ خلیفہ مامون کی تصنیف بیان کیا ہے اور یہی بیان زیادہ قابلِ قبول ہے ۔

اس افسانے کا دریا برد ہونا کجا ، وہ تو آج بھی موجود ہے ۔ عنصری ، فصیحی اور ناسی نے اسے نظم کیا ہے ۔ عنصری کی مثنوی اگرچہ مفقود ہے ، اس کے چند شعر ، میں ایک عکس سے ، جو پرنسپل محمد شفیع نے اگست سنہ ۱۹۳۷ع کے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا ہے اور اصل ورق الغزال پر غزنوی طرز کی کوفی میں پانچویں صدی ہجری کے منتصف اول کا نوشتہ ہے ، درج کرتا ہوں :

جوانی خردمند (؟) مادرش مردہ بود
پدر نیز دیگر زنی کردہ بود

زنی بدکنش معشقولیہ نام[1]
نبودش ھمی جز بدی ھیچ کام
زن بد اگر چون مہ روشن ست
میامیز با او کہ اھریمنست
دلش با پدر کردہ بودی درشت
ھمہ تخم تریش دادی بمشت
ھر آن مرد کو رفت بر رای زن
نکوھیدہ باشد ابر رای زن
بران[2] زن اندر زبن سود نیست
گر آتش نمایدت جز دود نیست

میں اس عورت کے نام معشقولیہ کی طرف بھی توجہ دلاتا ہوں جو پھر عربی طرز کا ہے اور عجمی نہیں۔

صفحہ ۶۷ : کہتے ہیں : "اسمعیل کی وفات کے بعد ، جو سامانی خاندان کا بانی ہے ، اس کا بھتیجا نصر بن احمد تخت نشین ہوا ۔"

واقعہ یہ ہے کہ اسمعیل سنہ ۲۹۵ھ میں وفات پاتا ہے ۔ اس کا فرزند احمد اس کا جانشین ہو کر سنہ ۳۰۱ھ میں فوت ہوتا ہے ۔ احمد کے بعد اس کا فرزند نصر تخت سلطنت پر جلوس کرتا ہے ۔ اس طرح نصر اسمعیل کا پوتا ہے ، نہ کہ بھتیجا۔

صفحہ ۳۲ : شیخ مرجویہ[3] کے فارسی فقرے "برکست من نگفتم آن پسر مناذر گفت" کا ترجمہ ذیل قابل غور ہے :

I never said this concerning any one ; that was said by Ibn Manazir.

۱- بحتولہ بالا عکس میں "بنام" معلوم ہوتا ہے ۔ (مرتب)
۲- عکس میں "برائے" نظر آتا ہے ۔ (مرتب)
۳- "سرجویہ ھمان ماسرجویہ طبیب بصرہ است کہ ابن ندیم در 'الفھرست' از او بہ ماسرجیس تعبیر کردہ و تالیف چند کتاب باو نسبت دادہ . . ."
(حاشیہ صفحہ ۶۷م ، تاریخ ادبیات ایران ، از جلال ھمائی ، جلد دوم ۔ مرتب)

شمس العلماء 'برکست' بہ تحریک سین پڑھ کر اسے مرکب لفظ مانتے ہیں اور اس کے معنی 'کسی کے متعلق' لیتے ہیں ، حالانکہ ''برگست'' باکاف عجمی و سکون سین ایک مفرد لفظ ہے جو تردیدی و ایرانی کلمہ ہے ۔ اس کے معنے حاشا و معاذاللہ ہیں ۔ یہ لفظ لغتِ فرس اور دیگر قدیم فرہنگوں میں ملتا ہے[1] ۔ قطران تبریزی :

بہ ہمت چون فلک عالی بہ صورت ہم چو مہ رخشا
فلک چون او بود برگست و مہ چون او بود حاشا[2]

صفحہ ۵۱ : ''محمدِ قاسم'' ۔ ان ناموں کے درمیان اضافتِ ابنی ہے جو کسرے کے ذریعے سے بولی جاتی ہے ؛ یعنی محمد بن قاسم ۔ پروفیسر یہ اضافت ترک کر گئے ہیں ۔

صفحہ ٦۹ : سامانی دور کے شعرا رودکی ، شہید بلخی ، مرادی وغیرہ کے

۱- ''برگست ۔ چنان بود کہ کسی گوید معاذ اللہ ۔ کسایی گوید :

رودکی استاد شاعران جہان بود
صد یک ازوی توی کسایی ؟ پرگست

(لغت فرس اسدی ، صفحہ ۱۱ ، طبع طہران)

''برکس و برگست ۔ بفتح با و کاف فارسی یعنی معاذ اللہ وحاشا و مبادا کہ چنین باشد فردوسی گوید :

سخنہا کہ گفتی تو برگست باد
دل و جان آن بدکنش گست باد

(فرہنگ رشیدی ، حصہ اول ، صفحہ ۲۷۲ ، طبع طہران)

''برگست باکاف فارسی بر وزن بدمست بمعنی برگس است کہ معاذ اللہ وخدا نکند باشد و بہ ہمین معنی با بای فارسی ہم آمدہ است ۔''

(برہان قاطع ، جلد اول ، صفحہ ۱۵۷) (مرتب)

۲- رودکی کہتا ہے :

گرچہ نامردم است آن ناکس
نہ شود سیر ازو دلم برکس (مرتب)

ساتھ ایک شاعرہ رابعہ بصری کا نام لیا ہے۔ یہ حضرت رابعہ بصری نہیں ہیں جو صوفیوں کے زمرے میں مشہور ہیں اور سنہ ۱۸۵ھ میں وفات پاتی ہیں بلکہ رابعہ قزداری جو کعب والئی قضدار یا قزدار کی دختر ہے اور مشہور شاعرہ ہے۔ رودکی اس کا کلام سن کر محو حیرت ہو گیا تھا۔ محمد عوفی اس کو مگس روئیں کہتا ہے۔ 'الٰہی نامہ' میں عطار نے رابعہ کے تفصیلی حالات دیے ہیں (دیکھو اورینٹل کالج میگزین[1] بابت مئی سنہ ۱۹۲۵ع، صفحہ ۶۸ - ۸۸)۔

صفحہ ۷۰: ''الپتگین کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحاق سنہ ۳۶۷ھ میں تخت نشین ہوا۔''

الپتگین بہ قول لین پول سنہ ۳۵۱ھ میں غزنیں پہنچا۔ سنہ ۳۵۲ھ میں اسحاق جانشین ہوا۔ سنہ ۳۵۵ھ میں بلکاتگین امیر مقرر ہوا۔ سنہ ۳۶۲ھ میں پیری جانشین ہو کر سنہ ۳۶۶ھ میں معزول ہوا اور سبکتگین اس کی جگہ امیر بنا، اس لیے ابو اسحاق کو سنہ ۳۶۷ھ میں الپتگین کا جانشین بنانا بالکل غلط ہے۔

صفحہ ۷۰-۷۱: کہتے ہیں کہ ''فارسی تہذیب اور فارسی شعر کا ذوق ہندوستان میں محمود کے باپ کے زمانے میں جڑ پکڑ چکا تھا، کیونکہ فتوحات کے سلسلے میں کئی بار اسے ہندوستان آنا پڑا اور جیپال سے جنگیں کیں۔ یہ تو معلوم نہیں کہ ان حملوں میں کون کون شاعر اس کے ساتھ آئے مگر یہ بھی یقین ہے کہ حسب دستور بہت سے آئے ہوں گے۔ اس کے غیر مسلسل قیام کی وجہ سے ہندوستان میں فارسی شاعری کا ذوق اس قدر نمایاں نظر نہیں آتا جتنا اس کے فرزند محمود کے دور میں۔ نہ کوئی ایسی یادداشت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعروں نے، جیسا کہ قاعدہ رہا ہے، خاص فتوحات کے موقعوں پر اس کی خدمت میں قصائد پیش کیے ہوں۔ البتہ ابوالفتح بستی کی ایک نظم، جو غزنیں میں تصنیف ہوئی، موجود ہے۔ نہ قدیم مؤرخین کے ہاں ایسے اشارے، جو ہندوستان میں شعری تحریک پر روشنی ڈالیں، ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی نظم ہندوستان میں محمود کی فتح سے پیش تر کوئی منضبط شدہ تاریخ نہیں رکھتی۔''

ہمارے نزدیک یہ بحث سراسر فرضی اور خیالی ہے۔ سبکتگین کی جیپال کے ساتھ صرف دو مرتبہ جنگ ہوئی۔ پہلی لمغان پر اور دوسری لمغان سے کسی قدر

۱۔ ملاحظہ ہو مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد پنجم، صفحہ ۸۲۷ (مرتّب)۔

فاصلے پر - بھلا یہ جنگیں ہندوستان میں فارسی شاعری کی کیا تخم ریزی کرتیں اور ہندوؤں میں شعر کا ذوق کیا پھیلاتیں - اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سبکتگین کے پاس سپاہیوں کی جگہ شاعر اور تیروں کی جگہ شعر تھے تو بھی اہل ہند ایک بیگانہ تہذیب کا اثر کیوں قبول کرتے - ادھر حال یہ ہے کہ سبکتگین کے درباری شاعروں کے نام تک معلوم نہیں - لے دے کر ایک نام ابوالفتح بستی کا ملتا ہے جو فتح بست کے موقع پر سبکتگین کے ہاتھ آتا ہے - لیکن اس کا میدان عربی ہے ، انشا اور کتابت کے واسطے مشہور ہے - سبکتگین نے اس کو اپنا درباری مؤرخ بنایا تھا - ایسی غیر موجّہ بحث اور قیاسی استدلال اس تالیف میں اور موقعوں پر بھی نظر آتے ہیں -

صفحہ ۱۷ : ابوالعباس (فضل) بن احمد اسفرائنی کے واسطے لکھا ہے کہ ''پہلے وہ نصر بن احمد سامانی کے دربار کا میر منشی تھا ، بعد میں سبکتگین کا وزیر ہوا ، جب وہ خراسان پر نوح بن نصر کی طرف سے حاکم ہوا - پیدایشی ایرانی ہونے کے سبب سے اسفرائنی عربی علمیت کے علاوہ فارسی کا جیّد عالم تھا -''

نصر بن احمد سنہ ۳۰۱ھ میں تخت نشین ہو کر سنہ ۳۳۱ھ میں وفات پاتا ہے ، اس لیے یہ ناقابل یقین ہے کہ ابوالعباس اس کے دربار کا ملازم ہو - نوح بن نصر ، جو سنہ ۳۳۱ھ سے سنہ ۳۴۳ھ تک حکومت کرتا رہا ہے ، ابوالعباس کے تعلق میں اس کا نام لینا بھی فضول ہے - تاریخ یمینی کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالعباس فائق کے مخصوصین میں سے تھا اور اس کا خطاب عمیدالدولہ تھا - جب سیف الدولہ محمود نیشاپور کا سپہ سالار بنایا گیا ، اس وقت ابوالعباس مرو کی ڈاک کا داروغہ تھا - امیر ناصر الدین سبکتگین کو اس کی امانت و دیانت کی اطلاع ملی - اس نے امیر رضی (مراد نوح بن منصور سنہ ۳۶۶ھ و سنہ ۳۸۷ھ) سے اسے مانگ لیا اور محمود کا وزیر بنا دیا - ابوالعباس جزرس بہت تھا - اس کو آمدنی بڑھانے اور توفیر دکھانے سے سروکار تھا - اس توفیر سے ملک تباہ ہوگیا اور آمدنی گھٹ گئی -

اس کی عربی دانی کے متعلق عتبی لکھتا ہے کہ وزیر ابوالعباس کو عربی کا علم نہ تھا اس لیے اس کی تحریریں فارسی میں ہوتی تھیں - چنانچہ بہت بے رونق ثابت ہوا - جب ابوالقاسم احمد بن حسن میمندی وزیر بنا ، اس نے دفتر کی زبان عربی کر دی اور عربی داں منشی مقرر کیے -

صفحہ ۷۲ : شمس العلما کا یہ قول کہ ابوالعباس نے 'شاہ نامہ' کی تصنیف کے واسطے فردوسی کی سفارش کی ، صحیح بنیاد پر قائم نہیں ۔ کیونکہ فردوسی محمود کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے سے اس کتاب پر مصروف تھا ۔ چنانچہ :

سخن را نگہ داشتم سال بیست
بدان تا سزاوار این گنج کیست

ایک اور موقع پر کہا ہے :

همی گفتم این نامہ را چند گاہ
نہان بود از چشم خورشید و ماہ

البتہ دربار شاہی میں فردوسی کا تعارف ابوالعباس کے توسط سے ہوتا ہے ۔

صفحہ ۷۳ : پروفیسر کا یہ بیان کہ ''عتبی نے اپنی تالیف (تاریخ یمینی) دربار خلافت سے سلطان کو خطاب یمین الدولہ عطا ہونے کی یادگار میں سلطان کے نام پر معنون کی'' قابل غور ہے ۔ کیونکہ یہ خطاب سلطان کی تخت نشینی سے ایک سال کے اندر اندر اس کو مل چکا تھا ۔ عتبی نے اگرچہ اپنی تالیف کی کوئی تاریخ نہیں دی لیکن سنہ ۴۰۹ھ تک کے واقعات اس میں درج ہیں ، یعنی حملۂ قنوج بلکہ نصر بن ناصرالدین کی وفات کا بھی ذکر کیا ہے ، جو واقعہ سنہ ۴۱۲ھ میں پیش آیا ۔ چونکہ یمین الدولہ سلطان کا خطاب تھا اس لیے اکثر چیزیں سلطان کی طرف نسبت پانے کی وجہ سے یمینی کہلائیں ؛ مثلاً ملک یمینی ، دولت یمینی ، عدل یمینی ، اسی طرح محمود کے سکّے یمینی کہلاتے تھے ۔ ان سکّوں پر یمینی مرقوم ہوتا تھا ۔ عتبی کی تالیف چونکہ محمود کی تاریخ تھی اس لیے محمود کی نسبت سے 'تاریخ یمینی' کہلائی ۔

پروفیسر کا یہ بیان کہ ''تاریخ یمینی سنہ ۴۱۵ھ کے قریب تصنیف ہوئی ، درست مانا جا سکتا ہے ، لیکن یہ کہنا کہ یہ کتاب محمود کی وفات کے بعد تالیف ہوئی درست نہیں ، کیونکہ محمود سنہ ۴۲۱ھ میں انتقال کرتا ہے ۔

صفحہ ۸۰ : عوفی نے بہرام گور کا شعر جو نقل کیا ہے کہ :

منم آن شیر گلہ ، منم آن پیل یلہ
نام من بہرام گور و کنیتّم بوجبلہ

اس کے تعلق میں ہم کہیں گے کہ یہ شعر مثمن اپنی قدیم شکل میں دو بیت

مربع کے برابر ہو گا ۔ ہر مصنف نے اپنے اپنے عہد میں اس میں تبدیلیاں کی ہیں ۔ ثعالبی غرر ملوک الفرس میں یوں نقل کرتے ہیں :

منم آن شیر شاہ منم آن ببر یلہ
منم آن بہرام گور ، منم آن بوجبلہ

لیکن ابن خوردادبہ نے کتاب المسالک و الممالک میں ، جو سنہ ۲۳۰ھ کے قریب تالیف ہوئی ہے ، اس کو نثر مسجّع بہرام گور کے نام سے یاد کیا ہے ، چنانچہ :

منم شیر شلنبہ و منم ببر یلہ

صفحہ ۸۱ : شمس العلما ، دولت شاہ کی یہ روایت کہ عضدالدولہ بویہ کے عہد میں قصر شیریں کی محراب پر شعر ذیل کندہ دیکھا گیا تھا :

ھزبرا بکیہان انوشہ بذی
جہان را بدیدار توشہ بذی

نقل کرکے کہتے ہیں کہ یہ شعر بہرام گور کے شعر سے زیادہ قدیم خیال کیا جاتا ہے ۔

میں کہوں گا کہ دولت شاہ راوی ضعیف ہے ۔ بہرام گور ، خسرو پرویز کی محبوبہ شیریں سے ، جس کے لیے قصر شیریں تعمیر ہوا ، بہت اقدم ہے ۔ اس کا زمانہ سنہ ۴۲۰ع تا سنہ ۴۳۸ع ہے اور خسرو پرویز کا زمانہ سنہ ۵۹۰ع تا سنہ ۶۲۷ع ہے ۔ اس کے علاوہ اس شعر کی ترکیب اور زبان چنداں قدیم بھی نہیں ۔ 'شاہ نامہ' کی ورق گردانی کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ جب شاپور ، اردشیر بابکان سے اپنے فرزند اورمزد کا ذکر چھیڑتا ہے ، دعائیہ کہتا ہے :

بدو گفت شاپور انوشہ بذی
جہان را بدیدار توشہ بذی

اس مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ قصر شیریں کے شاعر کو آخری مصرع میں فردوسی کے ساتھ توارد ہو گیا ہے ۔

ہم ناظرین کی توجہ اس شعر کے وزن کی طرف بھی مبذول کرنا چاہتے ہیں جو 'شاہ نامہ' کے وزن میں ہے ۔ یعنی متقارب مثمن محذوف ۔ محقق طوسی معیار الاشعار میں بحر متقارب مثمن کے واسطے کہتے ہیں کہ ایرانی اس وزن کو 'راہ اعشیٰ' کہتے ہیں ۔ کیونکہ اس بحر میں سب سے پہلے اعشیٰ نے اشعار لکھے ہیں ۔ جب اعشیٰ اس

وزن کا موجد قرار پایا تو کیا یہ مانا جائے کہ قصر شیریں کے شاعر کو وزن میں عرب شاعر اعشیٰ کے ساتھ بھی توارد ہو گیا ۔

صفحہ ۸۱ : ایک اور قدیم شعر بہ حوالۂ تاریخ آل غزنیں نقل کرتے ہیں ، و هو هذا :

زن شاهست در داوَر گردا
کوز گردد ندارد بیم از کس

پروفیسر صاحب کے طفیل میں ہم اس کتاب کے نام سے واقف ہوتے ہیں ۔ افسوس ہے اُنھوں نے اس کی کوئی صراحت نہیں دی ۔ تاہم وہ کوئی قدیم تالیف معلوم نہیں ہوتی ، غالباً گیارھویں صدی ہجری کے منتصف دوم یا بارھویں صدی کی تصنیف ہوگی ۔

خان آرزو نے غالباً 'مثمر' میں شعر بالا بہ حوالۂ دبستان المذاہب اس شانِ نزول کے ساتھ نقل کیا ہے کہ آبادیوں کے دور میں ایک بادشاہ فرهوش نامی گزرا ہے جس کی ملکہ کا نام شکر تھا ۔ بادشاہ کے دسترخوان پر ایک روز ارد کی مقشّر دال لائی گئی ۔ بادشاہ نے اپنے درباری شاعر شیدوس کی طرف اس خیال سے دیکھا کہ دال کی تعریف میں کچھ کہے ۔ شاعر نے فوراً ایک شعر پڑھا جس کا مطلب تھا کہ دال کفّارۂ گناہ کے واسطے برہنہ ہو گئی ہے ۔ بادشاہ یہ شعر سن کر پھڑک گیا اور ملکہ شاعر پر عاشق ہوگئی ۔ رات کے وقت شاعر کے گھر پہنچ کر طالبِ وصال ہوئی ۔ شیدوس نے انکار کیا اور کہا کہ جو عورت کسی سے نہیں ڈرتی ، اس سے ڈرنا چاہیے ۔ تو فرهوش جیسے شاہ والا جاہ کو چھوڑ کر اس کے ایک ادنٰی غلام پر فریفتہ ہوئی ؟ قصہ مختصر ملکہ مایوس ہو کر اپنے محل کو لوٹ گئی ۔ صبح کو بادشاہ نے جو ملکہ کے پیچھے پیچھے جا کر ملکہ اور شاعر کی گفتگو سن آیا تھا ، شاعر کو بلوایا اور ماجرائے شبینہ دریافت کیا ۔ شیدوس نے جواب میں یہ شعر پڑھا :

زن شاهست در داوَر گردا
کوز گردد ندارد بیم از کس

فرهوش بادشاہ یہ شعر سن کر نہایت خوش ہوا اور صلے میں شاعر کو ملکہ شکر بخش دی ۔ شیدوس کا گھر تو مفت میں بس گیا ، لیکن ہمیں اس قصے پر یقین

لانے سے قطعاً انکار ہے۔ ہمارے نزدیک دبستان المذاہب کا نامعلوم پارسی مصنف اس شعر کے وجود میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ وہ ایران کی قدامت کے جوش میں سلاطینِ ایران کے نئے سلسلے قائم کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ پیشدادیوں سے قبل ایران میں چار اور سلسلے گزرے جن میں سب سے اقدم مہ آبادی ہیں۔ انھی کو آبادی کہا جاتا ہے۔ مہ آباد ایران کا سب سے پہلا شخص ہے جسے خدا کی طرف سے پیغمبری اور بادشاہی عطا ہوئی۔ اس پر کتاب مقدس دساتیر نازل ہوئی۔ یہ کتاب پندرہ صحیفوں کا مجموعہ ہے اور ہر صحیفہ ایک ایک پیغمبر کی طرف منسوب ہے۔ مہ آباد کے بعد تیرہ پیغمبر اور آئے اور سب کے سب آباد کہلائے۔ مہ آبادیوں کے بعد دوسرے سلسلے میں 'جیان'، تیسرے میں 'شائی' اور چوتھے میں 'یاسان' ہیں۔ پانچویں سلسلے میں گل شائی ہیں جنھیں پیشدادی بھی کہتے ہیں۔ موجودہ تحقیقات پیشدادیوں بلکہ کیانیوں تک کو، جن کے حالات سے 'شاہ نامہ' کا بڑا حصہ پُر ہے، اساطیری درجہ دے رہی ہے۔ پھر مہ آبادی، جیان، شائی اور یاسان کا تو ذکر ہی کیا۔ جس طرح دساتیر مجعول ہے، اسی طرح اس کے باقی بیانات اور سلسلے موضوع ہیں۔ بلکہ شیدوس جیسے فرضی شاعروں کی بنا پر ایران میں فارسی شاعری کی قدامت کا دعویٰ بھی سراسر غلط ہے۔

ارد کی دال ہندوستانی کھاجا ہے۔ چنانچہ ایرانی ہم ہندیوں کو آج تک دال خوری کا طعنہ دیا کرتے ہیں۔ ''غلّہ را بغلّہ خورند و گویند دال روتی''۔ لیکن شیدوس کے قصے کے مصنف پارسی نے، جس کی تمام عمر ہندوستانی فضا میں گزری ہے، اپنے بزرگوں کو بھی دال کھلا دی۔

صفحہ ۸۱: شمس العلما یاتکار زریران کو ایک پہلوی رجزیہ نظم بتاتے ہیں، جس کے دوسرے نام پہلوی شاہ نامہ اور شاہ نامۂ گشتاسب ہیں۔ اس کی تصنیف کی عزت زردشت کی طرف منسوب کی ہے۔ فرماتے ہیں: ''قیاس میں آتا ہے کہ اس نظم نے پندرہ سو برس بعد شاہ نامہ نظم کرنے میں فردوسی کو محرک اور مثالیہ کا کام دیا ہے۔''

یاتکار زریران کو ہم نثر کی کتاب سمجھا کرتے تھے لیکن وہ نظم میں نکلی۔ اس کا مصنف، جسے ہم نامعلوم سمجھتے تھے، زردشت نکلا۔ نیز یہ کہ فردوسی نے اپنا 'شاہ نامہ' اس پہلوی 'شاہ نامہ' کے نمونے پر ڈھالا۔ چونکہ شمس العلما

نے اپنی جدید اطلاع کا کوئی ماخذ نہیں دیا ہے اس لیے ہم اس کے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں ۔ شمس‌العلما کی یہ صراحت زیادہ تر اس حصہ‌ٔ شاہ نامہ پر صادق آتی ہے جو دقیقی نے نظم کیا ہے ۔ وہ ان تمام مطالب پر حاوی ہے جو یاتکار زریران کے موضوع ہیں ۔ فردوسی کو اعتراف بھی ہے کہ دقیقی اس کا رہبر تھا : ہم او بود گوینده را راهبر ۔

صفحہ ۸۲ : خسرو پرویز کے دو مطربوں کے نام باربد (Barbud) اور سرخش (Sarakhsh) بتاتے ہیں ۔ باربد کو اہل لغت بہ ضم باے دوم بتاتے ہیں لیکن فردوسی نے بہ فتح باے دوم باندھا ہے اور یہی صحیح ہے :

چو رفتی بنزدیک او باربد
همش کاربد بد همش باربد

سرآمد کنون روز بر باربد
مبادا که باشد ترا یار بد

رہا 'سرخش' ، میں اس نام کی شناخت نہیں کر سکتا ۔ بہت ممکن ہے کہ پروفیسر کا سہو قلم ہو اور صحیح نام سرکش ہو ۔ سرکش خسرو کا مشہور مطرب ہے جو باربد کے خلاف حاجبِ دربار کے ساتھ سازش کرنے کی بنا پر معتوب شاہی ہوتا ہے ۔

فردوسی :
یکی مطربی بود سرکش بنام
بہ رامشگری در شده شاد کام

اور فرخی :
شاعرانت چو رودکی و شهید
مطربانت چو سرکش و سرکب

قصر شیریں اور شیدوس کے نوشتہ‌ٔ بالا شعر نیز دیگر مثالوں سے شمس العلما اس کوشش میں مصروف ہیں کہ شاعری کا وجود ساسانی دور میں ثابت کیا جائے ۔ لیکن وہ اپنے دعوے میں کامیاب نہیں ہوئے ۔ جو شہادت انھوں نے دی ہے ، زیادہ تر ظنی اور وضعی معلوم ہوتی ہے ، جیسا کہ میں گذشتہ سطور میں دکھا چکا ہوں ۔ خود ایرانیوں کی شہادت شمس العلما کے خلاف جاتی ہے ۔ عوفی ، ناصر خسرو ، فخری گرگانی وغیرہم کے بیانات اس مسئلے پر فیصلہ کن ہیں ۔

دولت شاہ کے ساتھ محمد صالح کنبوہ مورخ شاہ جہان ، مولانا محمد حسین آزاد ، رضا قلی خان ہدایت اور عباس اقبال آشتیانی ساسانیوں کے زمانے میں شاعری کے

وجود کے قائل ہیں ، لیکن ان بزرگوں کے دلائل غیر تسلی بخش ہیں ۔ بعض یہاں تک کہہ گزرے ہیں کہ ایران قدیم میں شاعری کی تمام اصطلاحیں تک موجود تھیں ؛ مثلاً نظم ، پیوستہ ۔ نثر ، پراگندہ ۔ شعر ، سرواد ۔ قافیہ یا ردیف ، پساوند ۔ تخلص ، داغ ۔ وزن شعر ، دم ۔ غزل ، چامہ اور قصیدہ ، چگامہ کہلاتے تھے ۔ ان کی حجت یہ ہے کہ جب یہ اصطلاحیں موجود تھیں تو کیا وجہ ہے کہ شعر اس زمانے میں موجود نہ ہو ۔ میں اس موضوع پر رسالۂ سہیل ، علی گڑھ (جنوری سنہ ۱۹۲۷ع) میں کافی بحث کر چکا ہوں[1] ۔ یہاں اسی قدر کہوں گا کہ یہ فارسی اصطلاحیں عربی اصطلاحوں کا ترجمہ ہیں ۔ چنانچہ پیوستہ ، پراگندہ اور پساوند تو پہلی ہی نظر میں صاف نظم ، نثر اور قافیہ یا ردیف کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں ۔ باقی اصطلاحیں بھی اسی پر قیاس کی جاسکتی ہیں ۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگرچہ ایرانیوں نے ان اصطلاحوں کو عربی اصطلاحوں کے ترجمے کے طور پر وضع کر لیا ، تاہم قبولِ عام کا خلعت ان کو نہ مل سکا ۔ ان کا استعمال ندرت کے ساتھ ہوا ہے اور صرف کتبِ لغات کی بنا پر وہ اب تک محفوظ ہیں ۔ ایک امر موجب حیرت یہ ہے کہ ان بلند دعووں کے باوجود ایران میں قدامتِ شعر کے یہ مدعی لفظ 'شاعر' کے واسطے کوئی مفرد لفظ تجویز نہ کر سکے ۔ سخن گو اور سخن پیوند اور ان کے بیسیوں مرادف بعد میں بنا لیے گئے ہیں ۔ فردوسی 'گوینده' لاتا ہے ، میرے خیال میں وہ بھی قائل کا ترجمہ ہے :

چنان دید گوینده یک شب به خواب
که رخشنده شمعی برآمد ز آب

دیگر

تو نیز آفرین کن که گوینده
بدو نام جاوید جوینده

'گوینده' بعد میں 'قوّال' کا مرادف قرار پایا ۔

صفحہ ۹۵ بہ ذیل نثر فارسی در قرن سوم و چہارم ہجری :

(۱) آئین بزرگی از دادبہ پارسی المعروف بہ عبداللہ ابن المقفع تالیف ۲۲۷ھ ۔

۱۔ ملاحظہ ہو مقالات حافظ محمود شیرانی ، جلد پنجم ، صفحہ ۶۶۹ (مرتّب) ۔

معلوم نہیں جناب پروفیسر کا کیا مقصد ہے ۔ دادبہ ابن المقفع کا نام نہیں ہے ۔ اس کا نام روزبہ اور اس کے باپ کا نام البتہ دازویہ ہے ۔ رسالہ 'کاوہ' کی یہ عبارت یاد رہے :

''یکی از دومین مترجمین کہ خبر ازو داریم مؤلف و مترجم بزرگ ایرانی معروف روزبہ پسر داذویہ مکنّی بابو عمر و ایرانی زردشتی بود از اواخر قرن اول و اوائل قرن دوم کہ چون در دست عیسی بن علی بن عبداللہ بن عباس مسلمان شد معروف بہ ابو محمد عبداللہ بن المقفع بن المبارک گشت ۔''

اسی طرح ابن المقفع کا زمانہ بھی غلط دیا ہے ۔ وہ سنہ ۱۴۰–۱۴۱ھ میں ہلاک ہوتا ہے اور اس کا باپ دازویہ حجاج بن یوسف کے عہد میں سنہ ۷۵ و ۹۵ھ کے مابین ہلاک ہوتا ہے ۔

(۵) فارسی ترجمہ 'خدائی نامہ' حسب الحکم منصور اول ، جسے اس کے دربار کے فاضل منشی قاضی ابو منصور بن عبدالرزاق معمری نے سنہ ۳۵۲ھ میں تیار کیا ۔

منصور اول سے پروفیسر کی مراد امیر ابو صالح منصور بن نوح سنہ (۳۵۰ھ و ۳۶۶ھ) ہے ۔ لیکن منصور کے حکم سے 'خدائی نامہ' کا فارسی میں کوئی ترجمہ نہیں ہوا ۔ جس چیز کو 'خدائی نامہ' کا ترجمہ سمجھا جاتا ہے ، وہ 'شاہنامہ ابو منصوری' ہے جو ابو منصور محمد بن عبدالرزاق کے حکم سے بہ ادارت ابو منصور المعمری سنہ ۳۴۶ھ میں تیار ہوتا ہے ۔ اس شاہنامے کا اصل دیباچہ فردوسی کے شاہنامے کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے اور دیباچہ قدیم کے نام سے مشہور ہے ۔ اس دیباچے سے ایک اقتباس ذیل میں نقل ہوتا ہے :

''ابو منصور عبدالرزاق مردی بود بافر و خوش کام و بزرگ اندر کام روائی . . . و بگوہر از تخم گردان ایران بود . . . از روزگار آرزو کرد تا او را نیز یادگاری بماند درین جہان ۔ پس دستور خویش ابو منصور المعمری را بفرمود تا بخداوندان کتب نامہ کرد وکس فرستاد . . . فرزانگان و جہان دیدگان از شہرہا بیاوردند و چاکر او ابو منصور المعمری را بفرمود تا نامہ گرد کرد . . . بفرا آوردن این نامہا . . . (از کیومرث) نخستین کہ اندر جہان آمد او بود کہ آئین مردی آورد و مردمان را از جانوران پدیدار کرد تا یزدگرد کہ آخر ملوک عجم بود ،

اندر ماہ محرم کہ سال بر سی صد و چہل و شش بود از ھجرت خواجہ' دنیا و عقبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم و این را شاہ نامہ نام نہاد ۔''

ابو منصور کا ذکر ابن الاثیر اور زین الاخبار میں ملتا ہے ۔ اس کا خاندان معلوم ہوتا ہے ہمیشہ طوس میں رہا ہے ۔ ابو منصور سپہ سالار خراسان ابو علی چغانی کی ماتحتی میں والئی طوس رہا ہے ۔ جب ابو علی نے بغاوت کی ، اس نے ابو علی کا ساتھ دیا ۔ سنہ ۳۳۸ھ میں امیر نوح بن نصر نے اس کا قصور معاف کر دیا ۔ وہ واپس طوس آگیا ۔ جمادی الآخر سنہ ۳۴۹ھ میں ابو منصور سپہ سالار خراسان بنایا گیا ۔ کچھ ماہ کے بعد یہی منصب الپتگین کو دے دیا گیا ۔ عبدالملک کی وفات پر نئے امیر ابو صالح منصور نے ابو منصور کو سپہ سالاری کا امیدوار بنا کر الپتگین کی گرفتاری کے واسطے مقرر کیا ۔ ابو منصور نے تعاقب کیا مگر الپتگین نکل چکا تھا ۔ چونکہ ابو منصور کو سپہ سالاری ملنے کی امید نہیں رہی تھی ، اس نے بغاوت کر دی اور ادھر اُدھر لوٹ مار شروع کر دی ۔ رئیس نسا کی اولاد سے ایک بھاری رقم جبراً وصول کی ۔ وشمگیر نے عیسائی طبیب یوحنّا کو ایک ہزار دینار رشوت دے کر ابو منصور کو زہر دلوا دیا ۔ ادھر شاہی حکم سے ابوالحسن محمد بن ابراہیم دوبارہ سپہ سالاری کے عہدے پر سرفراز ہوکر ابو منصور کے مقابلے کے واسطے روانہ ہوا ۔ جب دونوں فوجیں مقابل ہوئیں ، زہر ابو منصور پر پورا اثر کر چکا تھا اور آنکھوں سے اسے سوجھتا نہیں تھا ۔ شکست کے بعد اس کے آدمیوں نے اسے لے جانا چاہا لیکن تکلیف سے اس کی حالت اس قدر غیر ہوچکی تھی کہ اس نے خود کہا مجھے یہیں چھوڑ جاؤ ۔ مجبوراً وہ چھوڑ گئے ۔ اسی وقت غنیم کی فوج کا ایک سقلابی غلام ادھر آنکلا ۔ اس نے ابو منصور کا سر کاٹ لیا ۔ ہاتھ میں سے انگوٹھی نکال لی اور اپنے سردار کے پاس لے گیا ۔ یہ سنہ ۳۵۰ھ کا واقعہ ہے ۔

(۸) 'ترجمان البلاغة' از فرخی[۱] کی تاریخِ تصنیف سنہ ۳۹۵ھ اور مقام غزنیں

۱۔ جدید تحقیق کی رو سے 'ترجمان البلاغت' فرخی کی تصنیف نہیں ۔ استاد احمد آتش کو کتاب خانہ' فاتح سے 'ترجمان البلاغت' کا ایک ایسا مخطوطہ ملا جو سنہ ۵۰۷ھ کا لکھا ہوا تھا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب محمد بن عمر رادویانی کی تصنیف ہے ۔ کتاب ۱۹۴۹ع میں استنبول سے شائع ہوئی (مرتّب) ۔

بتایا ہے ۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ فرخی اس تاریخ سے کئی سال بعد غزنیں آیا ہے ۔ اگر فرخی اس سال یا اس سال کے بعد غزنیں میں ہوتا تو یقین ہے کہ محمود کے وزیر اول ابوالعباس فضل بن احمد اسفرائنی اور سلطان کے بھائی امیر نصر بن ناصر الدین کی مدح میں بھی قصائد لکھتا ۔ مگر دیوان میں ان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی موجود نہیں ۔ جس سے ظاہر ہے کہ ابوالعباس کی وفات کے بعد وہ غزنیں پہنچا ہوگا ۔

(۱۰) 'غایۃ العروضین' از بہرامی سرخسی ۔ پروفیسر اس کی نسبت سرخشی با شین معجمہ لکھ رہے ہیں ، حالانکہ وہ سرخس (باہر دو سین مہملہ) کا رہنے والا ہے جو خراسان کا نہایت مشہور شہر ہے ۔

(۱۵) نوروزنامے کے متعلق کہا ہے کہ خیام نے اسے پانچویں صدی کی ابتدا میں لکھا ہے ۔ لیکن اس وقت تک تو عمر خیام پیدا بھی نہیں ہوا ہوگا ۔ شمس العلما کا مقصد چھٹی صدی کی ابتدا سے ہوگا ۔

(۱۶) زینت نامے کے مصنف راشدی سمرقندی کے متعلق کہا ہے کہ وہ سلطان ملک شاہ سلجوق کے دربار کا شاعر ہے اور زینت نامہ اس نے سنہ ۴۲۵ھ سے کچھ بعد تصنیف کیا ۔ سنہ ۴۲۵ھ میں نہ ملک شاہ پیدا ہوا تھا نہ راشدی ۔ ۱۶ شوال سنہ ۴۸۵ھ میں جب ملک شاہ کا انتقال ہوا اس وقت اس کی عمر اڑتیس سال تین مہینے اور سترہ دن کی تھی ۔ بعض وجوہ سے پایا جاتا ہے کہ راشدی دربار غزنہ کے ساتھ وابستہ تھا اور مسعود سعد سلمان کے ساتھ اس کے روابط تھے ۔ غالباً اس نے سیف الدولہ محمود کے پاس اس کی سفارش بھی کی ہے ۔ دونوں شاعروں میں مشاعرے بھی ہوئے ہیں ۔ چنانچہ مسعود سعد سلمان :

ہر آن قصیدہ کہ گفتیش راشدی یک ماہ
جواب گفتم بہ زان بدیہہ ہم بزمان[۱]

۱۔ سیف الدولہ محمود کی مدح میں مسعود کے اس قصیدے کا مطلع ہے :

شب دراز و رہ دور و غربت و احزان
چگونہ ماند تن یا چگونہ ماند جان

(دیوان مسعود سعد سلمان ، مرتبہ رشید یاسمی ، صفحہ ۵۳۳)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(۱۸) موجودہ مجلدات بیہقی کے متعلق کہا ہے کہ خاندان غور کی ضخیم تاریخ کا باقی حصہ ہے ۔ اس فقرے میں غور کی جگہ غزنہ چاہیے ۔ اس کا نام 'آل سبکتگین جامع تاریخ' الٹ پلٹ لکھ دیا گیا ہے ۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

قصیدے کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ شاعروں نے ، جن میں راشدی بھی شامل تھا ، سیف الدولہ کے حضور مسعود کی جھوٹی شکایت کی تھی لیکن منہ کی کھائی :

خدایگانا دانی کہ بندہ تو چہ کرد
بہ شہر غزنین با شاعران چیرہ زبان

هر آن قصیدہ کہ گفتیش راشدی یک ماہ
جواب گفتم زان بر بدیہہ هم بہ زمان

اگر نہ بیم تو بودی شہا بحق خدای
کہ راشدی را بفکندمی ز نام و نشان

چو پایگاهم دیدند نزد شاهنشہ
کہ داشتم بر او جاہ و رتبت و امکان

بہ پیش شاہ نہادند مر مرا تہمت
بصد هزاران نیرنگ و حیلت و دستان

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخالفت جلد ہی ختم ہوگئی ۔ مسعود کے شائع شدہ دیوان میں (صفحہ ۵۸۹ ، مرتبہ رشید یاسمی) ایک مرثیہ شامل ہے جو غالباً اسی راشدی کے لڑکے کی وفات پر مسعود نے قید خانے میں لکھا تھا ۔ اس سے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں ۔ پانچویں شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ خود راشدی بھی اس موقع پر زندانی تھا :

ای برادر چگونہ شرح دهیم
آنچہ بر ما سپهر گردان کرد

دل ما خود ز حبس بریان بود
دیدۂ ما ز درد گریان کرد

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(۱۹) 'زین الاخبار' کے مصنف کی نسبت Gurd-Yezi گرد ییزی (بہ ضم کاف فارسی و سکون را و دال و فتح یا و سکون یاے دوم و کسر زا و سکون یا) دی ہے ، حالانکہ شہر کا صحیح نام گردیز بہ فتح کاف فارسی و سکون را و تحریک دال و سکون یا و زاے معجمہ ہے جس سے نسبت گردیزی ہوئی ۔

شمس العلما اس تاریخ کو بیرونی کی 'آثار الباقیہ' کی ایک تقلید مانتے ہیں ۔

(۲۰) اسدی مصنف لغت فرس کو سلطان محمود غزنوی کے دربار کا شاعر مانا ہے حالانکہ یہ اسدی خورد[1] ہے جو گرشاسپ نامہ تالیف سنہ ۴۵۸ھ کا ناظم ہے ۔ پال ہورن مرتّب لغت فرس کا بیان ہے کہ اسدی نے یہ فرہنگ اپنے آخر حصۂ عمر میں تصنیف کی ہے ۔

(۲۱) سفر نامۂ ناصر خسرو کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا ایک نیا ایڈیشن ڈاکٹر ناظم نے یونیورسٹی پریس کیمبرج سے شائع کیا ہے ۔ یہ اطلاع خلاف واقعہ ہے ۔ نہ ڈاکٹر ناظم نے یہ سفر نامہ مرتّب کیا ، نہ کیمبرج یونیورسٹی پریس نے اسے چھاپا ۔

(۲۲) ''تاریخ بلعمی از محمد بن عبداللہ البلعمی وزیر معروف نصر بن احمد سامانی جو اس نے ایام پیری میں سنہ ۳۴۶ھ کے قریب تالیف کی ۔''

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

راشدی داشتی تو فرزندی
کہ ہمہ کار تو بسامان کرد

در ربودش ز تو زمانۂ دون
تا ترا مستمند و حیران کرد

بدنیارست کرد چرخ بدو
تا ترا در نہفتہ زندان کرد

زانکہ دانست کین چنین فعلی
با تو جز پای بستہ نتوان کرد

(مرتّب)

۱- جدید دور کے ایرانی فضلا اسدی کلاں و اسدی خورد کو دو مختلف اشخاص تسلیم نہیں کرتے ۔ (مرتّب)

سامانیوں میں دو بلعمی وزیر گزرے ہیں ؛ پہلا ابوالفضل (محمد بن عبداللہ) البلعمی (متوفی سنہ ۳۲۹ھ) جو نصر بن احمد سامانی (سنہ ۳۰۱ھ و سنہ ۳۳۱ھ) کا وزیر تھا ۔ دوسرا ابو علی (محمد بن محمد) البلعمی خلف ابوالفضل مذکور (متوفی سنہ ۳۶۳ھ) وزیر منصور بن نوح (سنہ ۳۵۰ھ و ۳۶۶ھ) جس نے تاریخ طبری کا ترجمہ کیا ہے ، یعنی وہی تاریخ جو پروفیسر نے نمبر (۴) میں درج کی ہے ۔ سامانی خاندان سنہ ۳۸۹ھ میں ختم ہو جاتا ہے ۔ ہمیں تعجب آتا ہے اس وزیر پر جو سامانیوں کے خاندان کے اختتام سے ستاون سال بعد اپنی تاریخ لکھتا ہے ۔ اگر اس وزیر کو نصر بن احمد کا وزیر مانا جائے ، جیسا کہ ہم سے کہا گیا ہے ، تو وہ سنہ ۳۲۹ھ میں فوت ہو جاتا ہے ۔ سنہ ۴۴۶ھ میں اس کے لیے اپنی تاریخ لکھنا ناممکن ہے ۔

(۲۳) تاریخ سیستان کی تالیف سنہ ۴۴۸ھ میں نہیں بلکہ سنہ ۴۴۰ھ میں شروع ہوتی ہے ۔

صفحہ ۱۰۳ : کہتے ہیں ''ابو حفص جس نے تاریخ قائم کرنے والے ابیات لکھے ہیں ، پہلی صدی میں گزرا ہے ۔''

معلوم نہیں یہ تاریخ قائم کرنے والے اشعار کون سے ہیں ۔ ہمیں حکیم ابو حفص کا صرف ایک شعر معلوم ہے جو اکثر تذکرہ نگار نقل کرتے ہیں ۔ لیکن ابو حفص کا زمانہ پہلی صدی میں قیاس کرنا درست نہیں معلوم ہوتا ۔ وہ ایک فارسی فرہنگ کا بھی مصنف ہے جس کا ذکر مولانا جمال الدین حسین انجو نے اپنی کتاب فرہنگ جہانگیری میں کیا ہے ۔ پہلی صدی میں فارسی کی فرہنگ کا تصنیف ہونا بعید از قیاس ہے ۔ ادھر محمد بن 'قیس المعجم' میں اور آزاد بلگرامی 'خزانۂ عامرہ' میں سنہ ۳۰۰ھ کے قریب اس کا عہد مانتے ہیں ۔

صفحہ ۱۰۴ : خواجہ ابوالعباس مروزی کے ابیات کے سلسلے میں مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے جو بدگمانی کا اظہار کیا ہے اور ان کی اصلیت پر بعض وجوہ کی بنا پر شک کی فضا قائم کر دی ہے ، شمس العلما نے اس کا جواب فی نفسہ قابلیت کے ساتھ دیا ہے ۔ اگرچہ بعض امور میں ہم ان کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے ۔ ان اشعار کی روانی اور ان میں عربی الفاظ کی کثرت ہمارے خیال میں متاخرین کی ترمیم کا نتیجہ ہے ۔ سنہ ۱۹۳ھ میں بحر رمل مثمن کا استعمال فی الحقیقت

نہایت حیرت انگیز ہے ۔ شمس العلما کا یہ عقیدہ کہ ابوالعباس ، حنظلہ اور وصیف سجزی نے خلیل کے عروضی قواعد و ضوابط کی کبھی پروا نہیں کی بلکہ ان شعرائے عرب کا تتبع کرتے رہے جو خلیل واضعِ عروض کی ولادت سے بھی قبل گزرے تھے ، ہماری مشکل حل نہیں کرتا کیونکہ رمل مثمن عربی میں نہیں آتی ، نہ خلیل نے اس کا ذکر کیا ۔ ایک رمل پر کیا موقوف ہے ، دوسری مثمن بحریں بھی مستعملۂ فارسی ، عربی میں رائج نہیں ۔ لہٰذا تقلید شعرائے عرب کا سوال ہی پیش نہیں آتا ۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایرانی عربی عروض کی اشاعت کے بعد ایک عرصے تک تقلیداً مربعات و مسدسات میں اپنے اشعار لکھتے رہے ۔ پھر ایک زمانہ آیا جب ان مربعات کو ترک کرکے ان کی جگہ انھوں نے مثمنات کو ، جو عربی میں نامعلوم تھے اور فارسی کے قدرتی رجحان کے عین مطابق ، دریافت کر لیا ، اور عروضی قواعد میں ضروری ترمیم کر کے جدید عروض اختیار کر لیا ۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ عروضِ عربی کی اشاعت اور اس کی اصلاحی تشکیل کے واسطے بہت مدت درکار ہے ۔ یہ کام پچاس ساٹھ سال میں سرانجام نہیں ہو سکتا ۔

۴۴ پروفیسر صاحب کی توجہ ابن مفرّغ کے اشعار (سنہ ۶۳ - ۶۵ھ) : آبست نبیذاست ... الخ اور بلخیوں کے طنزیہ ابیات : از ختلان آمدہ برو تباہ آمدہ ... الخ (سنہ ۱۰۸ھ) نیز ابوالعباس بن طرخان کے اشعار : سمرقند کند مسند بزینت کی فگند ... الخ (سنہ ۱۷۷ھ) کی طرف مبذول کر کے عرض کرتے ہیں کہ یہ اشعار اپنے اپنے زمانے کے اصلی نمونے ہیں جو سب کے سب مربعات میں داخل ہیں ۔ جب سنہ ۱۷۷ھ تک مربعات عام طور پر رائج ہیں ، تو یہ باور کرنا کسی قدر مشکل معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۳ھ میں ابوالعباس مروزی نے رمل کے مثمن میں اشعار لکھے ہوں ۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان اشعار میں متاخرین کے ہاتھوں بہت کچھ اصلاح ہوئی ہے حتیٰ کہ ان کا قدیم وزن غائب ہوگیا ۔

صفحہ ۱۰۸ : ابوحفص سغدی ، میں سغد بہ ضم اول ہے نہ بالفتح اور حنظلہ بہ فتح اول ہے نہ بالکسر جیسا کہ پروفیسر صاحب نے قلم بند کیا ہے ۔

(۱۰۹) رباعی کے اولیں نمونوں میں حنظلہ بادغیسی کی دو رباعیاں دی ہیں جو صفحہ ۱۱۰ پر درج ہیں ۔ پہلی رباعی کا ابتدائی مصرع ہے :

مہتری گر بکام شیر دراست ... الخ

یہ رباعی جس کو قطعہ کہنا صحیح ہوگا ، بحر خفیف مسدس مخبون مقصور میں ہے اور رباعی کے وزن میں شامل نہیں ۔

رباعی کی دوسری مثال میں وہ قطعہ دیا ہے جو "یارم سپند گرچہ بر آتش همی فگند" سے شروع ہوتا ہے ۔ قطعہ ہذا بحر مضارع میں ہے اور رباعی کے وزن سے خارج ۔ اس لیے اس کو رباعی کہنا لفظ کا غلط استعمال کرنا ہے ۔

صفحہ ۱۱۴ پر تیسری صدی کے شعرا کی ایک انتخابی فہرست دی ہے ۔ اس فہرست کے شاعر نمبر ۲ کا نام محمد بن مہلّا (Muhammad bin Muhallad) ہے ۔ میں اس نام کو دیکھ کر سخت حیران ہوا ۔ آخر قیاس سے کام لیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمد بن مخلّد ہے جس کا ذکر تاریخ سیستان میں آتا ہے ۔ غالباً یہ ٹائپ کی غلطی ہے ۔

شاعر نمبر ۷ کا نام ابوالعباس زنجانی (Abul Abbas zanjani) دیا ہے ۔ شمس العلما کو یہاں سہو ہو گیا ہے ۔ یہ ابوالعباس ربنجنی (بہ فتح را و کسر با و سکون نون و فتح جیم و کسرۂ نون و سکون یا) ہے ۔ ربنجن ، سغد سمرقند میں ایک شہر کا نام ہے ۔

صفحہ ۱۱۷ : فیروز مشرقی کے قطعے کو جس کی ابتدا ہے :

مرغیست خدنگ ای عجب دیده

رباعی کے نام سے یاد کیا ہے ۔ اس قطعے کا وزن هزج مسدس اخرب مقبوض ہے جسے رباعی سے کوئی واسطہ نہیں ۔

رودکی

صفحہ ۱۱۸ : کہتے ہیں کہ 'رودکی مادر زاد نابینا تھا' ۔

میں اس سوال پر 'تنقید شعر العجم' میں کسی قدر تفصیل سے لکھ چکا ہوں[۱] ۔ یہاں اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ منینی شرح یمینی (صفحہ ۵۲ ، جلد اول ، طبع مصر ، سنہ ۱۲۸۲ھ) میں شارح نجاتی کی سند پر اور نجاتی رشیدی کے

---

۱ - ملاحظہ ہو مقالات حافظ محمود شیرانی ، جلد پنجم ، مضمون بہ عنوان "رودکی" صفحہ ۶۱ (مرتّب) ۔

سعدنامے کے حوالے سے لکھتا ہے کہ عمر کے آخری دور میں رودکی کی آنکھوں میں سلائی پھروادی گئی تھی ۔

صفحہ ۱۱۹ : لکھا ہے کہ رودکی پہلا ایرانی شاعر ہے جو ہندوستانی تخیل اور ذہنیت کا دل دادہ تھا اور جس نے ہندوستان میں فارسی شاعری کی ترقی میں اثر ڈالا ۔

ہم حیران ہیں کہ رودکی پہلا فارسی شاعری کی اشاعت کے لیے ہندوستان میں کیا اثر انداز ہوتا ۔ نہ کبھی وہ ہندوستان آیا نہ ہندوستان کے لوگوں سے تعلق رہا ۔ اس سلسلے میں اس کے منظوم ترجمۂ کلیلہ کا ذکر بے سود ہے ۔ اسی طرح پروفیسر کا دوسرا دعویٰ ، یعنی ہندوستانی فکریت کے واسطے شاعر کا اشتیاق ، ثبوت کا محتاج ہے ۔

شمس العلما کا خیال ہے کہ کلیلہ و دمنہ رودکی نے نصر بن احمد سامانی کے حکم سے لکھی تھی ۔ لیکن فردوسی کے اشعار سے ، جو انھوں نے صفحہ ۱۲۰ پر نقل کیے ہیں ، ثابت ہوتا ہے کہ نصر بن احمد کے وزیر ابوالفضل بلعمی کے حکم سے پہلے عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوئی ، پھر اس کی خواہش پر رودکی نے اس کو نظم کر ڈالا ، چنانچہ :

گرانمایہ بوالفضل دستورِ اوی
کہ اندر سخن بود گنجورِ اوی

بفرمود تا پارسی و دری
بکردند و کوتاہ شد داوری

اس کے بعد رودکی کے پاس ایک قاری بٹھا دیا گیا جو اس کو سناتا جاتا اور وہ نظم کرتا جاتا تھا ۔

گزارندہ را پیش بنشاندند
ہمہ نامہ بر رودکی خواندند

بہ پیوست گویا پراگندہ را
بسفت این چنین درِّ آگندہ را

صفحہ ۱۲۰ : کہتے ہیں کہ امیر نصر نے شاعر کو ایک خلعت اور چالیس ہزار درہم کلیلہ و دمنہ کے صلے میں مرحمت فرمائے ۔ ثبوت میں عنصری کا شعر

ذیل نقل کیا ہے :

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش
عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

شمس العلما نے اگرچہ اس شعر کے لیے اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا لیکن ہمارا خیال ہے کہ 'شعرالعجم' سے ماخوذ ہے ۔ میں 'تنقید شعرالعجم' میں اس موضوع پر کافی بحث کر چکا ہوں ۔ یہاں اس قدر کہنا مناسب ہوگا کہ عنصری کے دیوان میں کلیلہ کا مطلق ذکر نہیں ۔ شاعر نے دوسرا مصرع یوں لکھا تھا :

بیافتہ است بتوزیع ازین در و آن در

جس سے ظاہر ہے کہ یہ انعام کلیلہ کے صلے میں نہیں ملا بلکہ مختلف موقعوں پر ۔ ازرق ایک موقع پر عنصری کا یہی شعر اپنے ذہن میں رکھ کر کہتا ہے :

حدیث میر خراسان و قصہ' توزیع
بگفت رودکی از روی فخر در اشعار

اس شعر سے ظاہر ہے کہ عنصری نے اصل میں 'توزیع' لکھا تھا ۔ بعد میں کسی نے اصلاح دے کر اس کی جگہ کلیلہ دمنہ بنا دیا ۔ مزید شہادت میں خود رودکی کا شعر نقل کیا جاتا ہے جس کی بنیاد پر یہ قصہ وضع ہوا ۔ و ھو ھذا :

بداد میر خراسانش چل ہزار درم
وزو فزونی یک پنج میر ماکان بود

صفحہ ۱۲۱ : رودکی کے اشعار کی تعداد کے متعلق کہا ہے کہ ''رشیدی سمرقندی نے انھیں تیرہ مرتبہ گنا ، ایک لاکھ سے اوپر نکلے'' رشیدی کا شعر جس سے یہ معنے اخذ کیے ہیں ، ذیل میں درج ہے :

شعر او را بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار
ہم فزون تر آید ار چونانکہ باید بشمری

مگر پروفیسر کا مفہوم ، جو اعتراض سے خالی نہیں ، اس شعر سے تو ظاہر نہیں ہوتا ۔ تیرہ بار گنا ، پھر بھی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی ، مجبوراً کہہ دیا کہ ایک لاکھ سے سوا ہیں ۔ یہ کیا بات ہوئی ؟ ہمارے نزدیک شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کے اشعار کا شمار کیا ، تیرہ لاکھ نکلے لیکن اگر احتیاط سے انھیں گنا جائے تو اور بھی زیادہ نکلیں گے ۔

صفحہ ۱۲۵ : زین الملک اصفہانی کو معزی کا دوست اور رفیق کہا ہے ۔

صفحہ ۱۲۶ : اس صفحے پر رودکی کے قصیدے کی مثال میں چار شعر دیے ہیں ، ان کا آغاز ہے :

بود هر جا بهر نزهت گاه یارو نقل و مل
گلستان در گلستان و میوه اندر میوه زار

اور حاشیے میں اضافہ کیا ہے کہ 'دیوان رودکی' طبع طہران ناقابل اعتبار ہے ۔ اس میں رودکی کے معاصر حکیم قطران کا کلام ناقابل امتیاز حد تک مخلوط ہو گیا ہے ۔ میں نے رودکی کے یہ اشعار حکیم قطران کے ایک مخطوطے سے ، جو ڈاکٹر ہادی حسن کی ملک ہے ، مقابلے کے بعد یہاں درج کیے ہیں ۔''

اس صریح بیان کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ یہ اشعار رودکی کے نہیں ہیں بلکہ حکیم قطران تبریزی کی ملک ہیں ۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ قطران رودکی کا معاصر ہے بلکہ اس سے سو سوا سو سال بعد گزرا ہے ۔ میں اسی قصیدے کا ایک شعر نقل کرتا ہوں جو تمام گنجلک دور کر دیتا ہے :

افتخار دهر ابو منصور وهسودان که هست
بندگانش را بمیران صد هزاران افتخار

یہ ابو منصور سامانی نہیں ہے جیسا کہ شمس العلما نے صفحہ ۱۲۵ پر تحریر کیا ہے بلکہ آذربائیجان کا بادشاہ ہے جو ابو نصر مملان کا جانشین ہے ۔ قطران ان دونوں کا مداح ہے ۔

حکیم ناصر خسرو بلخی سنہ ۴۳۸ھ میں تبریز پہنچا ۔ اس وقت آذربائیجان کا بادشاہ یہی ابو منصور وهسودان تھا ۔ اس کا پورا نام سفرنامے میں یوں دیا ہے :

"الامیر اجل سیف الدولہ و شرف الملۃ ابو منصور وهسودان بن محمد مولی امیرالمومنین" (سفرنامہ حکیم ناصر خسرو ، مرتبہ مولانا حالی ، صفحہ ۷)۔

صفحہ ۱۲۷ : رودکی کی غزل کے نمونے میں اشعار ذیل نقل ہوئے ہیں :

مشوش است دلم از کرشمهٔ سلمیٰ
چنانکه خاطر مجنون ز طرهٔ لیلیٰ

چو گل شکر دهیم درد دل شود تسکین
چو ترش روی شوی وارهانی از صفریٰ

بہ غنچۂ تو شکر خندہ نشۂ بادہ
بہ سنبل تو در گوش مہرۂ افعیٰ
بپردہ نرگس تو آب جادوی بابل
کشادہ غنچۂ تو باب معجز عیسیٰ

ایسی صاف اور ہموار زبان نہ رودکی کی ہو سکتی ہے ، نہ اس کے عہد کی ، بلکہ کئی سو برس بعد کی معلوم ہوتی ہے ۔ کرشمۂ سلمیٰ ، طرۂ لیلیٰ ، مہرۂ افعیٰ ، خاطر مجنون ، آب جادوی بابل ، نشۂ بادہ ، در گوش ، معجز عیسیٰ وغیرہ ترکیبیں متاخرین کی شاعری کی نمایاں خصوصیات سے ہیں ۔ زبان کی روانی اور صفائی بھی تمام تر متاخرین کے رنگ میں ہے ۔

یہی حالت اس قصیدے کے اشعار کی ہے جو صفحہ ۱۲۹ و صفحہ ۱۳۰ پر رودکی کی غزل کی مثال میں نقل ہوئے ہیں اور جن کی ابتدا ہے :

چو بکشاید نگار من دو بادام و دو مرجان را
بدین نازان کند دل را بدان رنجان کند جان را

ہماری رائے میں ان کو رودکی سے دور کا تعلق بھی نہیں ۔

صفحہ ۱۲۸ ۔ شعر :

تو رودکی را ای مج کنون[1] همی بینی
بدان زمانہ ندیدی کہ زین خسیسان[2] بود

پہلا مصرع اصلاح طلب ہے ۔ یوں چاہیے :

بدان زمانہ ندیدی کہ در خراسان بود

مصرع :

عیال نہ زن و فرزند نہ معونت نہ

میں 'معونت' کی جگہ 'مؤنت'[3] چاہیے ۔

۱۔ مج کنون (کذا : سہ کنون ؟) ۔ (مرتّب)
۲۔ محیط زندگی و احوال و اشعار رودکی (صفحہ ۴۹۹) میں سعید نفیسی 'مج کنون' کی جگہ 'ماہرو' اور 'زین خسیسان' کی جگہ 'این چنینان' دیتے ہیں ۔ (مرتّب)
۳۔ گو محوّلہ بالا کتاب میں سعید نفیسی بھی 'معونت' ہی لکھتے ہیں ، تاہم شعر کے معنی پر قیاس کرتے ہوئے 'مؤنت' بہتر ہے (مرتّب) ۔

اسی طرح شعر :

کرا بزرگی و نعمت ازین و آن بودی

کرا بزرگی و نعمت ز آل سامان بود

کے مصرع دوم میں 'کرا' کی جگہ 'ورا' چاہیے -

صفحہ ۱۳۲ : مرادی کے مرثیے میں رودکی نے جو دو بیت کہے ہیں یعنی : مرد مرادی نہ ھمانا کہ مرد . . . الخ ، پروفیسر ان کو رباعی کے نام سے یاد کرتے ہیں - یہ وزن مفتعلن مفتعلن فاعلان ، بحر سریع مطوی موقوف ہے -

صفحہ ۱۳۲ : کہتے ہیں : 'رودکی کی ایک رباعی ، جو اس نے اپنے دوست شہید بلخی کی وفات پر کہی ہے ، اس کی تاریخ وفات کی حامل ہے - فارسی شاعری کی تاریخ میں (بہ حساب ابجد) مادۂ تاریخ برآمد کرنے کی یہ پہلی مثال ہے وھوھذا :

کاروان شہید رفت از پیش — و آن ما رفتہ گیر و می اندیش

از شمار دو چشم یک تن کم — در شمار خرد ھزاران بیش

یہ دو بیت بحر خفیف میں ہیں اور وزن رباعی سے خارج - شمس العلماء نے یہ تو کہہ دیا کہ تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے مگر نہ سال تاریخ دیا نہ مادۂ تاریخ کا پتا بتایا - ہم حیران ہیں کہ یہ تاریخ کیوں کر معلوم ہوگی ، جس حال میں کہ شاعر نے بھی اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا - ہمارا خیال ہے کہ رودکی کے عہد میں بحساب جمل کسی کلمے یا فقرے سے مادۂ تاریخ نکالنے کا طریقہ نامعلوم تھا ، لہٰذا ان اشعار سے کسی تاریخ کی امید رکھنا فعل عبث ہے -

چوتھے مصرع میں 'در شمار خرد' کے بجائے 'وز شمار خرد' بہتر اور موزوں قرأت ہے -

اسی صفحے پر ایک رباعی جس کا آغاز ہے : "چون کار دلم ز زلف او ماند گرہ" الخ اگرچہ رباعی کے وزن میں ہے لیکن رودکی کی زبان نہیں معلوم ہوتی بلکہ بہت بعد کی جب زبان میں محاورات کی افراط پیدا ہو گئی ہے ، 'گرہ ماندن کار' - 'گرہ ماندن گریہ در گلو' ایسے محاورے ہیں جو رودکی کے دور میں موجود نہیں تھے -

صفحہ ۱۳۳ : "روز آخر یکی کفن کردند" میں 'کردند' کی جگہ 'بردند' چاہیے - یہ بھی رباعی کا وزن نہیں ہے -

اسی صفحے پر دو رباعیاں موجود ہیں جن کی ابتدا ہے (۱) ای از گل سرخ رنگ بربودۂ و بو ، الخ اور (۲) با آنکہ دلم از غم ھجرت خواست . . . الخ رودکی کی طرف ان کا انتساب بہت مشتبہ ہے ۔

صفحہ ۱۳۵ : کہتے ہیں کہ قزوینی نے بست مقالے میں سنہ ۳۲۹ھ رودکی کی تاریخ وفات دی ہے لیکن اپنی اطلاع کا ماخذ نہیں دیا ہے ۔

یہ ماخذ انساب السمعانی ہے (صفحہ ۲٦۲ ، طبع یورپ) ۔

اسی صفحے پر تقی اوحدی کے تذکرے کا نام 'عرفات' ("Urafat") بہ ضم عین دیا ہے ۔ اصل میں عین پر فتحہ ہے نہ ضمہ ۔ پورا نام 'عرفات العاشقین' ہے ۔

شمس العلما رودکی کی مثنوی کو فارسی مثنوی گوئی کا اولین نمونہ کہتے ہیں جو یقیناً صحیح نہیں ۔ شاہ نامۂ مسعودی ، رودکی کے عہد سے بہت پہلے نظم ہوتا ہے ۔

صفحہ ۱۳۷ : "چنین داستان کس نگفت از خیال" میں 'خیال' کی جگہ 'فیال' فے کے ساتھ چاہیے ۔

حاجی صاحب کے پرواز تخیل کی مثال میں یہ عبارت نقل کی جا سکتی ہے ۔ فرماتے ہیں :

"ابوالمؤید کی مثنوی 'یوسف زلیخا' اس عہد میں اچھی مثنوی کی ایک اور مثال ہے ۔ فارسی زبان کے نہایت مشہور شاعر خسرو اور جامی اس کی طرز کے مقلد ہیں ۔"

گویا یہ مان لیا گیا ہے کہ نظامی کی مثنویوں کی طرح یہ مثنوی بھی قبولیتِ عام کا خلعت حاصل کر چکی تھی اور اس کی مقبولیت دیکھ کر خسرو اور جامی نے اس کے انداز کا تتبع کیا ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس یوسف زلیخا سے کوئی شخص واقف نہیں ۔ یوسف زلیخاے منسوب بہ فردوسی کے دیباچے میں ، جو صرف ایک قلمی نسخے میں مل سکا ہے ، ایک شعر آتا ہے :

یکی بو المؤید کہ از بلخ بود
بدانش همی خویشتن را ستود

یہ تنہا ماخذ ہے ہمارے اس علم کا کہ ابوالموید نے کوئی زلیخا نظم کی تھی ۔ اس سے زیادہ کسی کو کوئی اطلاع نہیں ۔ اس میں امیر خسرو اور جامی بھی شامل ہیں ۔ بدقسمتی سے اس تالیف کو زیادہ عمر نصیب نہ ہوئی اور اپنے وجود میں آنے

سے ایک صدی بعد دنیا سے رخصت ہوگئی - یہی حال اس کی دوسری تصنیف 'شاہنامۂ بزرگ' کا ہوا جس کا ذکر چوتھی اور پانچویں صدی کے اہل قلم کرتے ہیں : ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ظاہر ہے کہ ابوالمؤید کوئی بڑا شاعر و ناثر نہیں تھا جو دیر تک دنیا سے خراج تحسین وصول کرتا اور خسرو اور جامی اس کی شاعری سے اپنا چراغ روشن کرتے - رہی خسرو کی یوسف زلیخا، اس کا قصہ ہم اپنی عمر میں پہلی مرتبہ شمس العلما سے سنتے ہیں - جہاں تک ہمیں معلوم ہے ، امیر خسرو نے باوجود کثرت تالیف ، یوسف زلیخا نہیں لکھی ، نہ کسی نے اس کا تذکرہ کیا -

صفحہ ۱۳۹ : کہتے ہیں "عوفی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ رودکی اور دقیقی معاصر تھے اور دونوں نے نصر بن احمد سامانی کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں - دقیقی پہلا فارسی شاعر ہے جس نے ایران میں رجزیہ شاعری کی بنیاد ڈالی -"

جہاں تک ہمیں یاد ہے ، عوفی دونوں شاعروں کی معاصرت کے ذکر کے متعلق خاموش ہے - رودکی کو نصر بن احمد (سنہ ۳۰۱ - ۳۳۱ھ) کے عہد کا اور دقیقی کو ابو صالح منصور بن نصر (کذا) (سنہ ۳۵۰ - ۳۶۵ھ) اور نوح بن منصور (سنہ ۳۶۵ - ۳۸۷ھ) کے زمانے کا شاعر مانتا ہے - یہ امر ثبوت کا محتاج ہے کہ دقیقی نے نصر بن احمد کی شان میں قصائد نظم کیے ہوں -

دقیقی سے پیش تر ایک شاعر مسعودی مروزی گزرا ہے جس نے کیومرث سے لے کر یزدجرد تک شاہ نامے کی داستانیں نظم کی تھیں - رسالۂ کاوہ میں ، جو میری اطلاع کا ماخذ ہے ، مرقوم ہے :

"مسعودی مروزی تا آن جا کہ ما فعلاً خبر داریم قدیم ترین شاعریست کہ داستان ملی و تاریخ ایران را از کیومرث تا یزدجرد آخری برشتۂ نظم کشیدہ بودہ است -"

مسعودی کا ذکر دو ذرائع سے ہمیں ملتا ہے - (۱) ثعالبی کی کتاب غرر ملوک الفرس تالیف سنہ ۴۰۸ - ۴۱۲ھ - (۲) مطہر بن طاہر المقدسی کی کتاب البدء والتاریخ جو سنہ ۳۵۵ھ میں تصنیف ہوئی -

مقدسی کے ہاں مسعودی کے تین شعر محفوظ ہیں - پہلے دو ابتدا سے اور تیسرا خاتمے سے :

۱- نخستین کیومرث آمد بشاهی
گرفتش بگیتی درون پیشگاهی
۲- چو سی سالی بگیتی پادشا بود
که فرمانش بهر جای روا بود
۳- سپری شد نشان خسروانا
چو کام خویش راندند در جهانا

مقدسی کے زمانے میں مسعودی کی یہ مثنوی بہت مقبول تھی - اس کی عزت کی جاتی تھی اور قومی تاریخ کا درجہ دیا جاتا تھا - اس کے واسطے تصویریں تیار کرائی جاتی تھیں -

صفحہ ۱۴۲ : کہتے ہیں کہ دقیقی پہلا شخص ہے جس نے اپنے رزمیہ کو عربی الفاظ کی آمیزش سے پاک کیا - یہی روش فردوسی نے اختیار کر لی اور آخر تک اس پر قائم رہا -

شمس العلما اس عقیدے میں مولانا شبلی کے مقلد ہیں - میں اس بحث پر 'تنقید شعر العجم' میں کسی قدر مفصل لکھ چکا ہوں[۱] ، یہاں مختصراً اتنا کہوں گا کہ قصیدے وغیرہ میں سامانی دور کے شعرا قافیے کی ضرورت سے عربی ذخیرے کی خوشہ چینی کرتے رہے ہیں - مثنوی میں یہ ضرورت زیادہ محسوس نہیں ہوتی اس لیے عربی اثر سے پاک ہے - اس لحاظ سے دقیقی کوئی استثنا قائم نہیں کرتا بلکہ قاعدہ - رودکی اور ابو شکور بلخی کی مثنویوں کے جس قدر اشعار ملتے ہیں تعجب کی حد تک عربی الفاظ کی آمیزش سے پاک ہیں - میں مثالاً ابو شکور کے ''آفرین نامے'' سے متفرق اشعار نقل کرتا ہوں جو علی بن ابی نصر بن علی معروف بہ ابی الحسین اوزجندی کی عربی تالیف کے فارسی ترجمے موسوم بہ ''خرم نامے'' میں محفوظ ہیں - یہ ترجمہ پانچویں صدی ہجری کے منتصف اول میں شہر مراغہ میں تیار ہوا ہے :

۱- ملاحظہ ہو 'مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد پنجم ، صفحہ ۵۵ - (مرتب)

ابو شکور گوید در آفرین نامه :

چه نیکو سخن گفت فرزانه مرد
نگر تا توان نزد شیران مگرد

نگهدار تن باش و آن دو چشم
که چشم آورد پادشه را به خشم

ابا پادشه پادشاهی مجوی
نهنگان چشمش شود رو بروی

شنیدم که بی بادهٔ مغز گیر
شود پادشه زود مستی پزیر

(دیگر) ابو شکور در همین معنی گوید :

سزد ار بکمتر نباشی نژند
نباشی بچیز کسان آزمند

نه کمتر بوی نزد مردم شناس
نه بر گردن تو کسی را سپاس

هم از دست رنجت اگر نان خوری
بنان کسان اندرون ننگری

(دیگر) چنان چه ابو شکور گوید :

کرا باده مستی کند بیدرنگ
چو هشیاری آید ازو نیست ننگ

کرا پادشاهی کند مست کار
ابی پادشاهی شود هوشیار

(دیگر) مثنوی :

نهفتن سزد راز را جاودان
بجان گیر این پندها را بجان

چو با دوست دشمن بباید کشاد
هنرمند موبد چنان کرد یاد

سخن گر ز دشمن بخواهی نہفت
ابا دوست برگس مجالست گفت

چو گر دوست رازت نگہدارداو
چو دشمن شود راز پیش آرداو

(دیگر) نظم:

چہ دشمن بتو گرچہ نیکو بود
سرانجام بر زشت نیرو بود

اگر زشت آید ز دشمن پیام
نگر تا نخوانیش دشمن بنام

چو دشمن ترا پیش دارد شکر
گمان بر کہ زہر است ہرگز مخور

(دیگر) نظم:

بگفتار دشمن چہ آید فرود
کہ خوش نیست باگفت دشمن سرود

نہ ہرچ او بگوید سخن آن کند
نہ ہرچش بگوئی تو فرمان کند

جو ابیات مثنوی اور نظم کے عنوان سے درج ہوئے ہیں، بہت ممکن ہے کہ ابوشکور ہی کے ہوں۔ لیکن سب کے سب عربی کے اثر سے پاک ہیں۔ اس مختصر نمونے سے ظاہر ہے کہ تمام آفرین نامہ اسی رنگ میں ہوگا۔

شمس العلما کے بر خلاف ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ عربی اثر رودکی، دقیقی وغیرہم کے عہد سے فارسی میں محسوس ہونے لگا ہے، کیونکہ اس عہد سے قبل فارسی میں لٹریچر نہیں تھا جس پر عربی کا اثر ہوتا۔ جب لٹریچر شروع ہوا تب ہی اثر آیا۔ چنانچہ یہی دور زیر بحث ہے جس میں عربی اثر محسوس ہونے لگا ہے۔ اس عہد کے بعد جوں جوں فارسی لٹریچر بڑھتا جاتا ہے، یہ اثر بھی پھیلتا جاتا ہے۔ حتٰی کہ سلجوقی دور میں ایک طوفان کی طرح چھا گیا اور مقامات حمیدی جیسی تالیفات ظہور میں آنے لگیں۔

میں یہاں اسی خرم نامے سے ایک اخلاق غزل نقل کرتا ہوں جس میں

چند شعر جنس لطیف کے خلاف عام معاندت کے مظہر ہیں ۔ جیسا کہ عہد قدیم کا دستور تھا ۔ اس غزل میں بعض الفاظ عربی کے بھی موجود ہیں :

ازان کز تو بیش است ترسیده بہ
وزانچہ ندانی تو پرسیده بہ

ندانی ، ازانکس کہ داند ، بپرس
جواب سخنها نیوشیده بہ

نباشند همداستان بخردان
ز هر باب یک لفظ بشنیده بہ

سخن خورد جانست و همراز جان
سخن را بجان بر طرازیده بہ

کہ جان بی سخن سخت غمگین بود
بگفتار خویش نوازیده بہ

نہ مردم فرشتست نہ گاو خر
ازین طبع کاویش ببریده بہ

بخواهیدن دخت نیکو سگال
کہ زن گر بخواهی سگالیده بہ

کرا دختران بزرگ جسیم
دلش از غمان سخت پیچیده بہ

کہ دفن البنات من المکرمات
حدیثی ست کانرا شناسیده بہ

نباید کہ دختر بزاید زنی
وگر زاد در گور پوشیده بہ

پس ار زاد و مرگش نیامد فراز
بدان خان شویش فرستیده بہ

صفحہ ۱۰۵ : کہتے ہیں کہ دقیقی کی رباعیاں اب ناپید ہیں ۔ صرف ایک رباعی باقی رہی ہے جو یہاں منقول ہے :

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دهد
آری دهد ولیک بعمری دگر دهد

من عمر خویش را بصبوری گزاشتم
عمری دگر بباید تا صبر بر دهد

شمس العلما ان شاعروں کی رباعیاں درج کرنے کا خاص اہتمام کرتے ہیں مگر تعجب ہے کہ وہ اشعار رباعی و غیر رباعی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ جہاں چار مصرعے نظر آئے، ان کا نام رباعی رکھ دیا۔

رباعی اصل میں بحر ہزج کے خاص چوبیس اوزان کا نام ہے جو شجرۂ اخرم و اخرب میں نصف نصف منقسم ہیں۔ دقیقی کے یہ دو بیت رباعی کے دائرے سے باہر ہیں۔ ان کا وزن مضارع مثمن مقبوض و محذوف ہے۔

ان شعروں کی زبان کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے جس میں سات لفظ عربی کے شامل ہیں۔ کیا ایسی مثالوں کے باوجود دقیقی فارسی زبان کو عربی الفاظ کی ملاوٹ سے پاک و صاف کرنے والا مانا جائے گا؟

صفحہ ۱۴۸ : دقیقی اور اس کے معاصرین کے کلام سے فارسی ادب کے عام رجحانات کے تعلق میں شمس العلما نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان میں سے نمبر ۷ میں کہتے ہیں :

نمبر ۷ (۱) ''نظموں کے اکثر اوزان مقامی اور قدیم الاصل ہیں۔ (۲) عربی اوزان صرف قصائد کے ساتھ مخصوص ہیں۔ (۳) رباعی اور قطعات کے اوزان ایرانی ہیں (۴) اور غزلیں ایرانی ساخت کے اوزان میں ایرانی ذوق اور مقتضیات کے مناسب لکھی گئی ہیں۔''

سہولت کی غرض سے ہم نے اس بیان میں ہندسے ڈال دیے ہیں۔ ان میں سے (۱) میں بے حد تعمیم ہے۔ ان اوزان کو قدیم الاصل کہنا صحیح نہیں۔ ایرانیوں میں نہ شعر و شاعری کا دستور تھا نہ فن عروض تھا۔ جس قدر اوزان فارسی میں مستعمل ہیں یا تو عربی سے ماخوذ ہیں یا ان ماخوذ شدہ اوزان میں کسی قدر اصلاح کر کے ان کو اپنے مذاق کے مطابق درست کر لیا ہے۔ ایک تعداد ایسے اوزان کی ہے جو بعد میں دریافت ہوئے۔ (۲) میں عربی اوزان کی تخصیص خلاف حقیقت ہے۔ قصیدے کے لیے کسی وزن کی قید نہیں، معلومہ اوزان میں جس وزن میں چاہو لکھو، حتٰی کہ فرخی نے رباعی کے وزن میں بھی قصیدہ لکھا ہے۔ (۳) رباعی کے اوزان ایران زا ہیں مگر زمانۂ بعد از اسلام میں

دریافت ہوئے ہیں ۔ قطعے کے لیے کوئی خاص وزن مقرر نہیں ۔ قصیدے کی طرح ہر وزن میں لکھا جا سکتا ہے ۔ (۴) غزل کے ساتھ ایرانی ساخت کے اوزان کی شرط بےمعنی ہے ۔ جس وزن میں قصیدہ اور قطعہ لکھا جاتا ہے ، اسی وزن میں غزل لکھی جا سکتی ہے ۔ البتہ رباعی اور مثنوی کے خاص اوزان ہیں ۔ شمس العلما مثنوی کا تو ذکر ہی نہیں کرتے اور رباعی وغیر رباعی اوزان میں عملاً ، جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں ، کوئی فرق نہیں کرتے ۔

صفحہ ۱۵۱ :

نیک بخت آن کسی کہ داد و بخورد
شور بخت آنکہ او نخورد و نداد

صفحہ ۱۵۲ :

ز آمدہ شادمان نباید بود
وز گزشتہ نکرد باید یاد

دونوں شعروں کو حکیم قطران تبریزی کی ملک بتایا ہے حالانکہ وہ رودکی کی نہایت مشہور نظم سے تعلق رکھتے ہیں ۔ چنانچہ :

شاد زی با سیاہ چشمان شاد
کہ جہان نیست جز فسانہ و باد

زآمدہ شادمان نباید بود
وز گزشتہ نکرد ۔ باید یاد

نیک بخت آن کسی کہ داد و بخورد
شور بخت آنکہ او نخورد و نداد

باد و ابر است این جہان افسوس
بادہ پیش آر ۔ ہرچہ بادا باد

صفحہ ۱۵۲ ۔ ذیل کی نظم بھی قطران کی بتائی گئی ہے :

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز
نہ بہ آخر بمرد باید باز

خواہی اندر عنا و محنت زی
خواہی اندر نشاط و نعمت و ناز

خواهی اندک تر از جهان به پذیر
خواهی از ری بگیر تا بحجاز

این همه بود و باد تو خوابست
خواب را حکم نی مگر بمجاز

این همه روز مرگ اگر بینی
نشناسی ز یک دگر شان باز

یہ اشعار بھی متفقاً رودکی کے مانے جاتے ہیں ۔ پروفیسر نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ان کو قطران کی طرف منسوب کر دیا ہے ۔

صفحہ ۱۵۳ : اسی طرح رودکی کے ایک نہایت مشہور قطعے کا شعر ذیل قطران کے حوالے کر دیا ہے :

روی بہ محراب نہادن چہ سود
دل بہ بخارا و بتان طراز

اس قطعے کا دوسرا شعر یہ ہے :

ایزدِ ما وسوسۂ عاشقی
از تو پذیرد نہ پزیرد نماز

صفحہ ۱۵۵ : تیسرے باب کی ابتدائی سطور میں ، جو غزنویوں پر ہے ، سلطان محمود کے واسطے تحریر ہوا ہے کہ اس نے ایک شاہی جامعہ اور ایک عجائب خانہ قائم کیا تھا ۔

یہ بیان غالباً 'شعرالعجم' سے ماخوذ ہے لیکن جیسا کہ 'تنقید شعرالعجم' میں دکھایا گیا ہے ، یہ روایت علامہ شبلی نے فرشتہ سے نقل کی ہے اور فرشتے کی اصل عبارت یہ ہے :

"و در جوار آن مسجد مدرسۂ بنا نہادہ و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ ، دہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف کردہ ۔" تاریخ فرشتہ صفحہ ۳۰ ، نول کشور ۔

فرشتے کے ہاں صرف مدرسہ اور کتاب خانہ مذکور ہے ۔ عجائب خانہ کسی غلطی کی بنا پر مولانا کے قلم سے نکلا اور ہمارے شمس العلما بھی اسی غلطی کے شکار ہوگئے ۔

صفحہ ۱۵۶ : خوارزم (Khwarazam) بہ کسر رائے مہملہ ہے اور صفحہ ۱۵۷ حموی (Hamwi) بفتح میم ہے۔

صفحہ ۱۶۴ : تاریخ سلاطین آل غزنین کے ایک اقتباس میں یہ عبارت آئی ہے :

''خریطہٗ بدست حاجب خود میرزا حمید بخاری بخوارزم بطرف امیر فرستاد۔''

اس عبارت میں لفظ 'میرزا' مورد تامل ہے۔ یہ لفظ غالباً تیموریوں سے رواج میں آتا ہے۔ اس کا استعمال غزنویوں میں نامعلوم ہے۔

صفحہ ۱۷۴ : نیالتگین (''Niyaltagin'') صحیح نیالتگین بہ فتح یا و نون ہے۔

''ناتھ کے مارے جانے پر اس کا قریبی رشتہ دار تولک افسر بنایا جاتا ہے۔''

لیکن تاریخ بیہقی میں 'تلک' لکھا ہے اور اس کے حالات بھی دیے ہیں[1] کہ وہ کشمیری تھا اور ذات کا حجام۔ ہندی اور فارسی خط نہایت عمدہ لکھتا تھا۔ خواجہ احمد بن حسن میمندی اس کو اپنے ساتھ لائے۔ پہلے ترجمانوں میں ہوا، پھر اس قدر ترقی کی کہ نیالتگین والیٔ ہند کی سرکوبی کے واسطے، جو باغی ہوگیا تھا، مقرر ہوا۔ تلک نے نیالتگین کو قتل کرکے اس مہم کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔ بہرحال ناتھ کا وہ رشتہ دار نہیں ہے۔

صفحہ ۱۷۵ : ''بالائی ہند میں فارسی کی اشاعت بواسطۂ سید سالار مسعود غازی۔''

شمس العلما عنوان تراشنے میں بے مثل ہیں۔ یہ دل فریب عنوان دیکھ کر ہر شخص یہی گمان کرے گا کہ سالار مسعود غازی کسی اور مقصد سے نہیں بلکہ فارسی کی ادبی خدمت کے واسطے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ یہ قصہ آج تک نامعلوم رہا اور شمس العلما پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس بھولی بسری داستان کا سراغ لگایا۔ محمود کی فوجوں میں ہم ترک، خلج، افغان، عرب اور ہندو قومیت کے سپاہیوں کا غلبہ دیکھتے ہیں۔ چونکہ یہ خالص فارسی کی مہم ہے اس لیے شمس العلما نے سالار غازی کے لشکر میں ایرانی سپاہی دکھائے ہیں۔ یہ لشکر

۱۔ ملاحظہ ہو ''ذکر حال تلک الهندو'' تاریخ بیہقی، صفحہ ۴۰۶، طبع ایران، ۱۳۲۴ش۔ (مرتّب)

قنوج کی طرف روانہ ہوا ۔ سرہند ، کل (کول ؟) ، متھرا اور آگرے (تعجب ہے کہ اگرہ صحیح بہ فتح اول نہ بہ مد اول ، اس وقت موجود تھا ۔ حالانکہ یہ مشہور شہر سکندر لودھی کا بسایا ہوا ہے) والوں کی مزاحمت پر قابو پا کر اور گنگا پار کرکے اودھ پہنچ گیا ۔ بتوں کی پرستش معدوم کرنا اور خدائے واحد کے نام کی منادی کرنا ان لوگوں کا مقصد تھا ۔ نوجوان غازی کا لشکر جو لمبے سفر کی سختیوں کی وجہ سے گھٹتا جا رہا تھا ، خستہ و ماندہ اور چکناچور بھڑائچ پہنچ گیا ۔ یہاں سترہ گھنٹے کی جنگ کے بعد ، جو ہندی مہینے جیٹھ کے پہلے ہفتے میں اتوار اور پیر کو ہوتی رہی ، غازی موصوف نے جام شہادت نوش کیا ۔ چنانچہ ان کا عرس اب تک منایا جاتا ہے ۔

شمس العلما کا خیال ہے کہ لاہور سے بھڑائچ تک کی اس مہم کے نتائج ادبی اور ذہنی لحاظ سے قابل غور ہیں ۔ سالار غازی کے سینکڑوں پیرو ، جو برگزیدہ ایرانی تھے ، اپنے سردار کی شہادت اور لشکر کے منتشر ہو جانے کے بعد اودھ کے علاقے میں آباد ہوگئے ، جہاں ان کی اولاد آج بھی پائی جاتی ہے ۔ اس جماعت کے مستقل قیام نے فارسی تہذیب و تمدن کی اشاعت و ترویج کے واسطے اندرونی اودھ میں نمایاں خدمت کی اور اس حصۂ ہند کے لوگوں کی تہذیبی اور ادبی ذوق پر مفید اثر ڈالا ۔ سید سالار کے تابعین سب کے سب فارسی بولنے والے تھے جو منتشر ہو کر اودھ کے علاقے میں آباد ہوگئے ۔ اس واقعے کی بنا پر فارسی الفاظ اور رسم و رواج کو اندرون ملک میں داخلے کا موقع مل گیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس صوبے کی ہندو آبادی نے بہت جلد بعد فارسی زبان و ادب کا ذوق پیدا کر لیا اور غزنویوں کی حکومت کے انقطاع سے ایک صدی کے اندر اندر فارسی بولنے اور لکھنے لگے ۔

معلوم نہیں اس عہد کے مورخین ہمیں کیسے کیسے سرابوں کے پیچھے دوڑائیں گے ۔ مجھے روایت پر اعتراض نہیں بلکہ روایت کے اثرات پر ، جن کے شمس العلما مدعی ہیں ، یعنی اس مزعومہ ادبی کام یابی پر جو اس مہم کا ماحصل بتائی جاتی ہے ۔ پروفیسر اگر ہمیں اس عہد کے زیادہ نہیں دو چار مسلمان اور ہندو شعرا و مصنفین کے نام گنا دیتے یا ان کی تصنیفات اور دواوین کی نشان دہی کر دیتے یا وہ اثر واضح کرتے جو اودھ کی زبان یا اس کے تمدنی شعبوں پر ہوا ،

تو جو کچھ وہ منوانا چاہتے ، ہم مان لیتے ۔ بہ حالتِ موجودہ پروفیسر کا یہ بیان ایک دل کش خواب کا حکم رکھتا ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ۔

سالار غازی کی شکست اور شہادت کے بعد ان کے ہزیمت یافتہ لشکر کے لیے اودھ کی سرزمین میں تو امن کی جگہ تصور میں بھی نہیں آ سکتی ۔ ہر شخص ان کے خون کا پیاسا ہوگا ۔ کیسی بستی بسانا اور کیسا ذوق شعر پھیلانا ۔ اور یہ جو پروفیسر نے سالار غازی کے لشکر کو ایرانی فوج سے سجایا ہے ، ہمارے نزدیک درست نہیں ۔ بھلا ایرانی جو دفتری زندگی کے طبعاً عادی تھے ، سالار کے ساتھ نامعلوم دور و دراز مقامات میں کیوں آنے لگے ۔ ظاہر ہے کہ اس روایت کے تراشنے والے اس عہد کے اصلی حالات سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں ۔

شمس العلما ایک اور مغالطے میں ہمیں مبتلا کرتے ہیں ؛ وہ کہتے ہیں کہ غزنویوں کی سلطنت کے اختتام سے ایک صدی کے اندر اندر اودھ کے علاقے میں فارسی بولی اور لکھی جانے لگی ۔ یہ بیان بہ جاے خود درست ہے لیکن سالار مسعود سے اس کا کیا واسطہ ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطان محمود سنہ ۳۸۸ھ میں تخت نشین ہوتا ہے ۔ غزنویوں کا آخری تاجدار خسرو ملک سنہ ۵۸۲ھ میں سلطان معز الدین محمد بن سام کی قید میں آ جاتا ہے ۔ اس تاریخ پر ایک صدی اور اضافہ کی جائے تو یہ اضافہ ہمیں سنہ ۶۸۲ھ میں لے آتا ہے جو غیاث الدین بلبن کا زمانہ ہے ۔ ادھر سالار مسعود غازی سنہ ۴۲۴ھ میں جام شہادت نوش کرتے ہیں ۔ اس حساب سے ان کی وفات سے ڈھائی سو سال بعد سالار کی مہم اپنا رنگ لائی اور اودھ میں ذوق شعر و ادب پروان چڑھا ۔ مگر پروفیسر نے یہ تو لمبا راستہ اختیار کیا ہے ۔ گُدی کے پیچھے ہاتھ لے جا کر ناک پکڑنے سے کیا فائدہ ؟ یہ استدلال بالکل بے معنی ہے - ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ سلطان معز الدین محمد بن سام سنہ ۵۸۹ھ میں دہلی فتح کرتا ہے اور چند سال کے اندر اندر تمام مشرقی علاقہ بنگال تک فتح ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آ جاتا ہے ۔ جگہ جگہ ان کی بستیاں اور چھاونیاں بن جاتی ہیں ۔ غزنویوں کی تقلید میں درباری زبان فارسی رہتی ہے اور اہل دفتر سب کے سب فارسی جاننے والے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ مسلمانی فتوحات کے سیلاب کے ساتھ ساتھ فارسی بھی ہر طرف پھیل جاتی ہے ۔ اودھ کے علاقے میں بھی یہی انقلاب رونما ہوتا ہے اور وہی کام جو

(شمس العلما مدعی ہیں) سالار مسعود کے طفیل میں ہوا ، ہم کہتے ہیں درحقیقت وہ کام دہلی میں اسلامی حکومت کے قیام کی بنا پر ظہور پزیر ہوا ۔ اس میں سالار مسعود کا کون سا احسان ۔

صفحہ ۱۷۸ : محمود کے درباری شعرا میں منوچہری کا نام بھی شامل کیا ہے حالانکہ وہ صریحاً اس کے فرزند مسعود شہید کے عہد کا شاعر ہے اور خاص اسی کے دربار سے تعلق رکھتا ہے ۔ 'تنقید شعر العجم' میں ، میں اس پر کافی بحث کر چکا ہوں[1] ۔

اس کے بعد پروفیسر ، محمود کے درباری شعرا عنصری ، عسجدی ، اسدی ، فرخی ، فردوسی ، منوچہری اور غضائری کی شاعری پر اس سودمندی کے اثر کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو ہندوستان کی سازگار آب و ہوا نے اسے پہنچایا ہے ۔ بالفاظ دیگر نزاکت خیال ، رنگینیٔ انشا اور شگفتگیٔ بیان ، جو ان کی مدحیہ اور بیانیہ شاعری میں موجود ہے ، پروفیسر کا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی فضا کے بغیر ، جس کا اثر ان پر تمام و کمال چھایا ہوا ہے ، ناممکن تھا ۔

ایسے جذباتی اور خیالی بیان پر ہمیں اظہار حیرت کے سوا کوئی چارہ نہیں ورنہ ظاہر ہے کہ غزنی کے حملہ آور کی معیت میں یہ مسافر شاعر جو سردی کے موسم میں گاہ گاہ ادھر آ نکلتے ہیں ، ہندوستان کی آب و ہوا ان کی شاعری میں وجدانی تاثیر کی کیا روح پھونکتی ؟ فرخی تو پروفیسر کے دعوے کی صاف صاف تردید کرتا ہے ۔ وہ سفر ہند اور اس کی صعوبت کو اپنے ایک بے مزہ قصیدے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور امیر محمد بن محمود سے معافی مانگتا ہوا کہتا ہے :

بار خدایا خدایگانا شاہا
شعر مرا سہل برگزارہ کن این بار
زانکہ مرا رنج و خستگی رہ قنوج
کوفتہ کردہ است و خیرہ مغز و سبکسار[2]

صفحہ ۱۸۰ : سومنات کے سفر کے ذکر میں فرخی کا مشہور قصیدہ ہے جس

۱۔ دیکھیے مقالات حافظ محمود شیرانی ، جلد پنجم ، صفحہ ۱۸۲ ۔ (مرتّب)

۲۔ ملاحظہ ہو دیوان فرخی مرتّبہ عبدالرسولی صفحہ ۹۶ و مرتّبہ محمد دبیر سیاقی ، طبع ۱۳۳۵ ہجری شمسی ، طہران ، صفحہ ۹۴ ۔ (مرتّب)

کی سرخی ہے : ''در ذکر سفر سومنات و قدح آن الخ ۔'' پروفیسر نے 'قدح آن' کا ترجمہ ''Its Storming'' کیا ہے ۔ ہمارے نزدیک 'قدح' ضد مدح ہے مگر قصائد فرخی میں قدح کی جگہ 'فتح'[1] ہے جس سے عبارت کی تمام گنجلک دور ہو جاتی ہے ۔

راستے کی منازل بیان کرنے والے اشعار کا انتخاب پروفیسر نے مع انگریزی ترجمے کے نقل کیا ہے ۔ اس ترجمے سے چودھواں اور پندرھواں شعر چھوٹ گیا ہے ، یعنی :

چو چیکلودار[2] کہ صندوقہای زیور یافت
بکوہ پایۂ او شہریار شیر شکر

چو نہلوارہ[3] کہ اندر دیار ہند بہیم
بہ نہلوارہ[3] ھمی کرد بر شہان مفخر

صفحہ ۱۸۱ ۔ شعر :

فراخ پہنا حوضی بہ صد ہزار عمل
ہزار بت کدۂ خورد گرد حوض اندر

۱۔ ''در ذکر سفر سومنات و فتح آن و شکستن منات و رجعت سلطان گوید ۔''
(صفحہ ۶۷ ، دیوان حکیم فرخی سیستانی ، مرتبہ عبدالرسولی ، طابع ایران ، ۱۳۱۱ ہجری شمسی) ۔ دبیر سیاقی نے بھی عبدالرسولی کی پیروی کی ہے ۔
(مرتب)

۲۔ دیوان فرخی ، مرتبہ عبدالرسولی (صفحہ ٦۹) میں یہ مصرع یوں درج ہے :
چو چیکودر کہ چہ صندوقہای گوہر یافت
اور حاشیے میں لکھا ہے :
''چیکلودار نام محلی است در آن حدود و چیکودر بواو معدولہ ظاہراً مخفف آنست ۔'' (مرتب)

۳۔ عبدالرسولی ''نہروالہ'' دیتے ہیں اور حاشیے میں لکھتے ہیں :
''نہروالہ شہری است بگجرات وبہیم از راجہ ھای بزرگ آن ملک بودہ ۔''
(دیوان فرخی ، مرتبہ عبدالرسولی ، حاشیہ صفحہ ۷۰) (مرتب)

اس شعر میں 'فراخ پہنا' کی جگہ 'دراز[1] و پہنا' بہتر قرأت ہے اور 'گرد حوض اندر' کا ترجمہ 'حوض کے اندر' درست نہیں ۔ 'گردا گرد' یا 'حوض کے گرد' زیادہ صحیح ہے ۔

صفحہ ۱۸۱ :

دگر چو دیولوارہ کہ ہم چو دیو سفید
پدید بود سر افراشتہ میان گذر

پروفیسر شہر دیولواڑہ (گجراتی ، دیلواڈ) کو اپنے ترجمے میں دیولواڑہ حوض کہہ رہے ہیں ، حالانکہ فرخی مختلف منزلیں گنا رہا ہے یعنی لدواڑہ ، جو جیسلمیر کے قریب ہے ، چیکودار ، نہر واد ، مندھیر ، اس لیے دیولواڑہ بھی منزل کا نام ہے ، نہ تالاب کا ، جس کے بعد سومنات آتا ہے ۔ دیولواڑے کے ذکر میں فرخی نے کئی شعر لکھے ہیں ۔ اس شہر میں ناریل اور چھالیا (سپاری) کے درخت کثرت سے تھے ۔ شہر کے کنارے پر ایک مضبوط قلعہ تھا جہاں بت پرستوں کا زبردست اجتماع تھا ۔ چنانچہ :

دگر چو دیولوارہ کہ ہم چو روز[2] سپید
پدید بود سر افراشتہ میان گذر

درو درختان چون گوز ہندی و پوپل
کہ ہر درخت بسالی دہد مکرر بر

یکی حصار قوی برکران شہر و دران
زبت پرستان گرد آمدہ یکی معشر

دیولواڑے کے بیان کے ساتھ شعر ذیل بالکل بے محل لایا گیا ہے :

فریضہ ہر روز آن سنگ را بشستندی
بہ آب گنگ و بشیر و بزعفران و شکر

۱- دیوان فرخی مرتبہ عبدالرسولی (صفحہ ۷۰) میں ''دراز و پہنا'' ہی دیا ہے ، البتہ دبیر سیاقی متن میں ''فراخ پہنا'' (صفحہ ۶۹) اور حاشیے میں ''دراز و پہنا'' اور ''دراز پہنا'' دیتے ہیں ۔ (مرتب)

۲- شمس العلما نے بجائے 'روز سپید' 'دیو سپید' دیا ہے ۔ عبدالرسولی مرتب دیوان فرخی بھی شیرانی صاحب کی طرح 'روز سپید' دیتے ہیں اور مرتبہ دبیر سیاقی میں بھی (صفحہ ۶۹) 'روز سپید' ہی درج ہے ۔ (مرتب)

جو اصل میں سومنات کے بت کے غسل کے تذکرے سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا ایراد یہاں ، بہ حالیکہ سومنات سے تعلق رکھنے والے تمام اشعار حذف کر دیے ہیں ، بالکل غلط فہمی پیدا کرے گا[1] ۔

صفحہ ۱۸۳ : فرخی کے واسطے کہا ہے کہ قیام ہندوستان کی بنا پر اس نے ہندی الفاظ اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں ۔ مثال میں یہ شعر نقل کیا ہے :

بگولۂ شل افغانیان دو پرہ و تیز
چو دستہ دستہ بہم تیرهای چون سوفار

آخری مصرع میں 'دستہ بستہ' بجاے 'دستہ دستہ' زیادہ مناسب ہے اور 'چون سوفار' کی جگہ 'بیَ سوفار' چاہیے[2] ۔

اگر ایک لفظ سے کسی کا قیامِ ہند ثابت ہو سکتا ہے تو فردوسی کے لیے بھی یہی دعوئ کیا جا سکتا ہے ۔ وہ کہتا ہے :

چو آگاه شد کوتوال حصار
بر آویخت با رستم نامدار

(صفحہ ۷۴ ، جلد اول ، شاہ نامہ ، طبع بمبئی ، سنہ ۱۲۷۴ھ) 'کوتوال' ہندی لفظ ہے ، یعنی کوٹ والا ۔

دیگر

ز گفتار او مانده شنکل شگفت ز سرشاره هندوی برگرفت

(صفحہ ۱۳۴ ، جلد سوم ، طبع ایضاً)

یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا ۔ فرخی کے ہاں اور ہندی الفاظ بھی موجود

۱- قصیدہ زیر بحث میں مندرجہ بالا دونوں اشعار کے درمیان ۲۹ شعر ہیں ۔ (مرتّب)

۲- عبدالرسولی بھی 'دستہ بستہ' اور 'بی سوفار' ہی دیتے ہیں ۔ البتہ حاشیے میں قوسین کے اندر 'دستہ دستہ' بھی درج کیا ہے ، اگرچہ کسی خاص مخطوطے کا حوالہ نہیں دیا ۔ 'شل' کی تشریح میں لکھتے ہیں : ''شل بکسر نیزۂ کوچک پره دار'' (صفحہ ۶۲) ۔ (مرتّب) ۔

ہیں ۔ مثلاً 'کت' جو کھٹ یعنی کھاٹ ہے ۔ مثال :

خلانت جدا کرد جیپالیان را　　ز کتہای زرین و شاهانہ زیور
(صفحہ ۸۵)

فرہنگ نامہ قواس میں لکھا ہے : ''کت تخت هندوان باشد میان بافتہ ۔''
نخچیر وال ، یعنی شکاری اور شکار کھلانے والا ۔ مثال :

نخچیر والان این ملک را　　شاگرد باشد فزون ز بہرام
(صفحہ ۲۲۵)

شمن=(بت پرست) ۔ مثال :

اندیشہ رعیت چندان کہ او کند　　اندیشہ وثن نہ همانا کند شمن
(صفحہ ۳۲۴)

دیگر

زائران را مثل نماز برد　　چون شمن در بہار پیش وثن
(صفحہ ۳۲۶)

دیگر

باغ بت خانہ گشت و گلبن بت　　بادہ خواران گل پرست شمن
(صفحہ ۳۰۹)

لنگھن=روزۂ هندوان ۔ مثال :

خوان او دائم پر زائر و پر مہمان　　ور جز این باشد حقا کہ کند لنگھن
(صفحہ ۳۲۷)

چندن=صندل ۔ مثال :

هم زره روم سوی چین رو و برگیر
از چمن و باغ چین نہالۂ چندن

(صفحہ ۲۷۲)

صفحہ ۱۸۳ - ۱۸۴ - کہتے ہیں کہ (۱) مختاری سلطان ابراہیم کے عہد میں ہندوستان آیا اور پنجاب میں آباد ہوگیا ۔ اس نے اپنے قیامِ لاہور و ملتان کے

زمانے میں بے شمار قصیدے بادشاہ کی تعریف میں لکھے ۔ ان میں ایک قصیدہ نہایت مشہور ہے :

مسلمانان دلی دارم کہ ضائع می شود جانش
درافتادم بدان دردی کہ پیدا نیست درمانش

(۲) ملتان کے نخاس سے اس نے ایک ہندی غلام خریدا ، وغیرہ ۔

(۱) مختاری ، سلطان ابراہیم کے عہد میں ہندوستان نہیں آ سکتا ۔ اس کا زمانۂ شاعری ابراہیم کے عہد سے بعد شروع ہوتا ہے ۔ اس کے دیوان میں علاءالدین مسعود بن ابراہیم (سنہ ۴۹۲ھ - ۵۰۹ھ) کی مدح میں قصائد ملتے ہیں ، نیز اس کے فرزند ارسلان شاہ کی تعریف میں ، مگر ابراہیم کی شان میں کوئی قصیدہ موجود نہیں[۱] ۔ وہ ان سیاح شاعروں میں سے ہے جو کامیابی کی امید میں مختلف درباروں میں تقدیر آزمائی کرتے رہے ہیں ۔ آل غزنہ کے علاوہ وہ آل افراسیاب اور سلاجقۂ کرمان کے درباروں میں بھی رہا ہے لیکن زیادہ قصائد غزنوی سلاطین کی شان میں ملتے ہیں ۔ 'شہریار نامہ' بھی مختاری نے مسعود کے نام پر لکھا ہے ۔

مختاری کا پنجاب میں آ کر آباد ہو جانا اور لاہور و ملتان میں رہ کر قصائد

۱۔ دیوان مختاری غزنوی ، طبع ایران ، سنہ ۱۳۳۶ (بکوشش رکن الدین و ہمایوں فرخ) میں صفحہ ۳۳۱ پر ایک قصیدہ سلطان ابراہیم کی مدح میں دیا گیا ہے جس کا مطلع ہے :

گل نمود از تخت زرین گوشۂ زرین کلاہ
ابر گوہر بر کلاہش ریخت از چتر سیاہ

سلطان ابراہیم کا نام اس شعر میں آتا ہے :

گو ز بد حالی میاندیش و ز بی برگی مترس
جان شاہنشاہ سلطان شاہ ابراہیم خواہ

اسی قصیدے کی بنا پر مرتبین دیوان کا یہ دعویٰ کہ :

"باید پذیرفت کہ حکیم مختاری در اواخر سلطنت سلطان ابراہیم بسمت شاعر دربار مفتخر شدہ است ۔"

(مرتب)

لکھنا ایک ظنی معاملہ ہے جو ثبوت کا محتاج ہے۔ اگر وہ ہندوستان آیا ہے تو چلتا پھرتا آیا ہے[1]۔ مطلع بالا اگرچہ شمس العلما نے دولت شاہ کی سند پر مختاری کی طرف منسوب کیا ہے مگر جہاں تک میرا حافظہ مدد دیتا ہے یہ مطلع اس کے دیوان میں موجود نہیں۔ اسی طرح اس قصیدے کے واسطے یہ دعویٰ: ''و بسیاری از اکابر این قصیدہ را جواب گفتہ اند ہمانا بزیبائی این قصیدہ نگفتہ باشند۔'' جو پروفیسر نے نقل کیا ہے، بے دلیل ہے۔ اول تو اس مطلع کے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط قائم نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دولت شاہ نے دو مختلف شاعروں کے مصرعوں سے اپنا مطلع تیار کر کے مختاری کے حوالے کر دیا ہے۔ مثلاً دوسرا مصرع شہاب الدین ادیب صابر کے ہاں ملتا ہے۔ چنانچہ:

دلم عاشق شدن فرمود و من بر حکم فرمانش
در افتادم بدان دردی کہ پیدا نیست درمانش[2]

علی ہذا القیاس پروفیسر کا دعویٰ کہ اس قصیدے کا جواب خسرو، انوری، خاقانی، سلمان، عرفی وغیرہ نے دیا ہے۔ اصولاً صحیح نہیں۔ اس زمین کے اصل مالک غالباً خواجہ مسعود سعد سلمان[3] ہیں کیونکہ ادیب صابر اپنے اسی قصیدے

۱۔ محوّلہ بالا دیوان مختاری کے مرتّبین نے سلطان مسعود، عضدالدولہ شیرزاد اور سرہنگ محمد خطیبی کی مدح میں مختاری کے بعض قصائد کے اشعار سے یہ استنباط کیا ہے کہ:
''مسافرت حکیم مختاری غزنوی بدارالملک لاہور نزد عضدالدولہ شیرزاد و قزدار و چالندر درمیان سالہای ۴۹۵ - ۴۹۸ باشد۔ و چنانکہ از قصایدی کہ در مدح سلطان عضدالدولہ دارد، برمی‌آید، مدت توقف او در ہند مدت زمانی نکشیدہ'' ۔ (مقدمہ دیوان، صفحہ ۹۵) (مرتّب)

۲۔ ملاحظہ ہو دیوان صابر، طبع طہران، مرتّبہ علی قویم، صفحہ ۱۴۲، قصیدہ در ثناء مجدالدین ابوالقاسم بن جعفر قدامہ۔ (مرتّب)

۳۔ دیوان مسعود سعد سلمان مرتّبہ آقای رشید یاسمی میں اگرچہ اس زمین میں کوئی مکمل قصیدہ نہیں ملتا تاہم مقطعات کے باب میں ہم پانچ اشعار سے دوچار ہوتے ہیں جن کے تیور بتاتے ہیں کہ یہ مسعود کے کسی گم گشتہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کے آخر میں ، جس کا مطلع اوپر درج ہو چکا ہے ، کہتا ہے :

گر این طرز سخن در شاعری مسعود را بودی
بجان صد آفرین کردی روان سعد سلمانش[1]

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ پر)

قصیدے کے باقیات سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مرتّب نے ان پر عنوان ''مدح'' دیا ہے ۔ پہلا شعر ہے :

سخا زریست کز همت زند رای تو بر سنگش
سخن نظمیست کز معنی دهد رای تو سامانش

(صفحہ ۶۰۶ ، دیوان مسعود ، اشاعت رشید یاسمی)

لیکن مرتّبین دیوان مختاری کا کہنا ہے کہ یہ اشعار مختاری کے ہیں جو کسی غلط فہمی کی بنا پر مسعود سے منسوب کر دیے گئے ہیں ۔ (مرتّب)

۱- دیوان صابر میں یہ شعر یوں درج ہے :

بدین حسن و طراوت شعر اگر مسعود را بودی
هزاران آفرین کردی روانِ سعد سلمانش

(صفحہ ۱۴۳)

مرتّبین دیوان مختاری کا کہنا ہے :

''قصیدهٔ معروف 'مسلمان کردن آئین کرد چشم نامسلمانش' را اکثر گویندگان . . . و از شعرای همعصرش فلکی شروانی و صابر ترمذی استقبال کرده اند و فلکی شروانی چنان پنداشته است که این قصیده از مسعود سعد سلمان است زیرا میگوید :

گر این طبع سخن در شاعری مسعود را بودی
بجان صد آفرین کردی روانِ سعد سلمانش

صابر ترمذی هم که نظر بر قصیده فلکی شروانی داشته او هم در استقبال دچار چنین اشتباهی شده است و میگوید :

بدین حسن و طراوت شعر اگر مسعود را بودی
هزاران آفرین کردی روانِ سعد سلمانش

(مقدمہ دیوان مختاری ، صفحہ ۴۴)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

لہذا مختاری اس زمین کا موجد نہیں ہے بلکہ مقلد۔ مختاری کا اصل مطلع اس کے دیوان میں یوں ہے :

مسلمان کشتن[1] آئین کرد چشم ناسلمانش
بنوک ناوک مژگان کہ پر زہر است پیکانش

لیکن یہ قصیدہ سلطان ابراہیم کے نام پر نہیں ہے بلکہ محمود روباہی[2] کی

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ پر)

لیکن دیوان فلکی شروانی مرتبہ ڈاکٹر ہادی حسن میں اس زمین میں کوئی قصیدہ نہیں۔ (مرتب)

۱۔ دیوان مختاری طبع ایران میں 'کشتن' کی جگہ 'کردن' دیا گیا ہے جو غیر موزوں ہے۔ (مرتب)

۲۔ دیوان مختاری طبع ایران میں اس قصیدے کا عنوان ''مدح سلطان مسعود بن ابراہیم و حکیم سنائی غزنوی'' دیا گیا ہے۔ سلطان مسعود کے نام معنون کرنے کا سبب غالباً یہ شعر ہے، جو مرتبین کو کتاب خانۂ ملی ملک کے کسی 'جنگ' سے ملا :

دگر بار آن ملک مسعود ابراہیم دین پرور
خرامد باز هند از بهر غزو دین یزدانش

اس شعر کے علاوہ پورے قصیدے میں مسعود کی طرف کوئی خصوصی اشارہ نہیں ملتا۔ جہاں تک حکیم سنائی کی مدح کا تعلق ہے، وہ بالواسطہ طریقے پر ہے، یعنی ممدوح سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :

سنائی را صلت‌ها بخش تا او این چنین شعری
بپردازد کہ همتا نیست اندر شعر زاقرانش

تعجب ہے کہ مرتبین نے قصیدے کے اس قسم کے اشعار پر کوئی توجہ نہ کی :

مرا چون نامہ در محشر بدست پر گناه آید
هر آن نامہ کہ جز محمود روباهی است عنوانش

تو آن روباهی کاز تو اگر شیری امان خواهد
نخست افگندن دندان و چنگال است پیمانش

(مرتب)

تعریف میں ہے جو غالباً والیٔ ہند ہے ۔ مادح اور ممدوح کے نام شعر ذلیل میں آئے ہیں :

کہ گر عثمان مختاری بدرد از درد درماند
بجز محمود روباهی کہ داند کرد درمانش[1]

شاعر اپنے ممدوح کو کہتا ہے :

بہندستان بکن کاری چنان کاری و باعظمت
کہ عبرت نامہا سازند مردان در خراسانش

بہرحال مختاری کا یہ قصیدہ کسی خاص شہرت کا مالک نہیں ۔ اس زمین میں جس شاعر کا قصیدہ کامیاب مانا گیا ہے ، وہ خاقانی شروانی ہے ۔ اس کا مطلع ہے :

دل من پیر تعلیمست و من طفل زبان دانش
دم تسلیم سر عشر و سر زانو دبستانش

مختلف شعرا نے جواب دینے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ امیر خسرو کا مطلع ہے :

دلم طفلست و پیر عشق استاد زباندانش
سواد الوجہ سبق و مسکنت کنج دبستانش

خسرو کا جو مصرع شمس العلما نے صفحہ ۱۸۳ پر نقل کیا ہے ، وہ مطلع اول نہیں ہے ، ثانی ہو تو ہو ۔ عرفی بھی خاقانی کا قصیدہ سامنے رکھ کر کہتا ہے :

دل من باغبان عشق و حیرانی گلستانش
ازل دروازۂ باغ و ابد حدّ خیابانش

اسی زمین میں دو اور شاعروں کے مطلعے نقل ہوتے ہیں :

شاہی دهستانی :

بتی دارم کہ یک ساعت برون نایم ز فرمانش
چو ایمان دارم اندر دل بخوبی عهد و پیمانش

۱۔ متذکرہ بالا دیوان مختاری میں یہ شعر یوں ہے :

بجان تو کہ از یاد تو خالی سازمی تن را
اگر محمود روباهی بہ صحبت نیستی جانش (مرتب)

سید عزالدین حسن :

گہر برزد ہمی یارم ز یاقوت در افشانش
شدم چون ذرہ در سایہ ز خورشید درخشانش[1]

(۲) ملتان کے نخاس سے ہندی غلام کی خریداری ثبوت طلب ہے ۔ وہ غزنی کے بازار سے بھی تو خرید سکتا تھا ۔

صفحہ ۱۸۷ : مختاری کے قصیدے[2] سے گیارہ شعر نقل کر کے ، جس کی تشبیب سالمنی کے بیان کی حاسل ہے ، راے دی ہے کہ اس کے کلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تشبیہیں اور خیالات ، جو ایرانی ہیں ، ہندوستانی ماحول کے عین مطابق ترمیم پا گئے ہیں ۔ چونکہ اس کو شاہی لشکر کے ساتھ سرحد کا کوہستانی علاقہ اور پنجاب کے جنگل طے کرنے تھے ۔ وہ اشعار یہ ہیں :

(۱) چو من بقوت اسلام و نصرت داور
ز بہر خدمت بستم کمر بہ عزم سفر

(۲) مدیح بود مرا رہبر و سخن مونس
امید بود مرا ہمسر و خرد یاور

(۳) بخواستم ز مجمز[3] جازۂ آورد
یکی ہیونی صحرا نورد کہہ پیکر[4]

۱- دیکھیے دیوان حسن غزنوی ، بہ تصحیح مدرس رضوی ، صفحہ ۱۰۳ ، قصیدہ در ستایش بہرام شاہ غزنوی ۔ (مرتب)

۲- یہ قصیدہ بعنوان "مدح محمد بن خطیب (خطیبی)" دیوان مختاری ، طبع ایران کے صفحہ ۱۳۲ - ۱۳۱ پر ملتا ہے ۔ ممدوح کا نام شعر ذیل میں آتا ہے :

نظام واصل محامد محمد بن خطیب
کہ مجدت ز خطابش گرفت زینت و فر

۳- طبع ایران میں 'مجہز' ۔ (مرتب)

۴- طبع ایران میں 'و کوہ سپر' ۔ (مرتب)

(۴) سپهر گردن آگنده ران و پهن قفا[1]
بلند قامت و بسیار موی و کوچک سر

(۵) بریده[2] از دهنش خوشهای مرواید
دمیده از کتفش برگهای سوسن بر[3]

(۶) چو بادپای بکوهان او در آوردم
ز جای برجست آن بادپای کوه سپهر[4]

(۷) بسان ناقهٔ صالح بیک شب اندر کوه
هزار بار برون آمد از میان حجر

(۸) فلک بود متحیّر ز شورش[5] عالم
زمین بود متحرک ز جنبش لشکر

(۹) ز خاک تیره کنی رزم گاه[6] را بالین
ز خون تازه کنی جنگجوی را بستر

(۱۰) در آفرینش برنده بود خنجر تو
نه تربیت ز فسون یافت باز آهنگر[7]

(۱۱) نعوذ بالله اگر نام او برد[8] یاجوج
بریده گردد صد جای سد اسکندر

۱- محوّلہ بالا اشاعت میں یہ مصرع یوں درج ہے :
سطبر گردن و آگنده ران و پهن کفل (مرتّب)
۲- طبع ایران میں 'دویده' (مرتّب)
۳- طبع ایران میں 'سیسنبر' ۔ (مرتّب)
۴- طبع ایران میں 'کہ پیکر' ۔ (مرتّب)
۵- طبع ایران میں 'سوزش' ۔ (مرتّب)
۶- طبع ایران میں 'رزم خواه' ۔ (مرتّب)
۷- یہ شعر دیوان مختاری کی ایرانی اشاعت میں شامل قصیدہ نہیں ۔ (مرتّب)
۸- طبع ایران میں 'یاد او کند' ۔ (مرتّب)

ان اشعار میں پہلے دو شعر تمہیدی ہیں ۔ تیسرے میں اونٹنی منگوائی گئی ۔ دو شعروں میں اونٹنی کی تعریف ۔ چھٹے شعر میں اس پر سوار ہونے کا ذکر ۔ ساتویں میں ناقۂ صالح سے مثال دی گئی ۔ آٹھویں میں لشکر کی نقل و حرکت سے زمین پر لرزے کا آنا اور نویں دسویں میں ممدوح کی جنگ آزمائی کی تعریف بہ صیغۂ خطابیہ ۔ گیارھواں شعر سب سے غیر متعلق ۔

ان ابیات میں ، جو باہم بے ربط بھی ہیں ، ہمیں تو نہ ہندوستانی فضا نظر آئی ، نہ پنجاب کے جنگل نظر آئے ۔ تیسرے شعر میں 'کبھہ' کی جگہ 'کہ' چاہیے ، چوتھے شعر میں 'سپہر گردن' کے بجائے 'سطبر گردن' پانچویں میں 'بریدہ' کی جگہ 'پریدہ' اور 'سوسن بر' کی جگہ 'سیسنبر' بہتر معلوم ہوتے ہیں ۔ چھٹے بیت میں 'کوہ سپہر' 'کوہ سپر' نویں میں 'رزم گہ' 'رزم خواہ' اور دسویں میں 'فسون' 'فسان' ہیں ۔ یہ قرأت قیاسی ہے ۔

صفحہ ۱۹۰ : کہتے ہیں کہ محمودی دور میں پنجاب کے الحاق کے بعد لاہور میں پہلا دربار منعقد ہوتا ہے ۔ اس میں ایرانی شرفا اہل سیف و اہل قلم عہدہ داروں کے علاوہ اکثر فضلائے غزنہ و خراسان مع جماعت شعرا دارالحکومت ہند کے گرد و نواح میں ٹھہرنے کے واسطے آئے ۔ اہل ہند سبکتگین کے زمانے ہی سے فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہو چکے تھے ۔ جب محمود کا فاتحانہ داخلہ ہندوستان میں ہوا ، فارسی علوم کو ماضی کے مقابلے میں بے مثال فروغ ملا ۔ اس بنا پر وہ فارسی زبان اور فارسی طریق زندگی سے کامل طور پر واقف ہوگئے اور محمود کی وفات سے فوراً بعد لاہور فی الواقع غزنی کے مقابلے میں ترجیحاً دارالسلطنت بنا دیا گیا ۔ کیونکہ سیاسیات کی ضرورت کی بنا پر سال کا اکثر حصہ محمود کو پنجاب میں مقیم رہنا پڑتا تھا ۔

یہ تفصیلی اطلاع ، جو لاہور میں دربار کرنے اور اُس کو بحیثیت دارالحکومت غزنیں پر ترجیح دینے اور محمود کا اکثر وقت وہاں گزارنے کے سلسلے میں پروفیسر نے دی ہے ، ہماری نظر سے کسی تاریخ میں نہیں گزری ۔ بلکہ محمودی سیاسیات کی رو سے ناقابلِ عمل بھی ہے ۔ ہندوستان سے زیادہ ایران و توران کے ساتھ اس کو دلچسپی تھی ۔ اس لیے غزنیں کا مستقل تخت گاہ رہنا نہایت ضروری تھا ۔ سنہ ۴۱۲ھ میں محمود لاہور پر قبضہ کرکے تمام علاقے کو اپنے والی کے سپرد

کر دیتا ہے - فتح سومنات کے بعد ، جو سنہ ۴۱۶ھ میں ہوتی ہے ، ہندوستانی معاملات میں اس کو بہت کم دلچسپی رہ گئی تھی - اس کے بعد لاہور تو شاید ہی آیا ہو - لاہور غزنویوں کا دارالسلطنت اسی وقت بنتا ہے جب قبائلِ غز ان کو نکال کر غزنیں پر قبضہ کر لیتے ہیں - یہ واقعہ غالباً سنہ ۵۵۶ھ میں ظہور پذیر ہوتا ہے ، نہ محمود کی وفات کے سال میں جو سنہ ۴۲۱ھ میں واقع ہوتی ہے - سبکتگین کے عہد سے اہل ہند کا فارسی جذبات و افکار سے آشنائی پیدا کر لینا ، جس کے پروفیسر مدعی ہیں ، یقیناً بے بنیاد ہے -

صفحہ ۱۹۱ : کہتے ہیں 'شعرائے مشہور ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے بزرگ محمود کے تصرف سے ایک دراز مدت پہلے سے پنجاب میں آ کر آباد ہو گئے ہیں - اسی سبب سے ان کی ولادت اور پرورش لاہور میں ہوئی -

تاریخ ، شمس العلما کے اس بیان کی تائید سے خاموش ہے - مسعود سعد سلمان کے متعلق تو کامل وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے والد خواجہ سعد سلمان سنہ ۴۲۷ھ میں بہ عہد مسعود شہید (سنہ ۴۲۱ - ۴۳۲ھ) بہ سلسلۂ ملازمت لاہور آ کر آباد ہوتے ہیں - تفصیل بیہقی میں درج ہے - جب سنہ ۴۲۷ھ میں سلطان شہید نے شہزادے مجدود کو والئی ہند مقرر کیا ، سعد سلمان کو شہزادۂ موصوف کا مستوفی مقرر کیا - بیہقی کی عبارت ہے :

"و وی را (شہزادۂ مجدود) سہ حاجب با سپاہ دادند و بومنصور[1] پسر ابوالقاسم علی نوکی از دیوان ما باوی بہ دبیری رفت و سعد سلمان بہ مستوفی وحل و عقد سرہنگ محمد بستد" (تاریخ بیہقی ، صفحہ ۶۲۲) -

ابوالفرج رونی کے باپ کا نام مسعود ہے اور تخلص غالباً مسعودی ہے ، جس کی حکومتِ ہند سے کچھ تنخواہ یا جاگیر مقرر تھی - ابوالفرج ایک قصیدے

۱- تاریخ بیہقی ، طبع ایران ، ۱۳۲۴ ش (صفحہ ۵۰۱) میں 'بو منصور' کے بجائے 'بو نصر' مندرج ہے (مرتب) -

میں امیر سیف الدولہ محمود سے مسعودی کی اس تنخواہ پر اپنی بحالی کا مستدعی ہے :

کز وجوہی کہ داشت مسعوڈی
کند آن را ملک بدان تعین[1]

اس سے تو بظاہر یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مسعودی ، غزنویوں کے دور میں ہندوستان آ کر آباد ہوا ہے ۔ جیپالیوں کے زمانے میں مسلمانوں کا لاہور آ کر آباد ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے ۔ ابو ریحان البیرونی ہندوؤں کی تنگ نظری ، غیر اقوام سے ان کی بے التفاتی اور عدم ربط ضبط کا بے حد شاکی ہے ۔ وہ نہایت خودبیں اور مغرور ہیں ۔ اپنے آپ کو دنیا کی تمام قوموں سے افضل و اعلیٰ سمجھتے ہیں ۔ ان کو اپنی برتری کا بڑا گھمنڈ ہے اور پردیسیوں کو حقیر سمجھتے ہیں ۔ ایسی آبادی میں مسلمانوں کا جا کر آباد ہونا اور ان کے درمیان بود و باش اختیار کرنا خیالِ خام معلوم ہوتا ہے ، جس حالت میں کہ اس عہد کی سیاست نے مسلمانوں کو ان کا رقیب بنا دیا تھا ۔

صفحہ ۱۹۳ : شمس العلما تصور کر رہے ہیں کہ لاہور میں غزنویوں کے دربار کے انعقاد سے (جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے) عوامِ ہند میں فارسی شعر کا ذوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ خراسان اور دیگر مقامات کی ترقی کے ساتھ مساوات کا دم مارنے لگا تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ بالآخر سلاطینِ غزنہ نے سنہ ۹ ۲ ۴ ھ میں لامور کو اپنا دارالسلطنت قرار دے دیا ۔ لہذا مقامِ تعجب نہیں اگر اس عہد میں ہندوستان نے ایسے شاعر پیدا کیے ہوں جو عام قابلیت میں اپنے ایرانی معاصروں کے ہم پلہ تھے ۔

اس بیان میں ہم تاریخ سے دور بھٹک گئے ہیں ۔ کوئی سنجیدہ خیال انسان یقین نہیں کر سکتا کہ ایسے درباروں سے ، جو ہمارے نزدیک بالکل مغربی انداز کے ہیں ، جمہور میں شعر و شاعری کا چسکا پیدا ہوا ہو ۔ دربار نہ ہوئے

۱- پروفیسر چایکین کے تصحیح کردہ دیوانِ ابوالفرج رونی ، سنہ ۱۳۰۴ ھ ، صفحہ ۱۰۶ پر یہ شعر یوں درج ہے :

گر وجوهی کہ داشت مسعودی
کند او را ملک بدان تمکین (مرتب)

مشاعرے ہوئے ۔ سنہ ۴۲۹ھ مسعود شہید کا زمانہ ہے ۔ بہ قول لین پول سنہ ۵۵۶ھ (م سنہ ۱۱۶۱ع) میں لاہور غزنویوں کا دارالحکومت بنتا ہے ۔ وہ بھی اسی وقت جب قبائلِ غز غزنی کا تمام علاقہ ان سے چھین لیتے ہیں ۔

اس موقع پر پروفیسر لاہور کے دو شاعروں کا ذکر کرتے ہیں ۔ پہلا ابو عبداللہ Alankati ، دوسرا حمیدالدین مسعود Shal-i-Kob ۔

میں صرف ان ناموں کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں ۔ ابو عبداللہ کو پروفیسر 'النکتی' بفتح الف و لام و سکون نون و فتح کاف تازی و کسرۂ تاے فوقانی و سکون یا پڑھتے ہیں جو یقیناً غلط ہے ۔ اس صورت میں یہ لفظ مہمل ہے ۔ النکتی میں الف لام بہ قاعدۂ عربی آیا ہے ۔ نکت نکتہ کی جمع ہے ، آخر میں یاے نسبتی ہے ۔ اس لیے ہم اس کو Annukati بولتے اور Alnukati لکھتے ہیں ۔ ابو عبداللہ کا نام روزبہ ہے ۔ حمیدالدین کے ساتھ بعد کا لفظ شالی کوب ہے اس لیے اسے انگریزی میں منتقل کرنے کے واسطے پہلے ہائی فن کی ضرورت نہیں ۔

پروفیسر ، شالی کوب کو سلطان شہاب الدین غوری کے عہد کا شاعر مانتے ہیں حالانکہ محمد عوفی نے شعراے غزنہ میں اس کا شمار کیا ہے ۔ یہ شہاب الدین اس کی شہزادگی کا نام ہے ۔ بادشاہ بننے پر اس نے اپنا نام معزالدین محمد رکھا ۔ چنانچہ یہی نام قدیم تاریخوں میں نیز اس کے مسکوکات پر ملتا ہے ۔ اس بادشاہ کو شہاب الدین کہنا غیر موجّہ ہے ۔

صفحہ ۱۹۳ : پروفیسر ایک خانقاہ کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عوفی اس کو 'خانقاہ عمد' کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ اس کے بانی ابونصر پارسی ہیں ۔ 'عمد' میرے خیال میں 'عمید' ہوگا کیونکہ ابونصر 'عمید ملک' اور صاحب ہند (وزیر ہند) تھے اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر یہ خانقاہ ان کے عہد کی بنا پر 'خانقاہِ عمید' کہلاتی ہو۔

صفحہ ۱۹۵ : اس صفحے پر شمس العلما پنجاب میں تعلیمی حالات کا نقشہ کھینچتے ہیں ۔ جامعۂ (ابونصر) کے سرچشمۂ علوم بن جانے کے بعد چھٹی صدی کے خاتمے تک لاہور اور ملتان کی گلیوں اور بازاروں میں ابتدائی مکاتب کھل گئے ۔ ہر مذہب و ملت کے پیروؤں میں فارسی کا عام چرچا ہو گیا ۔ حتیٰ کہ ہندو شرفا بھی جو سلطنت کے عہدہ دار تھے ، نہ صرف فارسی سمجھ سکتے تھے بلکہ شعرو ادب کا

ذوق بھی رکھتے تھے ، حتّی کہ دارالحکومت لاہور دو صدیوں تک فارسی زبان کا گہوارہ بنا رہا۔

یہ ایسا بیان ہے جس کی ہم تصدیق نہیں کرسکتے ۔

صفحہ ۱۹۶ : کہتے ہیں 'جب شہاب الدین غوری نے سنہ ۵۸۲ھ میں آخری غزنوی بادشاہ خسرو بن بہرام شاہ سے لاہور چھین لیا . . . ۔

غزنویوں کے آخری بادشاہ کا نام خسرو ملک ہے اور لقب تاج الدولہ ، نیز سراج الدولہ ہے ۔ اس کے باپ کا نام خسرو شاہ ہے جو بہرام شاہ کا فرزند تھا ۔

صفحہ ۱۹۶ : پروفیسر کا یہ قول کہ محمود کی آمد کے پیش تر زمانے سے ایران و دیگر علاقوں سے ہندوستان آنے والے علما و فضلا و شعرا کا تانتا لگا رہتا تھا ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سر زمین میں ایسے فاضل پیدا ہوئے جو اپنے ایرانی ہم مشربوں کے دوش بدوش تھے ۔

میرے نزدیک اس بیان میں واقعیت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ۔ البتہ محمود کے بعد اس کا اطلاق درست مانا جا سکتا ہے ۔

صفحہ ۱۹۶ : کہتے ہیں کہ 'ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان نے سلطان مسعود غزنوی اور اس کے فرزند ابراہیم کے زمانوں میں شہرت پائی' ۔

مسعود سنہ ۴۲۱ھ میں تخت نشین ہو کر سنہ ۴۳۲ھ میں قتل ہوتا ہے ۔ سلطان ابراہیم سنہ ۴۵۱ھ سے سنہ ۴۹۲ھ تک سلطنت کرتا ہے ۔ یہ امر تصدیق طلب ہے کہ اس مسعود کے جلوس کے وقت یہ شاعر پیدا بھی ہوچکے تھے یا نہیں ۔ پروفیسر سے جو غلطی سرزد ہوئی ، یہ ہے کہ وہ مسعود ثالث کو مسعود اول سمجھ بیٹھے ۔ یہ بادشاہ علاء الدین مسعود سنہ (۴۹۲ – ۵۰۸ھ) ہے جو ابراہیم غزنوی کا فرزند اور ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کا ممدوح ہے ۔

مسعود سعد سلمان : پروفیسر اس نام کو ہمیشہ بغیر اضافت کے لکھتے ہیں حالانکہ انگریزی میں اضافت لکھنے کا دستود ہے ۔ یہ اضافتِ ابنی کہلاتی ہے ۔ میرا مطلب ہے کہ مسعود کی دال اور سعد کی دال کے آخر میں کسرہ آنا چاہیے ۔

صفحہ ۲۰۱ : کہتے ہیں کہ مسعود (سعد سلمان) سلطان محمود کے عہد میں پیدا ہوئے تھے اور شہرت سلطان ابراہیم کے زمانے میں پائی ۔

خواجہ مسعود کی ولادت محمود کے زمانے میں ، جو سنہ ۴۲۱ھ میں وفات

پاتا ہے ، ناقابل یقین ہے - چونکہ خواجہ لاہور میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کے والد خواجہ سعد سلمان سنہ ۴۲۷ھ میں ، جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں ، شہزادہ مجدود کے مستوفی مقرر ہو کر لاہور بھیجے جاتے ہیں ، اس لیے ان کی ولادت اس سال کے بعد تصور کرنی چاہیے -

صفحہ ۲۰۲ : ''و ارباب خرد و انصاف دانند کہ حسّیات مسعود در علو بجہ درجہ است -''

اس عبارت میں 'حسّیات' جس کا ترجمہ پروفیسر نے 'Poetic touches' کیا ہے ، غلط ہے - اس کی جگہ 'جسیات' جس کے معنی 'Prison Poems' ہیں ، چاہیے - اس میں شک نہیں کہ خواجہ مسعود اپنی جسیات کے واسطے مشہور عالم ہیں -

صفحہ ۲۰۲ : کہتے ہیں کہ سنائی ، مسعود کی شاعری کا بڑے جوش کے ساتھ مشتاق تھا - اس نے ایک علٰحدہ کتاب میں ، جس کا نام دیوان رکھا تھا ، اس کے اشعار کو جمع کیا تھا - یہ امر خود سنائی کے اپنے بیان سے جو قطعۂ ذیل میں آتا ہے ، واضح ہے :

چون ہدیۂ این رھی کہ گفتۂ تو
کافران را ھمی مسلمان کرد
کرد شعر جمیل تو زانسان
کہ صحابی ز نزل قرآن کرد[1]
چون علو[2] جہان بشعر تو دید
عقل او گرد طبع جولان کرد
شعر ھارا بجملہ در دیوان
چون فراہم نہاد دیوان کرد

۱- دیوان مسعود سعد سلمان مرتّبہ آقای رشید یاسمی کے اختتام پر سنائی کا یہ قطعہ درج ہے (صفحہ ۷۳۲ - ۷۳۳) - اس میں یہ شعر یوں ہے :

کرد شعر جمیل تو جملہ
چون نبی؄ را گزیدہ عثمان؅ کرد (مرتّب)

۲- دیوان مسعود مرتّبہ رشید یاسمی میں ''ولوع'' بجائے ''علو'' - (مرتّب)

تا چو دریای موجزن سخنت
در جهان درّ و گوهر ارزان کرد

گفت آری سنائی از سر جهل
لعل را با خزف بمیزان کرد[۱]

لیک معذور دار ازان که مرا
معجز شعر هات حیران کرد

پس چو شعری بگفت و نیک آمد
داغ مسعود سعد سلمان کرد

شمس العلما اس قطعے کا پورا مطلب نہیں سمجھے ۔ سنائی نے خواجہ مسعود کا کلیات مرتّب کیا تھا ۔ غلطی سے اس میں دوسرے شعرا کا کلام بھی شامل کر لیا ۔ خواجہ مسعود نے (یا بقول میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی ثقۃ الملک طاہر بن علی نے) سنائی کو اس غلطی سے آگاہ کیا ۔ اس پر سنائی نے خواجہ کی خدمت میں معذرۃً یہ قطعہ بھیجا جو اوپر درج ہے ۔ پروفیسر نے اس قطعے کا ترجمہ بھی دیا ہے جس میں بعض امور نظری ہیں :

دوسرے شعر میں 'نزل قرآن کرد' کا ترجمہ کیا ہے 'did with the Quran' اور 'نزل' کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے ۔

ع : 'عقل او گرد طبع جولان کرد' کا ترجمہ حسب ذیل غیر مناسب معلوم ہوتا ہے :

His wisdom Swiftly went round his disposition (desire) ;

ہمارے خیال میں شاعر کا مقصد ہے کہ اس کی عقل نے اس کی اشاعت کا اقدام کرنا چاہا :

گفت آری سنائی از سر جهل
لعل را با خزف بمیزان کرد

۱۔ مرتّبہ رشید یاسمی میں دوسرا مصرع ہے :
با لبی جمع ژاژ طیان کرد (مرتّب)

کا ترجمہ اس طرح کیا ہے :

Sanai said, Aye in ignorance, he put the ruby along with a shell in one balance ;

'گفت' کا فاعل سنائی نہیں ہے بلکہ خود خواجہ مسعود یا ثقۃ الملک ہے ۔ یعنی اس نے کہا کہ سنائی نے اپنی جہالت سے لعل کو ٹھیکری کے ساتھ ایک ہی پلڑے میں رکھ دیا ہے ۔

صفحہ ۲۰۴ : ادیب صابر :

اگر این طرز سخن در شاعری مسعود را بودی
بجان صد آفرین کردی روان سعد سلمانش

ہمارے نزدیک یہ شعر ایک شاعرانہ تعلّی ہے ۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ادیب صابر خواجہ مسعود کا معتقد اور مداح تھا ، جیسا کہ پروفیسر صفحہ ۲۰۵ پر ظاہر کر رہے ہیں ۔ اصل مقصد ذاتی تعریف ہے ۔ اس شعر کے واسطے ڈاکٹر ہادی حسن کے مقالے 'فلکی شروانی' کا حوالہ دیا ہے جو ہمیں انوکھا معلوم ہوتا ہے ، کیونکہ اس کا قدیم اور زیادہ مشہور ماخذ 'لباب الالباب' محمد عوفی ہے ، جہاں پورا قصیدہ ادیب صابر کے کلام کے ذیل میں درج ہے[1] ۔

صفحہ ۲۰۷ :

اشعار ترا در جہان گرفتن
باشد اثر خاتم سلیمان

اس شعر کا ترجمہ کیا ہے :

To be in possession of the verses in this world is just as good in effect as to possess the seal of Solomon.

جو ہمارے نزدیک درست نہیں ۔ شاعر کا مطلب ہے کہ تیرے اشعار دنیا کی تسخیر میں وہی اثر رکھتے ہیں جو اثر حضرت سلیمان کی انگوٹھی میں تھا ۔

۱- لباب الالباب (اشاعتِ براؤن) حصہ دوم کے صفحہ ۱۱۷ سے ۱۲۵ تک ادیب صابر کا تذکرہ اور نمونۂ کلام موجود ہے ، تاہم زیر بحث قصیدہ وہاں نظر نہیں آتا ۔

صفحہ ۲۰۸ : مسعود کا ایک قصیدہ جس کا مطلع ہے :

ای عزم سفر کرده و بسته کمر فتح
بکشاده چپ و راست فلک بر تو در فتح

سلطان ابراہیم کی مدح میں بتایا ہے حالانکہ مطلع کے بعد کے شعر سے ، جسے پروفیسر نے نقل بھی کیا ہے ، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ سلطان علاء الدین مسعود کی تعریف میں ہے ۔ چنانچہ شعر :

مسعود جہانگیر کہ از دھر سعادت[1]
ھر لحظہ بسوی تو فرستد نفر فتح

پہلے مصرع میں 'دھر' کی جگہ 'دیر' اور دوسرے مصرع میں 'نفر' کی جگہ 'خبر' چاہیے ۔ سیاق عبارت کا یہی تقاضا ہے ۔

صفحہ ۲۰۹ : مسعود کی مدح نگاری کے تعلق میں کہتے ہیں ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس نے اس میدان میں رواج مقررہ سے ایک اہم تجاوز کیا ہے ، جو اس کے عہد تک اقسامِ نظم میں صرف قصیدے تک محدود تھا ۔ اس سے پیش تر بہت کم شاعروں نے قصیدے کے سوا کوئی اور صنف مدح نگاری کے ذریعے کے طور پر اختیار کی ہے لیکن مسعود اس غرض سے نظم کی ہر قسم استعمال میں لایا ہے ۔ چنانچہ قصیدے کا کام اس نے مسدس ، غزل اور قطعے سے لیا ہے ۔ مسدس کی مثال :

بہرام شاہ خسرو گیتی کشای گشت
خورشید دھر و سایۂ فرّ خدای گشت
چترش کہ شد ھمایون فرّ ھمای گشت
او را خدای عزّوجل رھنمای گشت
آن خنجر زدودش دولت فزای گشت
روی عدوی او شده چون چترّ او سیاه[2]

۱- مسعود جہانگیری وز چرخ سعادت (دیوان مسعود سعد سلمان ، مرتّبہ آقای رشید یاسمی ، صفحہ ۷۹) ۔ (مرتّب)

۲- یہ اشعار بلکہ پورا مسمّط دیوان مسعود ، اشاعتِ رشید یاسمی میں نظر نہیں آتا ۔ (مرتّب)

اصولاً نظم کی یہ قسم ، جسے پروفیسر مسدس کہتے ہیں ، مسمّط کہلاتی ہے ، جس میں پانچ مصرعے متحدالقافیہ اور آخری مصرع دوسرے بندوں کے چھٹے مصرع کے ساتھ ہم قافیہ ہوتا ہے ۔ مسعود کا یہ مسدس بھی مسمّط ہے ۔ مسمّط کا بانی منوچہری دامغانی ہے جس نے معشّر تک کے مسمّط لکھے ہیں ۔ قطران تبریزی منوچہری کا مقلد ہے اور مسعود ان دونوں کے بعد آتا ہے ۔ بہرحال ایجاد کی عزت منوچہری کی طرف منسوب ہونی چاہیے ۔

صفحہ ۲۱۴ : اس صفحے سے شمس العلما پھر محمود کی طرف رجوع کرتے ہیں اور سب سے پہلے اس کے سترہ حملوں کی فہرست ، جو ہندوستان میں اس نے کیے ہیں ، قدیم و جدید کتب ِ تاریخ سے لے کر دیتے ہیں ۔ مگر ہمارے نزدیک کسی موضوع کو اس طرح پارہ پارہ کر کے متفرق طور پر بیان کرنا کتاب کو بے ترتیب بنانے کے علاوہ قاری کی زحمت کا موجب بھی ہے ۔

اس کے بعد محمود کی فہرست ِ خطابات بہ فحوائے قند ِ مکرر خفی و جلی ٹائپ میں دی ہے ۔ اس فہرست میں دس خطاب ہیں جن کے واسطے کہا ہے کہ ہمسایہ ریاستوں نے محمود کو دیے تھے ۔ لیکن سامانیوں اور خلیفہ کے سوائے دوسروں سے محمود خطاب کیوں قبول کرنے لگا ۔ نہ ان خطابات کا ذکر معتبر کتب ِ تاریخ میں میری نظر سے گزرا ۔ مثلاً (۱) عضدالدولہ ۔ (۲) مؤیدالملۃ ۔ (۳) شہاب الدولۃ والدین ۔ (۴) جمال الاسلام والمسلمین ۔ (۵) امیر المسلمین ۔ (۶) جمال الملۃ ۔

لیکن موجب ِ تعجب یہ امر ہے کہ اس کے نہایت مشہور خطاب ، جو اس کے سکّوں پر بھی بہ کثرت ملتے ہیں ، اس فہرست میں شامل نہیں ۔ مثلاً 'سیف الدولہ' جو سامانیوں نے دیا تھا ، جب وہ سپہ سالار خراسان تھا ، اس کے ابتدائی سکّوں پر ملتا ہے ۔ اسی طرح خلیفہ' بغداد نے تاج پوشی کے وقت اس کو 'یمین الدولہ و امین الملۃ' خطاب عطا کیا تھا ۔ یہ خطاب بالعموم محمود کے مسکوکات پر ملتا ہے ۔ اس کے آخر زمانے کے سکّوں پر "نظام الدین" یا "یمین الدولہ نظام الدین" خطابات ملتے ہیں ۔ پروفیسر ان صحیح خطابات سے اعراض کر کے غیر معتبر خطابوں کی فہرست ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں ۔

صفحہ ۲۲۰ : پروفیسر کا یہ بیان کہ "جب سومنات کے بت کو توڑا ، اس کے جوف میں سے بیش بہا اور قیمتی جواہرات نکلے" اگرچہ بعض موخّر تاریخوں

میں مذکور ہے مگر مستند نہیں ، نہ قدیم اور معتبر تاریخوں میں اس کا تذکرہ ملتا ۔ ہندوؤں کی پوجا کی اشیا (بت) مجوف اور جوڑدار نہیں ہوتیں ۔ بہرحال جواہرات کا بت کے پیٹ میں سے برآمد ہونا بالکل غلط ہے ۔ صحیح وہی ہے جو گردیزی نے لکھا ہے کہ :

''گنج بود اندر زیر بتان ، آن گنج را برداشت و مالی عظیم ازانجا بحاصل کرد'' (صفحہ ۸۷ ، زین الاخبار ، طبع ناظم) ۔ بتوں کو ہٹاتے وقت ان کے نیچے سے خزانہ برآمد ہوا یعنی جس مقام پر بت نصب تھے ، وہاں سے نکلا ۔

فرخی جو سفرِ سومنات میں محمود کے شریک اور شاہد عینی ہے ، تقریباً گردیزی کے بیان کی تصدیق کر رہا ہے :

خدای حکم چنان کرده بود کان بت را
ز جای بر کند آن شهریار دین پرور
بدان نیت که مر او را بمکه باز برد
بکند و اینک با ما همی برد همبر
چو بت بکند ازانجا و مال و زر برداشت[1]
بدست خویش به بت خانه در فگند آذر

صفحہ ۲۳۸ : انوری کے ایک قطعے کا شعر ہے :

باد معلومش که من بنده بشعر بوالفرج
تا بدیدستم و لوعی داشتستم بس تمام[2]

۱۔ عبدالرسولی حاشیے میں لکھتے ہیں :

''بکند وز بت خانه مال و زر برداشت''

(دیوان فرخی ، صفحہ ۷۲) ۔ (مرتب)

۲۔ دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ، کتاب قصاید (صفحہ ۲۱۵) میں یہ قطعہ بہ عنوان ''فی اقتراح القرطاس'' موجود ہے ، تاہم یہ شعر اس میں نہیں ۔ اس کی جگہ غالباً یہ شعر ہے :

باد معلومش که من خادم ، نه اکنون ، مدتیست
تا باشعار سنائی رغبتی دارم تمام (مرتب)

شعر کے پہلے مصرع کا ترجمہ قابل غور ہے :

He may know that I am a slave of his poetry, since I saw it I became all the more avid of it.

پروفیسر سمجھ رہے ہیں کہ انوری ابوالفرج کو بصیغہ غائب خطاب کر رہا ہے حالانکہ شاعر کا مخاطب اس کا کوئی دوست ہے۔ انوری کی شاعری کا دور سنہ ۵۳۰ھ کے قریب شروع ہوتا ہے۔ ابوالفرج اس صدی کے آغاز سے پہلے وفات پا چکا ہے۔ 'مرآت عالم' میں اس کا سال وفات ۴۸۲ھ ہے۔ 'صحف ابراہیمی' میں ۴۸۹ھ اور 'نشترعشق' میں ۴۹۰ھ ہے۔ ابوالفرج کے قصائد کی شہادت کی رو سے یہ سال ۴۹۷ھ کے بعد ہوگا۔ بہرحال ان میں خط و کتابت کا واسطہ ہمارے نزدیک دشوار ہے۔

اسی قطعے کے ایک اور شعر کا ترجمہ بھی شاعر کا صحیح مفہوم ادا نہیں کرتا :

عزم دارم کان بروزی چند بنویسم کہ لیست
شعر او مرغی کہ آسان اندرون افتد بدام[1]

پروفیسر کہتے ہیں :

He further declares his resolve to imitate Abul Faraj's poetry and compares it with a bird which it is not easy to ensnare.

انوری کہنا چاہتا ہے کہ میرا ارادہ ہے کہ چند یوم لگا کر میں اس (ابوالفرج) کے دیوان کی نقل کر لوں۔

یہ قطعہ، جس سے اوپر کے دونوں شعر نقل ہوئے ہیں، انوری نے اپنے کسی دوست کو لکھا ہے اور کہتا ہے۔ آپ کو معلوم رہے کہ میں ابوالفرج کے اشعار کا بے حد مشتاق ہوں۔ اس کا جستہ جستہ کلام میں نے مختلف لوگوں

۱- عزم آن دارم کہ روزی چند بنویسم، کہ لیست
شعر او مرغی کہ آسان اندرون آید بدام
(دیوان انوری، مرتّبہ سعید نفیسی، صفحہ ۴۱۵) - (مرتّب)

سے لے کر جمع کیا ہے ۔ اس سے میری سیری نہیں ہوتی ۔ کل یہ تذکرہ میں نے کریم الدین صاحب سے کیا ۔ انھوں نے کہا کہ ابوالفرج کے انتخاب کا ایک مخطوطہ میرے پاس موجود ہے ۔ تب سے میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ اس کی ایک نقل لے لوں ، کیونکہ اس شاعر کا کلام آسانی سے دست یاب نہیں ہوتا ۔ لیکن کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے میں ایک شعر بھی نقل نہیں کر سکا ۔ آپ سے اُمید ہے کہ میری دست گیری کریں گے ۔ آپ کے پاس اچھا برا جیسا کاغذ ہو اس کا ایک دستہ ، خواہ عنایتاً خواہ مستعار ، بھیج دیں ۔ اصل قطعہ بھی ، جس سے غیرضروری اشعار حذف کر دیے گئے ہیں ، ذیل میں نقل ہے[1] :

زندگانی مجلس سامی در اقبال تو ام
چون ابد بی انتها باد و چو دولت برمدام

باد معلومش که من خادم بشعر بوالفرج
تا بدیدستم و لوعی داشتستم بس تمام

شعر چند الحق بدست آورده ام فیما مضیٰ
قطعهٔ از زید و عمرو نکتهٔ از خاص و عام

چون بدان قانع نبودستم طلب میکرده ام
در سفر گاه مسیر و در حضر گاه قیام

دی همین معنی مگر بردست بن خادم برفت
با کریم الدین که هست اندر کرم فخر الکرام

گفت من دارم بلی از انتخاب شعر او
نسخهٔ بس بی نظیر و شیوهٔ بس با نظام

عزم آن دارم که روزی چند بنویسم که نیست
شعر او مرغی که آسان اندرون افتد بدام

۱۔ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے ، یہ قطعہ دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ، طبع ایران ، ۱۳۳۷ ہجری شمسی میں صفحہ ۲۱۵ پر موجود ہے ۔ تاہم اس میں اور شیرانی صاحب کے منتخبہ اشعار میں ، جو دیوان انوری کی نولکشوری اشاعت سے لیے گئے ہیں ، فرق ہے ۔ یہ اختلاف ذیل میں شعر بشعر دکھایا جاتا ہے :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

لیکن از بی کاغذی بیتی نکردستم سواد
هست امیدم که این خدمت چو بگزارد پیام

حالی او در خانه دارد نیک و بد یک دسته
نزد من خادم فرستد یا بمنّت یا بوام

(صفحہ ۲۵۱ کلیات انوری ، سنہ ۱۸۹۷ع ، نول کشور)

صفحہ ۲۳۸ : کہتے ہیں 'ایک اور موقع پر انوری ابوالفرج کو فرخی کے ساتھ ، جو محمود کے دربار کا ایک درخشان گوہر تھا ، تشبیہ دے رہا ہے :

در عذوبت نظمِ اقبالت چو نظمِ فرخی

اور ترجمہ : 'تیری اقبال مند نظم شیرینی میں فرخی کی نظم کی طرح ہے' ۔ شمس العلما نے یہ مصرع صحیح نقل نہیں کیا ۔ انوری کے کلیات میں (صفحہ ۵۳ ، نول کشور ، سنہ ۱۸۹۷ع) ایک قطعہ آتا ہے جس کی ابتدا ہے :

دی ز من پرسید معروفی ز معروفان بلخ
از شما پوشیده چون دارم عزیز شادخی

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

شعر نمبر ۱ : 'عالی' بجائے 'سامی' ۔ 'تمام' بجائے 'توام' 'دوام' بجائے 'مدام' ۔

شعر نمبر ۲ : باد معلومش که من خادم ، نه اکنون ، مدتیست
تا باشعار سنائی رغبتی دارم تمام

شعر نمبر ۳ : بعضی از دیوان او الحق بدست آورده ام
قطعه قطعه ، بیت بیت ، از عمرو زید و خاص و عام

شعر نمبر ۴ : 'وقت مسیر' بجائے 'گاه مسیر' ، 'مقام' بجائے 'قیام' ۔

شعر نمبر ۵ : 'لفظ' بجائے 'دست' ۔

شعر نمبر ۶ : 'یکی' بجائے 'بلی' ۔

شعر نمبر ۷ : 'آید' بجائے 'افتد' ۔

شعر نمبر ۸ : کوئی اختلاف نہیں ۔

شعر نمبر ۹ : حالی ، ار داری ، بتایی چند ، یابد ، یاسره
دستگیری آیدم ، اما عطا ، اما بوام

(مرتّب)

یہ قطعہ غالباً والئی ہرات کے واسطے لکھا گیا ہے[1] جس کو 'خسرو صاحب قران' کہا ہے :

زانکہ اندر خدمت این خسرو صاحبقران[2]
مدحتی گوئی کہ حکمش طاعت است از فرخی

آخری دو شعر خطابیہ و دعائیہ ہیں اور حسب ذیل ہیں :

شادمان زی ای قدر قدرت خداوندی کہ هست
جای مقلوبی فلک را گر کنون با اوچخی
از متانت حکم و اقبالت چو شعر بوالفرج
وز عذوبت مشرب عیشت چو نظم فرخی

پچھلے شعر میں والی کو دعائیہ کہا ہے کہ تیرا حکم اور اقبال متانت میں ابوالفرج کے شعر کی مثال ہو اور تیرا عیش شیرینی میں فرخی کے کلام کی طرح ہو ۔ گویا ممدوح کے حکم اور اقبال کو بہ لحاظ متانت ابوالفرج کے کلام کے ساتھ اور اس کی شیرینی عیش کو فرخی کی نظموں کے ساتھ مثال دی ہے ۔ تنہا مصرع کو لے کر ، جس کی صحیح قراءت بھی ان کے پاس نہیں ہے ، پروفیسر نے ایک غلط نظریہ قائم کیا ہے کہ انوری ابوالفرج کو خطاب کر رہا ہے اور اس کی اقبال مند نظم کو شیرینی میں فرخی کی نظم کے ساتھ تشبیہ دے رہا ہے ۔

صفحہ ۲۳۹ : کہتے ہیں ''عرفی جو اپنے آپ کو زمانے کا سب سے بڑا شاعر شمار کرتا ہے ، خان خانان کے ایک مدحیہ قصیدے میں ابوالفرج اور انوری کے تعلق میں اپنی احسان مندی کا اعتراف کرتا ہے ۔ وہ فخریہ ان کو اس زمین میں اپنا رہبر اور خود کو ان کے وزن اور طرز کا مقلد کہتا ہے ۔ وہ معنی خیز

۱۔ دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی (صفحہ ۲۶۱) میں اس قطعے پر ''در وصف کرم صاحب ترمذ'' عنوان ہے ۔ (مرتب)

۲۔ ''زانکہ گر در خدمت این صاحب صاحبقران'' (اشاعت سعید نفیسی) (مرتب)

۳۔ مرتبہ سعید نفیسی میں ''حبل اقبالت ۔'' (مرتب)

اشعار یہ ہیں :

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز
ہرچہ غنیمت نشمارند عدم را
بسم اللہ ز اعجاز نفس جانِ دہ شان باز
تا من قلم اندازم و گیرند قلم را
اول رہ این نظم خود ایشان بسپردند
پس باز نمودیم بہم منزل ہم را

فی الحقیقت یہ بڑا خراج عقیدت ہے جو عرفی نے ابوالفرج کی یاد میں ادا کیا ہے ۔''

ان اشعار میں ہمیں تو عرفی کی ممنونیت یا احسان مندی کی جھلک تک نظر نہیں آتی ۔ وہ جوش خودستائی میں اپنے ممدوح پر ان شعرا کے خلاف اپنی فضلیت اور برتری کا سکہ جمانے کی کوشش میں مصروف ہے ۔ کہتا ہے ابوالفرج اور انوری اس زمانے میں ملکِ عدم میں اپنا بسنا کیوں نہ غنیمت خیال کریں ، ورنہ میرے ہاتھ سے انھیں کیسی کیسی زکیں اُٹھانی پڑتیں ۔ اگر اب بھی انھیں کوئی دعوی ہو تو خدا کا نام لے کر آپ اپنی مسیح نفسی سے ان کو حیاتِ تازہ دیں تاکہ میں قلم ہاتھ سے رکھ دوں اور وہ قلم سنبھالیں اور اپنے دل کا ارمان نکالیں ۔ جہاں تک اس زمین کا تعلق ہے ، مجھ سے پہلے اُنھوں نے اس کا راستہ طے کیا ہے ، میں نے تو بعد میں ان کی ہمراہی کی ہے ۔ ہاں تو یہ شعر اس کی عقیدت مندی کے افسانہ خواں نہیں ہیں بلکہ اس کے تفاخر و پندار کے آئینہ دار ہیں ۔ عرفی کا یہ کہنا صحیح[1] ہے کہ اس بحر و قافیہ میں ابوالفرج نے سب سے پہلے قصیدہ لکھا ۔

۱- اس زمین میں انوری کا مطلع ہے :

ای قاعدۂ تازہ ز دست تو کرم را
وی مرتبۂ نو ز بنان تو قلم

آخر میں کہتا ہے :

این شعر بدان وزن و قوافی وردیفست :
''امروز نشاطیست فرہ فضل و کرم را''

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

انوری نے اس کا جواب دیا اور خود عرفی دونوں کے بعد آتا ہے۔

صفحہ ۲۴۵ : صائب کے شعر ذیل کے ترجمے میں ایک محاورہ 'آمدن حنا بہند' کی تشریح ضروری ہے :

نیست در ایران زمین سامانِ تحصیلِ کمال
تا نیامد سوی ہندوستان حنا رنگین نہ شد

There is not in the persian land the requisite material for perfection in the poetic art.

Until hena (myrtle) came to India it acquired no colour.

'آمدن حنا بہند' یا 'بہند رفتن حنا' ایک محاورہ ہے۔ ہند کے معنی 'سیاہ' ہیں۔ اس بنا پر 'ہند حنا' سے مراد سیاہی حنا ہے اور 'بہند رفتن حنا' سیاہی زدن حنا ہے۔ رضی دانش :

راہ دور ہند پابست وطن دارد مرا
چون حنا شب درمیان رفتن بہندستان خوش است

بہار نے 'آمدن حنا بہند' کی مثال میں صائب کا یہی شعر نقل کیا ہے۔

صائب نے اس محاورے کے استعمال میں صنعتِ ایہام کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

شمس العلما کے کمزور استدلال کی مثال میں ان کا ایک بیان مختصر کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ پنجاب میں غزنوی عہد کے دو شاعر ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے کلام کے نمونے دے کر یہ بحث چھیڑتے

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

(دیوان انوری ، اشاعت سعید نفیسی ؛ صفحہ ۶ - ۷)

اب ابوالفرج کے دیوان میں صفحہ ۹ - ۱۱ پر ایک قصیدہ ''در مدح خواجہ منصور بن سعید بن احمد بن حسن میمندی صاحبِ دیوان عرض'' موجود ہے ، جس کا مطلع ہے :

امروز نشاطی است فرہ فضل و کرم را
و امروز وفاقیست عجب تیغ و قلم را (مرتب)

ہیں کہ ہندستان کی شاعری ایرانیوں کی شاعری کے بالکل مساوی ہے ۔ اس حد تک ہم ان کے ساتھ متفق ہیں ۔ غزنی اس عہد میں فارسی شاعری کا گہوارہ تھا ۔ پنجاب سلطنت غزنہ کا ایک صوبہ بن گیا تھا ۔ بسلسلۂ ملازمت متعدد خاندان پنجاب میں آ کر آباد ہو گئے تھے ۔ ان آباد کاروں نے اپنی زبان و تہذیب اور دیگر روایات کو محفوظ رکھا ۔ اس لیے ان کی شاعری کا وہی درجہ ہونا چاہیے جو غزنویوں کی شاعری کا تھا اور اس میں کسی فخر اور تعجب کی بات نہیں ۔ وہ فارسی کے اہل زبان تھے ، اپنے تمدن پر قائم رہے ، لہذا دوسرے علاقے میں آباد ہو جانے سے کم از کم ایک دو نسل تک ان کی قومیت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا ۔ یہ ایک صاف اور کھلا معاملہ ہے ۔ لیکن پروفیسر اس نقطۂ نظر سے اعراض کر کے ایران و ہندستان کی اس ہم رنگی کی ایک غیر تاریخی وجہ پوری سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں :

صفحہ ۲۴۷ : 'قرونِ متوسطہ میں ایران و ہندستان کی اس سطح مساوات پر آنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ عہد قبل از اسلام میں لاکھوں خاندان ایران سے ترکِ سکونت کر کے ہندستان آ کر پنجاب میں بس گئے تھے ۔ اس طرح محمودی حملوں سے ایک دراز مدت قبل ہند و ایران میں ایک تمدنی رابطہ اور لسانی یگانگت قائم ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں پنجاب نے فارسی زبان اور فارسی شعر کا ذوق اپنے میں رچا لیا ۔ اس کے ثبوت میں 'تذکرۂ سلاطین آل غزنہ' کی یہ عبارت نقل کی ہے :

''و در اطراف لوہور آبادانی است قدیم کہ مردمانش ہمہ از اہل خراسان اند و فاضل علامہ شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت الرومی در معجم اسارت بآن کردہ کہ آنان در عہد افراسیاب گریختہ در ہند اقامت گزیدند ۔''

ابراہیم غزنوی (سنہ ۴۵۱ - ۴۹۲ھ) نے اپنے زمانے میں ایک لاکھ ایرانیوں کو پنجاب کے اس دارالحکومت سے خانہ کوچ غزنیں میں بلوایا ، تاکہ اس کی آبادی اور رونق میں افزایش ہو ۔ ہندستان میں ایرانیوں کے اس ازدحام کی مدنی سودمندی اور وہ نفع جو ایرانی تمدن کے ساتھ مستقل اور پایدار ارتباط پیدا کرنے سے اس کو اپنے تعلیمی اور لسانی اداروں میں حاصل ہوا ، بے حد ہے ۔ ان اثرات میں یہاں کے لوگوں کے ادبی مذاق میں اس قدر انقلاب پیدا ہوا کہ

پنجاب میں پیہم ایسے شاعر پیدا ہونے لگے جنھوں نے خود اہل ایران سے خراج تحسین وصول کیا اور جو ہر لحاظ سے ایران کے بہترین اساتذہ کے ہمسر تھے ۔

پروفیسر اس بحث سے خواب و خیال کی دنیا میں ہمیں لے جا رہے ہیں ، جس میں دلیل و حجت کو پس پشت ڈال کر ہر نا ممکن دعوے کو ممکن بنا دیا جاتا ہے ۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ شعر و شاعری افراسیاب کے زمانے سے ، جس کا ذکر آگے آتا ہے ، ایرانیوں کی قومی خصوصیت رہی ہے اور جس ملک میں وہ پہنچے ہیں ، اس کو اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے ۔ چنانچہ جب پنجاب میں آباد ہوئے اپنی قومی خصائص اپنے ساتھ لائے اور یہاں ایسی سازگار فضا پیدا کر دی کہ شعر و شاعری کی استعداد اہل پنجاب کی طبیعت کا جوہر خاص بن گئی ۔ چنانچہ غزنوی دور میں ، جب شعر و سخن کی آبیاری ہونے لگی ، اس کے ثمر نورس ابو الفرج رونی اور مسعود سعد سلمان ہوئے ۔

ہمارے بزرگ اپنی خوش اعتقادی سے ایسے قصوں میں یقین کر لیا کرتے تھے لیکن آج کل کی دنیا زیادہ چھان بین اور تجسس کرنے والی ہے ۔ جب تک کوئی بات تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ نہیں لی جاتی ، نہیں مانی جاتی ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایرانی مہاجر افراسیاب کے عہد میں آئے ۔ بہت اچھا ، مان لیا کہ افراسیاب ہی کے عہد میں آئے ، لیکن ہمیں افراسیاب کا زمانہ معلوم ہونا چاہیے ۔ شاہنامے کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ افراسیاب توران کا بادشاہ تھا اور کیانی سلاطین یعنی کیقباد ، کیکاؤس اور کیخسرو کے عہد میں گزرا ہے ۔ کیکاؤس کا فرزند سیاؤش افراسیاب کا داماد تھا ۔ اس شہزادے کے قتل کیے جانے پر ایرانیوں نے تورانیوں کے خلاف انتقامی جنگ شروع کر دی جو برسوں بلکہ صدیوں تک جاری رہی اور افراسیاب کے قتل پر ختم ہوئی ۔

شاہ نامے میں چار سلسلۂ سلاطین کا ذکر آتا ہے یعنی پیشدادی ، کیانی ، اشکانی اور ساسانی ۔ ان میں پہلے دو — پیشدادی اور کیانی — بالکل غیرتاریخی ہیں ۔ اس لیے افراسیاب کا زمانہ اساطیری یا داستانی زمانہ ہوا ۔ یہ مان کر کہ یہ زمانہ تاریخ سے قبل کا زمانہ ہے ، سوال کیا جا سکتا ہے ، کیا یہ ایرانی ہزاروں سال تک ہندوستان میں رہنے بسنے کے باوجود اپنی قدیم تہذیب اور تمدن پر قائم رہے ؟ اور ہندی اقوام سے کسی قسم کا تعلق یا سنگھٹن نہیں رکھا ؟ یہ امر ، ہم کہتے ہیں ، بہت دشوار ہے ۔ ہندوستان کی کروڑوں انسانوں کی آبادی میں یہ ایرانی مہاجر آئے

میں نمک کے برابر ہوں گے۔ جس طرح جزو کل میں جذب ہو جاتا ہے، اسی طرح چھوٹی قومیں بڑی قوموں میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ لہذا اس ایرانی جماعت کا ہندوستان کی قدیم آبادی میں گھل مل جانا لابدی ہے۔ اگر کسی بنا پر بچ رہی، زبان کا سوال پھر بھی قابل غور ہے۔ یہ لوگ کوئی ایسی زبان بولتے ہوں گے جو قدیم فارسی یا اوستا کی زبان سے ملتی جلتی ہو گی اور ہماری فارسی سے اسی قدر مختلف ہوگی جس قدر اوستا کی زبان اس سے مختلف ہے۔ اس صورت میں یہ لوگ ادبی مذاق کی شمع کیا روشن کرتے اور شعر و شاعری کی فضا کیا تیار کرتے، جس کے پروفیسر بڑے جوش کے ساتھ مدعی ہیں۔

ہم صوبۂ گجرات کی مثال پیش کرتے ہیں جہاں پارسیوں کی ایک جماعت عربوں کی فتحِ ایران کے بعد اس ملک سے ہجرت کر کے کھمبایت اور سورت وغیرہ میں آباد ہوگئی۔ ان کی آمد تاریخی زمانے میں ہوئی ہے۔ پارسی اپنی قومیت محفوظ رکھنے میں البتہ کامیاب ہیں۔ تاہم ایرانیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ تر ہندوستانی ہیں، حتیٰ کہ ان کی زبان بھی ہندوستانی ہے۔ اور امور سے قطع نظر ہم پوچھتے ہیں کہ انھوں نے گجرات میں فارسی اور اس کی شاعری کے واسطے کیا موافق ہوا پیدا کی اور ان کے اثر میں گجرات نے کتنے نامی شاعر پیدا کیے، جن کا نام ابوالفرج اور خواجہ مسعود کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔

اہل ہند میں فارسی زبان کے واسطے طبعی مناسبت کے اور اسباب ہیں۔ ایران اور ہندوستان کی اقوام آریائی ہیں جو ابتدا میں ایک ہی نسل تھیں۔ ایرانی زبانیں قدیم فارسی اور اوستائی وغیرہ، سنسکرت سے بہت قریب ہیں اور اس قدر قریب ہیں کہ اس کے آثار فارسی میں اب بھی موجود ہیں۔ سینکڑوں الفاظ ہیں جو فارسی اور سنسکرت میں مشترک ہیں، جن کو اہل لغت 'توافقِ لسانین' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں میں فارسی کی مہارت کے واسطے یہ قدرتی صلاحیت ان کے تمدن اور زبانوں کے قدیم اتحاد کی وجہ سے ہے، جس کا پرتو ان کے ذہنی اور عقلی قویٰ پر بھی کارفرما ہے۔ ہمارے نزدیک یہ توجیہ شمس العلما کے مذکورۂ بالا استدلال کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ اور قرینِ صحت ہے۔

صفحہ ۲۴۸: کہتے ہیں 'کئی تصانیف ابوالفرج کی یادگار ہیں لیکن جو آج باقی ہیں، ان میں ایک رسالہ عروض پر ہے اور ایک ضخیم دیوان ہے جو اس

نے اپنے مربی" سلطان ابراہیم کے نام پر معنون کیا ۔ یہ انتساب اس شعر سے شروع ہوتا ہے :

سپہرِ دولت و دین آفتابِ ہفت اقلیم
ابو المظفر شاہ مظفر ابراہیم

ان بیانوں میں سے میرا دل شمس العلما کے کسی بیان پر بھی مہر تصدیق لگانا نہیں چاہتا ۔ عروض کے ساتھ میری قدیم دل بستگی اور اس فن پر ایک بڑا ذخیرۂ کتب و رسائل جمع کرنے کے باوجود (اور اتنا ذخیرہ کسی کتب خانے میں موجود نہیں) میں شرم کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ابوالفرج کی عروضی تصنیف کا نام نہیں سنا ۔ افسوس ہے پروفیسر نے اس بیان کا کوئی حوالہ نہیں دیا جو ہمارے نزدیک غیر موثق ہے ۔

ابوالفرج کے دیوان کو ضخیم کہنا تصدیق طلب ہے ۔ اس کا ضخیم دیوان اگر کبھی تھا ، فی زمانہ مفقود ہے ۔ ابوالفرج سے پچاس ساٹھ سال بعد جب انوری کو اس کے دیوان کی تلاش ہوئی تو اس کو بھی اس کے دیوان کا ایک انتخاب کریم الدین سے دست یاب ہوا تھا :

گفت من دارم بلی از انتخاب شعر او
نسخہ" بس بی نظیر و شیوۂ بس بانظام

چنانچہ یہی انتخاب آج بھی رائج ہے ۔ اس کا حجم اتنا ہی ہوگا جتنا دیوان غالب اُردو کا ہے ۔

شعر انتسابی ، جو اوپر مذکور ہے ، موجودہ دیوان کے ابتدائی[1] قصیدے کا مطلع ہے ۔ یہ قصیدہ ابوالفرج نے سلطان ابراہیم کی مدح میں لکھا ہے ۔ اس کو انتسابی کہنا لفظ کا غلط استعمال کرنا ہے ۔

صفحہ ۲۴۹ : کہتے ہیں کہ 'ابراہیم کی وفات سے بیس سال بعد معز الدین بہرام شاہ نے سلطان سنجر سلجوقی کی امداد سے سنہ ۵۱۱ھ میں تخت سلطنت اپنے عم زاد ملک ارسلان سے چھین لیا[1] ۔'

---

۱ ۔ دیوان ابوالفرج رونی ، اشاعت پروفیسر چایکین میں ، جو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے ، اس قصیدے کا نمبر ۵۹ اور صفحہ ۸۶ ہے ۔
(مرتب)

لین پول نے بہرام کی تاج پوشی کی تاریخ سنہ ۵۱۲ھ دی ہے ۔ (ملک) ارسلان بہرام کا عم زاد نہیں بلکہ بھائی ہے ۔ علاء الدین مسعود (سنہ ۴۹۲—۵۰۹ھ) کے تین فرزندوں کا ذکر آتا ہے ۔ پہلا شیرزاد ، دوسرا ملک ارسلان (سنہ ۵۰۹ — ۵۱۲ھ) تیسرا بہرام ، جو ارسلان سے ملک لے کر سنہ ۵۱۲ھ میں تختِ سلطنت پر جلوس کرتا ہے ۔ یہ روایت ، کہ بہرام اور ارسلان چچا زاد تھے ، غلط معلوم ہوتی ہے ۔

صفحہ ۲۵۳ : سید حسن غزنوی کے متعلق کہا ہے کہ جب بہرام شاہ پر ان کی ہردلعزیزی اور قبولِ عام ناگوار گزری تو سید حسن مکے چلے گئے اور بارگاہ رسالت میں ایک قصیدہ لکھا ۔ اس کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ سلطان ابراہیم کی مدح میں لکھ کر روانہ کیا ۔ اس قصیدے کے تین شعر نقل کیے ہیں ۔ ہم حیران ہیں کہ بہرام (سنہ ۵۱۲ — ۵۴۷ھ) کے عہد میں سلطان ابراہیم کدھر آن گھسا ۔ اس کا زمانہ سنہ ۴۵۱ھ و ۴۹۲ھ ہے ۔ قصیدے میں ممدوح کا نام بہرام موجود ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ پروفیسر کی عبارت میں بہرام کی جگہ ابراہیم کا نام غلطی سے نقل ہوگیا ۔

صفحہ ۲۶۲ : سنائی کی بعض تالیفات سیرالعباد (Siyarul-Ibad) رموز الاصفیہ ، طریقت نامہ و بہرام نامے کے نام گنا کر کہا ہے کہ ان کے نام قدیم کتابوں میں ملتے ہیں اور ان کی تالیف سنائی کی طرف منسوب ہے ۔ لیکن اب ان کی سراغ رسی نہیں ہو سکتی ۔

سنائی کی اکثر تالیفات مثنویاں ہیں اور اب بھی موجود ہیں ۔ میرے مجموعہٴ کتب میں ، جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے ، سنائی کی ذیل کی تالیفات ایک ہی جلد میں منسلک ہیں ۔

(۱) حدیقہ ۔ (۲) سیر العباد (صحیح بہ تحریک سین و سکون یا و را) ۔ یہ مثنوی ایران میں چھپ بھی گئی ہے ۔ (۳) طریق التحقیق ۔ (۴) بہرام و بہروز ۔

صفحہ ۲۶۰ : شعر :

هفته ها باید که تا یک پنبه دانه ز آب و گل
شاهدی را حله گردد یا حماری را رسن

اس شعر میں 'هفته ها' کا درست املا 'هفتها' اور 'ز آب و گل' کا 'زاب و

گل' ہے۔ دوسرے مصرع میں 'حاری را رسن' کے بجائے صحیح قراءت 'شہیدی را کفن' ہے۔

صفحہ ۲۶۱ : سنائی کے 'ہندی اشعار' کے نمونے میں یہ شعر دیے ہیں :

لنگھنت گر ترا کند فربہ
سیر خوردن ترا ز لنگھن بہ

(دیگر)

نہ دران معدہ خدرۂ میدہ
نہ دران دیدہ قطرۂ پانی

ان شعروں میں صرف دو لفظ 'لنگھن' اور 'پانی' ہندی ہیں لیکن نظر فریب بنانے کے واسطے 'ہندی اشعار' عنوان رکھا ہے جو گمراہ کن ہے۔

صفحہ ۲۶۳ : کہتے ہیں 'ہندوستان کا پہلا غوری بادشاہ معز الدین محمد بن سام الملقب بہ شہاب الدین' ہے۔

اس سلطان کا نام محمد ہے، معز الدین لقب ہے جو تخت نشینی کے وقت اس نے اختیار کیا۔ قدیم اور معتبر تاریخوں میں، نیز اس کے کتبوں اور سکّوں پر 'معز الدین محمد' پورا نام ملتا ہے۔ پروفیسر اس کو جداگانہ لقب شہاب الدین عنایت کرتے ہیں جو درست نہیں۔ شہاب الدین شہزادگی کے ایام میں اس کا نام تھا جو جلوس کے وقت ترک کر دیا گیا۔

صفحہ ۲۶۳ : معزالدین کے عہد کے ایک شاعر اور اہل قلم کا نام 'شہاب الدین عرف محمد رشید' دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ نام شہاب الدین محمد (بن) رشید ہونا چاہیے۔ کیونکہ محمد کی ترکیب سے ناموں کا رواج ان ایام میں نہ تھا ؛ مثلاً محمد اکبر، محمد ہمایوں، محمد جہانگیر وغیرہ کی ترکیب بابر کے عہد سے رائج ہوئی ہے۔

اس شاعر کو مسعود سعد سلمان کا شاگرد بتایا ہے، لیکن مسعود کے شاگرد اور معزالدین کے مدّاح کی عمر سو سال کی یا اس سے زیادہ ہونی چاہیے۔

صفحہ ۲۶۴ پر 'تاریخ آل غزنیں' سے جو اقتباس دیا ہے، اس کے الفاظ ہیں : ''و بیک واسطہ شاگرد مسعود سعد سلمان بودہ۔'' جس سے ظاہر ہے کہ شہاب الدین خواجہ مسعود کے شاگرد کا شاگرد ہے۔ پروفیسر کا ترجمہ بھی اس

مؤقع پر اصلاح طلب ہے جو یہ ہے :

"And in a way a Pupil of Mas'ud sa'd slaman."

بیک واسطہ سے مراد ہے کہ شہاب الدین اور خواجہ مسعود کے درمیان ایک اور شخص ، جو خواجہ کا شاگرد اور شہاب الدین کا استاد ہے ، دخیل ہے۔

شمس العلما نے مذکورۂ بالا شاعر کے نام کے ساتھ ، جس کا تخلص شہاب ہے ، بے پروائی سے کام لیا ہے۔ عنوان میں اس کو رشید شہاب لکھا ہے ، جس سے گمان گزرتا ہے کہ نام رشید ہے اور ولدیت شہاب ہے ، حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ 'تاریخ آل غزنیں' کے اقتباس میں اس کو امیر شہاب الدین علی لکھا ہے (صفحہ ۲٦۴)۔ لطف علی بیگ آذر کے اقتباس میں 'شہاب الدین و محمد رشید' ہے[1]۔ خود پروفیسر نے جو نام اختیار کیا وہ شہاب الدین عرف محمد رشید ہے۔ اس عہد میں چونکہ ولدیت کا لانا ضروری سمجھا جاتا ہے اس لیے اکثر موقعوں پر بجائے ابن لکھنے کے اضافتِ ابنی سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً محمدِ رشید سے مقصد محمد ابن رشید لیا جائے گا۔ لیکن شمس العلما اس اضافت کے استعمال سے گریز کرتے ہیں ، اس لیے ان کے قارئین کو اکثر موقعوں پر ان اسما کے متعلق دھوکا رہے گا کہ آیا وہ مرکب ہے یا مفرد۔ لیکن محمد عوفی نے اس کا نام شہاب‌الدین علی ابی رجا الغزنوی دیا ہے[2] ، جس سے ثابت ہے اس کا نام علی ہے نہ محمد۔ تعجب ہے کہ پروفیسر نے اس قدیم اور معتبر حوالے کو صرفِ نظر کر کے ایک متاخر اور غیر معتبر راوی کے بیان پر مہر تصدیق لگائی۔

اکثر تذکرہ نگار ، جن میں عوفی بھی شامل ہے ، علی کو بہرام شاہ (سنہ ۵۱۲ — ۵۴۷ھ) کے عہد کا شاعر مانتے ہیں۔ شمس العلما نے جو قصیدہ اور قطعے نقل کیے ہیں ، وہ بھی بہرام شاہ کی شان میں ہیں۔ تاہم وہ اس شاعر کو معزالدین محمد بن سام کے شعرا میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے پاس تاریخ آل غزنیں کی جو سند

۱- معلوم ہوتا ہے پروفیسر صاحب نے 'آتشکدہ' کے جس نسخے سے یہ اقتباس لیا ، وہ ناقص تھا ورنہ 'آتشکدہ' طبع ایران سنہ ۱۳۳۷ - ۳۸ شمسی ، بخش دوم کے صفحہ ۵۷۲ پر صاف مرقوم ہے : "شہاب الدین : وہو محمد بن رشید۔" (مرتّب)

۲- لباب الالباب ، حصّہ دوم ، صفحہ ۲۷٦ ، مرتّبہ پروفیسر برون۔ (مرتّب)

ہے ، وہ بھی اس موضوعِ خاص پر خاموش ہے ۔ چنانچہ اس تاریخ کی اصل عبارت ہے ۔

''و ہم دران زمان امیر شہاب الدین علی کہ شہاب تخلص کرد و بسیار نغز گوی و بیک واسطہ شاگردِ مسعود سعد مسلمان بودہ ، بدارالخلافت مراجعت نمود ۔''

اس عبارت سے اسی قدر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دارالخلافہ میں آیا ، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ سلطان معزالدین محمد بن سام کے دربار کا شاعر اور مداح ہے ۔ لطف یہ ہے کہ خود پروفیسر بھی اس امر کا اظہار نہیں کرتے ۔ پھر معلوم نہیں کہ اس کا نام معزالدین محمد بن سام کے عہد میں کیوں داخل کیا گیا ۔ شہاب الدین علی ابورجا یقیناً غزنویوں کا مداح ہے ۔ اس نے بہرام شاہ اور خسرو شاہ (سنہ ۵۴۷ - ۵۵۵ھ) کی مدح میں قصائد لکھے ہیں اور ضرور ہے کہ خسرو ملک (۵۵۵ - ۵۸۲ھ) کی بھی مدح سرائی کی ہو ۔ قصہ مختصر ایک شاعر جو تین پشت تک غزنویوں کا مداح رہا ہو ، اس کو معزالدین کے دور میں داخل کرنا یقیناً حیرت انگیز ہے ۔ شہاب اپنی عمر کے آخری سنین میں غزنیں پہنچا ہے ۔ یہ واقعہ سنہ ۵۸۲ھ کے بعد ہونا چاہیے جب لاہور پر معزالدین کا قبضہ ہو جاتا ہے ۔ اس شاعر کا سال وفات ۵۸۶ھ ہے اور بقول تذکرۂ روز روشن[1] ۵۹۸ھ ہے ۔

صفحہ ۲۶۸ : ع 'آمد آن رگ زن مسیح پرست ، الخ ۔

اس قطعے کو پروفیسر نے ناتمام صورت میں نقل کیا ہے ۔ کل چار شعر دیے ہیں ۔ اس میں پانچ شعر اور ہیں جو میں 'تنقید شعر العجم[2]' میں درج کر چکا ہوں ۔ (صفحہ ۵۳۱ ، رسالہٗ اردو ، اورنگ آباد ، اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ع) ۔

صفحہ ۲۶۸ : شہاب الدین کی رباعی کی مثال میں پروفیسر نے یہ دو بیت دیے ہیں :

شاخکی چند نرگس رعنا
گلکی چند تازہ و چیدہ

۱۔ تذکرۂ روز روشن ، صفحہ ۳۴۴ ، طبع طہران ، سنہ ۱۳۴۳ شمسی ۔ (مرتّب)
۲۔ ملاحظہ ہو 'مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد پنجم ، صفحہ ۹۱ ۔ (مرتّب)

آن همہ دیدهای بی چهره
وین همہ چهره های بی دیده

یہ ابیات رباعی کے وزن میں نہیں ہیں بلکہ بحر خفیف میں ہیں ۔ ان کو رباعی نہیں کہا جا سکتا ۔

صفحہ ۲۷۰ : کہتے ہیں معزالدین کے عہد میں فارسی ادب کی ترق کے حق میں ایک اہم محرّک ، خراسان سے اس کے لشکروں کے ساتھ ادیبوں کی آمد تھی ۔ اس لشکر سے اس نے لاہور کی بغاوت فرو کی ، جو اس کے قیامِ غزنہ کے زمانے میں وقوع پذیر ہوئی تھی ، جہاں اس کو اپنے بھائی غیاث الدین کی وفات کی وجہ سے بڑی عجلت میں جانا پڑا تھا ۔ ایرانی ادیبوں کی یہ ہجرت ہندستان اور ایران کے مابین تمدنی سنگھم قائم کرنے میں درمیان کی کڑی ثابت ہوئی ۔

ہندستان میں موقع بہ موقع وقتاً فوقتاً ایرانی ادیبوں اور شاعروں کی آمد یا ہجرت کا ذکر پروفیسر کی تالیف کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ لیکن ان ہجرتوں کی تفصیل یا ان کے اثرات واضح طور پر کبھی نہیں دکھائے ۔ چنانچہ یہاں بھی وہی سلوک ہوا ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اطلاعیں تاریخی نہیں ہیں بلکہ مفروضہ ہیں ۔

پروفیسر نے جو بعض جزئی تفصیل معزالدین کے قیام و سفر کے سلسلے میں دی ہے ، اس سے ان کے قاری غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ لاہور اس کا دارالحکومت ہوگا ۔ وہاں سے جب غزنی تک گیا ، لاہور میں بغاوت پھیل گئی ۔ حالانکہ غزنیں اس کا مستقل تخت گاہ تھا اور لاہور ضرورۃً آتا تھا ۔

صفحہ ۲۷۰ : کہتے ہیں 'امام فخرالدین ، جو سلطان معزالدین کے ساتھ سفر و حضر میں رہتے ، ہفتہ واری وعظ کیا کرتے تھے ۔ ان وعظوں کا اثر بڑا دور رس ثابت ہوا ۔ ان سے لوگوں کے ادبی مذاق میں انقلابِ عظیم آ گیا اور تعلیم یافتہ اور شاعر طبع جماعت نے فارسی نویسی اختیار کر لی' ۔

یہ بھی فارسی تحریک کے حق میں نرالی وضع کا وجہِ ثبوت ہے ۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ امام صاحب پند و نصیحت ، تعلیمِ اخلاق ، تحریکِ صوم و صلٰوۃ ، گناہ سے پرہیز کرانے ، نیکیوں کی ترغیب دلانے ، عذابِ آخرت سے ڈرانے اور گم راہوں کو راہِ راست پر لانے کے بجائے اپنی مجالسِ وعظ میں شعر و سخن کا دفتر کھولتے ؟ ادب کے غوامض و نکات بتاتے ؟ شعر کے حسن و قبح پر بحث کرتے

اور اساتذہ کے کلام پر رائے زنی کرتے تھے ؟

صفحہ ۲۷۱ : کہتے ہیں : 'ایک دن امام رازی نے اثنائے وعظ میں ابیاتِ ذیل صریحاً سلطان کو خطاب کر کے پڑھے ۔ ان کا مطلب تھا کہ دنیا فانی ہے اور اس کو سب کے ساتھ حتیٰ کہ دشمنوں کے ساتھ بھی آشتی سے رہنا چاہیے :

اگر دشمن نسازد با تو ای دوست
ترا باید کہ با دشمن بسازی
وگرنہ چند روزی صبر فرما
نہ او ماند ، نہ تو ، نہ فخر رازی

یہ قصہ پروفیسر نے منتخب التواریخ سے لیا ہے جس کا حوالہ بھی دے دیا ہے ، مگر بدایونی کا مطلب پروفیسر صاحب کے بیان سے واضح نہیں ہوتا ۔ وہ کہتا ہے امام صاحب معز الدین کے بھائی سلطان غیاث الدین محمد بن سام کے پاس تھے ۔ اس کے نام پر 'لطائفِ غیاثی' و دیگر کتب انہوں نے تصنیف کیں ۔ جب امام ممدوح معز الدین کے پاس آ گئے ، ہر ہفتے وعظ کرتے ۔ خود سلطان موصوف ان مجالس میں حاضر ہوتا اور رقت کرتا ۔ لیکن امام صاحب اس نقل و حرکت اور دائمی حاضر باشی سے سخت ملول تھے ۔ ایک روز منبر پر سے آپ نے سلطان کو خطاب کیا اور کہا : 'اے سلطان معز الدین ! کچھ وقت کے بعد نہ تیرا یہ جلال اور کروفر رہے گا اور نہ رازی کا نفاق اور خوشامد باقی رہے گی ، اور وہی قطعہ پڑھا جو اوپر درج ہے ۔ جب سلطان کے قتل کا حادثہ پیش آیا ، بعض فتنہ پردازوں نے سلطان کے قاتل فدائیوں کے ساتھ امام صاحب کی شرکت کا باندھنو باندھا اور ظاہر کیا کہ امام ان کے ارادے سے واقف تھے ۔ اس بیان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ امام رازی سلطان سے ناخوش تھے اور مجبوراً ساتھ رہتے تھے ، تنگ آمد بہ جنگ آمد ، دل کی بات ذرا پردہ رکھ کر کہہ گزرے ۔

صفحہ ۲۷۳ - ۷۴ : شیخ معین الدین کے تذکرے میں شیخ علی بن عثمان الهجویری کے ساتھ ہمارا تعارف کرایا گیا ہے کہ 'سنہ ۴۳۳ھ میں لاہور تشریف لائے اور سنہ ۴۵۵ھ میں انتقال فرمایا ۔ پھر خواجہ معین الدین کے ساتھ ان کا مقابلہ کرکے خواجہ کی برتری ثابت کی ہے ۔ ابوالحسن کی کشف المحجوب ، جو انہوں نے لاہور میں تالیف کی ، خاص خاص سوالات کا مجموعہ جوابات ہے جو ان کے دوست اور رفیقِ طریقت ابو سعید الهجویری نے وقتاً فوقتاً کیے تھے ۔ یہ

سوالات اس قسم کے تھے کہ صوفی کون ہے ؟ عالم کون ہے ؟ دنیا میں ان کی ہستی کی کیا ضرورت ہے ؟ ابوالحسن نے جواب میں صوفی کی تعریف نہایت وسیع مفہوم میں کی اور علم و عالم کی شرح قرآن شریف کی توضیح کے مطابق کی' ۔

معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر ، داتا گنج بخش اور ان کے علمی و ادبی مشاغل کا ذکر غزنویوں کے عہد میں لانا بھول گئے ۔ اس فروگذاشت کی تلافی یہاں بطور سجدۂ سہو ایک مختصر حاشیے کی شکل میں کی گئی ہے ۔ یہ حاشیہ نہ مخدوم کے کمالات کا مظہر ہے ، نہ ان کی ادبی قابلیت کا ۔

مخدوم بڑے سیّاح ہیں ۔ انھوں نے شام ، عراق ، بغداد ، پارس ، قہستان و آذربائیجان ، طبرستان ، خوزستان ، کرمان ، خراسان و ماوراءالنہر تا اقصاے ترکستان (سرحد اسلام) اور ہندستان کی سیر و سیاحت کی ہے ۔ ہر جگہ صوفی مشاہیر سے ملے اور ان سے فیض حاصل کیا ۔ وہ ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی کے مرید ہیں ۔ ابو العباس احمد بن محمد الاشقانی بعض علوم میں ان کے استاد ہیں ۔ ابو جعفر محمد بن المصباح الصیدلانی کی بعض تصنیفات خود ان سے پڑھی ہیں ۔ ابوالقاسم قشیری ، ابوالقاسم گرگانی اور ابو سعید ابوالخیر و دیگر مشائخ کے ساتھ ہم صحبت رہے ۔ لکھتے ہیں کہ صرف خراسان میں تین سو مشائخ سے ملا ہوں ۔

متعدد تصنیفات کے مالک ہیں ، مثلاً (۱) منہاج الدین ۔ یہ کتاب ایک شخص مانگ کر لے گیا اور اپنی طرف منسوب کر لی ، اگرچہ کامیاب نہ ہو سکا ۔ (۲) البیان لاهل العیان (۳) اسرار الخرق والموئینات (۴) کشف الاسرار (۵) الرعایت لحقوق اللہ (٦) بحر القلوب (۷) حسین بن منصور حلاج پر بھی کوئی تصنیف تیار کی تھی ۔ ایک زمانے میں حسین کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور اس کی تصنیفات کے پچاس رسالے بغداد ، خوزستان ، فارس و خراسان میں پڑھے تھے ۔ (۸) دیوان اشعار ، کوئی شخص مستعار لے گیا اور واپس کرنے کے بجائے غاصبانہ قبضہ کر لیا اور ان کا تخلص نکال کر اپنا تخلص ڈال دیا ۔ (۹) کشف المحجوب ان کی تصنیفات میں سب سے زیادہ مشہور ہے جو اپنے زمانۂ تصنیف سے لے کر اب تک مقبول رہی ہے ۔ صوفی حلقوں میں قبولیت کے علاوہ اس کو قدامت کی حیثیت بھی حاصل ہے ۔ پانچویں صدی کے ربع دوم سے تعلق رکھتی ہے اور غزنوی دور کی ان چند تالیفات سے ہے جو دست بردِ زمانہ سے اتفاقیہ محفوظ رہ گئیں ۔ اس کے

ذریعے سے ہم اس عہد میں تصوف کی نشو و نما و ارتقا کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ کشف المحجوب صوفی اور صوفیانہ زندگی ، طریق تصوف ، مصطلحات تصوف ، مقامات صوفیہ ، ان کے مذاہب اور مقالات و رموز و اشارات پر ایک جامع کتاب ہے ۔ صوفی برادری کے ممتاز فرقوں ، سلسلے کے بزرگوں اور مصنف کے معاصر صوفیوں کے حالات پر شامل ہے ۔ تاریخ تصنیف ۴۳۱ھ بتائی جاتی ہے ۔ شمس العلما کا یہ دعویٰ کہ لاہور میں تصنیف ہوئی ، ہماری رائے میں درست نہیں کیونکہ حضرت مصنف خود اثنائے تصنیف میں ہندستان کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ ہندستان کے باہر لکھ رہے ہیں ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

''و اندر هندستان مردی دیدم که مدعی بود به تفسیر و تذکیر و علم
با من اندرین معنی مناظره کرد ۔'' (صفحہ ۱۹۲)

ایک دوسرے مقام پر یہ عبارت ملتی ہے :

''و در هندستان دیدم که اندر زهر قاتل کرمی پدید آمده بود و زندگی وی
بدان زهر بود ۔'' (صفحہ ۳۲۰)

کشف المحجوب سوال و جواب کی شکل میں مرتب نہیں ہوئی اور بعد کے تذکروں تذکرۂ عطار و نفحات الانس وغیرہ کا ایک نہایت ضروری ماخذ ہے ۔ اس کی فنی و ادبی حیثیت کی بنا پر پنجاب یونیورسٹی نے فارسی کے اعلیٰ امتحان کے نصاب میں شامل کر لیا ہے ۔

مخدوم علی بن عثمان ہجویری اور خواجہ معین الدین چشتی کی فضیلت کا مقابلہ ہمارے خیال میں غیر سنجیدہ اور ناموزوں : ع

طالع شہرت رسوائی مجنون بیش است

سے ہمیں انکار نہیں لیکن خواجہ صاحب نے تو خود مخدوم کے مزار پر آ کر چلہ کشی کی ہے اور رخصت کے وقت اپنا یہ شعر نذر عقیدت کیا ہے :

گنج بخش هر دو عالم مظهر نور خدا
کاملان را پیر کامل ناقصان را رهنما

مخدوم کی وفات باصح اقوال سنہ ۴۶۵ھ میں ہوئی ، نہ سنہ ۴۵۵ھ میں ۔ سلطان ابراہیم سنہ ۴۷۲ھ میں جب واردِ لاہور ہوتا ہے ، آپ کے مقبرے کی تعمیر کا حکم دیتا ہے ۔ مسعود ثالث اپنے عہد میں آپ کے روضے کی زیارت کو آتا ہے ۔

مزار آج بھی مرجعِ خلائق ہے ، باقاعدہ عرس ہوتا ہے ۔ مختصر یہ کہ داتا صاحب آج بھی پنجاب کے سب سے بڑے ولی مانے جاتے ہیں ۔

صفحہ ۲۷۳ : 'خواجہ معین الدین چشتی سنجری اصفہانی' کہتے ہیں کہ 'خواجہ صاحب پہلے صوفی ہیں جو بالائی ہندستان میں آ کر تصوف کا چراغ روشن کرتے ہیں ۔'

بعض ضعیف روایتوں میں انھیں اصفہانی لکھا گیا ہے ۔ ان کو سنجری (بہ فتح سین و سکون نون و فتح جیم و تحریک را و سکون یا) کہنا بر بنائے عدمِ تحقیق ہے ۔ ان کی صحیح نسبت سجزی (بہ حرکت سین و سکون جیم و کسرۂ زائے معجمہ و سکون یا) ہے ۔ چونکہ سجستان کے رہنے والے ہیں اس لیے سجزی کہلائے ۔ 'آئین اکبری[1]' میں ابوالفضل کے تقریباً یہ الفاظ ہیں : ''خواجہ معین‌الدین از سیستان است بنابرین او را سجزی می نویسند کہ معرب سکزی است ۔'' فرشتہ کا بیان ہے : ''تولد او در بلدۂ سجستان بودہ'' (صفحہ ۳۷۵ ، نول کشور) ۔

ابوالفضل اور فرشتہ سے قدیم تر حوالہ عصامی کی 'فتوح السلاطین' میں آتا ہے جو سنہ ۷۵۰ھ کی تالیف ہے ، چنانچہ :

معین الدین آن سجزی دین پناہ
کہ خفتہ است باجمیر آن مرد راہ

چو او را زیارت شہنشاہ کرد
و زانجا سوی تخت گہ راہ کرد

(صفحہ ۴۴۷)

۱۔ آئین اکبری ، جلد سوم ، مرتبہ سرسید ، طبع ۱۲۷۳ ہجری ۔ احوال ہندوستان ، صفحہ ۲۰۷ پر ابوالفضل کا بیان ہے :

''خواجہ معین الدین چشتی ، پور غیاث الدین حسن از سادات حسنی حسینی است ۔ در سال پانصد و سی ہفت در قصبہ سجز از دار سجستان بزاد . . . ''

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے شائع کردہ کرنل جیرٹ کے انگریزی ترجمہ آئین میں یہ فقرہ یوں ہے :

. . . and was born in A.H. 537 (A.D. 1142) in the village of sijz, of the province of Sijistan'' (p. 361, Vol. III).

صفحہ ۲۷۶ : ترکوں کے قبیلے کا نام 'غز بہ ضم اول ہے نہ بہ فتح اول جیسا کہ پروفیسر نے لکھا ہے ۔ یہ قبیلہ تاتاری نہیں ہے بلکہ ترک ہے ۔

(حاشیہ) اکاف بہ تشدیدکاف ہے نہ بہ تخفیف تشدید ۔ اندلسی ("Undulusi") یہ نسبت 'تقویم البلدان' میں بہ فتح اول و سوم ہے ۔

صفحہ ۲۷۴ : کہتے ہیں کہ خواجہ کے بزرگ سیستان میں رہتے تھے ۔ آپ کی ولادت اصفہان (سنہ ۵۳۷ھ) میں واقع ہوئی اور نشو و نما خراسان میں پائی ۔

لیکن صفحہ ۲۷۵ پر کہتے ہیں : 'خواجہ کے والد غیاث الدین کی موروثی املاک سیستان میں تھی مگر خواجہ کی ولادت سے دو سال بعد ظالم تاتاری غزوں کے حملوں سے تنگ آکر ، جو وقتاً وقتاً سیستان پر ہوا کرتے تھے ، نقل مکان کر کے خراسان چلے گئے اور نواح نیشاپور میں آباد ہو گئے اور وہیں سنہ ۵۵۱ھ میں فوت ہوئے ۔ اس وقت خواجہ کی عمر ۱۴ سال کی تھی ۔

یہ مان کر کہ خواجہ سنہ ۵۳۷ھ میں پیدا ہوئے ، دو سال بعد یعنی ۵۳۹ھ میں ان کے والد سیستان پر غزوں کے حملوں کی وجہ سے ہجرت کر کے نیشاپور کے نواح میں آباد ہو گئے ۔ یہ بیان وہی شخص دے سکتا ہے جو تاریخ سے ناواقف ہو ۔ غزوں سے بچنے کی پناہ ڈھونڈی بھی تو کہاں ، نیشاپور میں ، جو غزوں کا خاص اڈا تھا ۔ لیکن اس وقت غز آئے کہاں سے ؟ وہ تو اس تاریخ سے دس سال بعد نمودار ہوتے ہیں ، جب سنہ ۵۴۹ھ میں سلطان سنجر کو شکست دے کر خراسان پر اپنا قبضہ کرتے ہیں ۔ سیستان میں تو ان کی تاخت پہلی مرتبہ سنہ ۵۶۴ھ میں ہوتی ہے (تاریخ سیستان ، صفحہ ۳۹۱) ۔

صفحہ ۲۸۱ : 'خواجہ صاحب دس محرم سنہ ۵۶۱ھ کو اپنے چالیس مریدوں کے ساتھ اجمیر پہنچے ۔ یہ رائے پتھورا کا زمانہ تھا' ۔

خواجہ کے سلسلے میں ان کی تاریخ وفات کے سوا تمام تاریخیں قیاسی معلوم ہوتی ہیں ۔ یہاں تو تاریخ اور مہینہ تک دے دیا ہے ۔ ہمارے خیال میں یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تاریخ غلط ہے ، یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ وہ پرتھی راج کی گدی نشینی سے قبل وارد اجمیر ہوئے کیونکہ سنہ ۵۶۱ھ تک پرتھی راج گدی پر نہیں آیا تھا ۔ یہ تاریخ خواجہ کی آمد اجمیر سے بہت پہلے کی معلوم ہوتی ہے ۔ پرتھی راج کے قصے کا ادخال خواجہ کے حالات میں اکبری عہد کے بعد ہوا ہے ۔

صفحہ ۲۸۲ : 'آنا ساگر' ۔ صحیح تلفظ بہ فتح الف 'آنا ساگر' ہے ۔

صفحہ ۲۸۴ : اس صفحے میں عصامی اور اس کی مثنوی 'فتوح السلاطین' کا ، جس کو ڈاکٹر آغا مہدی حسین پروفیسر آگرہ کالج نے مرتب کیا ہے ، تذکرہ لایا جاتا ہے ۔ یہ پروفیسر کی فروگذاشت کی نہیں بلکہ ان کے اضطرار کی مثال ہے ۔ بھلا خواجہ معین الدین کے حالات میں 'فتوح السلاطین' کے تعارف کا کیا موقع ہے؟ اگر پروفیسر عصامی کے وہ اشعار درج کرتے جو خواجہ کے متعلق ہیں تو بھی ایک بات ہوتی مگر انہوں نے یہ بھی نہ کیا ۔ عصامی کا ذکر ان کو محمد تغلق کے عہد میں حسب قاعدہ لانا چاہیے تھا ۔

صفحہ ۲۹۱ : خواجہ معین الدین کے تفصیلی حالات کے بعد ، جن میں خوش اعتقادی کی حد تک صوفی روایات کی تقلید کی ہے ، شمس العلما ، خواجہ صاحب کے دیوان سے مختلف نمونے مع ترجمہ دیتے ہیں ۔ ان میں بعض موقعے صاف نہیں ہیں ۔ چند مثالیں یہاں دی جاتی ہیں :

بیا و ہر دو جہان را بششدرو اندر نہ
درین قمار بیک داد ہرچہ ہست ترا

دوسرے مصرعے میں 'داد' کی جگہ 'داو' چاہیے ۔ پہلے مصرع کا ترجمہ کیا ہے :

Come out put both the worlds with in the six gate,

'ششدر' یہاں کنایۃً عجز و حیرانی کے معنوں میں ہے ، نہ اس کے لغوی معنوں میں :

تو باز شاہی و از دست شاہ پریدی
بغیر شاہ مکن میل و سوی شہ باز آ

مصرع دوم کا ترجمہ ہے :

"Do not intend to fly in any other direction without the Kings assent, come back to the King.

'بغیر شاہ مکن میل' کا ترجمہ 'شاہ کے سوا کسی اور کی طرف رغبت نہ کر' مناسب ہے ۔

صفحہ ۲۹۸ :

مگو کہ کثرت اشیا نقیض وحدت تست
تو در حقیقت اشیا نظر فکن ہمہ اوست

یہ شعر ترجمے سے چھوٹ گیا ہے ۔

صفحہ ۳۰۰ :

ز بحر عشق یک قطرہ ظہور سر منصوریست
بطرف ہمت عاشق ازین کم‌تر نمی‌گنجد

'بظرف' کی جگہ 'بطرف' چھپا ہے اور مصرع کا ترجمہ بھی محل نظر ہے ۔

"Less than this is not possible for a laver's spirit."

صفحہ ۳۰۴ :

واقف آنست کہ دل واقف اسرار شود
مرد آنست کہ جان طالب دیدار شود

پہلے مصرع میں 'واقف' کی جگہ 'وقت' اور دوسرے مصرع میں 'مرد' کی جگہ 'جای' صحیح ہے ۔

صفحہ ۳۰۲ :

چہ رشکہاست کہ از یاد می‌برم ہر شب
کہ روی او ز چہ بر روی دوست می آید

اور مصرع اول کا ترجمہ :

"How jealous am I of my power of remembrance every night."

مصرع اول میں 'یاد' کی جگہ 'باد' صحیح ہے یعنی باد صبا ۔

صفحہ ۳۰۵ :

یعنی آن لطف و عنایت کہ خداوند مراست
چہ عجب باشد اگر بندہ گنہکار شود

پہلے مصرع میں 'آن' کے بجاے 'زان' بہتر قرأت ہے ۔

صفحہ ۳۱۸ :

سر غم عشقش را با خلق معین کم گوی
احوال سلاطین را با کس نتوان گفتن

دوسرے مصرع میں 'احوال' کی جگہ 'اسرار' زیادہ مناسب ہے۔

صفحہ ۳۲۵ : خواجہ صاحب کی غزلیات پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے عہد کے سب سے بلند مرتبہ شاعر تھے۔ ان کا انداز رنگین اور واضح ہے اورکلام ، جو دقیق خیالات کا مخزن ہے ، خوبصورتی سے مرتب اور تاثیر کے ساتھ ادا ہوا ہے۔ ان کے اشعار میں ، جو عشقِ حقیقی سے سرشار ہیں ، ہمیشہ پارسایانہ متانت اور انبساط موج زن ہے۔ صوفی شعرا میں سے ان کا کلام خواجہ حافظ کے کلام کے ساتھ بہت قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ مگر ان کے ہاں بادہ و مے خانہ اور ساقی و شاہد پہلی ہی نگاہ میں روحانی معلوم ہوتے ہیں۔ برخلاف حافظ کے جن کے گل و مل اور بلبل و گیسوے دلبر ان کو اپنے زمانے کے سر برآوردہ لا مذہب اور رند کی حیثیت سے عوام کی تضحیک و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔ خواجہ معین الدین کے ہاں یہ الفاظ مادی مفہوم میں ہرگز ہرگز نہیں آئے بلکہ حقیقت کے حامل ہیں۔ خدا اور عشقِ خدا ان کے مشارٌالیہ ہیں۔ نوجوان عشاق حافظ کے کلام سے لازمی طور پر تسکین پاتے ہیں کیونکہ یہ اشعار ان کے جذبات اور خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے جو حافظ اس قدر جاذب قلوب اور مقبول عام ہیں۔

شمس العلما نے اس کے بعد حافظ کی شاعری کے دو پہلو—حقیقت اور مجاز—پر بحث چھیڑی ہے لیکن ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ حافظ کی موہومہ و مفروضہ معشوقہ شاخ نبات اور اس کے واسطے حافظ کے عشق کو نہیں بھولے ہیں ، لیکن اس ذکر و اذکار سے میں اپنے اصل مقصد سے دور ہٹ گیا ہوں۔

پروفیسر کا خلاصۂ بحث یہ ہے کہ حافظ ابتدا میں ایک بے قید اور آزادانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ آخر عمر میں انھوں نے تصوف کا کوچہ اختیار کر لیا۔

ادھر خواجہ معین الدین کی زندگی اور ان کی شخصیت ہر قسم کے شبہے سے بری ہے۔ وہ شروع سے آخر تک صوفیٔ صاف باطن رہے۔ ان کی ابتدائی زندگی اور اس کے مشاغل پاک اور معصومانہ ہیں۔ ان کے نغمے مجازی عشق کی لے میں نہیں جو کرب اور کڑھن ، اذیت اور ہیجان کا مورث ہے ، بلکہ ان کی طبیعت عشق حقیقی کے واسطے وقف ہے جو ارفع و اعلیٰ اور خالص ہے اور زندگی کے حقیقی اسرار اور ہمارے مقصد حیات کو وا شگاف کرتی ہے۔ وہ اپنے ناظرین کو وجدانیات کی فضا میں لے جاتے ہیں اور عالم روحانیات کی سیر کراتے ہیں۔ ان کی شاعری کا سب

سے موثر وصف استغنا کا قوی جذبہ ہے جو حافظ سمیت اوروں میں غیر حاضر ہے۔ انھوں نے صلے کے واسطے کسی بادشاہ کی خوشامد نہیں کی ، نہ کسی امیر کبیر یا خسرو والا جاہ کی مدح میں کوئی غزل یا قصیدہ لکھا ۔ وہ ایک نہایت شان دار اور گراں قدر طرز کے مالک ہیں ، اگرچہ عشق اور شراب ، جو فارسی شاعری کے عام جوہر ہیں ، ان کے کلام کے بھی نمایاں عنصر ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ خواجہ صاحب کی شراب عیناً اس شعر کے مصداق ہے :

مرا از قدح بادۂ سرمدیست
وزین بادہ مقصود من بےخودی است

اور حافظ کی شراب تو ہر حال میں محتمل علیہ ضرور ہے ۔ اگرچہ ان کی شاعری انداز و بیان کے لحاظ سے نہایت دلکش اور شیریں ہے لیکن اس میں خواجہ کا سا رنگ ڈھنگ اور حرارت موجود نہیں ۔

خواجہ صاحب نہایت خوش قسمت ہیں جنھیں شمس العلما کی ذات میں ایسا جوشیلا معتقد مل گیا ہے جس نے تمام دنیا کے برخلاف نہ صرف خواجہ صاحب کو شاعر ہی ثابت کر دیا بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کی شاعری کے پایے کو حافظ سے بھی بڑھا دیا ۔ لیکن کیا یہ حقیقت ہے یا ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں ؟ :

آرزو خوبست اما این قدرہا خوب نیست

ہم میں شمس العلما کا سا جوش اور وجدان نہیں جو ان کے ہر بیان کو صوفیانہ انداز میں آمنا و صدقنا کہہ دیں ۔ ہماری رائے میں یہ ایک غلط شناخت والا معاملہ ہے ۔ جس طرح کوئی مسافر غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے اور منزل مقصود سے بھٹک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے ، یہی کیفیت شمس العلما کی ہے ۔ انھوں نے خواجہ صاحب کے دھوکے میں کسی اور معین کا دیوان اٹھا لیا ہے اور ایک دلکش انداز میں اس پر رائے زنی شروع کر دی ہے ۔ یہ غلطی اسی قسم کی غلطی ہے جو مولانا شبلی سے سرزد ہوئی ہے کہ رودکی کے گمان پر قطران تبریزی کا دیوان سامنے رکھ لیا اور دل کھول کر داد دیتے رہے ۔

متاخرین میں سے بعض تذکرہ نگار مثلاً تقی اوحدی ، والہ ، میر حسین دوست سنبھلی بعض اشعار خواجہ صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن خواجہ صاحب

کی طرف دیوان کا انتساب گذشتہ صدی سے شروع ہوتا ہے اور منشی نول کشور اس کو طبع کرتے ہیں ۔ لیکن جیسا کہ میں اپنے ایک مضمون ''دیوان حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی'' میں دکھا چکا ہوں کہ متاخرین کی یہ شہادت دیوان کا تعلق خواجہ صاحب کے ساتھ وابستہ کرنے کے لیے نا کافی ہے ۔ سب سے پہلے یہ سوال پیش آتا ہے کہ حضرت کے عہد سے لے کر گذشتہ صدی تک یہ دیوان گنجِ مخفی کی طرح کہاں غائب رہا اور خواجہ صاحب کے سوانح نگاروں کی نظروں سے کیوں کر اوجھل رہا ؟

دیوان ھذا ، طبع نول کشور ، ۹۱ صفحات پر ختم ہوتا ہے ۔ غزلیات کے سوا اس میں کوئی صنف نظم موجود نہیں ۔ غزلوں کی تعداد ایک سو اکیس ہے اور ابیات کا شمار گیارہ سو بارہ سو کے درمیان ہے ۔ شاعر اپنا تخلص دو طرح سے لاتا ہے یعنی معین اور معینی ۔ متعدد غزلیں حمد و نعمت میں ہیں ۔ کلام سراسر عشق و عرفان کے رنگ میں ڈوبا ہے ۔ عشق الٰہی کا جذبہ بہت غالب ہے ، رندی اور سرمستی کے مضامین خال خال موقعوں پر نظر آتے ہیں ۔ خمریات کا ذکر ، جو کہ عراقی اور حافظ کے ہاں بہت غالب ہے ، یہاں بالکل دھیما ہے ۔ شوخی مطلق نظر نہیں آتی ۔ متین اور سنجیدہ خیالات قدم قدم پر دامن گیر نظر آتے ہیں ۔ مذہب سے عداوت نہیں ، نہ شیخ و زاہد کا استخفاف منظور ہے ۔ تجرید و ترکِ تعلق شاعر کا پیغامِ خاص ہے ، یہاں تک کہ بہشت جو زہاد کی منتہائے مقصود ہے ، دام گاہِ علائق بنا دی گئی ہے ۔ خیال میں نزاکت اور خوش اسلوبی ، جو متاخرین کا دست مایۂ ناز ہے ، غلبہ پائے ہوئے ہے ۔ زبان میں ایسا لوچ ، گھلاوٹ اور لطافت موج زن ہے جو خواجہ صاحب کے زمانے میں قطعی نامعلوم ہے ۔ بندشیں اور ترکیبیں متاخرین کی طرز میں ہیں ۔ اظہار خیال کے واسطے بوقلموں اور متنوع پیرائے شاعر کے قبضے میں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل اس عہد تک بدرجۂ کمال ترقی پا چکی تھی ۔

کلام کا جوہر سادگی ، سادہ بیانی اور سادہ خیالی ہے ۔ تکلفات سے عام طور پر احتراز ہے ۔ خیالات کی رنگا رنگی اور تنوع غزل کا طغرائے امتیاز ہے ۔ لیکن اس دیوان میں بیرونی اور اجنبی خیالات بہت کم چھیڑے گئے ہیں ۔ نفس مضمون پر توجہ مائل ہے ۔ حقائق و دقائق تصوف ، واردات سلوک ، تجرید و تفرید ، فنا و بقا ، نفی و اثبات ، شوق دیدار وغیرہ کے اظہار پر شاعر کی تمام شاعری مبذول ہے ۔

مضمون کی اس تنگی سے کلام میں ایک خفیف سی جھلک نمودار ہے ، جدت اور آمد اچھے خاصے پیمانے پر ہے ۔ بعض ابیات ایسے صاف اور ہموار نکل آئے ہیں کہ دل میں چٹکیاں لیتے ہیں ۔ یہ ایسے شخص کا کلام ہے جو جذبات عشق الٰہی سے سرشار اور رسولؐ عربی کا عاشق زار ہے ۔ مسافرِ منزلِ طریقت ہے لیکن شریعت کی روشنی میں ، عشق ہے لیکن متانت کا دامن پکڑے ہوئے ، دیوانگی میں بھی دانائی کی ادا موجود ہے ۔ مسائلِ معرفت کے ساتھ فلسفۂ تصوف کی اصطلاحات بے تکلفی اور خوش مذاق کے ساتھ برتی گئی ہیں ، یہ بات حافظ اور عراقی کے ہاں موجود نہیں ۔ ان دقائق نے کلام کو بعض اوقات پیچیدہ بنا دیا ہے ۔

شاعر اپنے آپ کو 'مسکین معین' کہنے کا عادی ہے ۔ دیوان کے تتبع سے اس قدر اور پایا جاتا ہے کہ شاعر اپنی زندگی میں واعظ ضرور رہا ہے ، کیونکہ بعض مقطعوں میں اس نے منبر ، مجلس اور واعظ کی طرف تلمیح کی ہے ۔ چنانچہ:

معین برای بمنبر بگوی نکتۂ عشق
کہ بلبلِ چمنِ عشق در زمانہ توئی

دیگر

گرچہ شاهان را بتخت و تاج زینت می دهند
جلوۂ مسکین معین بر تاج و منبر کرده اند

دیگر

معینی گر همی خواهی کہ سترش بر زبان رانی
مقام آن سر دار است بر منبر نمی گنجد

دیگر

بیا بوعظ معینی رموز عشق شنو
کہ از حکایت او بوی دوست می آید

دیگر

خلق گویندم معین این رازَ بر منبر مگوی
آه کین آتش هزاران واعظ و منبر بسوخت

ان اشعار کی شہادت سے شاعر کا واعظ ہونا مفہوم ہوتا ہے اس لیے واعظین کی جماعت میں اس کی تلاش ضروری ہوئی ۔ چنانچہ ایک واعظ ، جو شاعر بھی ہیں ، بعد تلاش ہمیں ملے ہیں ۔ ان کا نام مولانا معین الدین بن مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی و الہراتی ہے ۔ سلطان ابوالغازی حسین کے عہد کے زبردست فاضل ہیں اور جامی کے ہم عصر ۔ آپ اپنے عہد کے مشہور واعظ اور مصنف ہیں ۔ دنیاوی تعلقات سے اس قدر بیزار تھے کہ سنہ ۹۰۰ھ میں آپ کے بھائی مولانا نظام الدین قاضیٔ ہرات کی وفات پر جب سلطان حسین نے بہ اصرار تمام منصبِ قضا آپ کی خدمت میں پیش کیا ، آپ نے بدرجۂ مجبوری قبول کیا اور سال بھر کے بعد اس سے دست کش ہوگئے ۔ علم و فضل اور زہد و ورع کے لحاظ سے ایک ممتاز ہستی تھے ۔ طبیعت میں بلندی اور مزاج میں استغنا تھا ۔ جامع مسجد ہرات میں ہر جمعے کو آپ کا وعظ ہوتا تھا ۔ تقریر میں تاثیر اور بیان میں دلکشی تھی ۔ ان کی مجالس میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہوتے ۔ ان میں جلیل‌القدر امرا بھی شامل ہوتے اور مولانا ان کی دنیاوی وجاہت کی پروا نہ کرکے بر سر منبر ان کے افعالِ شنیعہ پر سرزنش کرتے اور وہ دم نہ مارتے ۔ کامل چالیس سال آپ نے وعظ و تذکیر میں صرف کیے ۔ وعظ سے جو وقت بچتا ، تصنیف و تالیف میں صرف کرتے ۔ مولانا نے برخلاف دیگر علما کے اپنی مجالس وعظ کو حتی‌الوسع دلچسپ اور شگفتہ بنانے کی کوشش کی اور موقع بہ موقع نظم کا عنصر داخل کرکے ان میں اور بھی دلکشی پیدا کردی ۔ شعر میں آپ کا پایہ بلند ہے اور کلام میں عشق و تصوف کا رنگ غالب ہے ۔ طبیعت زودگوئی کی عادی معلوم ہوتی ہے ۔ حبیب السیر (صفحہ ۳۳۸ ، جلد سوم ، جزو سوم) جس سے میں نے مذکورہ بالا اطلاع حاصل کی ہے ، سال وفات سنہ ۹۰۷ھ دیا ہے ۔

مولانا معین الدین کثیر تصنیفات کے مالک ہیں : (۱) تفسیر بحر الدرر ۔ (۲) تفسیر حدائق الحقائق فی کشف اسرار الدقائق ۔ (۳) واضحہ فی اسرارالفاتحہ (سورۂ فاتحہ کی تفسیر) ۔ (۴) معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل سوانح عمری) ۔ سنہ ۸۹۱ھ میں اس کی ابتدا ہوئی اور کئی جلدوں میں لکھی گئی ۔ اس میں ایک مقدمہ ، چار رکن اور ایک خاتمہ ہے ۔ (۵) روضۃ الواعظین فی احادیث سیدالمرسلین (چار جلدوں میں) ۔ (۶) تفسیر سورۂ

یوسف - (۷) اعجاز موسوی (حضرت موسیٰ کے حالات میں ایک مبسوط تالیف ہے) - ان کے علاوہ اور رسالے اور کتابیں کثرت سے ہیں - نظم میں آپ نے بہت کچھ لکھا ہے اور غزل و رباعی کثرت سے لکھی ہے - ایک مثنوی بھی ان کی یادگار ہے -

دیوانِ زیر بحث بھی مولانا معین الدین کی یادگار ہے جو انتخاب معلوم ہوتا ہے - ان کی پُر گوئی سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پورا دیوان بہت ضخیم ہوگا - مولانا کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں دیگر مشاہیر شعرا کے علاوہ اپنے طبع زاد اشعار بلکہ بعض اوقات پوری پوری غزلیات تک لانے کے عادی ہیں اور مکرر بھی لے آئے ہیں - اس طرح انسان ان کی تصنیفات سے پورا دیوان حاصل کر سکتا ہے - چنانچہ ثبوت میں پروفیسر کی انتخاب کردہ غزلیات سے نمونۃً چند غزلوں کی نشان دہی ذیل میں مولانا کی تالیفات سے کی جاتی ہے :

صفحہ ۳۲۱ - ۲۵ :

حمدیکہ هم چو بحر کرَم بیکران بود
حمدیکہ شکر نعت هر دو جهان بود

شمس العلما نے پورا قصیدہ نقل کیا ہے -

مطبوعہ دیوان (طبع نول کشور ، سنہ ۱۲۸۸ھ) میں یہ قصیدہ صفحہ ۱۶ — ۱۹ پر موجود ہے - اس میں ایک کم پچاس اشعار ہیں - مولانا معین الدین تمام قصیدہ اپنی تالیف 'معارج النبوت' (مقدمہ ، فصل اول ، تحمید الثانی عشرہ) میں درج کرتے ہیں - قصیدے کی ابتدا میں یہ الفاظ ہیں : ''قال مؤلف الکتاب ختم اللہ آمالہ بالرشد و الصواب'' مصنف کی اس عبارت سے ثابت ہے کہ قصیدۂ هذا خود ان کی اپنی تصنیف ہے - اس قصیدے کے چند شعر مولانا کی ایک دوسری تصنیف 'اعجاز موسوی' میں منقول ہیں اور ان کے شروع میں مصنف کا دعویٰ ہے : ''چنان کہ نقیر گوید -''

صفحہ ۲۹۷ :

کسی کہ عاشق و معشوقِ خویشتن همہ اوست
حریف خلوت و ساقیِ انجمن همہ اوست

دیوان میں یہ غزل صفحہ ۱۳ پر ملتی ہے - اس میں گیارہ شعر ہیں - 'معارج النبوۃ'

(مقدمہ ، فصل اول ، تحمید الثامن کا آخر) میں تمام غزل مرقوم ہے اور شروع میں ''لمولفہ'' آیا ہے جس سے ثابت ہے کہ یہ غزل مولانا معین الدین کی ہے -

صفحہ ۳۰۷ :

راہ بکشای کہ دل میل بہ بالا دارد
پردہ برگیر کہ جان عزم تماشا دارد

دیوان میں صفحہ ۲۹ پر یہ نو شعر کی غزل ملتی ہے - 'ادھر معارج النبوت' (مقدمہ ، فصل سوم ، النعت التاسع کا خاتمہ) میں کامل غزل تحریر ہے اور گمان غالب ہے کہ مصنف کی ملک ہے -

صفحہ ۳۰۴ :

واقف آنست کہ دل واقفِ اسرار شود
مرد آنست کہ جان طالبِ دیدار شود

شعر ھذا جس طرح شمس العلما نے نقل کیا ہے ، مہمل بن گیا ہے - دیوان میں صفحہ ۲۷ پر یہ غزل ، جس میں ۲۱ ابیات ہیں ، درج ہے - اس غزل کے سات شعر معارج النبوت (رکن اول ، باب دوم ، فصل پنجم) میں آتے ہیں - ان کا عنوان ہے : ''چنان کہ معین دیوانہ تو گوید'' - اس غزل کے پانچ اور شعر مع مطلع 'معارج النبوت' مطبوعہ (رکن سوم ، باب چہارم ، فصل بست و چہارم 'در لطائف و اشارات ، صفحہ ۲۱۹) میں پائے جاتے ہیں اور شاعر حسب معمول گویا ہے : ''چنان چہ فقیر تو گوید -''

صفحہ ۳۰۰ :

مرا در دل بغیر از دوست چیزی در نمی گنجد
بخلوت خانۂ سلطان کسی دیگر نمی گنجد

اس غزل کے گیارہ شعر ہیں اور دیوان میں صفحہ ۲۵ پر ملتی ہے - 'معارج النبوت' (رکن اول ، باب ہفتم ، فصل سیزدھم ، لطیفۃ الثانیہ) میں اس غزل کے چار شعر ملتے ہیں - ظنِ غالب ہے کہ مصنف کی ملک ہے -

اس سے زیادہ مثالیں بہم پہنچانا طوالت کا موجب ہوگا ورنہ اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں جن میں مولانا معین الدین کی تصنیفات اور موجودہ دیوان میں وہی اشعار موجود ہیں - جب دیوان کے اس قدر ابیات مولانا کے ثابت ہوئے

تو کیا وجہ ہے کہ باقی غزلوں کو مولانا کی زادۂ طبع نہ مانیں اور تمام دیوان انھی کی طرف منسوب نہ کریں، جس کے فی الحقیقت وہ مالک اور جائز مالک ہیں[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالۂ اُردو اورنگ آباد ، صفحہ ۴۰۹ ، بابت جولائی سنہ ۱۹۲۴ع ، جس سے عبارت بالا منقول ہے[2] ۔

صفحہ ۳۳۰ : قطب الدین کے سپہ سالار بنائے جانے کے موقع کے وقت لکھتے ہیں کہ 'سلطان نے اس کو اپنے دشمن کھانڈے رائے کے خلاف مقرر کیا جو مسلمانی طاقت اور حکومت کے واسطے خطرہ ثابت ہو رہا تھا ۔ کھانڈے رائے نے سلطانی فوجوں کو متواتر شکستیں دی تھیں اور دہلی اور میرٹھ کے قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا ۔ قطب الدین نے ایک بڑا اور آراستہ لشکر جمع کیا اور سنہ ۵۸۹ھ میں کھانڈے رائے اور اس کے اتحادیوں کے خلاف اس کی کامیاب قیادت کی ۔ اسی سال وہ میرٹھ اور دہلی کی طرف بڑھا اور دوبارہ ان پر قابض ہو گیا ۔'

لیکن صفحہ ۲۸۷ پر پروفیسر ، تراوڑی کی جنگ میں ، جو سالِ ماسبق میں سلطان معزالدین محمد بن سام اور پرتھی راج کے درمیان ہوتی ہے ، کھانڈے رائے

۱- ہمیں کوئی تعجب نہ ہوگا اگر دیوان ہذا کا انتساب خواجہ کی طرف اکبری عہد میں عمل میں آیا ہو ۔ اکبر کے ساتھ شاہی خاندان کی ارادت نے سلطنت کا ہاتھ چشتیوں کے سر پر رکھ دیا تھا ۔ شاہی معتقدین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے عجب نہیں کہ خواجہ صاحب کو شاعر و مصنف قرار دیا گیا ہو اور کسی بے رو نے دانستہ یا نا دانستہ خواجہ کے نام کے ساتھ اس دیوان کو شہرت دی ہو ۔ اس سے زیادہ واضح مثال کتاب 'گنج الاسرار' کی ہے جو اسی عہد میں وجود میں آ کر خواجہ صاحب کے نام کے ساتھ منسوب کردی گئی ہے ۔ اس تالیف کا ایک قدیم مخطوطہ بہ کتابتِ شرف الدین القریشی سنہ ۹۸۰ھ کا نوشتہ میرے مجموعۂ کتب میں ، جو اب پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے ، موجود ہے ۔ اس کا نمبر ۳۷۸ ہے ۔ نسخۂ ہذا کے ساتھ بعض اسناد و وصایا بھی ہیں جو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ فریدالدین گنج شکر کی طرف سے کتاب ہذا کے تعلق میں دی گئی ہیں ۔ (حاشیۂ مصنف)
۲- یہ مضمون زیر نظر جلد ہی میں کسی اور جگہ ملاحظہ فرمائیں ۔ (مرتّب)

کی ہلاکت کا واقعہ ضبط تحریر میں لا چکے ہیں ۔ چنانچہ لکھا ہے :

صفحہ ۲۸۷ : سنہ ۵۸۸ھ میں شہاب الدین نے دوسرا حملہ کیا ۔ اس کی فوج سوار و پیادہ تقریباً ایک لاکھ تھی ۔ پرتھی راج کا لشکر اس سے تگنا تھا ۔ دونوں فوجیں تراوڑی کے میدان میں متابل ہوئیں ۔ دن بھر کی سخت جنگ کے بعد راجا اور اس کے اتحادیوں کی فوجوں کو ہزیمت ہوئی اور کھانڈے راؤ سپہ سالار میدان جنگ میں مارا گیا ۔ رائے پتھورا ، جو رات کی تاریکی میں نکل بھاگا تھا ، گرفتار ہو کر لایا گیا اور قتل کر دیا گیا ۔

یہ بیان ممکن ہے کہ پروفیسر نے 'فرشتہ' سے نقل کیا ہو جو کہتا ہے :
''و کھانڈے رائے حاکم دہلی و بسیاری دیگر از رایان در جنگ مغلوبہ کشتہ شدند و پتھورا در حدود سرستی گرفتار گشتہ بموجب فرمان سلطان بہ قتل رسید ۔''
لیکن اس جنگ کی سب سے قدیم یادداشت میں ، جو 'طبقات ناصری' میں محفوظ ہے ، تراین کی دونوں جنگوں میں کھانڈے رائے کی جگہ گوبند رائے کا نام ملتا ہے ۔ پہلی جنگ میں سلطان کے نیزے کی ضرب سے اس کے دو دانت ٹوٹ جاتے ہیں ۔ دوسری جنگ میں گوبند رائے کی لاش اس کے ٹوٹے دانتوں کی وجہ سے میدان میں پہچانی جاتی ہے ۔

بہرحال اس کھانڈے رائے کی نسبت ، جس کا وجود ہی مشتبہ معلوم ہوتا ہے ، یہ دعویٰ کرنا کہ اس نے سلطان (معزالدین محمد) کی فوجوں کو متواتر شکستیں دیں ، قطعاً ایک غیر تاریخی بیان ہے ۔

صفحہ ۳۳۱ : 'khakkar' ۔ صحیح لفظ کھوکھر ہے ۔ قدیم تلفظ بہ تخفیف واؤ تھا ۔ ہائے مخلوط فارسی میں لکھی نہیں جاتی اس لیے ککر (بہ ضم اول) لکھتے ہیں ۔

'Dumyak' بہ فتح دال ہے نہ بالضم جیسا کہ پروفیسر نے لکھا ہے ۔ سلطان معزالدین کے قاتل کھوکھر نہیں تھے بلکہ ملاحدۂ فدائی ۔

صفحہ ۳۳۱ : پروفیسر کا قول ہے کہ 'ایک قابل ذکر امر جو تاریخ سے معلوم ہوتا ہے اور ہماری دلچسپی کے سامان رکھتا ہے ، یہ ہے کہ اس زمانے میں فارسی ادیبوں اور با کمالوں کی ایک بڑی تعداد طوس ، نیشاپور اور غور و غزنیں سے رضاکارانہ طور پر سلطانی افواج کے ساتھ ہندوستان آئی ، جس کے ذریعے سے

فارسی بول چال اور شاعری کا ذوق اس ملک میں اسی معیار پر قائم رہا ، جو سلطان محمود کے زمانے میں پہنچ چکا تھا ۔ ان میں سے بعض سلطانی انعام سے مالامال ہو کر اپنے وطنوں کو لوٹ گئے اور بعض اسی ملک میں آباد ہوگئے ۔'

'قبل مغل فارسی' میں ہم وقتاً فوقتاً ایرانی ادیبوں کا ذکر پڑھتے ہیں ۔ معلوم نہیں پروفیسر کے کون سے ذرائع ہیں جن سے یہ ادبی قسم کی اطلاع انہوں نے حاصل کی ہے ، جن تک اور لوگوں کی رسائی نہ ہو سکی ۔ پروفیسر کا بیان شاید درست ہو لیکن تصدیق اور تفصیل کا محتاج ہے ، اس کے بغیر ہماری سنجیدہ توجہ کا مستحق نہیں ہے ۔

صفحہ ۲۳۲ : اسی طرح قطب الدین ایبک کے تذکرے میں کہا ہے کہ اس نے فارسی کی سرپرستی میں اپنے آقا کی روایات کو قائم رکھا ۔ لیکن اپنے دعوے کا کوئی ثبوت نہیں دیا ۔ صرف بہاء الدین اوشی کی رباعی پر قطبی قدردانی کی تمام داستان ختم کر دی ہے ۔ شمس العلما اگر ذرا تکلیف گوارا کرتے تو اس دور کے لیے ، جس پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے ، کم از کم ایک دو اہل قلم کے نام بہ آسانی حاصل کر سکتے تھے ۔ مثلاً مولانا حسن نظامی ، تاریخ تاج المآثر کے مصنف ۔ یہ ہندستان کے پہلے مورخ ہیں ۔ تاج المآثر میں موقع بموقع انہوں نے اپنا کلام درج کیا ہے ۔ دوسرے فخرالدین مبارک شاہ المعروف بہ فخر مدبر غزنوی ہیں جن کی ساری عمر ہندستان میں گزری ہے ۔ ان کی کتاب 'سلسلۃ الانساب' قطب الدین کے نام پر معنون ہے ۔ دیباچے میں عہد قطبی کی مختصر تاریخ حوالۂ قلم کی ہے ۔ یہ حصہ ڈاکٹر ڈینی سن راس نے بنام 'تاریخ فخرالدین مبارک شاہ' طبع بھی کردیا ہے ۔

صفحہ ۲۳۳ : عہد شمسی میں فارسی شعرا کے تازہ واردین کے ذیل میں پروفیسر نے ناصری اور روحانی کے دو نام دیے ہیں اور اس امر پر مصر ہیں کہ یہ ایرانی شعرا محض قدردانیٔ ہند کی بنا پر آئے تھے ، نہ بغرض سیر و تفریح ۔

پروفیسر کا دعویٰ مغلیہ عہد کے واسطے تو صحیح مانا جا سکتا ہے لیکن اس عہد کے واسطے غلط ہے ۔ یہ فتنۂ چنگیزی کا زمانہ ہے ۔ ماوراء النہر اور ایران پر قیامت صغریٰ گزر رہی ہے اور ان ممالک کے لوگ ان وحشیوں سے اپنی پیاری جان بچانے کے لیے ہر طرف بھاگ رہے ہیں ۔ ان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد ہندوستان

بھی پہنچی - محمد عوفی صاحب لباب الالباب انھی پناہ گزینوں میں شامل ہے -

صفحہ ۳۳۵ : مشہور صوفی شیخ ابو سعید ابوالخیر کا نام پروفیسر نے بالکل الٹ دیا ہے ؛ یعنی ابوالخیر ابو سعید - ابو سعید ، خود شیخ کی کنیت ہے اور ابوالخیر ان کے والد کی کنیت ہے جو یہاں بحیثیت اسم آئی ہے - دونوں ناموں کے درمیان اضافت ابنی ضروری ہے ، لیکن پروفیسر بالعموم یہ اضافت ترک کر دیتے ہیں ، جو ہر حال میں قابل اعتراض ہے -

صفحہ : ۳۳۶ : روحانی کے قصائد کے ذکر میں ، جو اس نے بعض قلعوں کی فتح کے موقع پر لکھے ہیں ، پروفیسر سے ان کی املا میں سہو سرزد ہوا ہے - انھوں نے لکھا ہے 'Mandu' اور 'Ratanbhur' - رتن بھور کسی قلعے کا نام نہیں - یہ نام Ranthanbhur ہے - دوسرا نام 'منڈو' عہد شمسی میں وجود میں بھی نہیں آیا تھا - نویں صدی ہجری میں مالوے کے سلاطین اس کی تعمیر کرتے ہیں - یہ نام دراصل منڈور Mandaur ہے جو راجپوتانہ میں جودھ پور کی بنا سے قبل اس خطۂ ملک کے راجاؤں کا دارالریاست تھا -

صفحہ ۳۳۶ : حاشیے میں کہا ہے کہ عطارد کا مرادف فارسی زبان میں دبیر فلک ہے جسے منشیٔ فلک بھی کہتے ہیں - لیکن یہ تو کنایہ ہے ، عطارد کی فارسی 'تیر' ہے -

صفحہ ۳۳۷ :

با قلم تا قرین شدم بجہان
روز من گشت چون جہان قلم

آخری مصرع میں قافیہ ہمارے خیال میں 'زبان' چاہیے ، 'جہان' بالکل نامناسب ہے -

صفحہ ۳۳۸ : تاج الدین دبیر دہلوی کے واسطے لکھتے ہیں کہ 'اس کا دادا غزنویوں کے آخری تاجدار خسرو بن ملک شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا تھا اور شاہی فوج میں شامل ہو گیا تھا - نوجوان شاعر کا باپ سنہ ۵۸۰ھ میں اس خاندان کی آمد کے جلد بعد پیدا ہوا -'

پروفیسر نے یہ نہیں بتایا کہ خود تاج دبیر کب پیدا ہوا - نہ اس جزئی اطلاع کے لیے انھوں نے کوئی حوالہ دیا - غزنویوں میں کوئی ملک شاہ نہیں

گزرا ۔ خسرو نام کے اس خاندان میں دو بادشاہ ہیں ۔ پہلا معز الدولہ بہرام شاہ (سنہ ۵۴۷ — ۵۵۵ھ) دوسرا تاج الدولہ یا سراج الدولہ خسرو ملک (سنہ ۵۵۵ — ۵۸۲ھ) ۔

دہلی سنہ ۵۸۰ھ میں پرتھی راج کے قبضے میں تھی ۔ مسلمانوں کا قبضہ اس پر سنہ ۵۸۹ھ میں ہوتا ہے ۔ یہ فرض کرکے کہ تاج دبیر کے بزرگ فتح دہلی کے فوراً بعد آئے تو بھی سنہ ۵۹۰ھ سے قبل نہیں آسکتے ۔ اگر تاج کا باپ سنہ ۵۹۱ھ میں پیدا ہوا اور اس کی عمر کے بیسویں سال یعنی سنہ ۶۱۱ھ میں تاج پیدا ہوا ، تب بھی شاعری میں نام پیدا کرنے اور شمس الدین التتمش کا مداح اور دبیر بننے کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے ۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب سنہ ۶۲۶ھ میں خلیفۂ عباسی المستنصر باللہ (سنہ ۶۲۳ — ۶۴۰ھ) کا سفیر التتمش کے واسطے خلعت لے کر آتا ہے ، تاج الدین مبارکباد میں اس موقع پر ایک قصیدہ لکھتا ہے جس کا مطلع ہے :

مژدہ عالم را ز عالم آفرین آوردہ اند
زان کہ شہ را از خلیفہ آفرین آوردہ اند

سنہ ۶۱۱ و ۶۲۶ھ میں صرف پندرہ سال کا فرق ہے ۔ چودہ سال کی عمر میں وہ نہ دبیر مملکت بن سکتا ، نہ ایسا پختہ مغز شاعر ہو سکتا کہ التتمش کے سامنے قصیدہ خوانی کر سکے ، اس لیے ہم پروفیسر کے بیان بالا کی تائید نہیں کر سکتے ۔

تاج الدین کے اپنے بیان سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوا اور ہندوستان میں تربیت پائی ۔ چنانچہ کہتا ہے :

مولا و منشا مبین در خاک ہندوستان مرا
نظم و نثرم بین کہ با آب خراسان آمدہ است

اسی قصیدے کے بعض اشعار سے پایا جاتا ہے کہ شاعر اپنا گھر بار چھوڑ کر ان ممالک (مراد دہلی) میں ایک مدت سے پڑا ہے مگر ابھی تک اس کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی ۔ چنانچہ :

سالہا شد بندہ را کز لطف ہر آزادۂ
در حریم این ممالک حصر حرمان آمدہ است

خانمان بگذاشتہ بر سمت شہری رفتہ کو
از علو قدر شاہش چون قدر خان آمدہ است

بی خیانت هست مقناطیس در باب هنر
بندهٔ سوی این دیار از جذبهٔ آن آمده است

اس بیان سے اس قدر واضح ہے کہ تاج ریزہ یقیناً دہلوی نہیں ہے ۔ اس قصیدے کا مخاطب ، التتمش کا وزیر ، نظام الملک قوام الدین جنیدی ہے ۔

حاشیے میں ، بحوالہ 'سیرالسالکین' ، تاج الدین کا نام ، تاج الدین شمس دبیر بتایا ہے اور کہا ہے کہ وہ نظام الدین اولیا کا استاد تھا ۔

یہاں 'سیرالسالکین' کے مصنف نے دو مختلف شخصوں کو ایک شخص سمجھ لیا ہے ۔ تاج الدین ریزہ اور شمس دبیر دو جداگانہ شخص ہیں ۔ ان میں آخرالذکر شیخ نظام الدین اولیاء کا استاد تھا ۔ جب عہد بلبنی میں شمس الدین مستوفی الممالک بنایا جاتا ہے ، تاج الدین نے مبارک باد میں اسے لکھا :

شمسا کنون بکامِ دلِ دوستان شدی
مستوفیٔ ممالکِ ہندوستان شدی

صفحہ ۳۳۹ : کہتے ہیں فیروز شاہ (رکن الدین) کی تعریف میں تاج الدین کے قصیدوں کا مورخین نے ذکر کیا ہے ۔ ان میں سے جو موجود ہیں ، قصیدۂ ذیل کے صرف ابتدائی اشعار دیے جاتے ہیں جو فصاحت اور تاثیر کی رو سے قابلِ لحاظ ہیں :

مبارک باد ملک جاودانی
ملک را خاصہ در عہد جوانی

یمین الدولہ رکن الدین آمد
درش از یمن چون رکن یمانی

پروفیسر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام قصیدہ محفوظ ہے ، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر کے منقول عنہ منتخب التواریخ بدایونی میں بھی یہی دو شعر دیے ہیں ۔ ڈاکٹر اقبال حسین ، جن کے پاس تاج ریزہ کے تعلق میں تمام مآخذ موجود ہیں ، لکھتے ہیں کہ اس قصیدے کے صرف دو شعر فرشتہ اور بدایونی اور مصنف 'عرفات العاشقین' نے دیے ہیں ۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ تمام قصیدہ کسی کتاب میں نقل نہیں ہوا ۔

صفحہ ۳۰۴ : شہاب مہمرہ کے ذکر میں ایک موقع پر کہتے ہیں کہ عرفی نے ہندوستان آنے پر قصائد میں شہاب کی طرزِ نگارش اور تخئیلی رجحان کا تتبع کیا ہے ۔

یہ بیان ہمارے لیے موجبِ حیرت ہے۔ شہاب کا انداز، علمیت، سنگلاخ زمین اور صنعت لزوم مالایلزم و دیگر صنائع ہیں۔ یہ رنگ جو زیادہ تر چھٹی ساتویں صدی میں مرغوب طبائع تھا، بھلا دسویں صدی میں عرفی اور اس کے معاصرین کو کیوں پسند آنے لگا۔ نہ عرفی کے قصائد سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ شمس العلما کا یہ قول اس قدر معتبر مانا جا سکتا ہے جس قدر ان کا یہ قول کہ عرفی نے دوسرے شعرا کی طرح قصیدے کو اپنا پیشہ نہیں بنایا، نہ انعام کی تلاش میں وہ سلاطین و امرا کے درباروں کا مشتاق رہا۔

عرفی کے قول ''قصیدہ کار ھوس پیشگان بود عرفی'' کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس ہوس پیشہ جماعت سے کبھی اعتزال نہ کر سکا۔ نہ غزل کا وظیفہ اس کو راس آیا۔ اس کی شہرت کا مدار انھی قصائد پر ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ بھی تو ہے کہ قصیدے کا لپکا اس میں اس قدر شدید تھا کہ اگر کوئی ممدوح نہ ملتا تو 'قصیدہ در مدح خود گفتہ' پر عمل پیرا ہوتا۔ بہرحال عرفی ان سینکڑوں ایرانی شعرا میں سے ایک ہے جو قسمت آزمائی اور قدردانی کی امید میں ہندوستان آتے تھے اور یہاں کے امرا کی بھٹئی کیا کرتے تھے۔

صفحہ ۳۶۵: عمید سنّامی کی نسبت 'تونکی' بیان کی ہے مگر اس نام کا کوئی قصبہ معلوم نہیں۔ اس کی دوسری شکل 'لومک' ہے، بہت ممکن ہے کہ 'تولک' ہو جس کا ذکر طبقات ناصری میں آتا ہے اور غور میں ایک قصبے کا نام ہے۔ اس سے 'تولکی' نسبت بنے گی۔ لیکن پروفیسر اس کو سنّامی کیوں نہیں کہتے۔ عمید کے اشعار سے پایا جاتا ہے کہ اس کا وطن 'سنّام' ہے۔ 'عرفات العاشقین' میں تقی اوحدی نے (جیسا کہ ڈاکٹر اقبال حسین نے 'ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا' میں نقل کیا ہے) اس کا مولد سنّام بتایا ہے۔

صفحہ ۳۷۰: عمید سنّامی کے مشہور قصیدے کا عنوان جس کا مطلع ہے:

منَ کہ چون سیمرغ در یک گوشہ مسکن کردہ ام
ماورای مرکز خاکی نشیمن کردہ ام

پروفیسر نے ''فی التوحید'' دیا ہے۔ حالانکہ یہ قصیدہ عمید کا مشہور حبسیہ قصیدہ ہے جو اس نے بحالتِ قید لکھا ہے۔ قصیدے میں صریح اشارے ایک

برج میں قید کیے جانے اور پاؤں میں بیڑیاں پڑنے کے متعلق موجود ہیں - چنانچہ :

ره درین یک برج بی روزن نمودندم ولی
من بہمت ره برون از هفت روزن کرده ام

برج قوس است این و من خورشید سان بر عالمی
نوبهاری را ز آه سرد بهمن کرده ام

مسند خورشید زرین تخت می زیبد مرا
حالی (کذا) را من تکیه بر کرسی آهن کرده ام

در گریبان سر فرو برد اژدهای هفت سر
تا من این مار دوسر در زیر دامن کرده ام

بند بیژن می کنندم عرض در چاه ستم
نی منیژه دیدم و نی جرم بیژن کرده ام

همدمانم هر یکی در شغل و من در بند حبس
حاش لله زین سخن ، تنها گنه من کرده ام

صفحہ ۳۷۳ : بسلسلۂ قصائد عمید ایک قصیدے کا عنوان ''در مدح سلطان سنجر'' تحریر کیا ہے - ہمیں اچنبھا ہوا کہ عمید سنامی کے زمانے میں ایک صدی بعد سلطان سنجر کیسے نمودار ہوگیا - آخر قصیدے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ وہ کسی امیر تاج الدین سنجر کی مدح میں ہے - چنانچہ :

خجسته شیر کمین تاج دین حق سنجر
که شرزۂ فلکش هست در شهار آهو

لیکن پروفیسر اس شعر پر غور نہ کرتے ہوئے صفحہ ۳۷۶ پر کہتے ہیں : 'جس قدرت اور جدت پسندی کے ساتھ سلطان سنجر کی مدح میں یہ قصیدہ تیار ہوا ہے ، ہماری توجہ کا مستحق ہے' -

صفحہ ۳۷۸ - ۷۹ : علاء الدین جہان سوز کی دو فخریہ غزلیں دی ہیں - ان کے مطلعے ہیں :

جهان داند که من شاه جهانم
چراغ دودۂ عباسیانم

دیگر

آنم کہ ہست فخر ز عدلم زمانہ را
آنم کہ ہست جور ز بذلم خزانہ را

لیکن تعجب ہے کہ پروفیسر ان کو قطعات میں شامل کر رہے ہیں اور قطعہ' اول کے واسطے فرماتے ہیں : 'اس عہد کے نائکوں (Na'iks) اور مغنیوں نے تین مختلف پردوں ترکی ، ہندوستانی اور فارسی میں گایا' ۔ یہ بیان میرے لیے اور بھی عجیب ہے ۔ اگر صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں میں ہندی موسیقی نے امیر خسرو سے بہت پہلے غزنوی دور ہی میں قبولِ عام کا خلعت حاصل کر لیا تھا ۔ میں اس بیان پر مطمئن نہیں مگر پروفیسر 'طبقات ناصری' کا حوالہ دیتے ہیں ۔ 'نائک' کا لفظ جو بہ جنسہ پروفیسر نے استعمال کیا ہے ، معلوم نہیں اسے ہندی مانا ہے یا فارسی ؟ نائک ہندی میں استاد و امامِ موسیقی ہے ۔ فارسی میں نائی بہ معنی نے نواز ہے ۔ کافِ تصغیر کے اضافے سے نائیک واحد میں آتا ہے لیکن بحالتِ جمع سراسر تکلف ہے ۔

عضدالدولہ شیرزاد فرزند علاء الدین مسعود (۴۹۲ - ۵۰۹ھ) جب والی' لاہور تھا ، مسعود سعد سلمان نے اس عہد کے درباریوں اور مغنیوں کا ایک خاکہ اپنی مختصر مثنوی میں یادگار چھوڑا ہے جو دیوان میں موجود ہے ۔ عضدالدولہ کے درباری ، حالانکہ ہندوستان میں موجود ہیں ، دن رات ہندوؤں سے تعلق میں آتے ہیں ، لیکن مسعود سعد سلمان ، جو ہندی میں بھی صاحبِ دیوان بتائے جاتے ہیں ، عضدالدولہ کے دربار میں ہندی موسیقی کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے ۔

شمس العلما نے علاء الدین جہاں سوز اور اس کی شاعری کا ذکر ''غوریوں اور غلاموں کے دور میں ہندوستان کی فارسی شاعری کی خصوصیات'' کے زیر عنوان درج کیا ہے ۔ ایسا کرنے میں ہم سمجھتے ہیں وہ تقدیم و تاخیر کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ لیکن جہاں سوز کا ذکر ہندوستان کی فارسی شاعری کے مذکور میں ہر جگہ ناموزوں ہے ۔ نہ وہ ہندوستانی ہے ، نہ ہندوستان میں رہا ، نہ ممالک غور شاملِ ہندوستان ہیں ۔ جب ہندوستان کے ساتھ اس کو دور کا تعلق بھی نہیں تو پھر اس کا ذکر ہندوستان کے شعرا میں کیوں لایا جائے ۔

دوبارہ غور کرنے پر ایک بات ذہن میں آئی کہ شمس العلما کے زعم میں شاید عمید اور جہاں سوز ایک ہی زمانے میں تھے ۔ انھوں نے دیکھا کہ عمید بھی سلطان سنجر کی تعریف میں قصیدہ لکھ رہا ہے اور علاء الدین جہاں سوز بھی سلطان سنجر کی شان میں رباعیاں لکھ رہا ہے ، اس لیے قدرۃً یہی نتیجہ نکلا کہ دونوں معاصر ہیں ۔ اس لیے دونوں کا تذکرہ ایک ہی جگہ یکے بعد دیگرے نتھی کردیا :

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

صفحہ ۳۸۱ : پانچویں باب کا عنوان ہے : ''خلجیوں ، تغلقوں اور خاندان غلاماں کے آخری تین سلاطین ، سلطان معزالدین کیقباد اور بلبنوں کے دور میں فارسی ادب کی حالت ۔''

گھوڑے کو گاڑی کے آگے رکھنا اگر صحیح طریقہ ہے تو اس جملے میں شمس العلما نے گاڑی گھوڑے سے آگے کھڑی کردی ہے ۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خاندانِ غلاماں کا ذکر خلجیوں اور تغلقوں سے بعد کیا ہے ۔ یہی جملہ اسی ترتیب سے پروفیسر بابِ ماسبق میں دہرا چکے ہیں اور دوبارہ متن میں لا رہے ہیں ۔ اس سے ناظرینِ کتاب کے ذہن میں غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے ۔ یہی نہیں انھوں نے معزالدین کیقباد (۶۸۶ - ۶۸۹ھ) کو ، جو پوتا ہے ، پہلے جگہ دی ہے اور بلبن (۶۶۴ - ۶۸۶ھ) کا ، جو دادا ہے ، بعد میں مذکور لائے ۔ مزید براں بلبن کو ہر جگہ جمع کی صورت میں لکھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک سے زیادہ بلبن ہیں ۔ بہرحال تاریخی ترتیب سے یہ کج روی قابل اعتراض ہے ۔

صفحہ ۳۸۲ : 'خسرو ایٹہ والے' ۔ امیر خسرو کا ایٹہ سے کوئی تعلق نہیں ۔ وہ پٹیالی میں پیدا ہوئے ۔ پٹیالی اگر آج ضلع ایٹہ میں شامل ہوگئی تو لازم نہیں آتا کہ امیر خسرو کی نسبت بھی بدل دی جائے ۔ خسرو کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی اور دہلی میں تمام عمر بسر کی ۔ چنانچہ دہلوی کہلاتے بھی ہیں ۔ اس نسبت کے ہوتے ہوئے ان کو 'ایٹہ والے' کہنا بالکل نامناسب معلوم ہوتا ہے ۔

صفحہ ۳۸۴ : کہتے ہیں 'خسرو کے والد سیف الدین محمود اپنے وطن موضع

گیش واقع ترکستان سے چنگیز خاں اور اس کی تباہ کاریوں کے خوف سے بھاگ کر سلطان ناصرالدین محمود خلف التتمش کے ابتدائی عہد میں ہندوستان آ کر موضع پٹیالی تحصیل ایٹہ میں آباد ہوگئے۔'

چنگیز خاں سنہ ۶۲۴ھ میں فوت ہوتا ہے۔ ناصرالدین محمود سنہ ۶۴۴ھ سے ۶۶۴ھ تک سلطنت کرتا ہے۔ اس لیے اگر سیف الدین اپنے ہم نام ناصرالدین کے عہد میں آئے تو یہ چنگیز کے عہد سے بہت بعد کا زمانہ ہے، نہ چنگیز خاں کا زمانہ۔

صفحہ ۳۸۴ : کہتے ہیں 'خسرو کے والد نے مشہور خوش نویس مولانا سعدالدین خطاط کو ان کا استاد مقرر کیا، جو خسرو کو نستعلیق اور شکستہ خطوں کی تعلیم دیتے تھے۔'

پروفیسر نے خسرو کے حالات کے ماخذ میں دیباچہ 'غرۃ الکمال' و دیباچہ 'تحفۃ الصغر'، 'شعر العجم' و فہرست کتب فارسیہ از ریو کا نام لیا ہے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس خاص بیان کے واسطے وہ کون سی کتاب کے منت پذیر ہیں۔ بہرحال ہمارا اعتراض یہ ہے کہ خسرو کی طفلی کے زمانے میں، جب ان کی عمر سات آٹھ سال کی ہوگی، یعنی سنہ ۶۶۰ھ کے قریب، خط نستعلیق و خط شکستہ دنیا کے پردے پر موجود نہیں تھے۔ نستعلیق کے موجد، جس کو نسخ اور تعلیق سے مرکب بتایا جاتا ہے، مولانا میر علی بن الیاس الطبّاخ تبریزی ہیں جو امیر تیمور کے عہد میں گزرے ہیں۔ مولانا سلطان علی مشہدی نے اپنے رسالہ' آداب الخط (تالیف سنہ ۹۲۰ھ) میں نستعلیق کے تین اساتذہ کے نام گنائے ہیں : اول یہی مولانا میر علی تبریزی جنھوں نے سنہ ۷۹۸ھ میں خواجوے کرمانی کی مثنوی کمال نامے کی، جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، کتابت کی ہے۔ دوسرے مولانا جعفر جن کو میر علی موصوف کا شاگرد کہتے ہیں۔ تیسرے مولانا اظہر تبریزی۔ انھوں نے سنہ ۸۷۷ھ میں خمسہ' نظامی و خمسہ' خسرو کی کتابت کی ہے۔ یہ نسخہ راقم کے کتاب خانے کی زینت رہا ہے۔ ہندوستان میں نستعلیق کا رواج غالباً نویں صدی ہجری سے شروع ہو جاتا ہے۔ میرے کتب خانے میں اس کے بعض قدیم نمونے موجود ہیں، مگر بدقسمتی سے بے تاریخ ہیں۔ سب سے قدیم تاریخ والا نسخہ صلٰوۃ مسعودی ہے جو سنہ ۸۶۰ کا نوشتہ ہے۔ یہ

خط اگرچہ نستعلیق ہے لیکن نہایت ابتدائی حالت میں ہے ۔ بہر حال ساتویں صدی ہجری کے وسط میں خط نستعلیق کا رواج ہندوستان میں ِمن قبیل ِ محالات ہے ۔

وہ خط جس کو ہم شکستہ کہنے کے عادی ہیں ، شاہجہاں کے عہد سے شروع ہوتا ہے ۔ اس کا بانی کفایت خاں ہے ۔ اس لحاظ سے یہ خط 'کفایت خانی' کہلایا ۔ اس کے فرزند درایت خاں نے اس کو اور زیادہ پیچ دار اور مشکل بنا دیا جو خط 'درایت خانی' کہلایا ۔ انھی خطوں کی بگڑی شکل بعد میں خطِ شکستہ کے نام سے موسوم ہوئی ۔ امیر خسرو کے عہد میں خط شکستہ کے وجود کا دعویٰ کرنا تاریخ سے بے خبری کا ثبوت دینا ہے ۔

صفحہ ۳۸۵ : کہتے ہیں کہ خسرو نے ماں کی گود ہی سے شاعری شروع کر دی تھی ۔ اس دعوے کے ثبوت میں ذیلی حاشیے میں خسرو کا فقرۂ ذیل نقل کیا ہے :

''دران صغر سن کہ دندان می‌افتاد سخن می گفتم و گوہر از دہانم می‌ریخت ۔''
(دیباچۂ غرۃ الکمال)

حضرت امیر کا تو یہ مطلب ہے کہ جب ان کے دودھ کے دانت ٹوٹنے لگے تھے ، اس وقت سے انھوں نے شعر کہنا شروع کیا ۔ سات آٹھ سال کی عمر میں بچوں کے دانت گرتے ہیں ۔ اس عمر میں ذہین اور طبّاع بچوں کے لیے شعر کہنا بالکل ممکن ہے ، نہ ماں کی گود میں ۔

صفحہ ۳۸۹ : امیر خسرو کی تصنیفات اور ان پر تبصرے کے ضمن میں ایک مثنوی کا نام 'تاج الفتوح' دیا ہے ، جو جلال الدین فیروز شاہ کے جلوس کے سال میں تصنیف ہوتی ہے ۔ اس مثنوی کا نمبر بارھواں ہے ۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ، امیر خسرو نے 'تاج الفتوح' نام کی کوئی مثنوی نہیں لکھی ۔ لیکن جلال الدین فیروز کی تاج پوشی اور اس کے دیگر حالات کے مذکور میں جو مثنوی انھوں نے لکھی اس کا نام 'مفتاح الفتوح' ہے ۔ یہ مثنوی اورینٹل کالج میگزین میں 'غرۃ الکمال' کے ایک نہایت قدیم نسخے سے ، جو یقیناً حضرت مصنف کے عہد کا نوشتہ ہے ، عزیزم یاسین خاں نیازی نے چھاپ دی ہے (دیکھو میگزین مذکور ، بابت ماہ مئی و ماہ اگست سنہ ۱۹۳۶ع) ۔

صفحہ ۳۹۷ : ضیاء برنی کی روایت سے کہتے ہیں کہ شاہی دربار کے ایک

معاصر شاعر خواجہ سنائی نے خسرو کی شان میں یہ شعر کہا ہے :

بخدا ار بزیر چرخ کبود
همچو اوهست و بود و خواهد بود

اور توضیح کی غرض سے حاشیے میں اضافہ کیا ہے کہ 'یہ مشہور خواجہ حکیم سنائی سے ، جو غزنوی دور میں گزرے ہیں ، مختلف ہیں۔'

یک نہ شد دو شد ۔ شمس العلما نے بہ یک جنبش قلم ایک سنائی کے دو سنائی تراش دیے ، مگر شعر بالا حکیم سنائی غزنوی متوفی سنہ ۵۴۷ھ کی معروف مثنوی 'حدیقۃ الحقائق' میں موجود ہے جو غالباً سنائی نے اپنے متعلق کہا ہے ۔ برنی نے مناسب موقع سمجھ کر اسی شعر کو خسرو کے حق میں نقل کر دیا ۔ اکثر مورخ دیگر اساتذہ کے اشعار اپنی تالیف میں نقل کرتے آئے ہیں ۔ بہرحال پروفیسر کا یہ نظریہ کہ سنائی تخلص کے دو شاعر ہیں ، پہلا غزنوی اور دوسرا خسرو کا معاصر ، ہمارے نزدیک ناقابل قبول ہے ۔

صفحہ ۳۹۱ : معلوم ہوتا ہے شمس العلما امیر خسرو کے باقی کلام پر تبصرہ کرنے سے گھبرا گئے ، لہذا باقی کتابوں کے صرف نام ایک فقرے میں گنا کر آگے بڑھ گئے ۔ وہ نام یہ ہیں :

(۱) تغلق نامہ ۔ (۲) مفتاح الفتوح ۔ (۳) افضل الفوائد ۔ (۴) خزائن الفتوح ۔ (۵) تاریخ دہلی ۔

ان میں سے 'تغلق نامہ' جس کا صرف ایک نسخہ مملوکہ' نواب صدر یارجنگ معلوم تھا ، محترمی سید ہاشمی نے انجمن مخطوطات فارسی حیدر آباد کے واسطے بڑی قابلیت کے ساتھ مرتب کر کے چھاپ دیا ہے ۔ نمبر چہارم 'خزائن الفتوح' انجمن سلطانیہ (مرحوم) علی گڑھ کی طرف سے سنہ ۱۹۲۷ع میں طبع ہو چکی ہے ، اگرچہ بے انتہا غلط چھپی ہے ۔ پروفیسر حبیب ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے 'خزائن الفتوح' کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے لیکن سخت غلط ۔

'تاریخ دہلی' یقیناً امیر کی تصنیف نہیں ، نہ کسی نے امیر کے تعلق میں اس تالیف کا ذکر کیا ۔

صفحہ ۴۰۰ ۔ خان شہید کے ساتھ تاتاریوں کی جنگ کا موقع بحوالہ' برنی دیپالپور اور لاہور کے وسط میں کہیں بتایا ہے اور ان کے سردار کا نام تیمور خان تاتار لکھا ہے ۔

لیکن امیر خسرو دہلوی اور حسن دہلوی ، جو اس جنگ میں موجود تھے ، اپنے اپنے مرثیوں میں ، جن کی نقلیں پروفیسر نے اپنی تالیف میں درج بھی کی ہیں ، صاف بیان دیتے ہیں کہ یہ جنگ دریائے لاہور پر ہوئی ہے[1] - چنانچہ خسرو خان شہید کے تعلق میں لکھتے ہیں :

یک کشش از مولتانش تابہ[2] لاہور اوفتاد
یعنی اندر عہد من کافر تواند سر کشید (صفحہ ۲۰۳)

لڑائی دریاے راوی کے کنارے پر ہوئی تھی بالکل واضح ہے - خسرو کہتے

۱- برنی کا بیان غلط فہمی پر مبنی ہے - واقعاتی شواہد اس کے خلاف ہیں - مثلاً یہ امر واقعہ ہے کہ شہزادہ محمد صبح کے وقت (بلکہ چاشت کو) ملتان سے روانہ ہوکر دوپہر تک میدان جنگ میں پہنچ جاتا ہے - میدان جنگ دیپال‌پور اور لاہور کے درمیان ہونے کی صورت میں یہ ممکن نہیں - حقیقت یہ ہے کہ تاتاری لاہور اور دیپال‌پور کے درمیانی علاقے کو روندتے ہوئے ملتان کی طرف بڑھتے ہیں اور ملتان کے شمال مشرق میں راوی کے کنارے جنگ ہوتی ہے - فرشتہ گو برنی سے مؤخر ہے ، تاہم اس کا بیان گنجلک سے پاک ہے و ھوا ھذا :
''تیمور خان . . . با بیست ہزار سوار مغل میان لاہور و دیپال پور درآمد و آن حدود را تاخت و تاراج کردہ متوجہ ملتان شد - سلطان محمد خان شہید از قرب وصول ایشان آگاہی یافتہ وقت چاشت از ملتان بیرون رفت و نیم روز کنار آب لاہور ، کہ در نواحی ملتان می‌گزرد ، جہت مصاف اختیار کرد -''
(تاریخ فرشتہ ، جلد اول ، صفحہ ۱۳۳ ، طبع بمبئی ، سنہ ۱۸۳۱ع) (مرتب)

۲- ''تاب لاہور'' بہتر قرأت ہے - ''تابہ لاہور'' سے شہر لاہور کا گمان ہوتا ہے - اسی سبب سے وحید مرزا صاحب نے اس مصرع کا ترجمہ یوں کیا ہے :

"One swift move brought him to Lahore from Multan."

(ملاحظہ ہو ''امیر خسرو'' بزبان انگریزی ، طبع لاہور ، سنہ ۱۹۶۲ع صفحہ ۵۶) -
ظاہر ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ غلط محض ہے - (مرتب)

ہیں کہ کافروں نے دریا پار کر کے مقابلہ کیا :

آن چہ ساعت بد کہ کافر بر سرش لشکر کشید

جوق جوق از آب بگذشتند و ناگہ در رسید (صفحہ ۴۰۴)

حسن دہلوی بھی خان شہید کے مرثیے میں خسرو کے ہم زبان ہیں ۔ لکھتے ہیں :

''وبیک فرسنگی آن ملاعین پیش باز آسدہ موضع مصاف در حدود باغ سریر بر کرانہٴ آب لاہور اختیار کرد ، چنانچہ متصل آب دیہی[1] بزرگ بود آن را حصن حصین ساخت ۔'' (صفحہ ۴۳۰)

''و کفار تتار علیہم الخذلان والخسران از آب لہاور عبرہ کردند و مقابل صف اسلامیان درآمدند ۔'' (صفحہ ۴۳۱)

تاتاریوں کے سردار کا نام تیمور نہیں بلکہ ایتمر[2] ہے ، جیسا کہ حسن دہلوی

۱۔ اس جگہ بجائے 'دیہی' کے 'دھندھی' کا لفظ مناسب معلوم ہوتا ہے جو بعض نسخوں میں ملتا ہے (مثلاً تاریخ مبارک شاہی ، صفحہ ۵۴ ، طبع ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) ۔ دھندھ ، ہندی لفظ 'ڈھنڈھ' کی فارسی شکل ہے ۔ سیلاب کے موسم میں دریا کا پانی کنارہ توڑ کر باہر نکل جاتا ہے اور ایک قسم کی 'شاخ دریا' بن جاتی ہے ۔ اسے ڈھنڈھ کہتے ہیں ۔ خواجہ حسن کے مرثیہ منثور کے سیاق سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے ۔ فرماتے ہیں : ''. . . کہ چون کفار در مقابل شوند ہر دو آب در عقب لشکر باشد تا نہ ازین حملہ کسی روی بفرار تواند نہاد و نہ از آن مخاذیل ساقہٴ لشکر را آفتی تواند رسید ۔'' ظاہر ہے کہ 'ہر دو آب' کا اشارہ دریائے راوی اور اس کی ڈھنڈھ کی طرف ہے ۔ (مرتب)

۲۔ پروفیسر محمد حبیب نے خسرو پر اپنی کتاب (بزبان انگریزی ، صفحہ ۱۵) میں ''اتمر'' لکھا ہے لیکن وحید مرزا اپنی اردو کتاب طبع الہ آباد (صفحہ ۴۷) میں اور انگریزی کتاب طبع لاہور (صفحہ ۵۵) میں اس مغل جرنیل کا نام تیمور خان لکھتے ہیں اور حاشیے میں تیمور خاں کو درست قرار دیتے ہیں ۔ (مرتب)

نے اپنے مرثیے میں تحریر کیا ہے :

''شبانہ بر رای مشکل کشای عرض داشتند کہ ایتمر باتمامی لشکر بہ سہ فرسنگی فرود آمدہ است ۔'' (صفحہ ۴۳۰)

برنی نے یہ نام بہ تخفیف یا 'اتمر' قلم بند کیا ہے ۔

''درمیان لوہور و دیوپالپور بہ اتمر ملعون . . . محاربہ و مقاتلہ افتاد ۔'' (صفحہ ۴۰۰)

چونکہ 'اتمر' کا الف بائے جارہ کے ساتھ ملا کر لکھا گیا ، یعنی 'باتمر' پروفیسر نے الف کو متحرک پڑھنے کے بجائے ساکن پڑھا اور ت کو متحرک کر دیا ۔ چنانچہ قدرۃً تمر یا تیمور[1] ہو گیا ۔

صفحہ ۴۱۴ : کہتے ہیں کہ خان شہید کی شہادت کے بعد امیر خسرو کچھ سال تک ملک امیر علی کے پاس رہے جو غیاث الدین بلبن کا درباری امیر تھا ۔ وہ عام طور پر حاتم خاں کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ شعرا کے حق میں حاتم کی طرح فیاض تھا ۔ خسرو نے اس کی مدح میں متعدد قصائد لکھے اور ایک منظوم 'اسپ نامہ' بھی اس کے واسطے تالیف کیا وغیرہ ۔

یہ بیان ہمیں الجھن میں ڈال رہا ہے ۔ خان شہید یوم جمعہ سلخ ذیقعدہ سنہ ۶۸۳ھ کو غروب آفتاب کے وقت شہادت پاتا ہے :

جمعہ بود و سلخ ذی حجہ کہ بود آن کارزار
آخر هشتاد و سہ آغاز هشتاد و چہار

دوسرے دن سنہ ۶۸۴ھ شروع ہوتا ہے ۔ خسرو گرفتار ہوتے ہیں اور دو سال بلخ میں گزارتے ہیں ، جیسا کہ مشہور ہے[2] ۔ یہ مدت ہمیں سنہ ۶۸۶ھ تک پہنچا

۱- ''تمر'' املای اصلی ''تیمور'' است و اصل این کلمہ بمعنی آهن است و املای جدید این کلمہ ''دمر'' بادال است ('نامہ' امیر تیمور گورکان بشارل ششم پادشاہ فرانسہ' بست مقالہ قزوینی ، جزو اول ، صفحہ ۴۱ ، طبع بمبئی ، سنہ ۱۹۲۸ع) (مرتب)

۲- خسرو کی تاتاریوں کے ہاتھوں گرفتاری کی مدت کے بارے میں وحید مرزا لکھتے ہیں : ''خسرو اس قید مغل سے کب اور کس طرح رہا ہوئے ، اس کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

دیتی ہے ، جو غیاث الدین بلبن کی وفات اور معز الدین کیقباد کی تخت نشینی کا سال ہے۔ کیقباد انہیں بلاتا ہے مگر ملک اختیار الدین[1] وزیر کے ساتھ اچھے تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے خسرو دربار میں نہیں جاتے اور خان جہان کے ساتھ اودھ چلے جاتے ہیں جو اس صوبے کا والی تھا۔ تعجب یہ ہے کہ خسرو اسی خان جہان کو حاتم کا خطاب دیتے ہیں :

خان جہان حاتم مفلس نواز

دو سال اس کے ساتھ گزارتے ہیں ۔ اس وقت تک سنہ ۶۸۸ھ شروع ہو گیا ہے یا

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

متعلق صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ، لیکن ان کے کچھ اشعار سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ملتان سے کچھ زیادہ دور نہ گئے تھے کہ قسمت نے ان کی گلوخلاصی کی ایک عجیب صورت پیدا کردی ۔" اس کے بعد وہ مثنوی 'خضر خان دول رانی' کے چند اشعار کا حوالہ دینے کے بعد کہتے ہیں ''اس بیان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ خسرو کو بہت جلد آزادی مل گئی اور غالباً وہ اسی روز ملتان واپس آ گئے ۔ اس لیے شبلی نعمانی کا یہ بیان ، جو غالباً انہوں نے احمد سعید مارہروی کی کتاب 'حیات خسرو' سے اخذ کیا ہے ، کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ مغل خسرو کو قید کرکے بلخ لے گئے تھے اور وہاں سے دو سال کے عرصے کے بعد وہ ملتان واپس آئے ۔" ('امیر خسرو' از وحید مرزا صفحہ ۷۷ ، ۷۸ ، طبع الہ آباد ، سنہ ۱۹۴۹ع) یہی خیال پروفیسر محمد حبیب نے خسرو پر اپنی انگریزی کتاب ، طبع سنہ ۱۹۲۷ع کے صفحہ ۱۷ کے حاشیے میں ظاہر کیا ہے ۔ (مرتب)

۱ - 'ملک اختیار الدین' سہو قلم معلوم ہوتا ہے ۔ یقیناً فاضل مصنف کی مراد 'ملک نظام الدین' سے ہے ۔ 'ملک اختیار الدین' تو خسرو کے سرپرست امیر علی کا لقب ہے ۔ چنانچہ : "و خداوند ملک ملوک الشرق و قطب ارکان ممالک اختیار الحق والدین . . . علی بیگ سلطانی . . . از اوج ارتفاع بچشم سعادت درکار بندہ ناظر و لیکن دل بندہ کہ از تافتگی آفتاب فراق در ہوای دوستان ذرّہ ذرّہ شدہ است ۔'' (اعجاز خسروی ، رسالہ خامسہ ، صفحہ ۵۰) ۔ (مرتب)

ہونے والا ہے ۔ اسی سال ربیع الاول کی کسی تاریخ سے وہ 'قران السعدین' کی تصنیف پر بحکم کیقباد مصروف ہیں اور رمضان میں ختم کر دیتے ہیں ۔

اس بیان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ امیر خسرو کو اس ملک امیر علی کے پاس ، جس کا نام بھی زمانۂ حال کا سا ہے[1] ، جانے اور کچھ سال گزارنے کے لئے موقع نہیں مل سکتا ۔ پروفیسر نے خسرو کی قید کے زمانے کو محسوب نہیں کیا ۔ یہ بھی یاد رہے کہ پروفیسر کے ماخذ 'شعر العجم' میں ملک امیر علی کا اس موقع پر کوئی تذکرہ نہیں آیا ۔

صفحہ ۲۱۷ : کہتے ہیں کہ جلال الدین خلجی کی وفات کے بعد امیر خسرو ، علاء الدین کی ملازمت میں آ گئے ۔ انہوں نے اس کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے اور ایک مثنوی ، جس کا نام 'خزائن الفتوح' ہے ، اس کی جنگوں اور فتوحات کے بیان میں لکھی ۔

کئی قصیدے کیسے ؟ علاء الدین (۶۹۵ - ۷۱۵ھ) کا زمانہ خسرو کی تالیفی زندگی کا خوش ترین و بہترین زمانہ ہے ۔ ان کی اکثر تصنیفات اسی عہد میں ختم ہوتی ہیں ۔ خمسے کی پانچوں مثنویاں ، دول رانی خضر خان ، 'خزائن الفتوح' اور

۱۔ فاضل مصنف کا خیال صحیح ہے ۔ اُس زمانے میں 'ملک' اور 'امیر' خطابات تھے ۔ اس شخص کا نام صرف علی ہے جیسا کہ امیر خسرو اپنے 'اسپ نامے' میں کہتے ہیں :

شاہ عہد اختیار دولت و دین
آفتاب شرف بخانۂ دین

ہم علی نام ہم بشیردلی
شیر دلدل سوار ہمچو علی

(تاریخ فیروز شاہی ، مرتبہ شیخ عبد الرشید ، صفحہ ۱۳۸) ۔
علاوہ ازیں پروفیسر شیخ عبدالرشید تاریخ فیروز شاہی ، حصہ اول صفحہ ۱۳۸ و ۱۳۹ کے حواشی میں ایک ایسے نسخے کا حوالہ دیتے ہیں جس میں ایک جگہ اس شخص کو 'ملک علی' اور دوسری جگہ 'امیر علی' کہا گیا ہے ۔
(مرتب)

کم از کم دو دیوان 'غرۃ الکمال' وغیرہ اسی عہد میں تیار ہوتے ہیں ۔ 'اعجاز خسروی' کا بڑا حصہ اسی زمانے کی یادگار ہے ۔ قصائد و غزلیات تو بے شمار ہیں ۔

'خزائن الفتوح' مثنوی نہیں ہے بلکہ نثری تالیف ہے ۔ اس میں علاء الدین کی جنگوں اور اقتصادی اصلاحات کے مختصر ذکر کے علاوہ دکن کی مہموں کا کسی قدر مفصل بیان ہے ۔ خسرو کی نثر خاص قسم کی ہوتی ہے جس کے وہ خود ہی موجد ہیں ۔ 'خزائن الفتوح' سنہ ۷۰۹ھ میں ختم ہوئی ۔

صفحہ ۳۱۷ : یہاں خسرو کے خطابات کی تفصیل دی ہے اور خطاب دینے والوں کے نام گنائے ہیں ؛ مثلاً 'طوطئی ہند' کے واسطے کہا ہے کہ یہ خطاب اہل ہند نے دیا اور ایرانیوں نے اس کی تائید کی ۔ خواجہ حافظ ، شہاب معائی اور عرفی نے اسی نام سے انہیں یاد کیا ہے ۔ ثبوت میں حافظ کا یہ شعر دیا ہے :

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اس شعر میں خسرو کی طرف اشارہ ہمارے نزدیک بعید از قیاس ہے ۔ البتہ شعرائے ہندستان مراد ہو سکتی ہے ۔ لیکن یہ کہنا کہ 'طوطیان ہند' سے مقصد امیر خسرو ہیں ، صریح زبردستی ہے ۔

ہم اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ 'طوطئی ہند' کا خطاب خسرو کو کسی نے نہیں دیا ، بلکہ خود انھوں نے اختیار کیا ہے ، چنانچہ فرماتے ہیں :

چو من طوطئ ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

(دیباچۂ غرۃ الکمال)

صفحہ ۳۱۹ : کہتے ہیں کہ امیر خسرو نے 'مطلع الانوار' کی طرح اپنے دیوان 'غرۃالکمال' کو ، جو مجموعۂ قصائد و غزلیات ہے ، صرف پندرہ روز میں تیار کیا تھا ۔

یہ بیان ہمارے نزدیک ناقابل قبول ہے ۔ 'غرۃالکمال' ایک ضخیم چیز ہے ۔ اس کے صفحات پانسو سات سو کے قریب ہوں گے ۔ کاتب پندرہ روز میں تو اس کی کتابت بھی نہیں کر سکتا ۔ اس کے علاوہ جہاں تک مجھے یاد ہے ، 'غرۃ الکمال' میں معز الدین کیقباد (۶۸۶ - ۶۸۹ھ) ، جلال الدین فیروز شاہ (۶۸۹ - ۶۹۵ھ) اور علاء الدین محمد شاہ (۶۹۵-۷۱۵ھ) کے مدحیہ قصائد شامل ہیں ۔ یہ قصائد

خاص خاص موقعوں پر لکھے گئے ہوں گے - یہی حالت غزلیات کی ہے - ان سب کی فراہمی کے واسطے ایک مدت درکار ہے - لہٰذا یہ کہنا کہ 'غرۃ الکمال' کو امیر نے پندرہ روز میں تیار کر لیا ، ہمارے اعتقاد کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہے[۱] -

شمس العلما نے یہی بیان صفحہ ۳۸۸ پر 'غرۃ الکمال' کی صراحت کے وقت دہرایا ہے - وہاں میں سہو قلم سمجھ کر چھوڑ آیا تھا -

صفحہ ۲۰-۲۲ : خسرو کے ہندی کلام کے سلسلے میں تقی اوحدی اور اس کے مقلّدین کے مبالغہ آمیز اقوال سے انکار کرنے میں میں شمس العلما کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں لیکن میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ امیر نے ہندی میں کچھ نہیں لکھا - ہندی موسیقی کے ساتھ ان کا عالمانہ تبحّر ، ہندی اور ایرانی موسیقی کے ملاپ سے ان کا نئے راگ تیار کرنا ثابت کرتا ہے کہ ہندی میں ان کو کافی مہارت ہوگی - خود امیر نے کسی موقع پر کہا ہے :

من ہم قدری درپیٔ این کار شدم

'این کار' سے مقصد ہندی گوئی ہے - پروفیسر اگر نہ مانیں تو اس کا کوئی علاج نہیں ورنہ امیر نے دیباچۂ 'غرۃ الکمال' میں صاف فرمایا ہے کہ :

"جزوی چند نظم ہندوی نیز نثر دوستان کردہ شدہ است ، این جا اسم بذکری پیش کردم -"

جس سے ثابت ہے کہ 'غرۃ الکمال' کی تصنیف کے وقت وہ چند جزو ہندی میں

۱- دیوان 'غرۃالکمال' سنہ ۶۹۳ ہجری میں ترتیب دیا جاتا ہے - اس کے دیباچے میں خسرو خود کہتے ہیں : "از تاریخ سنہ خمس و ثمانین و ستمائۃ کہ سہ و چہار سالہ بودم تا غایت بر محرران دیوان جمع آمدہ بود ھمہ درین دفتر مثبت افتاد و بعد ازین ہرچہ جمع گردد ہم درین کارخانہ خرچ شود -"
(دیباچۂ غرۃ الکمال ، صفحہ ۸۴ ، مطبع قیصری ، دہلی)
گویا آٹھ نو سال کے عرصے میں کہا ہوا کلام اس میں شامل ہے - مندرجہ بالا اقتباس کے آخری فقرے سے پروفیسر وحید مرزا نے صحیح استنباط کیا ہے کہ سنہ ۶۹۳ھ کے بعد موزوں کیا ہوا کچھ کلام بھی یقیناً اس میں شامل ہے (دیکھیے امیر خسرو ، از وحید مرزا ، صفحہ ۱۵۹) (مرتّب)

لکھ چکے تھے -

صفحہ ۳۲۲ : 'خواجہ حسن سنجری دہلوی'۔ پروفیسر نے جس طرح خواجہ معین الدین چشتی کو سنجری بنا دیا ہے ، اسی طرح امیر حسن دہلوی کو بھی سنجری مان لیا ہے - اور پروفیسر بھی کیا کریں ، فارسی سے عدمِ مزاولت کی بنا پر ہمارے ہاں جاہل کاتب پیدا ہو رہے ہیں اور ان کی جدت کا ایک کارنامہ تو یہی ہے کہ 'سجزی' کا 'سنجری' اور 'نخشبی' کا 'بخشی بنا دیا - یہ غلطی اس قدر عام ہو گئی ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان و قلم سے بھی سنجری ٹپک جاتا ہے - یہی نہیں بلکہ نہ جاننے والے اپنی غلطی پر ضد اور اصرار کرنے لگتے ہیں اور خود کو سچا سمجھتے ہیں - ہمارے شمس العلما کی بھی یہی حالت ہے ؛ وہ ان دونوں بزرگوں کی نسبت میں صحیح 'سجزی' ترک کرکے غلط 'سنجری' کی حمایت کر رہے ہیں - انہوں نے حسن کے تعلق میں جس قدر شواہد پیش کیے ہیں ، سب جگہ سجزی کی تصحیف سے سنجری بن گیا ہے - ان کا یہ خیال ہے کہ حسن دہلوی کے اسلاف میں کوئی شخص سلطان سنجر سلجوق کی ملازمت میں کسی بڑے عہدے پر ممتاز ہوگا ، اس وجہ سے خاندانی اعزاز کے واسطے اس کی اولاد نے یہ نسبت امتیازاً اپنے نام کے ساتھ لگالی - یہ عقیدہ 'مجموعہ' تذکار' کے بیان پر مبنی ہے جس کے الفاظ ، جس طرح کہ پروفیسر نے نقل کیے ہیں ، یوں ہیں :

''گویند لقب وی امیر از قدیم است کہ اجدادش در عہد سلطان سنجر سلجوق از این نسبت ممتاز بودہ اند'' (صفحہ ۳۲۴) -

مصنف 'مجموعہ' تذکار' کا مقصد 'امیر' کے لفظ سے ہے جو ان کے نام کے ساتھ ہے ، نہ سنجری سے - بہرحال نہ امیر خاندانی خطاب ہو سکتا ہے ، نہ سنجری - امیر حسن کو امیر کا خطاب دینے والے سلاطینِ ہند ہیں اور کوئی عجب نہیں اگر جلال الدین خلجی نے حسن اور خسرو کو ساتھ ہی یہ خطاب عطا کیا ہو - سنجری اور سجزی کی بحث کے متعلق بہترین مدار علیہ قدیم مخطوطات ہیں اور ہم پروفیسر صاحب سے درخواست کریں گے کہ ان الفاظ کی صحت کے واسطے ان مخطوطات کو دیکھیں -

صفحہ ۳۲۶ : امیر حسن کے دیباچے کی عبارتِ حاشیہ ''و معاملہ' ابن مصالح را قدلکی پیدا شد'' 'قدلکی' کی جگہ 'فذالکی' چاہیے -

صفحہ ۴۶۴ : برنی کی عبارتِ حاشیہ ''تا روزی در اثنای سواری کذا غازی بچہ مہِ پارہ'' میں 'گدا غازی بچہ' مہ پارہ' مناسب ہے ۔

صفحہ ۴۶۸ : برنی کی عبارتِ حاشیہ ''و سلطان را از شوخی آن رہ دیدگان'' میں 'زہ دیدگان' چاہیے ۔

صفحہ ۴۷۵ : کہتے ہیں 'ضیاء برنی کے تعلقات امیر خسرو اور خواجہ حسن کے ساتھ نہایت دوستانہ تھے اور آخر تک پائدار رہے ۔ بلکہ یہ برنی ہے جو ان دونوں بزرگوں میں دوستی کا باعث بنا اور دونوں بہ وجہِ ذوقِ مشترک ، یعنی شاعری ، اس کے ساتھ بڑی محبت رکھتے اور عزت سے پیش آتے ۔ یہ اتحاد اس قدر زبردست تھا کہ تینوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے جدائی گوارا نہ کرتا اور نہ ان کی غیرحاضری میں خوش نظر آتا ۔'

یہ بیان اگرچہ بڑی حد تک برنی کے اپنے بیان پر مبنی ہے ، ہمارے خیال میں محل نظر ہے ۔ برنی کے ساتھ خسرو اور حسن کے روابط ان کی عمروں کا فرق دیکھتے ہوئے اتنے گہرے نہیں ہو سکتے ۔ جب برنی پیدا ہوتا ہے ، دونوں بزرگ بتیس تینتیس سال اپنی عمر گزار چکے ہیں ۔ عمروں کا یہ تفاوت بجائے خود اس گہرے ارتباط کا مانع ہے جس کا برنی مدعی ہے ۔ خسرو کے انتقال کے وقت برنی مشکل سے چالیس سال کا ہوگا ۔ شاہی ملازمت میں اگر اس کو کوئی عروج ملا تو وہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں ملا ہے ۔ اس وقت تک خسرو وفات پا چکے ہیں ۔ رہا ذوق شعر جس کو شمس العلما تینوں میں قدرِ مشترک مانتے ہیں ، اس کے متعلق عرض ہے کہ شمس العلما پہلے شخص ہیں جو برنی کو شاعر بیان کرتے ہیں ۔ اس کی شہرت بحیثیت مورخ ہے نہ بحیثیت شاعر ۔ برنی کے اس بیان کو بھی ہم مشتبہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ان دونوں بزرگوں میں دوستی کا باعث بنا ہے ۔ کیا یہ دو بلند پایہ شاعر ، جن کی عمر کا اکثر حصہ دہلی میں بسر ہوتا ہے ، جہاں انھیں سینکڑوں مواقع ملنے جلنے کے میسّر ہو سکتے تھے اور دونوں خان شہید کی خدمت میں برسوں ملازم بھی رہے ، برنی کے زمانے تک ایک دوسرے سے ناواقف رہے ؟ ہمارے خیال میں ناقابلِ یقین ہے ۔ برنی کا بیان میرے سامنے نہیں ہے مگر میں سمجھتا ہوں ، اس کا مطلب جو شمس العلما سمجھے ہیں ، اس سے مختلف ہے ۔ یعنی برنی کے ذریعے سے ان میں یگانگت یا رشتہ داری کا سلسلہ قائم ہوا ہے ، ورنہ ان بزرگوں کے سامنے برنی کی حیثیت خورد اور شاگرد کی سی ہو سکتی ہے ۔

صفحہ ۴۷۵ : کہتے ہیں 'شاعری میں برنی کے پائے کا اندازہ اس کے کلام بالخصوص قصائد ، قطعات ، رباعیات و مراثی سے ہو سکتا ہے ، جو ہم تک پہنچے ہیں ۔ بعض کے نمونے درج ہیں . . . .'

شمس العلما نے کل چھ مختلف نمونے دیے ہیں جن میں تیئیس شعر ہیں ۔ ان میں سے میں تین آخری نمونوں سے یہاں بحث کرتا ہوں ۔ ان نمونوں پر میں نے کتاب میں ترتیب کے مطابق ہندسہ شمار ڈال دیا ہے ۔

نمبر ۴ (صفحہ ۴۷۶) : 'اس نے متعدد قصائد اپنے سرپرستوں کے اعزاز میں لکھے ہیں جن کے نمونے اس کی تاریخ اور دیگر تاریخی مصنفات میں محفوظ ہیں ۔ ان میں سے ایک سلطان فیروز شاہ کی مہم شکار کے وقت خاص شکارگاہ میں پڑھا گیا تھا ۔ ان اشعار کا بعد میں بھی چرچا رہتا ، جب کبھی بادشاہ شکار پر جاتے :

پیش تیرش آھوان را از پیٔ رد و قبول
شیر گردد خون ز بیم و خون شود شیر از رجا
پیش پیکان دو شاخش از برای سجده را
شیر چون شاخ گوزنان پشت را سازد دو تا
می شنیدم کز نہیب ترس این شیر زمین
شیر گردون را اغثنا یا غیاث آمد ندا

ان اشعار سے قبل پروفیسر کی عبارت حالی نہیں بلکہ خیالی تصور ہونی چاہیے ، جو زیادہ تر اس گمان میں لکھی گئی ہے کہ ان کا قائل برنی ہے ۔ حقیقت میں یہ اشعار خاقانی شروانی کے ایک قصیدے سے ہیں جو اس نے خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کے شکار کے بیان میں لکھا تھا ۔ اس کا مطلع ہے :

از سر زلف تو بوی سر بمہر آمد بما
جان بہ استقبال شد کای مہد جانہا تاکجا

(قصائد خاقانی ، جلد اول ، صفحہ ۹۳ ، نول کشور)

دوسرے شعر میں 'سازد' کی جگہ 'کردی' صحیح ہے[1] ۔

۱۔ دیوان خاقنی ، طبع ایران ، ۱۳۳۶ھ ش (صفحہ ۲۳) میں بھی 'کردی' ہے ۔ (مرتب)

نمبر ۵ (صفحہ ۴۷۷) : کہتے ہیں 'اس کے مرثیے اور بھی زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں - جو مرثیہ اس نے اپنے مربی" سلطان محمد تغلق کی وفات پر لکھا ہے سوز و درد ، آمد اور انداز بیان کے لحاظ سے نہایت غیر معمولی ہے - اس کا کچھ حصہ جو یہاں نقل ہوتا ہے ، محفوظ ہے :

سر الپ ارسلان بینی ز رفعت رفتہ بر گردون
بمرد اما بہ خاک اندر تن الپ ارسلان بینی
امیرانی کہ بر قصرش ہزاران پاسبان بودی
کنون بر قبۂ گورش کلاغان پاسبان بینی

یہ ابیات نہ برنی کے ہیں ، نہ کسی کے مرثیے میں لکھے گئے - حکیم سنائی غزنوی ان کے مالک ہیں اور ان کے نہایت مشہور قصیدے سے ، جو پند و عبرت پر لکھا گیا ہے ، تعلق رکھتے ہیں - (اس قصیدے کے لیے ملاحظہ ہو کلیات سنائی ، صفحہ ۱۱۲ ، طبع طہران) - ضیا برنی کا قصور اتنا ہے کہ اس نے محمد بن تغلق کی وفات کے بیان میں مناسب سمجھ کر نقل کر دیا - باقی امور شمس العلما کے سرسبز تخیل کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں -

نمبر ۶ (صفحہ ۴۷۸) :

مایہ زہر است شرب عالم را
میسوہ مرگست تخم آدم را

ای حریف عدم قدم در نہ
کم زن این عالم کم از کم را

صبح محشر دمید ما را خواب
بانگ زن خفتگان عالم را

رستخیز است خیز باز شگاف
سقف ایوان طاق طارم را

شہ محمد بخفت در دل خاک
نیلگون کن لباس ماتم را

پس بدست خروش بر تن دہر
خاک زن این قبای معلم را

یہ اشعار بھی خاقانی کے ہیں اور کلیات خاقانی (جلد اول ، صفحہ ۵٦۲) میں ملتے ہیں ۔ قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ برنی کی تاریخ میں ان کا ایراد ہوا اس لیے یہ قرینہ کہ وہ اسی مؤرخ کے شعر ہوں گے ، ہمیں کعبے سے ترکستان لے جائے گا ۔ برنی کے واسطے شاعری کا دعویٰ ہمارے نزدیک ناقابل یقین ہے ۔ نہ کسی نے اس کو شاعر مانا ، نہ شاعر کی حیثیت سے کبھی اس کا ذکر آیا ۔ پروفیسر پہلے شخص ہیں جو اس کی شاعری کی داستان ہمیں سناتے ہیں ۔

ایک امر قابل گزارش ہے ؛ برنی کے دور میں ضیاء نام کے تین شخص مشہور ہیں ۔ پہلا یہی ضیاء برنی ، دوسرا ضیاء سنامی جو 'نصاب الاحتساب' کا مصنف ہے ۔ تیسرا ضیاء نخشبی جو زبردست نثار ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہے ۔ اس کا 'طوطی نامہ' نہایت مشہور اور مقبول ہے اور درس نظامیہ میں شامل رہا ہے ۔ 'گل ریز نخشبی' تصوف میں اس کی ایک اور تالیف ہے ۔ ممکن ہے کہ پروفیسر نے ناموں کی مماثلت کی وجہ سے برنی کو نخشبی سمجھ لیا ہو ۔

صفحہ ۴۸۳ : کہتے ہیں 'تاج الدین سنگ ریزہ ایک خراسانی شاعر' جو بہ زمانۂ طفولیت سلطان شمس الدین التمش کے دور میں ہندوستان آیا ، ایک قصیدے میں کہتا ہے :

خیز از منی قدیم ِ مرا سیر کن برطل
بگذر ازین حدیث کہ یک سیر و یک من است

فارسی شعرا کی زبان پر ہندی اثر دکھانے کی غرض سے یہ شعر لایا گیا ہے جس میں سیر اور من ہندی الفاظ ہیں ۔ یہ بجائے خود درست ہے لیکن اس موقع پر پروفیسر ایک عجیب غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں ۔ گویا ان کے نزدیک دور شمسی میں دو تاج الدین ہیں ۔ پہلا تاج الدین دبیر دہلوی مذکورۂ صفحہ ۳۳۸ جس کا دادا سنہ ۵۸۰ھ میں دہلی آیا اور جس کا باپ عنقریب بعد پیدا ہوا ۔ دوسرا تاج الدین سنگ ریزہ شاعر خراسان جو بہ عہد شمس الدین ہندوستان آیا ۔ یک نشد دو شد ۔ ہمارے خیال میں تاج الدین دبیر یا تاج ریزہ یا تاج سنگ ریزہ ایک ہی شخص ہے ۔ 'فرہنگ نامۂ قواس' میں اس کو تاج دبیر عرف ریزہ کہا گیا ہے ۔ وہ رشید وطواط کا جواب ہے جس کا قامت نہایت مختصر تھا ۔ تاج بھی اپنی کوتاہ قامتی کی بنا پر 'سنگ ریزہ' یا 'ریزہ' کہلاتا تھا ۔ وہ ایرانی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اس کے اپنے شعر سے ثابت ہو چکا ہے ۔

اکثر تذکرہ نگار اس کو تاج ریزہ لکھتے ہیں لیکن 'سیر العارفین' میں جمالی نے سنگ ریزہ تحریر کیا ہے ۔ التمش اور رکن الدین فیروز کے علاوہ اس نے غیاث الدین محمد خلف شمس الدین التمش اور التمش کے وزیر قوام الدین محمد جنیدی اور غالباً رضیہ سلطان کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں ۔ سیر و من والا شعر غیاث الدین محمد کے مدحیہ قصیدے میں آتا ہے ، اس کا مطلع ہے :

ساقی بیا کہ وقت مئی لعل روشن است
میدان خاک تیرہ کنون سبز گلشن است

صفحہ ۳۸۳ : کہتے ہیں 'سلطان معز الدین کیقباد کے کسی درباری شاعر کی تصنیف کردہ خالص ہندی نظم سے شعر ذیل نہایت ضروری ہے :

من کی اوجڑی نگری کو تب کریں آبادان
ناصر دیں سے جب ملیں موج دین کبادان'

کہا گیا ہے یہ ایک طویل تہنیتی نظم ہے جو امیر خسرو کی 'قران السعدین' کے شاہی افراد سلطان ناصر الدین بغرا خان والیٔ بنگالہ اور اس کے فرزند سلطان معز الدین کیقباد بادشاہ دہلی کی تاریخ ملاقات کے وقت ، جو سنہ ۶۸۸ھ میں دارالسلطنت میں ہوئی تھی ، لکھی گئی تھی ۔

شمس العلما ، امیر خسرو کی ہندی شاعری کے منکر ہیں مگر اسی عہد کے کیقباد کے درباری ہندی شاعر کی شاعری اور اس کی طویل تہنیتی نظم پر بغیر تحقیق و تلاش ایمان لے آئے ۔ شعر جو نمونے کا دیا ہے ، اس کی زبان متاخرین کے رنگ میں ہے ۔ اس کو کون سات سو پونے سات سو سال پہلے کی زبان مانے گا ۔ کی ، کو ، سے ، تب ، جب وغیرہ حروف ۔ کریں ، ملیں مضارع زمانۂ حال کے رنگ میں ہیں ۔ یہی حالت اس ترکیب کی ہے جو 'من کی اجڑی نگری' میں ہے ۔ اس زبان میں معز الدین کے عہد کی بو باس تک نہیں ۔

سلطان معز الدین اور اس کے والد ناصر الدین میں ملاقات دارالسلطنت دہلی میں نہیں ہوئی بلکہ کڑہ کے قریب دو دریاؤں کے مابین ، جن کے نام گھگر اور سرو ہیں ۔ امیر خسرو 'قران السعدین' میں فرماتے ہیں :

نصب شد اعلام شہنشاہ دہر
بر لبِ گھگر بحوالیِ شہر

کھکو ازین سوی و سرو زان طرف
از تف لشکر بلب آوردہ کف

یہاں کتاب کا آخری باب ختم ہوتا ہے ۔

اب ہم اور زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں ، ہندوستان میں قبل مغل فارسی ایک صبرآزما مطالعہ اور طویل تحقیقات کی طلبگار ہے ۔ غوریوں سے قبل کے فارسی شعرا پر کافی کام ہو چکا ہے ۔ اسی طرح مغلیہ عہد کے واسطے ضرورت سے زیادہ ذرائع موجود ہیں ، لیکن غوریوں کے زمانے سے لے کر مغلوں کے عہد تک ، جو تقریباً ساڑھے تین صدی کا زمانہ ہے ، فارسی شاعری کا تاریک دور کہا جا سکتا ہے ۔ یہ زمانہ فتح دہلی سے ، جو سنہ ۵۸۸ھ میں ہوتی ہے ، آغاز پا کر ابراہیم لودھی اور بابر کی جنگ پانی پت کے وقت ، جو سنہ ۹۳۲ھ میں ہوتی ہے ، ختم ہوتا ہے ۔ اس عہد کے شعرا و دیگر مصنفین اور ان کے حالات ، سوائے چند کے ، جو زیادہ مشہور ہیں ، بالکل نامعلوم ہیں ۔ شمس العلما کی غایت اصلی یہی دور ہے مگر وہ حشو و زوائد میں اس قدر مشغول رہے ہیں کہ اصلی مضمون پر کافی وقت اور توجہ نہ دے سکے : ع

غم بیرون گرفت از ما هوای منزل ما را

نہ ان کی تحقیقات اس تمام زمانے پر حاوی ہے بلکہ برنی کی وفات پر ، جو ۷۵۸ھ میں ہوتی ہے ، کتاب کو ختم کر دیا ہے ۔

شمس العلما اس تمام تحقیقات سے ، جو پچھلے چند سال میں اسی مضمون پر ہوئی ہے اور ملک میں شائع ہوچکی ہے ، بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں ۔ میں بعض نام یہاں درج کرتا ہوں :

(۱) 'تنقید شعرالعجم' جو رسالۂ 'اردو' اورنگ آباد میں سنہ ۱۹۲۲ع سے ۱۹۲۷ع تک شائع ہوتی رہی اور اب انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کتابی صورت میں شائع کر رہی ہے[1] ۔

۱۔ تنقید شعرالعجم ، انجمن ترقی اردو (ہند) نے سنہ ۱۹۴۲ع میں شائع کی تھی ۔ دوسری بار یہ تنقید ، مقالات حافظ محمود شیرانی کے سلسلے میں بطور جلد پنجم ، مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کی گئی ہے ۔ (مرتّب)

(۲) 'دی ارلی پرشین پوئٹس آف انڈیا' (ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا) از ڈاکٹر اقبال حسین ، پروفیسر پٹنہ کالج - طبع سنہ ۱۹۳۷ع - یہ مختصر جلد تقریباً وہی زمین طے کر رہی ہے جو خود پروفیسر نے طے کی ہے -

(۳) 'امیر خسرو' از ڈاکٹر وحید مرزا ، پروفیسر عربی لکھنؤ یونیورسٹی ، جسے پنجاب یونیورسٹی نے اب سے چند سال قبل اپنے صرفے سے شائع کیا ہے -

(۴) 'مفتاح الفتوح' از امیر خسرو دہلوی ، طبع شدۂ اوریئنٹل کالج میگزین مئی و اگست سنہ ۱۹۳۶ع -

(۵) عزیزم آغا عبدالستار کے بعض مضامین ، شائع شدۂ اوریئنٹل کالج میگزین ، بدیں تفصیل :

(الف) 'سلطان ناصرالدین قباچہ اور اس کے درباری شعرا' بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۸ع و فروری سنہ ۱۹۳۹ع -

(ب) 'التمش کے دور میں علمی و ادبی تحریکات ، مئی سنہ ۱۹۳۹ع -

(ج) 'روحانی' اگست ۱۹۴۰ع -

(د) 'عہد شمسی کا ایک مؤرخ شاعر' مئی سنہ ۱۹۳۸ع -

(۶) 'دہلی کا ایک قدیم شاعر تاج الدین سنگ ریزہ یا ریزہ' از یٰسین خان نیازی ، نومبر سنہ ۱۹۳۴ع -

(۷) 'دیوان خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیری' 'رسالۂ اردو' اورنگ آباد ، جولائی سنہ ۱۹۲۴ع -

یہ فہرست ابھی ناتمام ہے - تلاش سے اور مضامین بھی دستیاب ہو سکتے ہیں -

کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر کام پروفیسر نے کیا ہے ، اس سے کہیں زیادہ وہ چھوڑ گئے ہیں - مثلاً قباچہ ، جو ۶۰۲ھ میں والیٔ ملتان مقرر ہوتا ہے ، علم و ادب و شعر و سخن کا بڑا سرپرست تھا - اس کا دربار مرجعِ اہل کمال تھا - اس کے وزیر عین الملک اشعری کی معارف پروری کی بنا پر اچھے شعرا اور فضلا ملتان میں جمع ہوگئے تھے - محمد عوفی اس وزیر کو صاحب اسمعیل عبّاد اور

نظام الملک کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے ۔ عوفی اپنے تذکرے میں تمام شعرائے دربار کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ وہ کہتا ہے مجدالدین سید الافاضل نے اپنے دیوان (تذکرہ) میں ان کا ذکر کیا ہے ۔ اس لیے وہ صرف چند ناموں پر کفایت کرتا ہے یعنی تاج الفضلا شمس الدین محمد کاتب بلخی ، جو شعر میں عدیلِ انوری اور خط میں ابن مقلہ کا ہم پایہ تھا ، وہ قباچہ کے مداحین میں سے ہے ۔ اس کے ایک مدحیہ قصیدے کے مطلع پر قناعت کرتا ہوں :

ای لبِ لعلت مزاجِ آبِ حیوان یافتہ
بر جہان دلبری حسن تو فرمان یافتہ

تاج الفضلا فضلی ملتانی ، بخارا میں عوفی کا ہم مکتب تھا ، جامع الصغیر قاضی امام فخر الدین جان دونوں مل کر حفظ کرتے تھے ۔ نمونۂ کلام :

ای ظفر همدم ترا از بخت بر تا آمده
نامۂ تائید تو انّا فتحنا آمده

فخر الشعرا ضیاء الدین سجزی ۔ منہ :

خیل لالہ کز کمین گاہ بہار آمد پدید
بر بساط باغ آنک با زمانہ در وغاست

صدر الاجل . . . جنہیں سلطان جلال الدین نے 'بغروش' کا خطاب دیا تھا ۔ منہ :

گفتم بدان نگار کہ خورشید انوری
گفتا ز وی نکوترم ار نیک بنگری

سدید الدین محمد عوفی بخاری المولد ، امام رکن الدین بخاری اسناد ہیں ۔ شوق علم میں سمرقند ، خوارزم ، نیشاپور ، ہرات ، اسفزار وغیرہ شہروں کا سفر کیا ۔ پہلے قلج ارسلان خان نصرت الدین عثمان بن ابراہیم کے دربار سے تعلق پیدا کیا ۔ سنہ ۶۱۷ھ میں ملتان آ پہنچا ۔ کمبایت کا قاضی بنا کر بھیج دیا گیا ، جہاں کتاب 'الفرج بعد شدت' کا فارسی میں ترجمہ کرکے سلطان قباچہ کے نام معنون کیا ۔ فارسی کا سب سے قدیم اور اہم تذکرہ عوفی نے ملتان میں بیٹھ کر تالیف کیا ہے ۔ جس طرح یہ تذکرہ اہم ہے اسی طرح اس کی دوسری تصنیف 'جوامع الحکایات' فارسی زبان کی چوٹی کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے ۔ دونوں کتابیں عین الملک اشعری کے نام پر لکھی گئی ہیں ۔ عوفی نے بیسیوں دعائیہ قطعے اس وزیر کی شان میں لکھے ہیں ۔

قاضی منہاج سراج بھی اولاً دربار قباچہ سے رجوع کرتے ہیں ۔ جب ملتان پر التمش کا قبضہ ہوگیا ، قاضی اور محمد عوفی التمش کی ملازمت میں داخل ہوگئے ۔ ناصرالدین قباچہ کا عہد ، جو سنہ ۶۲۵ھ میں ختم ہوتا ہے ، ہرحال میں فارسی شاعری اور اس کی تاریخ کا ایک زریں دور ہے جس کو دنیا فراموش کر چکی ہے ۔

سلطان شمس الدین کے عہد میں امیر بہاء الدین علی الجامجی مجد الملک کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے ، جو ایک کامیاب فاتح سپاہی ہونے کے علاوہ ایک خوش طبع شاعر بھی ہے ، جس کو سیاسیات کے مد و جزر نے کبھی قید اور کبھی فتح کی دو عملی میں آباد رکھا ۔ عوفی اس کے مفصل حالات دیتا ہے ۔ اس کی رباعیاں خاص طور پر دلچسپ ہیں ۔

فخر مدبّر ، کتاب 'آداب الحرب' ، جو عہد شمسی کی سب سے اہم تالیف ہے ، التمش کے نام پر لکھتے ہیں ۔ یہ فنونِ جنگ و طریقِ حرب پر بہترین کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے ۔

مؤید جاجرمی ، اس عہد کا مشہور فاضل ، التمش کے نام پر امام غزالی کی 'احیاء العلوم' کا فارسی ترجمہ تیار کرتا ہے ۔ اس ترجمے کا ایک قدیم نسخہ آٹھویں صدی ہجری کا نوشتہ پرنسپل محمد شفیع کے کتب خانے کی زینت ہے ۔

اسی عہد میں امام رازی کی عربی تالیف 'سرّ مکتوم' کا ترجمہ ، رکن الدین فیروز کے حکم سے ، فارسی میں لکھا جاتا ہے ۔

سلطان رضیہ کے زمانے میں امیر امام ناصر (ی) شاعر کا نام سنا جاتا ہے ۔ ناصر الدین محمود اور اس کے جانشین بلبن کے زمانے میں شمس دبیر ہے[1] ،

۱۔ اس کی بابت بدایونی لکھتا ہے : ''و از جمعی کہ در عہد ناصری کوس شاعری نواختہ بدرجۂ ملک العلامی رسیدہ بودند ، یکی شمس الدین دبیر است کہ آثار فضائل و کمالات او از حد بیان و توصیف و تعریف مستغنی است و میر خسرو قدس اللہ سرّہ عیار اشعار خود را بر محک قبول طبع او زدہ بآن مباہات فرمودہ و در دیباچہ غرۃ الکمال و در آخر ہشت بہشت کلام خود را بذکر محامد و نشر مناقب او زیور تمام بخشید'' (منتخب التواریخ ، جلد اول ، صفحہ ۹۴ ، طبع کلکتہ ، سنہ ۱۸۶۵ء) ۔ (مرتّب)

جس نے شیخ فرید الدین شکرگنج کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے ۔ شمس، نظام الدین اولیا کا استاد بھی ہے ۔ انھوں نے 'مقامات حمیدی' اس سے پڑھی اور علمِ حدیث حاصل کیا ۔ بلبن، شمس کو اپنے فرزند بغرا خان کا مستوفی[1] بناتا ہے ۔ تاج ریزہ مبارک باد میں کہتا ہے :

شمسا کنون بکامِ دلِ دوستان شدی
مستوفیٔ ممالکِ ہندوستان شدی

'اعجاز خسروی' کے ایک فقرے سے مفہوم ہوتا ہے کہ شمس دبیر نے اپنا دیوان امیر خسرو کو دیا تھا[2] :

''و دیوان خاص کہ نظمش از نثرہ و شعری سخن میگوید یادگار بکاتب سپرد ۔''

'قران السعدین' سے پایا جاتا ہے کہ بغرا خان نے اس کو اپنا ایلچی بنا کر کیقباد کے پاس[3] روانہ کیا تھا :

دید کہ کس نیست ز برنا و پیر
در خور این کار چو شمس دبیر

شمس کا ایک قصیدہ بدایونی کی تاریخ میں محفوظ ہے ۔ اس کا مطلع ہے :

ای ہمہ کار دلم از تو بنادانی خام
دادۂ دوش مرا وعدۂ مہمانی خام

۱- بدایونی کے الفاظ ہیں : ''و سلطان غیاث الدین بلبن و در آخر حال او را منشیٔ مملکتِ بنگالہ و کامرود ساختہ در ملازمت پسر بزرگ خویش نصیر الدین بغرا خان گذاشتہ بود'' (منتخب التواریخ، جلد اول، صفحہ ۹۴، طبع کلکتہ، سنہ ۱۸۶۵ء) ۔ (مرتّب)

۲- اوریئنٹل کالج میگزین (مئی سنہ ۱۹۳۹ع) صفحہ ۴۸ ۔ (ملاحظہ کیجیے اعجاز خسروی، طبع نولکشور، سنہ ۱۸۷۶ع، رسالہ خامسہ، صفحہ ۵۴) ۔ (مرتّب)

۳- اوریئنٹل کالج میگزین (مئی سنہ ۱۹۳۹ع) صفحہ ۴۸ ۔ (ملاحظہ فرمائیے قران السعدین، طبع نولکشور، سنہ ۱۲۸۷ھ، صفحہ ۸۷) ۔ (مرتّب)

شمس العلما ، صوفی شعرا کی طرف خاص طور پر مائل ہیں ۔ تعجب ہے کہ وہ شیخ جمال الدین قطب ہانسوی متوفی سنہ ٦٥٩ھ کو بالکل فراموش کر گئے ۔ وہ ایک ضخیم دیوان کے مالک ہیں جو گزشتہ صدی میں طبع بھی ہوگیا ہے ۔

جلال الدین خلجی خود شعرگوئی کی طرف رغبت رکھتا تھا ۔ اس کے اشعار برنی اور بدایونی کے ہاں ملتے ہیں ۔ اس کے درباری شعرا میں بدایونی نے مؤید جاجرمی ، امیر ارسلان ، کاتبی ، سعد منطقی ، باقی خطیب اور قاضی مغیث الدین ہانسوی کے نام دیے ہیں ۔ ان میں مغیث زیادہ مشہور ہے ۔ اس نے ایک غزل لکھی تھی جو انتیس وزن میں پڑھی جا سکتی تھی ۔ مغیث کے کلام کے نمونے 'شرح مخزن اسرار' اور 'دستورالشعرا' مرتبۂ سنہ ۸۰۳ھ میں ، جو مبارک شاہ شرقی والیٔ جون پور کے نام پر لکھی جاتی ہے ، درج ہیں ۔

عہدِ علائی میں فخرالدین مبارک قوّاس غزنوی ، مؤلفِ 'فرہنگ نامہ' ایک مشہور شاعر اور صاحبِ دیوان ہیں ۔ برنی اور مولانا رفیع دونوں ان کا ذکر کرتے ہیں ۔ رفیع نے انھیں استاد الشعرا کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ شہاب الدین جوہری ایک اور شاعر ہیں ۔ ان کا ذکر 'دستورالافاضل' میں آتا ہے ۔ جوہری ، قوّاس مذکور کے حق میں لکھتے ہیں :

فخر دین ، کان کرم ، گنج هنر ، دریای فضل
ای بطبعت یک سخن سرمایۂ صد جوهری

حضرت بوعلی شرف قلندر پانی پتی صوفی شاعر ہیں ۔ ان کی مثنوی اور دیوان بنا بر کثرتِ شہرت محتاجِ بیان نہیں ۔

غیاث الدین تغلق کے زمانے میں سعد فلسفی اور عبید شاعر کا نام ، جو بڑے فتنہ‌پرداز تھے ، ضیاء برنی اور دیگر مورخین نے لیا ہے ۔ بدایونی کے قول کے مطابق خسرو اپنی تالیفات میں ان دونوں کے شاکی نظر آتے ہیں ۔ عبید اپنے آپ کو خسرو کا مد مقابل سمجھتا تھا ۔ خسرو کے حق میں اس کا یہ شعر مشہور ہے :

غلط افتاد خسرو را ز خامی
کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

یہی عبید دوسرے موقع پر کہتا ہے :

دوش دیدم نظامی اندر خواب
گوئیا شستہ خمسہ را می شست

گفتم ای شیخ از چہ می‌شوئی ؟
ای بزرگ زمانہ پشت بہ پشت
گفت از ننگِ خسرو لاچین
کو چہ داند جوابِ خمسہ گفت

امیر خسرو نے اسی کو الٹ دیا اور لکھا :

دوش دیدم نظامی اندر خواب
بر دھانِ عبید می‌زد مشت

گفتم ای شیخ از چہ رنجیدی ؟
چہ گنہ کرد این خبیث درشت ؟

گفت بنگر چہ افترا کردہ است
خمسۂ خویش را نظامی شست

بدویدم بپایش افتادم
ورنہ این سفلہ را بجا می‌کشت

بدرچاچ استعارہ گوئی کا بادشاہ ہے ۔ اس کے قصائد درسِ نظامیہ میں اب تک داخل رہے ہیں ۔ اس کا شاہ نامہ ، محمد بن تغلق کی تاریخ میں ، تیس ہزار ابیات پر مشتمل تھا ۔ تاریخ گوئی میں بامعنی مادۂ تاریخ کا فقرے کے ذریعے استخراج سب سے پیشتر اسی کے ہاں ملتا ہے ۔ قلعۂ نگر کوٹ کی تاریخِ فتح 'ادخلوا فیہا' اسی نے کہی ہے جس سے ۷۳۸ھ بر آمد ہوتے ہیں ۔ ناصر الدین ایک اور شاعر ہے جس کی ہجو میں بدرچاچ نے ایک قطعہ لکھا ہے ۔

مولانا رکن الدین ، مرید شیخ نصیر الدین محمود ، ایک فقیہ اور مشّاق شاعر ہیں جو فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی دور میں اپنی مثنوی 'طرفۃ الفقہا' فقہی موضوع پر تالیف کرتے ہیں ۔ اس مثنوی میں تیس ہزار سے زاید اشعار ہوں گے ۔ اس تالیف کا ایک مخطوطہ ، جو بظاہر مصنف کے قلم کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے ، میرے مجموعۂ کتب میں موجود ہے (نمبر ۱۶۸۵) ۔

اسی زمانے میں حمید قلندر ایک اور شاعر گزرے ہیں جو نظام الدین اولیا اور چراغ دہلی کے مرید ہیں ۔ 'خیرالمجالس' چراغ دہلی کے ملفوظات (سنہ ۷۵۵ھ۔ ۷۶۰ھ) حمید قلندر نے تدوین کیے ہیں ۔ وہ شاعرِ بے بدل مانے جاتے ہیں ۔

نمونہ' کلام 'دستور الشعراء' میں موجود ہے ۔

امیر احمد ، خسرو کے فرزند ، ایک خوش مذاق شاعر مانے جاتے ہیں ۔ ان کے ساتھ ایک اور شاعر قاضی عابد کا بھی نام لینا چاہیے ۔ جب فیروز شاہ پدساوتی اور برم تلہ کے جنگلوں میں ہاتھیوں کا شکار کھیلتا ہے ، ملک ضیاء الملک نے یہ رباعی نذر کی :

رباعی

شاہی کہ ز حق دولت پایندہ گرفت
اطراف جہان چو مہر تابندہ گرفت
از بہر شکار فیل در جاج نگر
آمد ، دو بکشت و سی و سہ زندہ گرفت

اس عہد کا سب سے معروف شاعر مطہر کڑہ ہے ، جو فیروز شاہ اور اس کے امرائے عہد کا مداح ہے ۔ مطہر بھی چراغ دہلی کا مرید تھا ۔ بدایونی اس کا دیوان پندرہ ہزار ابیات پر شامل بتاتا ہے ۔ اکبر کے زمانے میں مولانا محمد صوفی نے اس دیوان کا ایک انتخاب ، جس میں پانچ ہزار شعر ہوں گے ، تیار کیا تھا ۔ ڈاکٹر وحید مرزا پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی اور پروفیسر محمد شفیع نے مطہر کے حالات و کلام پر ایک طویل تبصرہ اوریئنٹل کالج میگزین کے کئی نمبروں میں شائع کیا ہے ، جو شمارۂ مئی سنہ ۱۹۳۵ع سے شروع ہوتا ہے ۔

'انشائے عین ماہرو' کا مصنف یعنی ملک الشرق ملک عین الملک ، مطہر کا ممدوح خاص ہے جس کی تعریف میں شاعر نے متعدد قصیدے لکھے ہیں ۔ عین ماہرو نے اسلام آباد کے قریب ایک گاؤں شاعر کو معافی میں دیا تھا ۔

مطہر کا نصاف 'نصیب اخوان' جو بہ تقلید 'نصاب الصبیان' سنہ ۷۷۶ھ میں تالیف ہوتا ہے ، ہندوستان میں بہت مقبول رہا ہے ۔ اب بھی اس کے نسخے اکثر مل جاتے ہیں ۔ اس نصاب کا ایک مخطوطہ بخط محمد زمان ابن عبدالغنی جالندھری نوشتہ سنہ ۱۰۶۹ھ ، جو میرے مجموعے میں ہے ، معلومہ نسخوں میں سب سے قدیم ہے ۔ اس کا نمبر ۲۱۷۵ ہے ۔

شہابی باشندۂ ناگور اس عہد کے نامی طبیبوں میں سے ہیں ۔ بڑے آزاد منش

اور مستغنی المزاج تھے ۔ خدمتِ خلق ، جو فنِ طبابت کی اصلی غایت ہے ، مدت العمر ان کا پیشہ رہی ۔ 'طبِ شہابی' جو منظوم ہے ، انھی کی یادگار اور بہت مقبول ہے ۔ میرے مجموعۂ کتب میں اس کا ایک نسخہ نمبر ۱۸۶۰ ، نوشتہ سنہ ۱۰۰۴ھ موجود ہے ۔ اس کا کاتب راجو ابن سید محمد ہے ۔

'غنیۃ المنیہ' ہندی موسیقی پر ایک قابل قدر تالیف ہے جو فیروز شاہ تغلق کے عہد میں امیر شمس الدولۃ والدین ابراہیم حسن ابو رجا حاکمِ گجرات کی فرمایش پر لکھی گئی ہے ۔ یہ تالیف ہندی مآخذ پر مبنی ہے اور دو قسم ، چار باب اور اٹھارہ فصلوں پر حاوی ہے چنانچہ :

قسم اول : باب اول : در معرفت سرود ۔ (۴ فصل) ۔

باب دوم : در معرفت مزامیر (۲ فصل) ۔

قسم دوم : باب اول : در بیان رقص (۴ فصل) ۔

باب دوم : در شرائط و آداب سرود (۸ فصل) ۔

اس سے پیشتر ایک عربی تالیف 'فرید الزمان فی معرفت الالحان' جس کا موضوع ایرانی موسیقی ہے ، اسی والی کے ارشاد سے ترجمہ ہو چکی ہے ۔

عزالدین خالد خانی ایک شاعر ہے جو 'دلائل فیروز شاہی' بادشاہ کے حکم سے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتا ہے ۔ اسی طرح ایک اور سنسکرت تالیف 'باراہ سنگتا' ہے جو اسی بادشاہ کے حکم سے عبدالعزیز شمس تھانیسری ، مؤلف تاریخ فیروز شاہی ، فارسی میں ترجمہ کرتا ہے ۔ اس کتاب کے دو نسخے میرے کتب خانے میں حاضر ہیں ۔

مسعود بک ، جن کو اقاربِ فیروز شاہ سے بتایا جاتا ہے ، صوفی شاعر اور صاحبِ دیوان ہیں ۔ ان کا دیوان حیدر آباد دکن میں چھپ چکا ہے ۔

فیروز شاہ کے دور میں یہ امر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ ہندوی زبان میں مثنوی بھی لکھی گئی ہے ۔ مولانا داؤد نے کتاب 'چندا ین' ، جو لورک اور چاندا کا عشقیہ افسانہ ہے ، جوناشہ خان جہاں خلف وزیر خان جہاں کے نام پر لکھی ہے ۔ اس مثنوی کو ان ایام میں بلکہ بدایونی کے زمانے تک ، جس سے میں یہ اطلاع لے رہا ہوں ، بے حد شہرت حاصل رہی ہے ، حتیٰ کہ اس عہد کے واعظین تک اس کے اشعار اپنے وعظوں میں نقل کرتے تھے ۔

(صفحہ ۲۵ ، منتخب التواریخ[۱] ، طبع سوسائٹی)۔

قاضی ظہیر دہلوی سلطان محمد تغلق کے شعرا میں داخل ہیں ۔ صاحبِ دیوان ہیں ۔ بدایونی نے نمونۂ کلام دیا ہے ۔ ملک عزیز اللہ کا قصیدہ موشح ، جو مبارک شاہ شرقی (سنہ ۸۰۲ - ۸۰۳ھ) کی تعریف میں ہے ، دستور الشعرا میں محفوظ ہے ۔

اس صدی کے وسط میں ایک شاعر شہابی ہے ، جس کی مثنوی 'عروۃ الوثقیٰ[۲]' تالیف سنہ ۸۵۹ھ بوستان کی طرح اخلاق موضوع پر لکھی گئی ہے ۔ شہابی ایک مشّاق شاعر ہے اور اس کا کلام استادانہ ہے ۔

'شرف نامہ' کے مصنف ابراہیم فاروقی ہیں ۔ انھوں نے اپنا کلام الفاظ و لغات کی مثال کے واسطے بہت نقل کیا ہے ۔

اس صدی کے آخر میں سلطان سکندر لودھی قابل ذکر ہے ۔ اس کی طبیعت نظم کے واسطے بہت موزوں تھی ۔ گل رخی اس کا تخلص تھا ۔ مولانا جمالی اسی عہد کی پیداوار ہیں ۔ جامی کے ساتھ ان کے لطیفے مشہور ہیں ۔

بدایونی ، سکندر لودھی کے عہد میں ایک برہمن شاعر کا ذکر کرتا ہے ، جو کتبِ رسمی کا درس دیتا ہے ۔ اس نے اس برہمن کا ایک شعر ، جو مسعود بک کی زمین میں ہے ، نقل بھی کیا ہے :

دل خون نشدی چشم تو خنجر نشدی گر

رہ گم نشدی زلف تو ابتر نشدی گر

میں نے یہ چند نام نہایت عجات میں یہ دکھانے کے لیے نقل کر دیے ہیں کہ شمس العلما نے یہ موضوع ، جس پر تحقیقات کی بے حد ضرورت ہے ، بالکل تشنہ

۱۔ بدایونی کے الفاظ یہ ہیں :

"و در سنہ اثنٰی و سبعین و سبعمایۃ (۷۷۲) خان جہاں وزیر وفات یافت و پسرش جوناشہ نام بہان خطاب مخاطب گشت و کتاب 'چندابن' را کہ مثنوی ست بزبان ہندوی در بیان عشق لورک و چاندا نام عاشق و معشوق و الحق خیلی حالت بخش است ، مولانا داؤد بنام او نظم کردہ و از نہایت شہرت درین دیار احتیاج بہ تعریف ندارد ۔" (مرتّب)

۲۔ مثنوی 'عروۃ الوثقیٰ' پر حافظ صاحب کا مضمون اسی جلد میں شامل ہے ۔ (مرتّب)

چھوڑ دیا ہے - فہرست دکنی ہو جائے گی اگر اس میں ہندوستان کی صوبہ داری سلطنتوں کے شعرا اور اہل قلم بھی داخل کر لیے جائیں گے یعنی گجرات، سندھ، کشمیر، مالوہ، جون پور، بنگالہ، دکن وغیرہ - میں اس قسم کے بعض اسما بھی یہاں درج کرتا ہوں -

دستور الشعرا : جون پور میں سنہ ۸۰۳ھ میں تدوین ہوئی ہے - یہ اشعار کی بیاض ہے اور نسخہ اصل برٹش میوزیم میں محفوظ ہے - اس میں بعض ہندوستانی شعرا کا کلام بھی ملتا ہے -

تفسیر بحر مواج : از قاضی شہاب الدین ملک العلما - اس کا ایک عمدہ قدیم نسخہ نوشتہ سنہ ۸۵۹ھ دو جلدوں میں میرے کتب خانے میں موجود ہے (نمبر ۱۵۷۱) - قاضی صاحب متعدد رسالوں کے مصنف ہیں - مثلاً رسالہ ارشاد در نحو - تیسیرالاحکام (نمبر ۱۵۲۵) - اصول ابراہیم شاہی (نمبر ۹۹۸) - چہل حدیث (نمبر ۱۰۳۹) -

مکتوبات شیخ شرف الدین یحییٰ منیری : صوفی حلقوں میں قبول عام کے مرکز تھے -

تحفۃ المجالس : از برہان بن بدر، ترجمہ رسالہ امام غزالی در عہد سلطان محمود والئی مالوہ - اس کا ایک مخطوطہ نمبر ۱۶۰۷ میرے مجموعہ کتب میں موجود ہے -

رسالہ در سیرت النبی : از میر عبدالاول بن علی بن الحسن الحسینی، تالیف سنہ ۱۰۷۸ھ "وقتیکہ لشکر خراسان و دلی متوجہ گجرات شدند" (۱۶۳۵) -

عیون الشرع : از قاضی نعمت اللہ ابن طاہر بنام محمود شاہ بیگڑہ بن محمد شاہ بن احمد شاہ -

میزان العدالت : از قوام بنام مظفر شاہ گجراتی -

مجمع النوادر[1] : از فیض اللہ بن زین العابدین بن حسام الدین بتیانی المخاطب بملک القضات صدر جہان، معنون بنام محمود بیگڑہ، تالیف سنہ ۹۰۳ھ در محمد آباد

۱- اس تالیف پر دیکھو ڈاکٹر محمد اقبال ایم - اے، پی ایچ - ڈی کا مضمون، شائع شدہ اورینٹل کالج میگزین، اگست سنہ ۱۹۳۹ع - (حاشیہ مصنف)

چاپانیر ، کاتب خواجہ عبدالقادر بن محمود قریشی سنہ ۹۳۰ھ۔ اس کا موضوع چہار مقالہ نظامی عروضی اور جوامع الحکایات کے ساتھ مشترک ہے ۔ نسخہ ہذا راقم کے مجموعہ کتب سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا نمبر ۱۶۸۱ ہے ۔

شفاء العلیل : از کریم بن محمد بن عثمان دبیر خان اعظم قتلغ خان (۱۶۹۸)۔

فارسی ترجمہ وفیات الاعیان لابن خلّکان : از یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان بن علی بن احمد الشجاع الشعری ، جو سنہ ۸۹۳ھ میں ختم ہوتا ہے ۔ محمود شاہ بیگڑہ کے واسطے تیار ہوتی ہے ۔ میرے ہاں اس تالیف کا نمبر ۱۹۹۳ ہے ۔

حمزہ نامہ : غالباً آٹھویں صدی ہجری کی یادگار ہے ۔

ہدایت الرمی : در تیر اندازی ، از محمد بدھ عرف سید میر علوی ، بنام علاء الدین حسین شاہ والئی جون پور (نمبر ۱۵۹۱)۔

کفایہ مجاہدیہ : از منصور بن محمد بن احمد بن یوسف ، برائے سلطان زین العابدین والئی کشمیر (۳۵۱)۔

مفرّح القلوب : ترجمہ ہتپدیش از تاج الدین مفتی المالکی بہ فرمان ملک الملوک الشرق و الغرب نصرت الدولۃ والدین مقطع شق بہار ۔

ہمیں تعجب آتا ہے کہ شمس العلما چند شعرا کے نام پیش کر کے ان کی بنا پر ہندوستانی شعرا کی ایرانی شعرا پر فضیلت کے خواب دیکھ رہے ہیں ۔ حالانکہ جو امور فارسی کے میدان میں ہندیوں کو ایرانیوں پر تفوق دے سکتے ہیں ، انھی کو پروفیسر نے پس پشت ڈال دیا ہے ۔ مثلاً سب سے قدیم تذکرۂ شعرا اسی سر زمین میں تالیف ہوتا ہے ۔ ایک جماعت شرح نگاروں کی ہے جس نے فارسی اساتذہ نظامی ، انوری ، خاقانی وغیرہم کے کلام کا مطالعہ کر کے اس پر شرحیں تیار کیں اور ان کے مشکل ابیات کی روایتی تشریح محفوظ رکھی ۔ مولانا محمد بن قوام بن رستم کڑئی گجراتی 'مخزن اسرار' کی شرح سنہ ۷۹۵ھ میں تالیف کرتے ہیں ، جس کو شرح نگاری کے نمونے یا معیار کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اس شرح میں تمام فنی اور علمی نکات و غوامض پر آیات کلام پاک ، احادیث نبوی اور کلام شعرا کی امداد سے پوری روشنی ڈالی ہے اور ادبی و تاریخی اطلاع بہم پہنچائی ہے ۔ متعدد ہندوستانی شعرا مسعود سعد سلمان ، تاج الدین ریزہ ،

عمید لوبکی ، خسرو ، امیر حسن سجزی یا امیر نجم الدین حسن سجزی ، قیصر سجزی ، مولانا بہاء کاری (کذا) ، جمال الدین استاجی ، حمید قلندر ، مولانا فخر الدین ، ابوبکر نسعی (کذا) ، مغیث الدین ہانسوی ، عبید منجّم وغیرہ کے اشعار موقع بموقع نقل کیے ہیں ۔ اس شرح کے اختصار عام طور پر رائج ہیں اور مفصل شرح نہیں ملتی ۔

اسپرنگر کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل الدین محمد نے 'سکندر نامہ' کے دونوں حصوں پر بھی حواشی لکھے ہیں ۔ ان کی ایک اور تصنیف 'جواہر المعادن' ہے جو فنونِ بدیع و بیان و عروض پر شامل ہے ۔

مولانا محمد بن داؤد شادی آبادی قصائدِ خاقانی و قصائدِ انوری پر جدا جدا شرحیں تیار کرتے ہیں ۔ یہ مانڈو کے رہنے والے ہیں اور غیاث شاہ (سنہ ۸۸۰ھ ۔ ۹۰٦ھ) و ناصر شاہ (سنہ ۹۰٦ھ ۔ ۹۱٦ھ) والیانِ منڈو کے دور میں گزرے ہیں ۔ شرح انوری ، ناصر شاہ کے نام پر منسوب ہے ۔

مولانا نظام الدین سکندر نامۂ نظامی گنجوی پر ایک مختصر شرح لکھتے ہیں ۔ ان کا زمانہ دسویں صدی ہجری کا پہلا منتصف ہے ۔

اس سے بھی اہم اور قیمتی کام ہندی فرہنگ نگاروں کا ہے ۔ اساتذہ کے مطالعے کے وقت قدم قدم پر الفاظ کے معنی کی تلاش رہتی ہے ۔ اس غرض سے ایک بڑی جماعت ان فرہنگ نویسوں کی پیدا ہوگئی ۔

ان میں سب سے مقدم مولانا فخر الدین مبارک شاہ غزنوی عرف کمان گر یا قواس ہیں جو دوستوں کی فرمایش سے شاہ نامہ وغیرہ کے لغات تیار کرتے ہیں ۔ فرہنگ نامے کے پانچ حصے ہیں ۔ ہر حصہ 'بخش' کہلاتا ہے ۔ بخش کی ذیلی تقسیم 'گونہ' ہے اور گونہ کی ذیلی تقسیم 'بہرہ' ہے ۔ فرہنگ نامے کا حجم ایک رسالے سے زیادہ نہیں ہے ۔ قواس ، علاء الدین خلجی (سنہ ٦۹۵ھ ۔ ۷۱۵ھ) کے عہد کے مشہور شاعر ہیں ۔

دوسرا نمبر 'دستور افاضل' کا ہے جو مولانا رفیع دہلوی عرف حاجب خیرات کی یادگار ہے ۔ یہ محمد بن تغلق (سنہ ۷۲۵ ۔ ۷۵۲ھ) کے زمانے میں گزرے ہیں ۔ دہلی سے بعض حوادث کی بنا پر سفر اختیار کرتے ہیں اور قصبۂ 'بیر' میں جا

نکلتے ہیں ۔ یہاں شمس الدین محمد احمد ججنیری وزیر سے ملاقات ہوئی ۔ وزیر انھیں آستان آباد آنے کی دعوت دیتا ہے ، جہاں اس کی فرمایش سے مولانا یہ فرہنگ سنہ ۷۴۳ھ میں ، جیسا کہ شعر ذیل سے معلوم ہوتا ہے ، تیار کرتے ہے :

ز هجرت بود هفصد با سه و چل
مرتب گشته دستورِ افاضل

مولانا رفیع پختہ کار شاعر ہیں ۔ قطعۂ ذیل رشید وطواط کی مدح میں ان کے قلم سے نکلا ہے :

استادِ سخنورانِ عالم
فرزانه رشید دین وطواط

شیداء فضائلت ارسطو
دیوانهٔ لفظِ تست بقراط

در پیشِ تو شاعرانِ عالم
چون پیشِ خلیفه خلفِ اوساط

شد کاتب چرخ در خط از تو
شاگرد صفت به پیش خیّاط

روی فضلا ز رشک تو زرد
چون عورتِ حامله ز اسقاط

در جملهٔ گوشها رسیده
نظم سخنت چو دُر در افراط

هر چند مدایحت نویسد
از طبع رفیع نبود افراط

دہلی سے جدا ہوتے وقت یہ رباعی لکھی تھی :

یکچند دلم دبدبهٔ خانی دید
خود را بمثابهٔ جهانبانی دید
چشم از سر او کشیده بادا یارب
کو بر سر جمع ما پریشانی دید

ادات الفضلا (تالیف سنہ ۸۲۲ھ) کے مصنف قاضی بدرالدین دہلوی ہیں۔ بحرالفضائل (تالیف سنہ ۸۳۷ھ) مولانا فضل الدین محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۃ البلخی المعروف بہ کڑئی کے قلم سے نکلی ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کتاب کا ایک معاصر نسخہ میرے کتب خانے میں تھا، اس کا نمبر ۱۶۸۹ ہے۔ میں اس کتاب پر ایک مضمون مارچ اور اپریل سنہ ۱۹۲۹ء کے 'مخزن' میں دے چکا ہوں[1]۔

'زبانِ گویا' از مصنفات ملا رشیدی برادر جد ابراہیم فاروق ہے۔

سنہ ۸۷۲ھ میں ابراہیم فاروق نے شرف نامہ' احمد منیری لکھا جس کی اہلِ لغات میں بڑی قدر و منزلت تھی۔

سنہ ۸۷۳ھ میں مولانا محمد بن داؤد شادی آبادی (منڈوی) شارح خاقانی و انوری نے مفتاح الفضلا، سنہ ۹۱۶ھ میں مولانا محمود بن شیخ ضیا نے بہ عہد سلطان سکندر لودھی تحفۃ السعادت اور سنہ ۹۲۵ھ میں مولانا محمد لاڈ نے 'مؤید الفضلا' تالیف کی۔ ان کے علاوہ قنیۃ الطالبین از قاضی شاہ، موائد الفواید، فرہنگ شیخ زادہ عاشق، فوائد الفضلا، لسان الشعرا، طب حقائق الاشیا اور فرہنگ شیرخانی اس فن کی دیگر تالیفات ہیں جن کے زمانوں سے ہم ناواقف ہیں، اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ وہ عہد قبل مغل کی یادگار ہیں۔ اس مواد کی اساس پر مغلیہ دور میں وہ لغات تیار ہوتے ہیں جو آج بھی فارسی لغات کے واسطے سند کا حکم رکھتے ہیں، اور یہی ایرانی آغا جو ہر موقع پر ہم ہندیوں پر ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہیں، ضرورت کے وقت ان ہندی لغات نگاروں سے استفادہ کرتے ہیں، خواہ وہ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی ہوں یا ملک الشعرا بہار یا کوئی اور۔ کتاب مشہور 'برہان قاطع' کو اپنا مشعل راہ بنائے بغیر انھیں چارہ نہیں۔ فی الحقیقت ہم ہندیوں کے واسطے یہ بجا فخر کا موقع ہے کہ مغرور ایرانی خود اپنی زبان کے بارے میں ہمارا منت کش ہے۔

اس سلسلے میں مجھے ایک واقعے کا ذکر کرنا ضروری ہوا جو پروفیسر برون سے تعلق رکھتا ہے؛ آنجہانی کو فارسی محاورہ 'بہند رفتن حنا' کا اصلی مفہوم

۱۔ ملاحظہ ہو مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد اول، صفحہ ۱۰۲۔ (مرتّب)

معلوم کرنے کی ضرورت ہوئی ۔ جب ان کے ایرانی دوستوں سے مایوسی ہوئی ، مجبوراً انھوں نے ہندوستانی پروفیسر محمد شفیع ، پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی سے دریافت کیا ۔ پروفیسر ممدوح نے اس محاورے کے صحیح معنی ، اس کا محلِ استعمال اور اساتذہ کے کلام سے شواہد لے کر آنجہانی کو بھیج دیے جس سے ان کی تسلی ہو گئی ۔ کیا اس وقت بھی ایران فارسی کے لغات و محاورات پر وہی سامان رکھتا ہے جو ہندوستان میں میسر ہے ؟

☆ ☆ ☆

دیوانِ خواجہ معین الدین اجمیریؒ

(کیا یہ دیوان الٰہی کی ملکیت ہے؟)

(از رسالہ ''اُردو'' بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء)

کسی زبان کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعے کے وقت بعض عجیب و غریب باتیں ایک محقّق کی نظر سے گزرتی ہیں ۔ مصنفین کے سلسلے میں بعض ایسی ہستیاں نظر آئیں گی ، جو بغیر کسی استحقاق کے ، بزمِ ادب کے مشاہیر میں شمار ہوکر اصلی اور حقیقی مستحقین کے دوش بدوش کھڑی ہیں ۔ حقیقۃً اس بزم میں ان کی باریابی کسی نامعلوم بے انصافی یا کسی اتفاقی غلطی اور غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے جس کی اصلی حقیقت ہم عصر تاریخ کی یاد سے محو ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک رازِ سربمہر بن گئی ہے ۔ ان میں بعض ایسے بے رحم ہیں جو نہایت بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ غیر لوگوں کے کلام پر قبضۂ مالکانہ جما کر ان کی تمام عمر کی محنت اور جانکاہی کے نتیجے کو اپنا بنا کر مشہور کر دیتے ہیں ۔ ایسے حضرات کو اگر "ادبی قزّاق" کے نام سے موسوم کیا جائے تو موزوں ہوگا ۔ بعض وقت ان کا راز طشت از بام ہو جاتا ہے لیکن اکثر اوقات نہیں ہوتا ۔ ادبی قزّاق ہر قوم اور ہر زبان میں پائے جاتے ہیں ۔ صاحبِ 'کشف المحجوب' کا ایک واقعہ ہے کہ ان کا دیوان ، جس کی ان کے پاس صرف ایک نقل تھی ، کسی شخص نے مستعار مانگا اور یہ ستم ظریفی کی کہ مطالعے کے بعد بجائے واپسی کے اصل کتاب سے ان کا نام خارج کرکے اس کو اپنے نام سے مشتہر کردیا ۔ اسی طرح تصوف میں آپ کی ایک اور تالیف 'منہاج الدین' نامی ایک شخص نے عاریۃً دیکھنے کو لے کر اپنی

طرف منسوب کر دی[۱] ۔

انوری کا قصہ مشہور ہے کہ ایک روز بلخ کے بازار سے گزرتے ہوئے کسی مقام پر اس نے لوگوں کا ہجوم دیکھا ۔ بھیڑ چیر کر اندر گیا تو دیکھتا ہے کہ خود انوری کے اشعار ایک شخص مجمع میں سنا رہا ہے ۔ شاعر نے بڑھ کر اس سے پوچھا کہ ''یہ اشعار کس کے ہیں ؟'' اس شخص نے جواب دیا ''انوری کے !'' دوبارہ سوال کیا کہ ''انوری کو جانتے بھی ہو؟'' اس شخص نے جواب دیا : ''چہ خوش ! جاننا کیسا ، میں خود انوری ہوں ۔'' انوری نے ہنس کر کہا ''شعر دزد'' سنتے آئے ہیں لیکن ''شاعر دزد'' آج ہی دیکھا[۲] ۔

یہی انوری اپنے قصیدے میں کسی نامی گرامی شاعر کے متعلق گویا ہے :

کس ندانم از اکابر گردن کشان نظم
کورا صریح خون دو دیوان بگردنیست

شادی آبادی[۳] اس شعر کی شرح میں لکھتا ہے کہ امیر معزّی نے مولانا احمد ساوی اور مولانا حمید اسغانی (؟) کے دیوانوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا ۔

دوسرا گروہ اس گروہ سے کم خطرناک نہیں لیکن نوعیت عمل میں بالکل متضاد ہے ۔ اخلاق نظر میں ان کا فعل چنداں مذموم نہ مانا جائے ، لیکن

۱۔ فرماتے ہیں : ''مرا این حادثہ افتاد بدو بار ۔ یکی آنک دیوان شعرم کسی بخواست و باز کرفت و اصل نسخہ جز آن نبود آن جملہ را بکردانید و نام من از سر آن بیفکند و رنج من ضائع کرد تاب اللہ علیہ و دیکر کتابی کردم هم اندر طریقت تصوف نام آن منهاج الدین ، یکی از مدعیان رکیکہ کہ کرای کفتار او نکند نام من از سر آن پاک کرد و بنزدیک عوام چنان نمود کہ وی کردہ است . . . ''
(صفحہ ۲ ، متن کشف المحجوب ، تصحیح شدہ ژوکوفسکی ، طبع ایران ، سنہ ۱۳۳۶ش) ۔ (مرتّب)

۲۔ لطائف الطوائف ، علی بن حسین الواعظ کاشفی ، صفحہ ۱۰۹ ، طبع آقا محمد شیرازی ، ملک الکتاب ، بمبئی ، سنہ ۱۳۱۱ھ ۔

۳۔ شرح قصائد انوری ، از محمد بن داؤد بن محمد علوی شادی آبادی ۔

ادبی اخلاق ، اخلاقِ مروجہ سے مختلف ہیں ۔ ادبی نقطۂ نظر سے ان کا جرم اسی قدر سنگین اور اہم ہے جس قدر سابق الذکر گروہ کا ، اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے ان کے جرم کے مختلف مدارج ہیں ۔ جس طرح کوئل کوّے کے گھونسلے میں اپنے انڈے چھوڑ آتی ہے ، یہ گروہ اپنی تصانیف کو دوسروں کے سر تھوپ دیتا ہے ۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ نفریں وہ طبقہ ہے جو گذشتہ بزرگانِ دین کے نام پر اپنے دماغی کارناموں کو شہرت دیتا ہے کیونکہ اس کا مقصد بعض مذہبی مسائل پر رجحانِ عام کی تبدیلی ہوتی ہے یا کسی خاص فرقے کی آرا کو مقبول عام بنانا اصلی مقصود ہوتا ہے ۔

بعض امیر اور رئیس ادبیاتِ لطیفہ کے دل دادہ ہوتے ہیں ، لیکن چونکہ تصنیف کی قابلیت کا جوہر ان میں مفقود ہوتا ہے ، اس لیے کرایے کے ٹٹو ان کے لیے یہ کام کرتے ہیں ۔ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ اپنا کلام دیگر مشاہیر کی طرف مضاف کرکے زبان زدِ عام ہونا دیکھنا چاہتے ہیں ۔ سیاسی اغراض کی تکمیل کی غرض سے اکثر مجہول تصانیف پیدا کی جاتی ہیں ۔ سلف پرستی ایک اور شکل ہے جس میں معتقدین اپنے پیر و مرشد کے اصلی جوہر کو زیادہ فروغ اور رونق دینے کی غرض سے ادب و شاعری وغیرہ کے اضافی کمال ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں ۔

تیسری صورت مغالطہ ہے جس میں بہ وجہِ ہم نامی ، یا محض اتفاقیہ غلطی کی بنا پر ، ایک شخص کا کلام دوسرے کے سر منڈھ دیا جاتا ہے ۔ ہم نامی کی وجہ سے تاریخ میں اکثر غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ لیکن مغالطہ اور سلف پرستی کا فرق دریافت کرنا بعض اوقات ایک مؤرخ کے لیے نہایت دشوار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ معلول کو دیکھتا ہے اور علّت اس کی نگاہ سے چھپی رہتی ہے ۔ نتیجہ اس کے پیش نظر ہے لیکن اس نتیجے کو بر روئے کار لانے والی ہستیاں آنکھوں سے غائب ہیں ۔ یہاں مغالطہ یا سلف پرستی کی مثال میں دیوان حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے متعلق ایک تبصرہ پیش کیا جاتا ہے ۔

یہ دیوان مطبع نولکشور میں سب سے پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۸۸ھ مطابق سنہ ۱۸۷۱ع میں طبع ہوا ۔ جب سے اب تک کئی بار چھپ چکا ہے اور کتب فروشوں کے ہاں عام طور پر ملتا ہے ۔ کچھ عرصہ ہوا جلال الدین الٰہی بخش تاجران کتب لاہور نے نیا ایڈیشن نکالا ہے ۔ اس کے قلمی نسخے بھی وقتاً فوقتاً نظر سے گزرتے ہیں

لیکن اکثر گزشتہ صدی یا قرنِ ماسبق سے تعلق رکھتے ہیں اور لوگ خواجہ صاحب کا کلام سمجھ کر نہایت عزیز رکھتے ہیں۔

کار پردازانِ مطبعِ نولکشور نے، اس دیوان کے متعلق، اشاعتِ بارِ اوّل میں خاتمے پر یہ بیان دیا ہے:

''آج تک کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت خواجہ صاحب قدس سرہ با دیگر کمالات صوری و معنوی، مذاق شعر و شاعری بھی رکھتے تھے۔ حسن اتفاق سے ہم کو ایک مختصر دیوان حضرت صاحب کا بمنزلہ کلیات کتب خانہ مستجمع کمالات جناب منشی مردان علی خان صاحب رعنا، نائب دیوان سرکار مارواڑ سے نصیب ہوا اور اس پر مواہیر فیضی و ابوالفضل ثبت تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ کتب خانہ اکبر بادشاہ کا تھا اور شہنشاہ ممدوح از بس معتقد حضرت خواجہ صاحب قدس سرہ کا تھا، اس نے اپنے عہدِ دولت میں بہم پہنچایا اور شکر خدا کہ ہم کو گھر بیٹھے بےمنّت ہاتھ آیا۔ چونکہ یہ نعمت غیر مترقّبہ تھی اس لیے ہم نے واسطے یادگار حضرت کے طبع کیا تاکہ بطور تبرک کے لوگ اسے حرز زبان بنائیں اور ہم بھی اس سعادت سے ثمرۂ خیر پائیں''۔

اس میں پہلا بیان تو صریحاً غلط ہے۔ دیوان مذکور ممکن ہے کہ اس قدر قدیم ہو، جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے لیکن یہ بیان کہ اکبر نے کوشش کر کے بہم پہنچایا، ثبوت کا محتاج ہے۔ اگر اس قسم کا کوئی ذکر اس نسخے میں تھا تو کارپردازانِ مطبع کا فرض تھا کہ اسے بھی دیوان کے ساتھ شائع کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ بہ وجہ حضرت شیخ سلیم چشتی، شہنشاہ جلال الدین اکبر ایک زمانہ خاص تک خواجہ اجمیر کا بہت معتقد رہا ہے۔ چنانچہ فتحپور سے اجمیر تک پا پیادہ سفر بھی کیا ہے۔ اس کے بعد کارپردازانِ مطبع کا بیان ہے:

''جناب خان صاحب موصوف سے ہم نے دریافت کیا کہ آپ کو کس جگہ سے یہ نسخہ اکسیر ہاتھ آیا؟ خان صاحب ممدوح نے یہ روایت بیان کی کہ ایک شب میں نے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بمقام لکھنؤ، سنہ ۱۸۶۵ع میں، رؤیائے صادقہ میں دیکھا کہ حضرت صاحب میرے مکان پر تشریف لائے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ایک نقش

تبرکاً مجھ کو عنایت ہو ۔ چنانچہ حضرت صاحب نے عنایت فرمایا ۔ اس
کی تعبیر یہ ہوئی کہ اسی کے قریب ایک دست فروش میرے پاس یہ دیوان
ایک پرانی ردی کتاب جان کر گھر بیٹھے فروخت کر گیا ۔"

خواب کے متعلق رائے زنی کرنا ایک ادبی نقاد کے منصب میں داخل نہیں ، کیونکہ اس کے موضوع واقعات ہیں نہ ظنّیات ، اس لیے راقم اس کی معمّا کشائی سے اعراض کر کے ، اسی گزارش پر اکتفا کرتا ہے کہ میں یہ قصّہ قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ۔ اس لیے کہ مردان علی خاں رعنا اور منشی نول کشور پہلے حضرات نہیں ہیں جنھوں نے سب سے پیشتر اس دیوان کا سراغ نکالا ہے ، بلکہ ان کے عہد سے ایک صدی پیشتر تک کے اہل علم کو کم از کم اس کا ضرور علم تھا اور جیسا کہ سابق میں گزارش کر چکا ہوں ، یہ دیوان اس قدر نایاب بھی نہیں تھا ۔ چنانچہ اسی دیوان کے متعلق تذکرۂ روز روشن ، صفحہ ٦٣٧ پر ، حضرت خواجہ معین الدین کے حالات میں ، مصنف نے یہ دیوان حضرت خواجہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے :

"دیوانی مختصر از ملفوظات آن قدوۂ عرفای کرام و اسوۂ اولیای عظام پیش
نظر است و این چند اشعار منتخب ازان مختصر کہ در وی جای معین وجای
معینی تخلص می فرماید ۔"

انتخاب میں صاحبِ تذکرہ نے چھیالیس بیت اور ایک رباعی دی ہے ۔ ان میں سے موجودہ دیوان نولکشور میں قریباً سترہ اشعار ، جو دس مختلف غزلوں سے تعلق رکھتے ہیں ، موجود نہیں ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ صاحبِ تذکرۂ روز روشن کے زیر نظر اس مطبوعہ دیوان کا اصل نسخہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور قلمی نسخہ ہے جس میں اس نسخے سے زیادہ غزلیات ہیں ۔

تذکرۂ مخزن الغرائب (سنہ ۱۲۱۸ھ) میں حضرت خواجہ کے نام صرف دو رباعیاں درج ہیں ۔ یہ مصنّف دیوان کے وجود سے بےخبر معلوم ہوتا ہے ۔ وہ رباعیاں یہ ہیں :

۱۔ عاشق ہمہ دم فکر رخ دوست کند
معشوق کرشمۂ کہ نیکوست کند
ما جرم و گنہ کنیم و او لطف و عطا
هرکس هر چیز لایق اوست کند

۲- ... ای بعد نبی بر سر تو تاج نبی
وی داده شہان ز صولتت باج نبی
آنی تو کہ معراج تو بالا تر شد
یک قامت احمدی ز معراج نبی

پہلی رباعی 'روز روشن' میں بھی درج ہے۔ مردان علی خان مبتلا نے اپنے تذکرۂ 'منتخب الاشعار' میں، جو سنہ ۱۱۶۱ھ میں تصنیف ہوا ہے، صرف پچھلی رباعی حضرت خواجہ کے نام پر لکھی ہے اور مصرعہ دوم کو مصرعۂ اول کی بجائے لکھا ہے یعنی ترتیب بدل دی ہے۔

میر حسین دوست 'تذکرۂ حسینی' میں، جو سنہ ۱۱۶۳ھ میں مرقوم ہوا ہے، خواجہ معین الدین چشتی کے حالات بالتفصیل دیتا ہے [۱] اور آخر میں ان کے دیوان سے ایک رباعی اور غزلوں کے بعض اشعار نقل کرتا ہے۔ 'آتشکدۂ آذر' میں صرف گزشتہ دو رباعیاں ملتی ہیں اور 'مجمع الفصحا' میں رباعیوں کے علاوہ یہ دو بیت بھی خواجہ کے نام پر دیے ہیں:

سیل را نعرہ ازانست کہ از بحر جداست
و آنکہ با بحر در آمیخت خاموش آمد
نکتہا دوش دلم گفت و شنید از لب یار
کہ نہ ہرگز بزبان رفت نہ در گوش آمد

کتب خانۂ بانکی پور کی فہرست میں اس دیوان کے متعلق یہ الفاظ ہیں:

''اس اعتقاد کے تسلیم کرنے کا، کہ یہ دیوان مشہور و معروف خواجہ معین الدین چشتی سے علاقہ رکھتا ہے، ہمارے پاس صرف یہ ذریعہ ہے کہ تقی اوحدی 'عرفات' میں اور والہ 'ریاض الشعرا' میں اس دیوان کے بعض اشعار نقل کر کے ان کو حضرت خواجہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن نہ یہ دونوں مؤلف اور نہ کوئی اور مصنف صاف طور پر ذکر کرتا ہے کہ خواجہ کی یادگار کوئی دیوان بھی ہے''۔

۱- ملاحظہ ہو 'تذکرۂ حسینی' از میر حسین دوست سنبھلی، صفحہ ۲۹۴ - ۳۰۲، نولکشور، سنہ ۱۸۷۵ع۔ (مرتب)

اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے بھی یہ دیوان خواجہ معین الدین چشتی کی طرف منسوب کر دیا ہے اور اب وہ عام طور پر انھی کے نام سے مانا جاتا ہے۔ لیکن ایک محقق اور منتقد کی نظر میں یہ شہادت اور بیانات اس دیوان کا تعلق خواجہ اجمیر سے وابستہ کرنے کے لیے کافی معلوم نہیں ہوتے، کیونکہ سب سے مقدم یہ سوال پیش آتا ہے کہ حضرت خواجہ کے عہد سے ان بزرگوں کے عہد تک، جس کے درمیان پانچ صدیوں سے زیادہ کی مدت حایل ہے، یہ دیوان گنجِ مخفی کی طرح کہاں غائب رہا اور خواجہ کے سوانح نگاروں کی نظروں سے کیوں کر بچا۔

خواجہ معین الدین چشتی کے حالات اور کمالات، ان کے زمانے سے لے کر اب تک، ہر عہد میں دنیا کی نظر میں رہے ہیں۔ تمام شائقین کے علاوہ اصحابِ تصوف کو ان کے واقعات و مقالات سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی ہے۔ پھر ایسی مشہور از آفتاب ہستی کا کلام اس عرصۂ دراز تک دنیا کی نگاہ سے کیوں کر پوشیدہ رہا؟ آپ کے دیوان سے گزشتہ قرون کے مصنفین کا بے خبر رہنا ایک دشوار امر معلوم ہوتا ہے۔ ہر عہد میں اور ہر دور میں خواجہ کے واقعات لکھے اور پڑھے گئے ہیں۔ لیکن ان تصنیفات میں خواجہ کے دیوان یا شاعری کا مطلق ذکر نہیں آتا۔ آپ کی تصنیف 'انیس الارواح' موجود ہے جس میں آپ نے پیرو مرشد حضرت عثمان ہارونی کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔

خود آپ کے ملفوظات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ نے 'دلیل العارفین' کے نام سے شائع کیے ہیں۔ 'سیرالعارفین' میں، جو نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے، آپ کے کافی حالات ملتے ہیں۔ ابوالقاسم فرشتہ نے مشائخ ہند کے احوال میں سب سے مقدم آپ کا ذکر کیا ہے اور آپ کے متعلق تمام واقعات جمع کر دیے ہیں۔ علاوہ بریں اہل تصوف کے تذکروں میں آپ کے حالات اکثر موجود ہیں۔ لیکن ان تمام کتابوں میں نہ صرف آپ کے دیوان بلکہ آپ کے ذوقِ شعر تک کا ذکر نہیں ملتا۔ بابو لال صاحب نے 'ہدایت المؤمنین' کے ایک حصے کا ترجمہ سنہ ۱۸۷۹ع میں شائع کیا، جس میں خواجہ صاحب کے مبسوط حالات ملتے ہیں، لیکن آپ کے دیوان سے یہ مصنف

بھی اجنبی ہے[1] ۔ دیوان فی نفسہ اس سوال پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا ۔ اس میں کوئی ایسی شہادت، یا تلمیح موجود نہیں جو اس کو خواجہ صاحب کی ذات سے انتساب دے ۔ اگرچہ بعض شہادتیں اس انتساب کی تردید کے حق میں ، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا ، موجود ہیں ۔ دیوان ۹۱ صفحات پر ختم ہو جاتا ہے جس میں غزلیات کے سوا کوئی اور صنفِ نظم موجود نہیں ۔ غزلوں کی تعداد ایک سو اکیس ہے اور ابیات کا شمار گیارہ سو بارہ سو کے درمیان ہے ۔ شاعر اپنا تخلص دو طرح سے لاتا ہے یعنی 'معین' اور 'معینی' ۔ متعدد غزلیں حمد و نعت میں ہیں ۔ کلام سر تا پا عشق و عرفان کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور عشق کا جذبہ بہت غالب ہے ۔ رندی اور سرمستی کے مضامین خال خال موقعوں پر نظر آتے ہیں ۔ خمریات کا جوش ، جب کہ عراقی اور حافظ کے ہاں بہت غالب ہے ، یہاں بالکل دبا ہوا ہے ۔ شوخی مطلق نظر نہیں آتی بلکہ متین اور سنجیدہ خیالات قدم قدم پر دامن گیر نظر آتے ہیں ۔ مذہب سے عداوت نہیں ہے اور نہ شیخ و زاہد کا استخفاف منظور ہے ۔ تجرید اور ترکِ تعلق شاعر کا اصل موضوع ہے ، یہاں تک کہ بہشت و خلد ، جو زہاد کی غایتِ مقصود ہے ، دام گاہِ علائق بنا دی گئی ہے ۔ کلام میں متانت اور شیرینی نظر افروز ہے ۔ خیالات میں نزاکت اور خوش اسلوبی ، جو متاخرین کا دست مایہ ناز ہے ، غلبہ پائے ہوئے ہے ۔ زبان میں کچھ اس قسم کی گھلاوٹ اور لطافت موج زن ہے جو خواجہ معین الدین کے ایام میں قطعی نامعلوم تھی ۔ ناتمام بندشیں اور ترکیبیں متاخرین کے طرز کی پائی جاتی ہیں ۔ ادائیگیِ خیالات کے لیے الفاظ کے بوقلموں پیرائے شاعر کے قبضے میں ہیں ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی زبان اس عہد تک ترقی اور وسعت بدرجۂ کمال پا چکی تھی مثلاً ہستیِ انسانی یا وجودِ انسانی کا مقصد ادا کرنے کے لیے شاعر نے نہ ترکیبیں اختیار کی ہیں ۔

۱۔ احمد گلچین معانی ، تذکرۂ میخانہ کی اشاعتِ طہران ، سنہ ۱۳۴۰ شمسی کے صفحہ ۷۷۴ کے حاشیے میں لکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ در تراجم عرفا و بالاخص کتاب معین الاولیاء کہ مشتمل است بر حالات و مقالات خواجہ معین الدین چشتی ، شعری بوی نسبت دادہ نشدہ است ۔" (ر ک : معین الاولیاء ، چاپ اجمیر در سنہ ۱۲۱۳ھ) ۔ (مرتب)

زنگِ تن ، نقابِ حدوث ، پردۂ تن ، دلقِ ہستی ، زندانِ تن ، لباسِ حدوث ، پردۂ آب و گل ، شبستانِ بدن ، پردۂ خاک وغیرہ وغیرہ ۔

کلام کا عام جوہر سادگی ، سادہ بیانی اور سادہ خیالی ہے ، تکلفات سے عام طور پر احتراز ہے ۔ خیالات کی بوقلمونی اور تنوع غزل کا تمغائے امتیاز ہے لیکن اس دیوان میں بیرونی اور اجنبی خیالات بہت کم چھیڑے گئے ہیں ، نفس مضمون پر توجہ مائل ہے ، اس لیے اشعار میں ایک قسم کا تسلسل پایا جاتا ہے ۔ حقائق و دقائق ، تصوف ، وارداتِ سلوک ، تجرید و توحید ، فنا و بقا ، نفی و اثبات ، اشتیاقِ دیدار ، بیانِ عشق وغیرہ کے اظہار پر شاعر کی تمام شاعری مبذول ہے ۔ مضمون کی اس تنگی سے کلام میں ایک خفیف سی اداسی کی جھلک نمودار ہے ۔ جدّت اور آمد اچھے خاصے پیمانے پر ہے ۔ بعض ابیات ایسے صاف اور ہموار نکل آئے ہیں کہ دل میں چٹکیاں لیتے ہیں ۔ یہ ایک ایسے شخص کا کلام معلوم ہوتا ہے جو جذباتِ عشقِ الٰہی سے سرشار اور رسول عربی ؐ کا عاشقِ زار ہے ، مسافرِ منازلِ طریقت ہے لیکن شریعت کی روشنی میں ، عشق ہے لیکن متانت کے ساتھ ، دیوانگی میں بھی دانائی کی ادا موجود ہے ۔ مسائلِ معرفت کے ساتھ فلسفۂ تصوف کی اصطلاحات کو نہایت بے تکلفی اور خوش اسلوبی کے ساتھ برتا گیا ہے جو عراقی اور حافظ کو بھی نصیب نہیں ۔ ان دقائق نے کلام کو بعض وقت دقیق اور پیچیدہ کر دیا ہے ۔ حکیم سنائی غزنوی کے ہاں زاہدی اور تصوف میں کوئی امتیاز نہیں ہے ۔ ان کا بیان تصوف ، پند و موعظت ، اخلاق و حکم اور زہد و تقویٰ پر منحصر ہے ۔ عطار نے مثنوی کے علاوہ غزل کو خصوصیت کے ساتھ دقائق و نکات معرفت و سلوک کی اشاعت کا میدان بنایا ۔ عطار کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جذبۂ عشق ، کیفیاتِ روحانی اور وارداتِ حقیقت کی ترجمانی کے لیے اپنے ہم عصر شیخ محی الدین ابن عربی کی طرح مجاز کی زبان اختیار کی اور اس غرض سے مے وجام ، پیمانہ و میخانہ ، بت و مُغ ، ترسا بچہ و گبر ، دَیر ، مِینا ، ناقوس ، چلیپا ، شاہد و شمع ، زنار و خرابات وغیرہ وغیرہ کو خاص معنی دے کر غزل سے آشنا کر دیا ۔ حقیقت و مجاز کے اتحاد نے غزل میں ایک خاص حلاوت و ملاحت پیدا کر کے اس کے خط و خال کو قصیدے سے بالکل ممیّز کردیا ۔ حقیقت کا اظہار مجاز کے پیرائے میں فریدالدین عطار سے شروع ہوتا ہے ۔ عطار کے تتبّع میں مولانا روم نے اس زمین کو زیادہ وسعت دی ۔ عراقی نے غزل کی شراب کو زیادہ تیز اور

سرجوش کر دیا ۔ حافظ نے اس کے رنگ کو شوخ اور کیف کو زیادہ لطیف بنا دیا اگرچہ غزل نے اس طرح خرابات کی آب و ہوا اور تصوف و عرفان کی آغوش میں پرورش پائی اور حقیقت و مجاز کی دوعملی میں ہوش سنبھالا لیکن فلسفۂ تصوف کا خلعت اس کو جامی اور مغربی عطا کرتے ہیں ۔ یہی آخری رنگ اس دیوان میں عام ہے ۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا ۔ دیوان میں مسئلہ ہمہ اوست پر بہت زور دیا گیا ہے ۔ ذیل میں بعض مثالیں درج ہیں :

کسی کہ عاشق و معشوق خویشتن ہمہ اوست
حریفِ خلوت و ساقیٔ خویشتن ہمہ اوست
اگر تو خرقۂ ہستیِ خویش پارہ کنی
نظر کنی کہ درین زیر پیرہن ہمہ اوست
مگر کہ کثرتِ اشیا نقیضِ وحدت گشت
تو درحقیقتِ اشیا نظر فگن ، ہمہ اوست
چو نائیی کہ نہد بر زبانِ نی لبِ خویش
نہادہ بر دہنِ عاشقان دہن ہمہ اوست
چہ جای بادہ و جام و کدام ساقیِ مست
خموش باش معینی و دم مزن ، ہمہ اوست

دیگر

جمالِ یار می خواهی بذراتِ جہان بنگر
کہ هر ذره است مرآتی کزو دیدار می تابد

دیگر

صفات و ذات چو از هم جدا نمی‌بینم
بهر چہ می نگرم ، جز خدا نمی‌بینم

متعدد موقعوں پر شاعر نے اپنے آپ کو ''مسکین معین'' لکھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر مسکین کا لفظ اپنے تخلص یا نام کے ساتھ استعمال کرنے کا عادی

تھا ۔ اس قسم کی بعض امثال حوالہٗ قلم ہیں :

در آ بہ مجلسِ مسکین معینِ شوریدہ
کہ نقل و بادہ ز گفت و شنید خودبینی

دیگر

مسکین معین در یک غزل بنمود اسرار ازل
بشنو کلامِ لم یزل در کسوتِ گفتار او

دیگر

چون دلِ مسکین معین آئینہٗ تست ای کریم
آئینہٗ خود را صفائی دہ ز نورِ خویشتن

دیگر

گنگ شو مسکین معین هم خود ثنای خود مگو
بہتر آن باشد کہ من گویم بدین سان حمدِ تو

دیگر

در مجلس مسکین معین یک دم نشین صد دُر بچین
بنگر چہ دُر های ثمین دادہ است دریای دلم

دیوان کے تتبّع سے اس قدر اور پایا جاتا ہے کہ شاعر اپنی زندگی میں واعظ ضرور رہا ہے کیونکہ بعض مقطعوں میں اس نے منبر ، مجلس اور وعظ کی طرف کئی مقامات پر تلمیح کی ہے ، چنانچہ ذیل کی امثال شاہد ہیں :

بزم خاص است معین بادۂ وحدت پیش آر
هان کہ مستیٗ تو بر مجلسیان تافتہ است

دیگر

معین برآی بہ منبر ، بگوی نکتہٗ عشق
کہ بلبلِ چمنِ عشق در زمانہ توئی

دیگر

گرچہ شاہان را بہ تخت و تاج زینت می دهند
جلوۂ مسکین معین بر تاج و منبر کرده اند

دیگر

معینی گر همی خواهی کہ سّرش بر زبان رانی
مقام آن سّرِ دارست ، بر منبر نمی‌گنجد

دیگر

بیا بہ وعظِ معینی رموزِ عشق شنو
کہ از حکایتِ او بوی دوست می آید

دیگر

معین را در صغر آنکس بہ منبر در سخن آرد
کہ در گہوارۂ طفلی قرینِ ابنِ مریم شد

دیگر

خلق گویندم معین این رمز بر منبر مگوی
آہ کین آتش ہزاران واعظ و منبر بسوخت

ان اشعار سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ شاعر کا پیشہ وعظ گوئی تھا ۔

گزشتہ مشاہدات کی روشنی میں اس دیوان کو خواجہ معین الدین چشتی کی طرف منسوب کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے ۔ میں اپنے گزشتہ دلائل کو مختصراً یہاں پھر دہراتا ہوں :

(۱) تاریخ خواجہ صاحب کی شاعری اور ان کے دیوان سے ناواقفِ محض ہے ۔

(۲) اس دیوان کی زبان خواجہ صاحب کے عہد کی زبان ہرگز نہیں بلکہ متاخرین کی زبان معلوم ہوتی ہے ۔

(۳) دیوان میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی رو سے اس کا تعلق خواجہ صاحب سے قائم کیا جائے ۔

(۴) دیوان سے اس قدر ظاہر ہے کہ اس کا قائل کوئی واعظ ہے ۔ چونکہ داخلی شہادت سے اس قدر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ کسی واعظ کا کلام ہے اس لیے ہمیں واعظین کے سلسلے میں اس کے مصنّف کی تلاش کرنی چاہیے ۔ اس غرض سے میں مولانا معین الدین ابن مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی ، صاحبِ 'معارج النبوت' اور مشہور واعظ کا نام پیش کرتا ہوں ۔

مولانا اپنی تصنیفات میں اپنے آپ کو 'مسکین معین' لکھنے کے عادی ہیں[1]۔ آپ سلطان ابوالغازی حسین کے عہد کے زبردست فاضل ہیں اور مولانا جامی کے ہم عصر ۔ آپ اپنے عہد کے مشہور واعظ اور صاحبِ تصنیفاتِ کثیرہ ہیں ۔ دنیاوی تعلقات سے اس قدر بیزار تھے کہ جب سنہ ۹۰۰ھ میں آپ کے بھائی مولانا نظام الدین قاضیٔ ہرات نے اس عالمِ فانی سے رحلت کی تو آپ نے سلطان حسین کی استدعا اور اصرار پر بہ دقّتِ تمام اپنے بھائی کا منصب قبول کیا اور ایک سال کے بعد ہی اس سے دست کش ہوگئے ۔ آپ کا درجہ علم و فضل اور زہد و تورّع میں نہایت ممتاز تھا ۔ طبیعت میں بلندی اور دنیا کی طرف سے بے پروائی بسی ہوئی تھی ۔ جامع مسجد ہرات میں ہر جمعہ کو وعظ فرمایا کرتے تھے ۔ آپ کے وعظ میں اثر ، تقریر میں تاثیر اور بیان میں دلکشی تھی ۔ ہزاروں مستمعین آپ کے وعظ سے بہرہ اندوز ہوتے تھے ۔ ان مجالس تذکیر میں بڑے بڑے جلیل القدر امرا بھی شریک ہوتے تھے اور مولانا ان کی وجاہتِ دنیاوی کی ذرا پروا نہ کرکے ، برسرِ منبر ان کے افعال قبیحہ پر سرزنش کرتے تھے ۔ وہ سنتے تھے اور اُف نہیں کر سکتے تھے ۔ سچ کہا ہے : ''حق کا مرتبہ دولت اور حکومت سے بالا ہے ۔'' تاریخ حبیب السّیر میں مولانا معین الدین کے حالات میں (صفحہ ۳۳۸ ، جلد سوم ،

۱- ''در کانپور بسال ۸۹۳ م دیوان معین مسکین (معین الدین بن حاج محمد فراہی) معاصر جامی را اشتباہاً بنام خواجہ معین الدین چشتی چاپ کردہ اند ۔''
(تذکرۂ میخانہ ، باہتمام احمد گلچین معانی ، حاشیہ صفحہ ۷۷۴) ۔ (مرتّب)

جزو سوم) یہ عبارت ملتی ہے :

''مولانا معین الدین انفراهی برادر ارشد قاضی نظام الدین بود و بسیاری از فضایل و کمالات اظهار وقوف می‌نمود ۔ در زهد و تقوی درجۂ علیا داشت و اکثر خطوط را در غایت جودت بر صحیفۂ تحریر می نگاشت ۔ در ایام جمعہ بعد از نماز در مقصورۂ مسجد جامع هرات وعظ در کمال تاثیر می گفت و دُرَر غرر معانی آیات و احادیث را بہ الماس طبع لطیف می سفت ۔ باعاظم امرا و نوئینان کہ در مجلس وعظ می نشستند ملتفت نمی گشت و در وقتِ نصیحت آن طائفہ سخنان درشت بر زبانش میگزشت و آن جناب بعد از فوت برادر بموجب تکلیف خاقان والا گہر مدت یک سال صاحبِ قضا بود ، آنگاہ ترک آن امر دادہ ، هرچند دیگر مبالغہ نمودند قبول نفرمود ۔ از آثار قلم لطافت نگار مولانا معین الدین 'معارج النبوت' درمیان مردم مشهور است و اکثر وقائع و حالات سیّد کائنات علیہ افضل الصلواۃ و اکمل التحیات بروایات مختلفہ دران مسطور و مولانا معین الدین از شهور سبع و تسعمایۃ مریض شدہ درگذشت و در مزار مقرب حضرت باری خواجہ عبداللہ انصاری پهلوی برادر خود قاضی نظام الدین مدفون گشت ۔''

مولانا معین الدین نے چالیس سال کامل وعظ و تذکیر میں صرف کیے ہیں ۔ وعظ سے جو وقت بچتا تھا ، تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا تھا ۔ آپ نے فن تذکیر کو ، برخلاف ہمارے علماے عہد کے رویے کے ، حتی‌الوسع دلچسپ اور شگفتہ بنانے کی کوشش کی ہے ۔ آپ کے مواعظ اور تصنیفات مذاق شعر سے پُر ہیں ۔ ان میں عشق و تصوف کا رنگ نہایت شوخ ہے ۔ شعر میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے ۔ طبیعت میں زود گوئی بہت معلوم ہوتی ہے ۔ آپ کا مرتبہ شعرائے متصوّفین میں عراقی اور مغربی کے مساوی مانا جائے تو مبالغہ نہیں کہا جا سکتا ۔ شعر کا مذاق فنِ تذکیر کی طرح خاندانی ہے ۔ آپ کے والد مولانا شرف الدین حاجی محمد ، جو مرزا ابوالقاسم بابر کے عہد کے مشاہیر فقہا میں شمار ہوتے تھے ، خود بھی شاعر تھے ۔ میں تبرکاً ان کے چند اشعار یہاں درج کرتا ہوں :

نقّاش قصر فطرت ، بی صورت و هیولی
بر صدر لوح حکمت نقشی کشید زیبا

شہباز جان نشستہ بر قبۂ معانی
عنقای عقل جستہ بر قاف قرب ماوی
برداشت قبضۂ گل ، بنگاشت پیکر دل
از نور اوست حاصل ، خورشید اوج اعلیٰ
مجموعۂ عجائب ، اعجوبۂ غرائب
پاک از ہمہ شوائب ، از جسم و جان معرّی

مولانا معین الدین تصانیفِ کثیرہ کے مالک ہیں ۔ ان کی کتابیں اور رسالے بے شمار ہیں لیکن جو مجھے معلوم ہو سکیں ، ذیل میں درج ہیں :

(۱) تفسیر بحر الدرر ۔

(۲) تفسیر حدائق الحقائق فی کشف اسرار الدقائق ۔

(۳) واضحہ فی اسرار الفاتحہ ۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے[1] ۔

(۴) معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل سوانح عمری ہے جس میں آپ کے اجداد امجاد یعنی ساتوں انبیاے اعظم کے بھی حالات درج ہیں ۔ سنہ ۸۹۱ھ میں اس کتاب کی ابتدا ہوئی اور کئی جلدوں میں لکھی گئی ۔ اس میں ایک مقدمہ ، چار رکن اور ایک خاتمہ ہے ۔ کتاب کو جابجا اقوال ، آیات ، نکات اور اشعار سے دل چسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ شعرا میں سنائی ، عطار ، مولانا روم ، اوحدی ، عراقی اور مولانا جامی کے ابیات موقع بہ موقع استعمال کیے ہیں ۔ اس کے سوا شاعر نے اپنے اشعار بھی کثرت کے ساتھ نقل کیے ہیں ۔

(۵) روضۃ الواعظین فی احادیث سید المرسلین ، چار جلدوں میں ہے ۔

(۶) تفسیر سورۂ یوسف علیہ السلام ۔

۱۔ تفسیر ھذا کا ایک نسخہ پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب کو کریمی لائبریری بمبئی سے ملا ۔ اُنھوں نے اس کتاب کی مدد سے دیوان معین الدین کی بابت مزید معلومات بہم پہنچائی ہے ۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ مقالات شیرانی ، جلد ششم ۔
(مرتب)

(۷) اعجازِ موسوی ۔ یہ وہی کتاب ہے جس کو 'مخزن الغرایب' میں 'معجزاتِ موسوی' لکھا گیا ہے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں ایک مبسوط تصنیف ہے جو مطبع عمدۃ المطابع میں سنہ ۱۲۷۲ھ میں چھپ بھی چکی ہے ۔

ان کے علاوہ اور رسالے اور کتابیں کثرت سے ہیں ، جو مولانا معین الدین کے قلم سے نکلی ہیں ، جن کی میں سراغ رسانی نہیں کر سکا ۔ نظم میں آپ نے بہت کچھ لکھا ہے ۔ آپ کا کلام از قسم رباعی و غزل و مثنوی کثرت سے ملتا ہے ۔ ایک رسالہ مثنوی میں بھی آپ نے لکھا ہے ۔

میرا ایسا خیال ہے کہ اکبری عہد کے موٴرخین کو مولانا کے متعلق صحیح معلومات تھیں لیکن بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان کے حالات سے بہت کم اعتنا کی ہے ۔ مجھے صرف ایک مختصر بیان مولانا کے متعلق تذکرۂ 'مخزن الغرائب' میں ملا ہے جس نے میرے تمام شکوک کو یقین کے درجے تک پہنچا دیا ۔

مجھے نہایت رنج اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ نایاب اور ضخیم تذکرہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے ۔ مولانا معین الدین کے حالات صاحبِ تذکرہ کو تین مختلف ذرائع سے ملے ہیں ۔ چونکہ وہ نہایت ہی ناکافی اور غیر معین تھے اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ 'مخزن الغرائب' میں مولانا کی ذاتِ واحد اقانیم ثلاثہ میں تبدیل کر لی گئی اور ایک معین کے تین معین بن گئے ۔ اس تذکرے میں سب سے مقدم (۱) مولانا معین الدین ہروی ہیں جن کے واسطے مصنفِ تذکرہ کے الفاظ ہیں :

"مولانا معین الدین ہروی فاضل تحریر و دانش مندِ کامل بودہ ۔ کتاب 'مدارج النبوۃ' و 'معجزات موسوی' (اعجاز موسوی) و تفسیر قرآن ازو در عالم مشہور است ، و در تفسیر آن قدر نکات و عجائبات بیان کردہ کہ در ہیچ تفسیر دیدہ نشد ، و در نظم و نثر کمال مہارت داشتہ ، علی الخصوص در انشای مہد؟ (کذا) ۔ این چند بیت از ذہنِ مستقیمِ اوست :

چو من ز بادۂ شوق تو مست و بی خبرم
ہمہ جمال تو بینم بہرچہ می نگرم
تو ہر حجاب کہ خواہی فرو گذار کہ من
بہ نعرۂ کہ زنم صد حجاب را بدرم"

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ غزل ، جس کا مطلع اور ایک شعر 'مخزن الغرائب' میں درج ہے ، موجودہ دیوان (طبع نولکشور سنہ ۱۲۸۸ھ) میں صفحہ ۵۶ پر پائی جاتی ہے ، جس کے کل سات شعر ہیں ۔ یہی غزل مولانا کی تصنیف 'معارج النبوت' (مقدمہ فصل اول ، تحمید الاول) میں پوری کی پوری درج ہے ۔ اس طرح موجودہ دیوان کو مولانا معین الدین کی طرف منسوب کرنے کے لیے ہمیں یہ پہلا مگر یقینی سراغ ملتا ہے ۔ (۲) دوسرے معین فراہی ہیں جن کے لیے منقول ہے :

"معین فراهی راست :

مگر فصل بهار آمد که عالم سبز و خرّم شد
مگر وصل نگار آمد که دل با عیش همدم شد"

دیوان میں رجوع کرنے سے علم ہوتا ہے کہ یہ پندرہ شعر کی غزل ہے اور صفحات ۲۲ و ۲۳ پر ملتی ہے ۔ اس غزل کے آٹھ شعر مع مطلع بالا کتاب 'معارج النبوة' (رکن اول ، باب ہفتم ، فصل چہارم) میں ملتے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ معین فراہی اور معین الدین ہروی ایک ہی شخص ہیں ۔ نیز یہ کہ موجودہ دیوان کے بھی یہی مالک ہیں ۔ (۳) تیسرے ملا معینی ہیں ۔ ان کے متعلق 'مخزن الغرائب' میں تحریر ہے :

"ملا معینی در زمان اکبر پادشاه بوده است :

اگر از خوابِ غفلت سر بر آری آن زمان بینی
که خورشید تجلیّ بر در و دیوار می تابد"

دیوان میں یہ غزل صفحہ ۳۵ پر ملتی ہے جس کے چودہ بیت ہیں ۔ اس غزل میں شعرِ بالا بھی موجود ہے ۔ اس فرق کے ساتھ کہ قافیے میں 'در و دیوار' 'دلِ بیدار' ہے ۔ اس غزل کا مطلع ہے :

چنان از روزنِ دل نور آن دلدار می تابد
که خورشیدِ جمالش از در و دیوار می تابد

یہ مطلع کتاب 'معارج النبوة' (رکن دوم ، باب سوم ، فصل سوم ، صفحہ ۶۷ ، طبع نولکشور) میں بھی ملتا ہے ، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ 'ملا معینی اور مولانا معین الدین ایک ہی ہستی ہیں ۔ مولانا ، جیسا کہ دیوان اور ان کی دیگر تصانیف سے معلوم ہوتا ہے ، اپنا تخلص دونوں طرح لاتے ہیں ۔ اس غلط خیال کی ،

کہ وہ اکبر کے عہد میں تھے ، تردید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی ، اس لیے کہ اس کے متعلق صحیح اطلاع گذشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے ۔

ذیل میں 'تذکرۂ حسینی' اور 'تذکرۂ روز روشن' کے انتخابیہ اشعار ، جو خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں ، مطالعہ کرتا ہوں :

ز پیش خویش برافگن نقاب دعویٰ را
ببین بہ دیدۂ صورت جمالِ معنٰی را
بحق او کہ بہ کونین دیدہ نکشایم
کہ تا نخست نہ بینم جمالِ مولٰی را
اگر در آتشِ عشقت بسوختم چہ عجب
کہ کوہ تاب نیاورد یک تجلّٰی را
معین بہ چشم خرد حسن دوست ننماید
بہ بین بہ‌دیدۂ مجنون جمالِ لیلٰی را

دیوان میں اس غزل کے سات شعر ہیں اور صفحہ ۵ پر ملتی ہے ۔ لیکن اس غزل کا دوسرا شعر یعنی ''بحق او کہ بکونین'' الخ ، کتاب 'معارج النبوۃ' (رکن اول ، باب سوم ، فصل دوم ، لطیفہ رابع عشرہ کے تحت) میں مندرج ہے اور دوسرا شعر کتاب 'اعجاز موسوی' (صفحہ ۲۲۹ ، عمدۃ المطابع ، سنہ ۱۲۷۲ھ) میں ملتا ہے اور ظنِ غالب یہی ہے کہ یہ غزل مولانا معین الدین کی ہے ۔

'تذکرۂ روز روشن' از مظفر حسین صبا ، صفحہ ۶۳۸ - ۶۴۰ ، طبع سنہ ۱۲۱۶ھ ۔

اس تذکرے میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دیوان سے جو اشعار انتخاب ہوئے ، ان میں ایک شعر یہ ہے :

این چہ نور است کہ بر کون و مکان تافتہ است
نور عشق است کہ از مطلعِ جان تافتہ است

دیوان میں یہ نو اشعار کی غزل ہے اور صفحہ ۹ پر ملتی ہے ۔ کتاب 'معارج النبوۃ' (مقدمہ ، فصل اول ، تحمید عاشر) میں اس غزل کے سات اشعار مع مطلع درج ہیں اور سب سے اہم یہ امر ہے کہ مصنف نے غزل کی ابتدا میں دعویٰ کیا ہے کہ

یہ میری غزل ہے۔ چنانچہ اس کے الفاظ ہیں :

"للعبد الضعیف نوّر اللہ قلبہ ۔"

یہ غزل ہمیں مصنف کی اپنی شہادت پر 'معارج النبوۃ' کے مصنف مولانا معین الدین کی طرف منسوب کرنا چاہیے ، نہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف :

درونِ قصرِ دل دارم یکی شاهی کہ گہ گاهی
ز دل بیرون زند خیمہ بہ بحر و بر نمی گنجد

دیوان میں اس غزل کے گیارہ شعر ہیں اور صفحہ ۲۵ پر ملتی ہے اور مطلع ہے :

مرا در دل بغیر از دوست چیزی در نمی گنجد
بخلوت خانۂ سلطان کسی دیگر نمی گنجد

'معارج النبوۃ' (رکن اول ، باب ہفتم ، فصل سیزدہم ، لطیفۃ الثانیہ) میں اسی غزل کے چار شعر مصنف نے لکھے ہیں جن میں شعر بالا بھی موجود ہے ۔

راہ بکشای کہ دل میل بہ بالا دارد
پردہ برگیر کہ جان عزم تماشا دارد

دیوان میں صفحہ ۲۹ پر یہ غزل ملتی ہے جس کے نو شعر ہیں ۔ 'معارج النبوت' (مقدمہ ، فصل سوم ، النعت التاسع) کے خاتمے پر کامل غزل مرقوم ہے ۔

اندر آئینۂ جان عکس جمالی دیدم
همچو خورشید کہ در آب زلالی دیدم

دیوان میں صفحہ ۴۸ پر یہ غزل ہے جس میں کلھم نو شعر ہیں ۔ اسی غزل کے نو شعر مع مطلع معارج النبوت ، رکن اول ، باب ہفتم ، فصل یازدہم ، لطیفہ خامسہؑ کے اختتام پر موجود ہیں ۔

صفات و ذات چو از هم جدا نمی بینم
بهر چہ می نگرم ، جز خدا نمی بینم

یہ آٹھ ابیات کی غزل ہے اور دیوان میں صفحہ ۵۲ پر ملتی ہے ۔ 'معارج النبوۃ' میں رکن سوم ، باب چہارم ، فصل بست و چہارم ، صفحہ ۲۱۹ (نولکشور) پر اس غزل کے چھ شعر مع مطلع و مقطع مرقوم ہیں ۔

میں بخوفِ طوالتِ مضمون 'روز روشن' کا مطالعہ ختم کرتے ہوئے گذارش

کرتا ہوں کہ اس تذکرے کے اشعار کا مولانا معین الدین کی تصنیف میں پایا جانا دلیل ہے اس دعوے کی کہ یہ اشعار مولانا معین الدین کے ہیں ، نہ خواجہ معین الدینؒ کے ۔

اب میں صرف ان اشعار کا ذکر کروں گا جو دیوان اور 'معارج النبوت' میں عام ہیں اور ان میں سے بھی وہی اشعار لوں گا جن کے مصنف ہونے کا مولانا معین کو دعویٰ ہے :

چشم بکشای کہ آفاق پُر از نور خداست
خالی از نور خدا در ہمہ آفاق کجاست

دیوان میں صفحہ ۷ پر یہ غزل ہے اور سات شعر کی ہے ۔ اسی غزل کے تین شعر 'معارج النبوت' (مقدمہ فصل اول ، تمہید السابع) میں پائے جاتے ہیں ۔ مصنف ان کی ابتدا میں لکھتا ہے : ''العبد الضعیف ۔''

آتشی افروخت عشق و جسم و جان من بسوخت
گفتم آہی بر کشم کام و زبانِ من بسوخت

اس غزل کے گیارہ ابیات ہیں اور دیوان میں صفحات ۱۱ - ۱۲ پر ملتی ہے ۔ اس غزل کے نو شعر مع مطلع کے 'معارج النبوت' میں (مقدمہ ، فصل اول ، تمہید العاشر کے خاتمے پر) موجود ہیں ۔ ان کے واسطے مصنف لکھتا ہے :

''لمؤلفہ غفر اللہ لہ ۔''

یہی غزل اس تصنیف کے رکن اول ، باب ہفتم ، فصل ہشتم کے اختتام پر پھر پائی جاتی ہے جس میں آٹھ شعر ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل مصنف کو بہت مرغوب تھی ۔ کیونکہ وہ اس کی دوسری تصنیف 'اعجاز موسوی' میں پھر دہرائی گئی ہے ، جہاں صفحہ ۹۷ - ۹۸ پر ملتی ہے اور مصنف ابتدا میں لکھتا ہے : ''چنانچہ فقیر گوید'' ۔ اسی غزل کے چھ بیت اسی 'اعجاز موسوی' میں صفحہ ۳۶ پر پھر پائے جاتے ہیں ، جن کے لیے دعویٰ کیا ہے : ''ابیات مؤلفہ ۔''

آتشی آمد پدید و جسم و جان یکسر بسوخت
دل درون سینہ ام چون عود در مجمر بسوخت

اس غزل کے سات شعر ہیں اور دیوان میں صفحہ ۱۲ - ۱۳ پر ملتی ہے ۔

'اعجاز موسوی' میں پوری غزل صفحہ ۹۲ موجود ہے اور مصنف کا دعویٰ ہے :
''لمؤلفہ فی ھذا المعنی ۔''

کسی کہ عاشق و معشوق خویشتن ہمہ اوست
حریفِ خلوت و ساقیِ خویشتن ہمہ اوست

یہ گیارہ شعر کی غزل ہے اور دیوان میں صفحہ ۱۳ پر نظر آتی ہے ۔ معارج النبوت میں (مقدمہ ، فصل اول ، تحمید الثامن کے آخر میں) تمام غزل مرقوم ہے اور ''لمؤلفہ'' مصنف کا دعویٰ ہے ۔

یارب این صورت کہ در مرآت جان پیداست کیست ؟
آنچنان حسنی درین پردہ نہان پیداست کیست ؟

دیوان میں صفحہ ۱۴ پر سات شعر کی یہ ایک غزل ہے ۔ 'اعجاز موسوی' میں یہی غزل صفحہ ۲۵۹ پر موجود ہے ۔ اس کے ابتدا میں صاحبِ کتاب ''لمؤلفہ'' کہہ کر اپنی غزل مانتا ہے :

حمدیکہ ہمچو بحر کرم بیکران بود
حمدیکہ شکر نعمت ہر دو جہان بود

دیوان میں صفحات ۱۶ - ۱۹ پر یہ حمدیہ قصیدہ ملتا ہے جس میں ایک کم پچاس اشعار ہیں ۔

یہ تمام قصیدہ 'معارج النبوت' مقدمہ ، فصل اول ، تحمید الثانی عشرہ میں پورا موجود ہے ۔ اس کی ابتدا میں صاحبِ 'معارج' کے الفاظ ہیں : ''قال مؤلف الکتاب ختم اللہ آمالہ بالرشد والصواب ۔'' اسی قصیدے کے چند اشعار 'اعجاز موسوی' کے صفحہ ۵۸ پر نظر آتے ہیں اور ان کی ابتدا میں مصنف کا دعویٰ ہے : ''چنانچہ فقیر گوید ۔''

چشم بکشای کہ دیدار خدا جلوہ نمود
دیدہ شو یکسر و بربند در گفت و شنود

یہ چودہ شعروں کی غزل صفحہ ۲۳ پر دیوان میں ملتی ہے ۔ (فصل پنجم باب دوم ، رکن اول) ۔ 'معارج النبوہ' میں اس غزل کے چار شعر ہیں جن کے واسطے مصنف کہتا ہے : ''چنانچہ معین دیوانہ تو گوید'' ۔ اسی غزل کے بارہ شعر مع

مطلع و مقطع اسی کتاب کی تحمید الخامس ، فصل اول ، مقدمے میں مرقوم ہیں ۔

وقت آنست کہ دل واقفِ اسرار شود
جای آنست کہ جان طالب دیدار شود

دیوان میں صفحہ ۲۷ پر یہ غزل ہے ۔ اس میں ۲۱ ابیات ہیں ۔ اس غزل کے سات شعر 'معارج النبوۃ' (رکن اول ، باب دوم ، فصل پنجم) میں آتے ہیں ۔ ابتدا میں مؤلف گویا ہے : ''چنانچہ معین دیوانہٴ تو گوید''۔ اسی غزل کے پانچ شعر مع مطلع 'معارج النبوۃ' (مطبوعہ) میں (رکن سوم ، باب چہارم ، فصل بست و چہارم ، در لطائف و اشارات) صفحہ ۲۱۹ پر پائے جاتے ہیں اور حسب معمول شاعر ابتدا میں کہتا ہے : ''چنانچہ فقیر تو گوید ۔''

نغمہٴ عشق کزان سوی جہان می آید
بہ مشامِ دلم از عالم جان می آید

یہ صفحہ ۳۴ - ۳۵ پر دیوان میں سترہ ابیات کی غزل ہے ۔ اسی غزل کے چھ بیت مع مطلع ، فصل پنجم ، باب دوم ، رکن اول 'معارج النبوت' میں نظر آتے ہیں ۔ ان کے لیے مصنف گویا ہے : ''چنانچہ فقیر گوید سواوی معین ۔''

اگر بی‌پردہ نتوانی کہ بینی پرتو ذاتش
بذرات جہان بنگر کہ ہر ذرہ است مرآتش

یہ دیوان میں صفحہ ۳۴ پر سات بیتوں کی غزل ہے ۔ 'معارج النبوت' (رکن اول ، باب دوم ، فصل پنجم) میں اس کے دو شعر ملتے ہیں ۔ اور یہی اشعار مقدمہ فصل دوم ، مناجات الثالثہ 'معارج النبوۃ' میں بھی نظر آتے ہیں ۔ یہاں شاعر کہتا ہے : ''لمؤلفہ ۔''

بیا در بزم 'او ادنیٰ' یکی حرفی زمن بشنو
وزان اسرار 'ما اوحیٰ' یکی طرزی سخن بشنو

یہ سات شعروں کی غزل دیوان میں صفحہ ۷۸ پر آتی ہے ۔ 'معارج النبوۃ' (مطبوعہ) میں (رکن سوم ، باب چہارم ، فصل دوم) صفحہ ۱۰۷ پر اس کے چھ شعر پائے جاتے ہیں اور مصنف ان کے لیے ''لمؤلفہ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے ۔

از مطلع دل زد علم یک لمعۂ از رخسار او
شد ذرۂ ذرۂ ہستیم در پردۂ انوار او

صفحہ ۷۹ پر دیوان میں یہ پندرہ ابیات کی غزل ملتی ہے ۔ مقدمہ 'معارج النبوۃ'، فصل اول ، تمہید ثانی کے خاتمے میں اس کے دس شعر موجود ہیں جن کو مصنف نے ''لمولفہ'' کے ذیل میں درج کیا ہے ۔ اسی غزل کے تین شعر اسی کتاب کے رکن اول ، باب سوم ، فصل دوم کے اختتام پر پائے جاتے ہیں جن کے شروع میں مولانا معین فرماتے ہیں : ''و فقیر نرا درین باب معنی بخاطر گذشتہ چنانچہ فقیر تو گوید ۔''

هستی طلیعہ ایست ز نور وجود او
کونین شبنمی است ز دریای جود او

دیوان میں صفحہ ۸۰ - ۸۱ پر یہ غزل درج ہے جس کے گیارہ بیت ہیں ۔ 'معارج النبوۃ' میں (مقدمہ فصل اول ، تمہید السادس کے خاتمے میں) یہ پوری غزل درج ہے اور ابتدا میں ''لمؤلفہ'' آتا ہے ۔

پیش ازان کاستاد فطرت فرش ایوان ساختہ
پایۂ قدرت فراز کونِ امکان ساختہ

یہ غزل دیوان میں صفحہ ۸۱ اور ۸۲ پر ملتی ہے جس میں پندرہ اشعار ہیں ۔ 'معارج النبوۃ' کے مقدمہ فصل سوم ، نعت دوازدہم میں اس غزل کے نو شعر نظر سے گزرتے ہیں ۔ مصنف ان کے متعلق کہتا ہے : ''قال مؤلف الکتاب هدی الله طریق الصواب فی نعت ۔''

اس سے زیادہ مثالیں بہم پہنچانا قارئین کرام کی زحمت کا موجب ہوگا۔ بیسیوں اور ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں مولانا معین الدین کے ہاں اور موجودہ دیوان میں وہی اشعار موجود ہیں ، بلکہ بعض وقت پوری پوری غزلیں عام ہیں ۔ جب اس دیوان کی اس قدر غزلیں مولانا معین الدین کی ثابت ہوتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ باقی غزلوں کو مولانا کی زادۂ طبع نہ مانیں ، اور کل دیوان کو انھی کی طرف منسوب نہ کریں ، جس کے حقیقت میں وہ جائز مستحق ہیں ۔ اب تک مولانا معین الدین کی دو تالیفیں میری نظر سے گزری ہیں ؛ پہلی یہی 'معارج النبوۃ' اور دوسری 'اعجاز موسوی ۔' بدقسمتی سے 'معارج النبوۃ' کا کامل نسخہ بہم نہ پہنچا ، صرف مقدمہ اور تین رکن میری نظر سے گزرے ہیں ۔ باقی رکن

چہارم اور خاتمہ مجھے دستیاب نہیں ہوئے ۔ ممدوح کثیر التعداد تصانیف کے مالک ہیں ۔ اگر ان کی تالیفات میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین واثق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا اس میں پتا لگ جائے گا بلکہ اس کے علاوہ اور سینکڑوں نئی غزلیں ہاتھ آئیں گی جو دیوان کے حجم کو المضاعف کردیں گی ۔[1]

☆ ☆ ☆

۱۔ ملاحظہ کیجیے پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب مرحوم کا مضمون ''دیوان خواجہ معین الدین چشتی اجمیری'' جو زیرِ نظر جلد کے ضائم میں شامل ہے ۔
(مرتب)

خزائن الفتوح از امیر خسرو دہلوی

بسلسلہ مطبوعات انجمن تاریخ جامعۂ اسلامیہ علی گڑھ ، مرتبہ سید معین الحق صاحب ایم ۔ اے ۔ معلّمِ تاریخ جامعہ اسلامیہ علی گڑھ ، سنہ ۱۹۲۷ع

(از اورینٹل کالج میگزین ، بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۳۵ع)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ نے ایک انجمن بنام 'سلطانیہ تاریخی انجمن' بنائی تھی جس کا مقصد غیر مطبوعہ ، ملکی تاریخی کتابوں کی طباعت تھی ۔ چندہ پندرہ روپے سالانہ تھا جس کے عوض میں ممبروں کو ہر سال انجمن کی ایک مطبوعہ کتاب مفت دی جاتی تھی ۔ طباعت کے لیے سب سے پہلی کتاب جو انتخاب کی گئی ، حضرت امیر خسرو کی تالیفِ بالا 'خزائن الفتوح' تھی ۔ کتاب پر سالِ طبع ۱۹۲۷ع ہے لیکن لاہور کے ممبروں کو یہ تالیف کئی سال بعد ملی ۔ اس کے حجم کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ چندہ دہندگان کو یہ سودا مہنگا پڑا ۔

تالیف ھذا میاں سر محمد شفیع کے ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی ، بار ایٹ لا' لاہور ، خان محمد سعادت علی صاحب رئیس لاہور اور نواب سمیع اللہ بیگ صاحب چیف جسٹس حیدر آباد دکن کے ناموں کی طرف منسوب ہے جن کی فیاضی نے انجمن کو یہ مخطوطہ شائع کرنے کے قابل بنایا ۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تین دیباچے بزبان انگریزی بہ تفصیل ذیل دیے گئے ہیں ۔

سب سے پہلے جناب صدر یعنی پروفیسر عبدالحلیم جنرل ایڈیٹر کا پیش کلمہ ہے کہ بہت کم ملک ایسے ہوں گے جو تاریخی دستاویزوں کے لحاظ سے ہندوستان کی طرح دولت مند ہوں ۔ مگر جنگوں ، ناموافق آب و ہوا اور ہماری بے توجہی نے زمانۂ وسطیٰ کی تاریخی تصنیفات کے ایک بڑے حصے سے ہمیں محروم کر

دیا ہے اور جو باقی رہا ہے اس کا اکثر حصہ، مخطوطات کی شکل میں ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ ہندوستانیوں نے بعض مستثنیات کے ساتھ ان کو بربادی سے محفوظ رکھنے کے واسطے کوئی اقدام نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں عملاً جو مبارک تحریک ہوئی وہ مغربی فضلا کی شرمندۂ احسان ہے۔ اس میدان میں بنگال کی شاہانہ (کذا) انجمن ایشیائی بڑی حامی کار ثابت ہوئی اور تاریخ ہند کے ہر مہر پرور کے شکریے کی مستحق ہے۔ سلسلہ ہذا ایک جدید کوشش ہے جس کے ذریعے سے اس ملک کے ادبی حلقوں میں اسلامی عہد کے ہندستان کی بعض تاریخی مصنّفات کو پیش کیا جائے گا اور ایسے مصنفین کو ترجیح دی جائے گی جو اپنے روایت کردہ واقعات کے معاصر ہیں، اور کوشش کرکے مختلف نسخوں سے مقابلے کے بعد ہر تصنیف کا ایک قابل اعتماد متن پیش کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن نسخہ ہذا تو مختلف نسخوں پر مبنی نہیں ہے اور نہ اس کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد جناب مرتّب کا افتتاحیہ ہے کہ 'خزائن الفتوح' سے اگرچہ زمانۂ وسطی کے مورخ واقف تھے لیکن اس کے مطالب سے کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کے نسخے بہت کمیاب ہیں اور اس کے بعض اقتباس صرف ایلیٹ کی تاریخ کے ذریعے سے معلوم ہیں۔ 'خزائن الفتوح' کا متن برٹش میوزیم کے نسخے آر ۱۶۳۸ اور سید حسن برنی بلند شہری کے نسخے پر مبنی ہے۔ دونوں نسخوں میں اس قدر کم اختلاف ہے کہ اس کو علیحدہ ذیلی حاشیے میں دکھانا ضروری نہ تھا۔ میوزیم کا نسخہ اگرچہ قدیم نہیں لیکن صحیح اور مایقرا ہے۔ اس کے بعد حضرت مرتّب کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک مزید حاشیہ آرائی یا تنقید غیر ضروری ہے۔ دیباچہ، جو آگے آتا ہے، حضرت امیر خسرو کی طرز نگارش اور تالیفات سے ہماری کافی شناسائی کر دیتا ہے نیز یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ 'خزائن الفتوح' کی سابقہ تالیف کا تکملہ ہے، اور پروفیسر حبیب پہلے شخص ہیں جو اس واقعے کے معلن ہیں (یہ ایک ایسا بیان ہے جو شرمندۂ اثبات نہیں)۔ موصوف کا ترجمہ مع ذیلی حواشی کے زیر طبع ہے۔ امیر خسرو کے ادبی نکات، تلمیحات اور صنائع کلام کی تشریح ایک طویل اور تھکا دینے والا کام ہے (دریں چہ شک!)۔ علاوہ

بریں فارسی خوانوں کے لیے اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مبتدیوں کو کوئی اسے پڑھانے کا بھی نہیں۔ بہت اچھا ہوا جو جناب مرتّب نے اپنے آپ کو اور اپنے قارئین کو اس تمام زحمت سے بچا لیا۔ بس اسی پر جناب ایڈیٹر کا دیباچہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہی رسمی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جس میں جناب صدر پروفیسر عبدالحلیم اور پروفیسر محمد حبیب کا بنابر بیش قیمت امداد شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ پھر اپنے دوستوں حضرات عبدالرشید ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، ایم سلطان حمید ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی اور قاضی عطاء اللہ صاحب، ایم۔ اے۔ کی خدمت میں برائے پروف خوانی اظہار تشکر کیا گیا ہے۔ مگر جناب ایڈیٹر بقول نظیری:

طفیلی جمع شد چندان کہ جای میہمان گم شد

ان رسمی شکریوں کے ہجوم میں اصلی مستحق جناب کاتب کو خدا جانے کیوں فراموش کر گئے، اس لیے کہ یہی بزرگ ہیں جو سب سے زیادہ امیر خسرو کی اس تالیف کے احیا کے ذمہ دار ہیں اور 'خزائن الفتوح' کا متن، خواہ صحیح خواہ غلط، سراسر انہی کا ساختہ و پرداختہ ہے، جس میں باقی بزرگان کا ہاتھ (ان میں حضرت ایڈیٹر بھی شامل ہیں) برائے بیت ہے۔

پروفیسر حبیب کا مقدمہ صفحہ ۷ سے صفحہ ۱۵ تک ہے لیکن اس میں امیر خسرو کے افکار و آرا سے بحث کرنے کے مقابلے میں موصوف نے اپنے خیالات و جذباتِ عالیہ کی زیادہ نمائش کی ہے۔ پہلے فقرے میں خسرو کی 'اعجاز خسروی' کا ذکر ہے۔ دوسرے فقرے میں ان کی نثر کو ایک خراب قسم کی نظم کہا گیا ہے۔ تیسرا فقرہ اسی پر معطوف ہے۔ چوتھے اور پانچویں فقروں میں اس طرزِ خاص کی مثالیں دی گئی ہیں۔ چھٹے میں کتاب کی تقسیم اور کبیر الدین، علاء الدین کے درباری مؤرخ کا ذکر جو برنی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ ساتویں فقرے میں یہ بیان کہ خسرو نے موجودہ تصنیف کبیر الدین کی تاریخ کے تتبّع میں لکھی ہے، جس طرح خمسہ نظامی کے جواب میں اپنا خمسہ لکھا ہے۔ آٹھویں میں یہ ذکر کہ اس تصنیف کو علاء الدین کی سرکاری تاریخ کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ پچھلے دو فقروں کے بیانات کے لیے ہمیں کوئی معقول وجہ معلوم نہیں۔ نویں فقرے میں کہا گیا ہے کہ خسرو نے اس میں جلال الدین کے قتل اور علاء الدین کی ان شکستوں کا ذکر نہیں کیا جو مغلوں نے اسے دیں۔ دسویں فقرے میں

کہا ہے کہ 'خزائن الفتوح' ایک نقاد کے واسطے ایک پائدار قیمت کی چیز ہے ، اگرچہ اس میں مبالغہ ہے لیکن جھوٹ کہیں نہیں ہے ۔ جو امور اس تاریخ سے متروک ہیں ، دیگر ذرائع سے معلوم کیے جا سکتے ہیں اور اس طرح علاء الدین کے عہد کی کامل تاریخ ہم حاصل کر سکتے ہیں ۔

پروفیسر حبیب کا بیان ہے کہ دکن کی مہموں سے تعلق رکھنے والا حصہ تاریخِ ہند میں دائمی قدر کا مستحق ہے ، جس میں اونٹ کی پیٹھ سے زیادہ ناہموار راستے پر طویل کوچ ، غارت شدہ مندروں ، حلقۂ اطاعت میں لائے گئے راجوں اور صدیوں کی اندوختہ دولت کا ایک ہی داؤ میں دہلی کے خونخوار سلطان کی خدمت میں ترسیل کا ذکر و اذکار ہم پڑھتے ہیں ۔ یہ مہم کیا تھی ؟ موت ، ہوس اور تاخت و تاراج کا ایک دیوانہ رقص تھا ۔ پروفیسر حبیب ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور اپنے جذبات میں توازن قائم رکھ سکتے تو مسلمانی تاریخ کی روح کے ادراک سے اس قدر قاصر نہ رہتے ۔

موصوف اس کے بعد علاء الدین کی اس دکنی مہم کو غیر مذہبی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاف صاف یہ مہم گھوڑوں ، ہاتھیوں ، جواہرات اور سیم و زر کے حاصل کرنے کے لیے کی گئی تھی ، نہ کسی مذہبی رسالت و تبلیغ کے واسطے ۔ مسلمان وہاں اپنے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی غرض سے نہیں گئے تھے ۔ وہ عمدہ سپاہی تھے ، ایسے بے سود مقاصد بھلا کب ان کی جنگی تجاویز میں برہمی پیدا کر سکتے تھے ۔ ہاں بے شک خدا کے نام کی سنجیدگی کے ساتھ تمجید کی گئی ۔ ان حملہ آوروں نے ، جہاں جہاں یہ گئے ، مسجدیں بھی بنائیں اور بانگ اذان صحراؤں اور برباد شدہ شہروں سے بلند کی لیکن یہ سب کچھ رسماً ہوا اور یہ دکنی مہم ہر قسم کی متشددانہ اور غیر متشددانہ مذہبی تبلیغ و اشاعت سے بالکل معصوم تھی ۔

پروفیسر ممدوح کی اس عجیب و غریب تبصرہ فرمائی کی منطق کو ہم مطلق نہیں سمجھے ۔ علاءالدین کی جنگوں کو کسی نے بھی مذہبی غزواۃ کے نام سے تعبیر نہیں کیا ۔ خود امیر ان جنگوں کو ''عالم گیری'' کے لفظ سے یاد کرتے ہیں :

باز گشتن از بیان رسم گیتی داشتن
سوی عالم‌گیری و طرز علم افراشتن

(خزائن الفتوح ، صفحہ ۳۴)

آگے چل کر پروفیسر کہتے ہیں کہ 'خزائن الفتوح' کا ایک سطحی قاری شاید اس میلان کو ترجیح دے کہ یہ کتاب مذہبی تشدد و تعصب کے اثرات میں لکھی گئی ہے، لیکن یہ ایک شدید غلطی ہوگی۔ امیر خسرو کا مذہبی مطمحِ نظر غیر معمولی طور پر رواداراںہ تھا، جیسا کہ ان کے دیوان کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ 'خزائن الفتوح' کے نہایت شدید مقولات میں بھی ایک پردہ دارانہ تعریض ہے۔

اس کے بعد فاضل دیباچہ نگار کتاب سے ترجمے کی صورت میں ایک اقتباس دے کر سوال کرتے ہیں: کیا یہ ایک فخریہ تعصب کی قرنا ہے یا ایک غم انگیز فکریت کا دل گداز نغمہ؟ کیا امیر خسرو ان بت شکنوں کی مدحت گری میں زمزمہ سنج ہیں یا ان کے صحیح مذہبی حسّیات کے فقدان پر کف افسوس ملتے ہیں؟ جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ ایک درباری مؤرخ، جو سرکاری طور پر تاریخ نگاری پر مامور ہے، اپنی اصلی رائے کے اظہار کا کوئی حق نہیں رکھتا اور امیر خسرو اپنی تاریخ سلطان کی خواہش کے مطابق لکھ رہے ہیں۔ لیکن جیسا کہ صاحبِ 'روضۃ الصفا' میر خواند نے لکھا ہے کہ درباری مؤرخ کو اشارات و کنایات یا بے جا مدح نگاری یا دوسرے طریقوں سے، جیسا موقع ملے، اپنی صحیح رائے کے اظہار سے، جو اس کے جاہل ممدوح پر منکشف نہ ہو اور جسے دانا و عقلا سمجھ سکیں، باز نہیں رہنا چاہیے۔ امیر خسرو بھی ملک نائب کافور سلطانی کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ 'دیول رانی' میں وہ اس پر سب و شتم کرتے ہیں۔ لہٰذا خسرو کی دینی اور شعری روشن ضمیری مہم دکن کی بربریت کے خلاف بیزاری کا اظہار ہی کر سکتی ہے اور اسی بنا پر ان کا خاکہ فی الحقیقت اس قدر بھیانک ہے۔ شاعر نے ایک قدیم تمدن کی بربادی پر خونیں اشک بہائے ہوں یا نہ بہائے ہوں لیکن اس کے طرز کلام سے یہ بالکل واضح ہے کہ یہ خدا کی بندگی نہیں تھی بلکہ دنیاوی طمع کا مقصد جس نے حملہ آوروں کو اس مہم پر آمادہ کیا۔ 'خزائن الفتوح' سے تو پروفیسر کی اس رائے کی تائید نہیں ہوتی۔

علاء الدین کی مہموں کے خلاف پروفیسر حبیب کا یہ معصومانہ غصہ اور متشدّدانہ رویہ نہایت استعجاب انگیز ہے۔ آخر دنیا میں ایسی باتیں بھی ہوا ہی کرتی ہیں۔ ہر فاتح و جابر بادشاہ نے ایسا کیا ہے اور کیا آج نہیں ہو رہا؟ لیکن ان خالص فوجی مہموں میں حبیب صاحب نے مذہبی سوال کیوں داخل

کیا اور پھر اس کے لیے معذرت خواہی بھی کر رہے ہیں کہ ان جنگوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا ۔ اس پر طرّہ یہ کہ امیر خسرو کے صاف و صریح بیان کے باوجود ان کی طرف سے عذرداری کر رہے ہیں کہ علاء الدین کے خوف سے انھوں نے حقیقت پر پردہ ڈالا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ یہ غیر مدلّل موقع پروفیسر کے اپنے جذبات کا پیدا کردہ ہے ۔ امیر خسرو اس گندم نمائی اور جو فروشی سے بالکل معصوم ہیں ۔ 'خزائن الفتوح' امیر نے علاء الدین کے حکم سے نہیں لکھی تھی بلکہ اپنی خوشی سے ۔ اس کے متعلق ان کا بیان بالکل صریح اور واضح ہے ۔ وہ دیباچے میں کہتے ہیں :

"تا ازان گونہ کہ در بحور نظم فراوان غوص نمودہ بودم و انبار ھای لآلی گرد آوردہ ، خواستم کہ برای ستّدہ والا نثری نیز بیارایم ۔"

(صفحہ ۴ ، خزائن)

جب امیر خسرو اپنی خواہش سے یہ نثر کے موتی علاء الدین کے قدموں پر نثار کر رہے ہیں تو پروفیسر کا یہ قول کہ یہ کتاب امیر نے علاء الدین کے حکم سے لکھی ہے ، نہ صرف پایۂ اعتبار سے ساقط ہے بلکہ گمراہ کن ہے ۔ علیٰ ھذا امیر ہر قسم کی پردہ دارانہ تعریض اور منافقانہ سوانگ بھرنے سے بری ہیں ۔

حبیب صاحب تاریخ کے پروفیسر ہیں ۔ تعجب ہے انھیں علاء الدین کے تمام کارناموں میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی ۔ اس کا اقتصادی پروگرام ، جو دنیا کے لیے موجبِ رشک و حیرت ہے ، انھیں شروع ہی سے یاد نہیں آیا ۔ اس سے بھی زیادہ اس کا وہ درخشاں کارنامہ جس نے آٹھویں صدی ہجری میں سرزمین ہند میں مغلوں کے آئے دن کے حملوں کا خاتمہ کر دیا تھا ۔ پروفیسر صاحب کی ذہنیت بھول کر بھی اس طرف منتقل نہیں ہوئی ، لیکن اس کی فتوحات کے ایک ادنٰی شاخسانے ، یعنی مہمِ دکن پر وہ سرخ آنسو بہانے کے لیے تیار ہوگئے حالانکہ سیاسی اعتبار سے وہ بالکل ہنگامی اور بے نتیجہ تھی ۔ پروفیسر اس دھوکے میں کہ ایک بڑا قدیم تمدن نیست و نابود کر دیا گیا ، رنگین آنسو بہا رہے ہیں ، حالانکہ کوئی تمدن ایسی ہنگامی تاخت و تاز سے برباد نہیں ہوا کرتا ۔ لیکن وہ ہڈیاں دیکھتے ہیں اور روتے ہیں ۔ ہم پوچھتے ہیں کیا لڑائیوں میں لڈو بٹا کرتے ہیں ؟

ہمیں حیرت ہے کہ فاضل پروفیسر کو علاء الدین کے نمونے کا تاریخ میں کوئی شخص نظر نہیں آیا ، حالانکہ دکن کے خلاف مہم میں نہ وہ اول ہے اور نہ آخر ہے ۔ سب سے پیشتر مہاراجہ اشوک نے دکنی فتوحات کا راستہ کھولا ۔ علاء الدین تو اشوک کے بعد آتا ہے ، جس طرح کہ اکبر ، علاء الدین کے نقش قدم پر چلتا ہے ۔ یہ سلاطین اپنے اپنے زمانے میں بڑے فاتح ہوئے ہیں اور ان کی کثرتِ فتوحات نے بالآخر ان کی ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت کے تخیل تک رہنمائی کی ہے ۔ اسی لیے یہ تینوں سلاطین دکن کی فتح کے لیے جد و جہد کرتے رہے ہیں ۔ لیکن علاء الدین کے لیے مثالیہ اشوک نہیں ہے بلکہ سکندر اعظم اور اسی لیے اس نے اپنے نام اور سکّے میں 'سکندر الثانی' کا خطاب اختیار کیا ہے ۔ اب جس اصول نے سکندر کو یونان سے نکل کر ہندوستان میں پورس سے جنگ کی ترغیب دی ، اسی اصول کے ماتحت علاء الدین بھی دکن فتح کرنے پر آمادہ ہوتا ہے اور ہم پروفیسر صاحب سے دریافت کرتے ہیں : کیا آج ملک گیری کا دروازہ بند ہو چکا ہے ؟

'خزائن الفتوح' کے متعلق بہت سی باتیں کام کی کہی جا سکتی تھیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ دیباچہ نگار نے یہ مقدمہ عجلت کی حالت میں کتاب پر زیادہ وقت صرف کیے بغیر لکھا ہے ، اسی لیے اس میں ایسی بحثیں ہیں جو کتاب سے در حقیقت کوئی تعلق نہیں رکھتیں ؛ مثلاً 'روضۃ الصفا' کے مصنّف کی نصیحت کا نقل کیا جانا جو یقیناً بے موقع اور بے محل ہے ، اسی طرح یہ دعویٰ کہ امیر خسرو ملک کافور سلطانی سے نفرت کرتے تھے اور اسی لیے وہ 'دیول رانی' میں اس کو سب و شتم سے یاد کرتے ہیں ۔ فاضل پروفیسر اپنی جلد بازی میں یہ بھول گئے کہ 'دیول رانی' میں ملک کافور شہزادہ خضر خان کے کور کیے جانے کا ذمہ دار ہے ۔ اس لیے ہر راستی پسند شخص اس سے نفرت کرے گا اور امیر خسرو تو بدرجۂ اولیٰ کیونکہ اس جواں مرگ شہزادے کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات بھی تھے ۔ لیکن 'خزائن الفتوح' کی تصنیف کے وقت حالات بالکل مختلف تھے ۔ بحیثیت فاتح دکن وہ ان کے ہر احترام کا مستحق تھا ۔ چنانچہ 'خزائن الفتوح' میں ہر مقام پر وہ اس پر تحسین و آفرین کرتے ہیں ۔ ہمیں یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ 'خزائن الفتوح' 'دیول رانی' سے چھ سال قبل تصنیف ہوتی ہے ۔

ہم پروفیسر کے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کرتے کہ خسرو 'خزائن الفتوح' میں ایک درباری مؤرخ کا فرض ادا کر رہے ہیں اور اس لیے رمز و کنایہ سے مصنف 'روضۃ الصفا' کے عقیدے کے مطابق صحیح واقعات کی طرف ہماری رہبری کر رہے ہیں۔

اب ہم دیباچوں سے اعراض کر کے اصل کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں: جناب ایڈیٹر کے اس بیان کے باوجود کہ نسخہ' ھذا کا متن دو مخطوطوں پر قائم ہے، جن میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور اسی لیے اس اختلاف کو ذیلی حواشی میں دکھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، کہا جا سکتا ہے کہ نسخہ' ھذا اس قدر غلط ہے کہ اس کا کوئی صفحہ غلطیوں سے خالی نہیں۔ قدم قدم پر عبارت کا ربط درہم و برہم نظر آتا ہے اور چھوٹی اور بڑی غلطیاں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ قاری دق ہو جاتا ہے۔ میں بعض مثالیں ذیل میں عرض کرتا ہوں:

صفحہ ۲۰، سطر ۸ و ۹ : سحرۂ خون آشام یعنی، کہ گفتاران آدمی خوار، کہ در گوشت و پوست اولاد و اطفال مردمان دندان بی خرد تیز می کردند، و سیل خون فرود می بردند و گوار شان می آمد۔"

ان دو سطروں میں ہمیں یہ غلطیاں نظر آتی ہیں: 'یعنے' کے بعد علامتِ وقفہ غلط۔ 'گفتاران' کی جگہ 'کفتاران' چاہیے۔ 'بی خرد' کی جگہ 'بی خردی'۔ 'فرود' کے بجائے 'فرو' اور 'گوار' کی جگہ 'گوارا' لانا چاہیے۔

صفحہ ۲۰، سطر ۱۰ و ۱۱ : "و از ناگوارای آب هم ایشان را فرود در خاک شان تا حلق فرود می بردند، و مر مردمانرا بر کاسه سر ایشان سنگ انداز میکردند"۔

اس عبارت میں 'ناگوارای' کے بجائے 'ناگوارائی' اور 'فرود' کی جگہ 'فرو' چاہیے۔ 'فرو' کے بعد فعل 'می برد' چاہیے اور دوسرے 'فرود' کی جگہ وہی 'فرو' چاہیے۔ 'مردمان' سے قبل 'مر' اور 'مردمان' کے بعد 'را' بالکل غلط ہیں۔ 'کاسہ' پر ہمزہ ضروری ہے۔

صفحہ ۲۰، سطر ۱۲ : "و سزا بهای خون که بخورده بودند از سر ایشان فرودِ می آید"

یہاں 'سزا بهای' کی جگہ 'شرابهای' اور 'می آید' کی جگہ 'می آمد' چاہیے۔

بلا شائبۂ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان پانچ سطروں میں ، جو ایک ہی فقرے سے تعلق رکھتی ہیں ، پندرہ غلطیاں موجود ہیں ۔ اب کس طرح یقین کیا جائے کہ اس کتاب کے پروف پڑھے گئے ہیں ۔

صفحہ ۲۱ سطر ۴ : ''باز از آنجا کہ کمال دینداری این معین شریعت جملگی اصحاب اباحت را احضار فرمود ۔'' یہاں 'شریعت' کے بعد علامت خبر 'است' ضروری ہے ۔

صفحہ ۲۱ سطر ۵ و ۶ : ''تاھر یک را پیش جستند ، و بزمی تفتیش کردند ۔ از کیفیت آن آلودہ گان بی حیا چنان روشن گشت ۔'' اس فقرے میں 'بزمی' کی جگہ 'بہ نرمی' چاہیے ۔ 'آلودہ گان' کو آلودگان' لکھنا چاہیے ۔

صفحہ ۲۱ سطر ۸ و ۹ : ''و میان خواہر و برادر نیسرہ چتری زادہ ۔ بر سر ھمہ از سین سیاست آرّہ راند ، بحدی کہ مردان را اگر در خود بینی از سر ھیبت نیت می گشت ۔''

اب یہ عبارت 'نیسرہ چتری' 'خود بینی' اور 'نیت' کی بنا پر بالکل مہمل بن گئی ہے ۔ ہم اس کی صحت سے عاجز ہیں ۔

صفحہ ۲۲ ، سطر ۳ و ۴ : ''نرخ حبوب کہ منفعت عام شہری و روستائی است ، در ایامی ارزان داشت ، کہ از کف ابر ممثل قطرہ نمی چکید ۔'' 'حبوب' کے بعد 'را' چاہیے اور 'ممثل' کی جگہ 'ممسک' چاہیے ۔

صفحہ ۲۳ ، سطر ۲ : ''باز دارالعدل کشادہ تر از پیشانی راست کاران بنا فرمودہ ۔'' 'دارالعدل' کی جگہ 'دارالعدلی' آنا چاہیے ۔

صفحہ ۲۴ ، سطر ۶ : ''تا ھر کس در شور و شیون ھر چہ بہتر و بایستہ تر بانصاف می ستاند ۔'' 'شور' کے بدلے 'سُور' لانا چاہیے ۔

صفحہ ۲۵ ، سطر ۴ و ۵ : ''در اقامت خیرات بنایادی نہاد ، کہ سپہر در وی شیدا گردد ۔'' 'بنایادی' کے عوض 'بنیادی' چاہیے ۔

صفحہ ۲۶ ، سطر ۱۳ و ۱۴ : ''بیک اشارت والا جملگی گردونہاء سیّارہ کہ دوکان گاو فلک در زیر داشتند ، بکار آمدند ۔ و مشتری بخریدن سنگ و آھن بازار گرم کرد و مہ براندن ثور شرف نمود ۔''

اس موقع پر 'دوکان' کی جگہ 'دوگان' اور 'شرف' کے بعد 'خود' آنا چاہیے

اور 'گردونہاء' کی جگہ 'گردونہای' صحیح ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر 'آھن' کی جگہ 'آھک' ہو۔

صفحہ ۲۷ ، سطر ۶ : "از بس کہ در تحصیل سنگ عشق تمام داشتند ، عاشق وار دامن کوہ را چاک چاک کردند" ۔ 'عاشق' کی جگہ 'فرھاد' چاہیے ۔

صفحہ ۲۷ ، سطر ۷ تا ۱۰ : ''و بعضی در قلع بنیاد ھای کفر از پولاد تیزتر بودند ۔ آھن ھای تیز کردہ روی جہاد بہ صنم خانہاء رایان آوردند ، و بازو ھای را آھنین را در شکستن سنگ نیروی ھر چہ قوی تر دادند ۔ ھر جا کہ بتخانہ در تعبدیت کمر تعظیم بستہ بود ، زبان متین بہ بحث محکم اساس کفر را از دل او بر میکنند ۔''

اس عبارت میں یہ تصحیح ضروری معلوم ہوتی ہے : 'آھن ھای' سے پہلے 'با' چاہیے ۔ 'بازو ھای' کے بعد 'را' غیر ضروری ہے ۔ 'تعبدیت' کی جگہ 'تعبد بت' ، 'متین' کی جگہ 'میتین' اور 'میکنند' کی جگہ 'میکند' چاہیے ۔

صفحہ ۲۸ ، سطر ۳ و ۴ : ''سنگ تراشان ھند ، کہ در صنعت خارا ، فرھاد را بی سنگ گردانند ، تیشہ برداشتہ روی خارا را بلطافتی ابلیس میکردند ، اگر وھم بروی بگذرد ، بلغراد ۔''

اس فقرے میں 'ابلیس' کی جگہ 'املس' ۔ 'اگر' سے پہلے کاف بیانہ اور 'بلغراد' کی جگہ 'بلغزد' چاہیے ۔

ہم نے نمونے کی غرض سے صرف چند موٹی موٹی غلطیاں دکھائی ہیں ۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ان صفحات میں بس اسی قدر غلطیاں ہیں ۔ اگر باریک اغلاط کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کی تعداد بہت بڑھ جائے گی ۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ فارسی کو اردو رسم الخط کے مطابق لکھا گیا ہے ۔ ذیل میں صرف تین صفحات کی اغلاط نمونۃً حوالہً قلم کی جاتی ہیں :

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۱	۱	چوں	چون
"	"	ازبس	ازبس
"	۲	بنیانرا	بینا را

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۱	۲	آں	آن
,,	,,	,,	,,
,,	۳	,,	,,
,,	۴	,,	,,
,,	,,	فرودماند	فروماند
,,	۵	بنمود،	بنمود
,,	,,	مردم	مراد
,,	۶	لپسندیده	پسندیده
,,	,,	بذیر	تدبیر
,,	,,	براین	برین
,,	۸	بینائی	بینائیی
,,	۹	عین الملکیت	عین الملک
,,	,,	گردانید	گردانیده
,,	۱۱	بعداقت	بحذاقت
,,	۱۲	چوں	چون
,,	,,	دراں	دران
,,	۱۳	خش کشی	خس کشی
,,	,,	خساں	خسان
,,	۱۴	چوں	چون
,,	۱۵	آں	آن
,,	,,	چوں	چون
,,	,,	مفسداں	مفسدان
,,	۱۷	دیده	دیدهٔ
,,	,,	دروں	درون
,,	,,	برائے	برای
,,	,,	دیده	دیدهٔ

صفحه	سطر	غلط	صحیح
٦٢	١	چنانچہ	چنانکہ ؟
"	"	آں	آن
"	"	دروں	درون
"	"	ور	در
"	٢	آں	آن
"	"	ما	مانظر
"	٧	موئے بموئے	موی بموی
"	"	موئے	موی
"	"	الملک،	الملک
"	٨	چوں	چون
"	"	پیراموں	پیرامون
"	"	ر	بر
"	"	پست	پشت
"	"	روئے	روی
"	٩	براں	بران
"	١٠	زم	حزم
"	"	کارے	کاری
"	"	باں	بدان
"	"	وآں	وآن
"	١١	ریانکاراں	زیانکاران
"	"	باتی	باق
"	"	صاف	صاف کرد
"	١٢	رائے	رای
"	١٣	دراں	دران
"	١٤	حالئے	حالی
"	١٥	دیدہ	دیدہ را
"	١٦	چوں	چون

صفحه	سطر	غلط	صحیح
٦۲	۱٦	موئے	موی
,,	۱۷	برساں	برسان
,,	,,	صدمہ	صدمهٔ
,,	,,	پشم	چشم
,,	,,	زنده	زند
٦۳	۱	خوں	خون
,,	,,	غلطید	غلطانید
,,	,,	مقلّہ رائے	مقلّهٔ رای
,,	۲	رائے	رای
,,	,,	التفا	اکتفا
,,	۳	رائے	رای
,,	,,	پیغولہ	پیغولهٔ
,,	,,	ارد	آرد
,,	,,	ودرین	درین
,,	,,	کیں	کمین
,,	۴	ناگاه	کہ ناگاه
,,	۵	بہ چراغ	چراغ
,,	,,	روش	روشن
,,	,,	کوکبہ	کوکبهٔ
,,	٦	شہانی	شہابی
,,	۷	دیده دور	دیده دوز
,,	,,	قطرت	قطرات
,,	,,	باراں	باران
,,	,,	بقدر	بعدد
,,	۸	آں	آن
,,	۹	رائے	رای
,,	,,	زده	زدهٔ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٦٣	١٠	چشمہ سار	چشمہ ساری
,,	١٥	دریں	درین
,,	,,	روئے	روی
,,	١٦	منظر آن	منتظر آن ؟
,,	,,	مقبلان	مقبلان
,,	١٧	جائے	جای
,,	,,	گہ ان	گبران

کتاب ھذا انھی قسم کی اغلاط سے بھری پڑی ہے - ہم نے اپنی عمر میں اس سے زیادہ مغلوط کتاب نہیں دیکھی - ہمیں رنج ہوتا ہے سلطانیہ انجمن کے منصب داروں کی اس غفلت پر ، جنھوں نے خسرو کی اس تالیف کو ایک نہایت غلط نویس کاتب کے حوالے کر کے کروٹ تک نہیں لی - وہ اس تالیف کے ہیرو پر لعن و طعن کرنے ، ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرنے ، فرضی نظریوں اور دیگر رسمی اور نمائشی امور میں مشغول رہے لیکن خدا کے ان نیک بندوں نے 'خزائن الفتوح' کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں جھانکا کہ کاتب کے ہاتھوں اس بدنصیب تالیف کا کیا حشر ہو رہا ہے اور اس کا متن کہاں تک فگار کیا گیا ہے -

ابھی کل کی بات ہے اسی علی گڑھ سے امیر خسرو کی مثنویاں قابل ہاتھوں سے ترتیب پا کر شائع ہوئی ہیں اور دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں - لیکن اس سلسلے کے مرتبین سب کے سب پرانے بزرگ تھے - علی گڑھ میں اب نئی نسل کا دور دورہ ہے اور شاید یہ سب سے پہلا کام ہے جو ان مجددین نے ، جن میں زیادہ تر شعبہ' تاریخ کے اساتذہ شامل ہیں ، انجام دیا ہے - مگر جنرل ایڈیٹر و ایڈیٹر ، دیباچہ نگار و پروف خواں ، پریزیڈنٹ و نائب پریزیڈنٹ و سکرٹری تک نے اپنے فرائض کی بجا آوری سے گریز کیا ہے - وہ ایک چھوٹی سی تالیف کو صحت کے ساتھ چھاپنے سے قاصر رہے ہیں - ہمیں اپنے صحیح علمی نقدان کا ماتم کرنا چاہیے -

کاتب عجیب عجیب مضحک اغلاط کا عادی ہے - مثلاً 'سپہ کش' (سپہ سالار) کو اس نے کتاب بھر میں 'سہکش' لکھا ہے - چنانچہ :

صفحہ ٧٠ ، سطر ١٠ - صفحہ ٧١ ، سطر ٥ - صفحہ ١٠٠ ، سطر ١٣ -

صفحہ ۱۲۰ ، سطر ۸ و ۱۵ - صفحہ ۱۵۱ ، سطر ۱۳ - صفحہ ۱۶۹ ، سطر ۸ - صفحہ ۱۸۲ ، سطر ۱۷ -

'پاشیب' (زینہ پایہ) کو بمد الف 'پآشیب' لکھا ہے - دیکھیے صفحہ ۴۵ ، سطر ۱۱ - صفحہ ۵۵ ، سطر ۲ و ۱۴ - صفحہ ۵۷ ، سطر ۱۴ - صفحہ ۷۶ ، سطر ۶ و ۷ - اسی طرح 'پیلک' (تیر) کو بای فارسی کے ساتھ 'پپلک' رقم کیا ہے - ملاحظہ ہوں صفحہ ۴۰ ، سطر ۹ - صفحہ ۶۰ ، سطر ۱۶ - صفحہ ۶۷ ، سطر ۱۵ - صفحہ ۱۶۳ ، سطر ۱۳ - یہی سلوک 'میتین' (سابل) کے ساتھ کیا گیا ہے جسے ہر مقام پر 'متین' کی شکل میں لکھا ہے ، چنانچہ صفحہ ۲۷ ، سطر ۹ - صفحہ ۳۳ ، سطر ۵ - صفحہ ۱۰۲ ، سطر ۶ - صفحہ ۱۰۵ ، سطر ۸ - صفحہ ۱۷۰ ، سطر ۱۴ - صفحہ ۱۷۲ ، سطر ۱۱ - علیٰ ھذا 'حنا' (سہندی) کو 'حنیٰ' لکھا ہے : صفحہ ۱۵ ، سطر ۷ - صفحہ ۱۵۱ ، سطر ۷ -

ایسی صریح اور آشکارا غلطیوں کے بار بار دہرائے جانے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ پروف نہیں پڑھے گئے کیونکہ اگر پروف خوانی کی جاتی تو یقین ہے کہ ایسی فاحش اغلاط کہیں نہ کہیں تو پروف خواں کی نگاہ سے گزرتیں اور درست کی جاتیں -

آخر میں ہم پروفیسر حبیب کے ایک جدید نظریے کے متعلق چند الفاظ کہنا چاہتے ہیں ؛ انھوں نے اپنے دیباچے میں بیان کیا ہے کہ 'خزائن الفتوح' کبیر الدین کے 'فتح نامہ' کا تکملہ ہے - یہ بیان کسی صحیح بنیاد پر قائم نہیں ، اس لیے کہ کبیر الدین نے کوئی کتاب موسوم بہ 'فتح نامہ' ، جیسا کہ پروفیسر سمجھے ہیں ، نہیں لکھی - برنی 'تاریخ فیروزی' میں نہیں بلکہ 'تاریخ فیروز شاہی' میں (صفحہ ۳۶۱) 'فتح نامہا' لکھتا ہے جس سے مقصد کوئی خاص تالیف نہیں ہے بلکہ وہ خطوط ہیں جو علاء الدین اپنی ہر نئی فتح کے اعلان کے وقت اپنی قلمرو میں شائع کراتا رہا اور جن کو کبیر الدین لکھتا رہا - لہٰذا 'خزائن الفتوح' کو کبیر الدین کی کسی مفروضہ تالیف 'فتح نامہ' کا تکملہ خیال کرنا بالکل ناواجب اور بے بنیاد ہے - رہی 'تاریخ علائی' پروفیسر اس کے متعلق کچھ نہیں کہتے اس لیے ہم بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے -

☆ ☆ ☆

انگریزی ترجمہ "خزائن الفتوح" امیر خسرو

از پروفیسر محمد حبیب، بی۔ اے (آکسن)، پروفیسر تاریخ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(از اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۵ع و ماہ فروری، مئی و اگست سنہ ۱۹۳۶ع)

حضرت امیر خسرو کی تالیف 'خزائن الفتوح' کا انگریزی ترجمہ، جو ۱۹۳۱ع میں زیور طباعت سے آراستہ ہوتا ہے، دراصل ۱۹۲۰ - ۲۱ع میں تیار کیا گیا تھا، جب پروفیسر حبیب آکسفورڈ میں بحیثیت ریسرچ اسکالر، پروفیسر مارگولیوتھ کی نگرانی میں کام کر رہے تھے۔ اس ترجمے میں پروفیسر مارگولیوتھ کا بھی ہاتھ ہے اور بہت سے مقامات کی موصوف نے نظرثانی بھی کی ہے۔

ولایت سے واپسی ہندوستان پر، حبیب صاحب نے اپنے تلامذہ، جناب ایس۔ اے۔ رشید، معین الحق اور سلطان حمید کی معیت میں اس ترجمے پر پھر نظرثانی کی۔ ان کا بیان ہے کہ حتی الامکان اس ترجمے کو صحیح بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور تحت اللفظی کی رعایت کا لحاظ رکھا گیا لیکن جہاں تحت اللفظی سے مقصد حل ہوتا نہیں دیکھا، وہاں مصنّف کے الفاظ کا محض ترجمہ دینے کے بجائے اس کے خیالات کا چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے کہ حبیب صاحب اپنے اس خیال میں صحیح ہوں لیکن ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خسرو ان حضرات کے بس میں نہیں آئے۔ ان کے طرز نگارش کی اشکال و دقّت پسندی اور مخصوص صنائع بدائع کے لیے ان کا التزام و اہتمام وغیرہ ایسے امور ہیں جو ان کی نثر کو دوسرے شعرا کی نظم سے مشکل بنا دیتے ہیں۔

پروفیسر حبیب نے اس ترجمے کو ، جہاں تک کہ وہ سمجھ سکے ہیں ، مطلب خیز بنا دیا ہے لیکن جہاں وہ خسرو کا اصل مقصد سمجھنے سے قصر رہے وہاں یا تو انھوں نے تحت اللفظی ترجمے کی کوشش کی یا بے بسی کے عالم میں اس خاص مقام سے دامن بچا کر نکل گئے ۔ اس لیے قسمیہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے ترجمے میں ہمیشہ خسرو ہی کے مطالب و معانی کے بالالتزام پابند رہے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ ترجمے کی غرض سے 'خزائن الفتوح' کا انتخاب محترم پروفیسر کی بڑی سنگین اور قابلِ افسوس غلطی ہے ۔ یہ پتھر ان کے دست و بازو کو دیکھتے ہوئے بہت بھاری نکلا ۔

پروفیسر نے اصل متن کے ساتھ نہایت آزادی سے کام لیا ہے ۔ اول تو کوشش کر کے تمام عربی اشعار و امثال و عبارات کو ، بغیر کسی اعلان و معذرت کے ، اپنے ترجمے سے حذف کردیا ۔ گویا یہ حصہ ان کے نزدیک 'خزائن الفتوح' سے تعلق نہیں رکھتا ۔ اس کے علاوہ جہاں امیر خسرو نے اپنے مخصوص مگر پیچیدہ انداز میں ، بحسابِ جمل تاریخ دی ، پروفیسر نے اس حصے کو بھی یک قلم ترک کر دیا ۔ متن کی ایسی حک و تنسیخ ، ہم کہتے ہیں ، آج تک کسی مترجم نے روا نہیں رکھی ۔ مگر سب سے زیادہ قابل افسوس وہ عمل ہے کہ جہاں کہیں کسی مشکل اور پیچ دار لفظ یا فقرے سے سابقہ پڑا اور پروفیسر صاحب اس کے سمجھنے سے قاصر رہے ، فوراً اس کو بلا تأمل اپنے ترجمے سے خارج کر دیا ۔ تقریباً ایک چوتھائی سے زیادہ کتاب اس عمل کے نذر ہو گئی ہے ۔ علی ھذا نسبت والی سرخیاں متن سے ہٹا کر حاشیے میں داخل کر دی ہیں مگر جس مقصد کے واسطے یہ سرخیاں متن میں لائی گئی تھیں ، جب شروع ہی سے پروفیسر نے اس التزام کو شرمندۂ التفات نہیں کیا تو ان کا حاشیے میں دکھانا محض بیکار ہے ، کیونکہ بحالتِ موجودہ اس سے انگریزی داں قاری کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ۔

ترجمہ ھذا میں ہر قسم کی اغلاط لغوی ، تاریخی اور جغرافیائی نظر آتی ہیں ۔ سب سے زیادہ تعداد ان اغلاط کی ہے جو زباندانی سے تعلق رکھتی ہیں ۔ ان کی مثالیں آگے آئیں گی ۔

بعض اوقات پروفیسر نے ذیلی حواشی سے بھی کام لیا ہے لیکن اکثر حالات

میں یہ حواشی (ان میں تاریخی حواشی شامل نہیں) ہمارے لیے کوئی ندرت نہیں رکھتے اور ایسے موقعے الا ماشاء اللہ بہت کم ہیں جن میں وہ ہماری معلومات میں جدید اضافہ کرتے ہوں ، حالانکہ 'خزائن الفتوح' ایک مشکل اور ادق تصنیف ہے اور اس میں ادبی و تاریخی و دیگر قسم کے حواشی کی کافی ضرورت ہے ۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ جہاں حاشیے کی ضرورت ہے وہ مقام تشنہ چھوڑ دیا گیا اور جہاں ضرورت نہیں ، آسان آسان حاشیے بہم پہنچائے گئے ہیں ۔ میں سب سے پہلے بعض غیر ضروری حاشیوں کی مثالیں دیتا ہوں جن میں مغالطہ خیز حاشیے بھی شامل ہیں ۔

(۱) صفحہ ۶ ، حاشیہ ۴ : "الف خان یا الغ خان ، علاء الدین کے چھوٹے بھائی الماس بیگ کا خطاب تھا ۔"

ضیاء برنی اور امیر خسرو کی شہادت کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ الماس بیگ کا خطاب 'الغ خان' تھا نہ الف خان ۔ تاریخ فیروز شاہی کا بیان ہے :

"چون در شهور سنہ خمس و تسعین و ستمایۃ سلطان علاء الدین بر تخت گاہ پادشاہی جلوس کرد برادر را الغ خان و ملک نصرت جلیسری را نصرت خان و ملک هزبر الدین را ظفر خان و سنجر خسر پورہ امیر مجلس خود را الپ خان خطاب کرد" (صفحہ ۲۴۲) ۔

دول رانی خضر خان :

سپہ کش بود الغ خانِ معظم
کہ بر ہر فتح فتحی می‌شدش ضم

(صفحہ ۵۹/۷)

قصہ مختصر الماس بیگ کے لیے یہ خیال کرنا کہ اس کا خطاب الف خان تھا ، بالکل بے بنیاد ہے ۔

(۲) صفحہ ۷ ، حاشیہ ۱ : "اس عہد کی اصطلاح میں 'شہر' (city) سے مراد ہمیشہ دہلی ہوا کرتی تھی ۔ باقی شہر اپنے اپنے ناموں سے پکارے جاتے تھے ۔ ملک کے دارالخلافہ کے واسطے خاص حرمت مقصود تھی لہذا احتراماً اس طرح سے مذکور ہوتا تھا ۔"

مترجم کے اصل الفاظ ہیں :

"The city (shahr) in the language of those days always meant Delhi. Other cities were called by their names. A certain sanctity was attached to the Capital of the country, and it was referred to with respect."

شہر ان خاص معنوں میں نہ اس عہد میں اور نہ کسی اور زمانے میں مستعمل ہوا اور یہ حاشیہ بالکل مغالطہ انگیز ہے ۔ البتہ لفظ 'حضرت' اس غرض سے لایا جاتا تھا مثلاً حضرتِ بغداد ، حضرتِ غزنیں اور حضرتِ دہلی ۔ بالفاظِ دیگر ہر دارالسلطنت پر اس کا اطلاق ہوتا تھا ۔

قران السعدین :

حضرت دھلی کنف دین و داد

تنہا 'حضرت' سے بھی یہی مراد ہوتی تھی ۔

دول رانی خضر خان :

چو سرداران حضرت سر نہادند
دلیران سر تیغِ خنجر نہادند

(صفحہ ۲/۵۹)[1]

خود 'خزائن الفتوح' کا جملہ ، جس پر مترجم نے یہ نوٹ دیا ہے ، یوں ہے :
"تابمیقات خویش در حوالیِ حضرت آمد ۔"

(صفحہ ۲/۱۲)

(۳) 'خزائن الفتوح' میں صفحہ ۱۲ پر یہ شعر آتا ہے :

ذکر ارزانی نرخِ غلّہ
کہ بہ یک دانگ گران شد پلہ

مترجم نے اس کا ترجمہ حسب ذیل کیا ہے :

"Account of the cheapness of corn, when a single 'dang' turned the scale." (p. 12, para 3)

۱۔ صفحہ کے پہلے ہندسوں سے مراد صفحات اور دوسرے سے مراد سطور ہیں ۔

دانگ اس عبارت میں قابلِ تشریح ہے ۔ چنانچہ پروفیسر نے اپنے ترجمے میں اس پر حاشیہ دیا ہے مگر حسبِ معمول ناکافی اور تشنہ ، و ھوھذا :

"The fourth part of a misqal ; a trifling weight."

مگر اس تشریح سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی ۔ آخر اس چھوٹے وزن یا مثقال کے چوتھے حصے نے ترازو کا پاڑا کیسے بھاری کر دیا ؟ ہم سمجھتے ہیں مصنّف کا مقصد اس دانگ سے نہیں ہے بلکہ مسکوکات کے دانگ سے جو درم کے ایک چھٹے حصے کے برابر ہوتا ہے ۔ سعدی :

نہ دینار دادش سیہ‌دل نہ دانگ

مثنوی 'نہ سپہر' :

مرکب و مرکوب اصولی برند
بوزنہ در دام و درم فرق کنند

(ایضاً) دیگر :

کس ملکان را ندهد دانگ و درم
این قدر است از پیٔ درویش کرم

کتاب 'بحر الفضائل' میں ، جو ۸۳۷ھ کی تالیف ہے ، مرقوم ہے :

"و از شش دانگ یک درم شرعی شود اما درم دھلی چھار دانگ است ۔"

'مسالک الابصار' سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں ایک تنکہ آٹھ درم کے برابر ہوتا تھا ۔

راقم کے پاس چاندی کے ایسے سکّے موجود ہیں جو مسعود غوری کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور جو چھ مل کر وزن میں ایک درم کے برابر ہوتے ہیں ، غالباً یہی دانگ کہلاتے ہوں گے ۔ 'فارسی نامہ' میں جو گذشتہ صدی کی تصنیف ہے ، یہ نسبت دی گئی ہے :

۴½ ماشہ = ایک مثقال
۳½ ماشہ = ایک درم
۴ رتی = ایک دانگ

شعر کا مطلب یہ ہے کہ غلہ اس قدر ارزاں ہے کہ ایک دانگ کی قیمت کے غلے میں ترازو کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے ۔

مترجم کا قلم اکثر آسان اور سہل اسماء و تلمیحات پر چلا ہے ؛ مثلاً صفحہ ۱۶ ، حاشیہ ۱ فرہاد پر ہے ، جس کے لیے کہا گیا ہے کہ اس نے ایک بڑے پہاڑ میں سوراخ کیا تھا ۔ صفحہ ۱ ، حاشیہ ۱ وضو اور تیمّم پر اور صفحہ ایضاً حاشیہ ۲ سدّ سکندر پر ، جس کو پروفیسر صاحب سکندر ذوالقرنین (دارای اوّل) کی ساختہ بتاتے ہیں ۔ صفحہ ۱۹ ، حاشیہ ۱ ضحاک پر اور صفحہ ۲۰ ، حاشیہ ۱ قارون پر ہے ۔

(۴) صفحہ ۲۵ ، حاشیہ ۱ کیخسرو پر ، حسبِ ذیل دیا ہے :

''کیخسرو : ایران کا ایک مشہور شہنشاہ اور رستم پہلوان کا آقا ۔ اس کے پاس ایک پیالہ یا آئینہ تھا ۔ دنیا میں جو کچھ واقع ہوتا تھا وہ اس میں دیکھ لیا کرتا تھا ۔''

کہا جاتا ہے کہ اوّل تو اس حاشیے کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ جو شخص 'خزائن الفتوح' کے پائے کی تالیف میں دلچسپی لے گا ، ظاہر ہے کہ ایسے سادہ اور مبتدیانہ حواشی اس کی رہبری نہیں کر سکتے ۔ مزید براں یہ حاشیہ منتقدانہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا ، کیونکہ کیخسرو کی طرح رستم کے کئی آقا ہیں ۔ مثلاً کیقباد و کیکاؤس اور لہراسپ و گشتاسپ ۔ کیخسرو کی دوسری نشانی یہ دی ہے کہ اس کے پاس ایک پیالہ یا آئینہ تھا ۔ ہماری بدقسمتی کہ خود پروفیسر کو یقین نہیں کہ وہ پیالہ تھا یا آئینہ ۔ پیالے کے لیے جمشید بھی مشہور ہے اور آئینے کے واسطے سکندر ۔ اسی طرح حاشیۂ ہذا کی روشنی میں کیخسرو کی شخصیت بالوضاحت ہم پر نہیں کھلتی اور کمرِ یار کی طرح یہ عقدہ کہ کیخسرو کے پاس آئینہ تھا یا جام ، پروفیسر حبیب آج تک حل نہیں کر سکے ۔

(۵) خسرو ، سومنات کے بتوں کے ذکر میں یہ فقرہ لاتے ہیں :

''و آن بتان را کہ در نیم راہ بیت الخلیل خانہ گیر شدہ بودند ، و رہزن گمراھان گشتہ ، سنّت خلیل بہ شکستن ایشان درست کردند ۔'' (صفحہ ۵۲/۴ ، خزائن) اس فقرے کا ترجمہ ہے :

"The idols, who had fixed their abode midway to the house of Abraham (Mecca) and their waylaid straggler's, were broken to pieces in pursuance of Abraham's tradition."

(p. 36, l. 1)

ظاہر ہے کہ عبارتِ بالا میں 'گمراہان' سے مراد بت پرست ہیں ۔ پروفیسر نے اس کے ترجمے 'stragglers' پر حاشیہ ۱ حسب ذیل دیا ہے :

"Obviously referring to the custom of Mussalmans praying at Hindu shrines. Muslim pilgrims to Mecca, it seems used to visit Somnath on their way. It was a great seaport and the place from which the pilgrims embarked on their voyage."
(p. 36)

یہ حاشیہ ہمارے لیے نہایت حیران کن ثابت ہوا ہے ۔ یہ کون سی رسم ہے جس کے زیر اثر مسلمان ہندوؤں کے مقدس مقامات میں جا کر عبادت کرتے تھے اور پھر کس غرض سے ؟ خصوصاً مسلمان عازمانِ بیت اللہ سومنات کیوں جاتے ؟ ہمارے لیے یہ سب کچھ گونگے کے خواب کا حکم رکھتا ہے ۔ امیر خسرو کی عبارتِ بالا میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا ۔ حاجیوں کی بندرگاہ کی حیثیت سے سومنات کو کسی وقت بھی شہرت نہیں ملی ۔ حاجیوں کے لیے گجرات کا راستہ اسی وقت کھلا ہے جب علاء الدین کی فتوحات نے اس کو سلطنتِ دہلی کے ساتھ شامل کر دیا ہے ۔

(٦) 'خزائن الفتوح' میں قدم قدم پر حواشی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر پروفیسر صاحب کا انتخاب اس بارے میں نہایت انوکھا ہوتا ہے ۔ مثالاً فتح رنتھنبور کے وقت امیر خسرو لکھتے ہیں :

"و در باب آن دارالکفر خطاب دارالاسلام از آسمان نزول یافت ۔"
(صفحہ ۱۱/۵۸) ۔

یوں تو دارالکفر اور دارالاسلام عام ترکیبیں ہیں اور 'خزائن الفتوح' میں کئی موقعوں پر ملتی ہیں لیکن جس انداز سے امیر خسرو ان اصطلاحات کو یہاں لائے ہیں ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاص معنے مقصود ہیں یعنے یہ کہ رنتھنبور کا مسلمانی نام دارالاسلام رکھا گیا ۔ قریب قریب یہی خیال اسی تالیف کے شعر ذیل میں ادا ہوا ہے :

داستان فتح رنتھنبور کاندر یک غزا
گشت زان سان دار کفری دار اسلام از قضا

(صفحہ ۱۳/۵۳)

امیر کے ہاں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بجائے صاف الفاظ میں یہ کہنے کے کہ فلاں شخص یا شہر کا یہ نام رکھا گیا ، وہ اسی قسم کی ترکیبیں اس مطلب کے اظہار کے لیے لاتے ہیں ؛ مثلاً یہاں ایک مقام پر کہا ہے کہ آسمان سے اس کا خطاب دارالاسلام نازل ہوا ۔ دوسری جگہ کہا کہ قضا سے وہ دار اسلام بن گیا ۔ اسی طرح دیولدی کے نام کے ذکر میں کہتے ہیں کہ آسمان نے دیولدی اس کا نام رکھا ۔ چنانچہ دول رانی خضر خان :

پری روئی ز مردم حور زادہ　　سپہرش نام دیول دی نہادہ

(صفحہ ۱۴/۸۲)

اور 'خزائن الفتوح' کے تسمیے میں کہتے ہیں کہ غیب سے اس کا نام 'خزائن الفتوح' ہوا :

این نامہ کہ نقد فتح دارد در جیب
شد نام خزائن الفتوحش از غیب

(صفحہ ۱/۴)

یہ موقع حاشیے کے لیے نہایت ضروری تھا ۔

رنتھنبور ۷۰۰ھ میں فتح ہوتا ہے ۔ علاءالدین خلجی کے مسکوکات پر دہلی اور دیوگیر کے علاوہ ایک دار الضرب 'دارالاسلام' بھی ملتی ہے جس کے طلائی و نقرئی سکّے ۷۰۲ھ[1] سے شروع ہوکر آخرِ عہدِ علائی تک ملتے ہیں اور کافی تعداد میں ملتے ہیں ۔ سکّہ شناس آج تک یہ معلوم نہ کر سکے کہ اس دارالاسلام سے کون سا شہر مراد ہے بلکہ وہ یہی سمجھتے رہے کہ دہلی ہی کا نام دارالاسلام[2] ہے ۔

یہ بھی یاد رہے کہ علاء الدین اپنے مفتوحہ علاقوں کے نام بھی بدل دینے کا عادی ہے ؛ مثلاً چیتّوڑ (چتّوڑ) کی فتح کے بعد خضر خان ، اپنے فرزند کے نام

۱- یہ بیان سرسری مشاہدے پر مبنی ہے اور بالکل ممکن ہے کہ تحقیقات سے یہ ثابت ہو کہ اس ٹکسال کے سکّے ۷۰۰ھ سے شروع ہوتے ہیں ۔ (حاشیۂ مصنف)

۲- دیکھو فہرست مسکوکات ، انڈین میوزیم کلکتہ : از نیلسن رائٹ ، صفحہ ۸ ، جلد دوم ، سلسلۂ مسلمیہ ۔　　(حاشیۂ مصنف)

پر ، اس شہر کا نام خضر آباد[1] رکھ دیا ۔ سوانہ کا نام خیرآباد[2] رکھا ۔ ایک اور شہر کا نام ، اپنے فرزند مسعود کے نام پر ، مسعود پور[3] رکھا ۔ ایک اور شہر خود بادشاہ کے نام پر علاپور[4] کہلایا ۔ علیٰ ھذا ایرج پور کا نام سلطان پور[5] بھی غالباً علائی دور کی یادگار ہے ۔

(ے) امیر کے بیانِ بالا کی روشنی میں رنتھنبور کا مسلمانی نام دارالاسلام قرار پاتا ہے ۔ مگر پروفیسر اس موقعے کو غیر ضروری سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ اس کے عین بعد فتحِ مانڈو کا قصہ چھڑ جاتا ہے جس کی ابتدا میں یہ شعر آتا ہے :

کیفیت فتح حصن مانڈو ضبط همہ مالوا بہ یک دو

(خزائن ، صفحہ ۵۹)

۱۔ دول رانی خضر خان :

بانعام خضر خان شاد کردش

پس آنگہ نام خضر آباد کردش (صفحہ ۶۷/۲۰)

۲۔ سوانہ اب ریاست جودھپور میں شامل ہے :

حدیث فتح سوانہ کہ گشت خیرآباد

ز تیغ شہ کہ همیشہ بخیر باقی باد

(خزائن الفتوح ، صفحہ ۷۳)

۳۔ ''اختر فرخندۂ ملک ملوک الوزرائی بہ طالع سعد در مسعود پور رسید و دران مقام کہ از پورمسعود بادشاہ نامی گشتہ است ، دو روز پای علم برسر مسعود پور بود ۔'' (خزائن الفتوح ، صفحہ ۸۰/۴) (حاشیۂ مصنف)

۴۔ تغلق نامہ ص ۱۶۹۸ ، صفحہ ۸۹ :

چو آمد نیک نزدیک علاپور

علاپور از مہابت شد بلاپور (حاشیۂ مصنف)

۵۔ ''و بہ سلطان پور عرف ایرج پور رسیدند ۔'' (خزائن الفتوح ، صفحہ ۸۱/۶) (حاشیۂ مصنف)

شعر هذا میں 'ماندو' اور 'دو' ہم قافیہ ہیں جس سے یہ قیاس لگانے کی کافی گنجائش نکل آتی ہے کہ ماندو کا تلفظ بفتح دال ہندی ہے نہ بضم جیسا کہ پروفیسر صاحب حسبِ اتباعِ عام لکھ رہے[1] ہیں۔ امیر 'تغلق نامہ' میں بھی ماندو کا قافیہ 'دوادو' لائے ہیں۔ چنانچہ :

خود او در دهلی و جان در دوادو
تنش در شهر و جان در دهارو ماندو

(تغلق نامہ، صفحہ ۱۱۱)''

جہانگیر کے سکّے کے شعر ذیل سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے :

ز نام شاه جهانگیر سکّهٔ مندو
دهد بنورجهانی[2] چو مهر و مه پرتو

یہاں میں جہانگیری سکّے کا ایک اور شعر نقل کرتا ہوں جس کا رواج ، بروی تزک جہانگیری کمبایت میں ہوا تھا :

بزر این سکّه زد شاه جهانگیر ظفر پرتو
پس از فتح دکن آمد چو در گجرات از مندو

بہرحال ایسے ضروری مقامات سے پروفیسر صاحب حاشیہ دیے بغیر خاموشی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ اور اسی مندو کے بیان میں ، جہاں آنکھ کا ضلع چل رہا ہے ، اندھے بادل کی طرح برس پڑتے ہیں اور اپنے ناظرین کی اطلاع کے لیے سرمے پر حسب ذیل حاشیہ دیتے ہیں :

(۸) صفحہ ۴۳ حاشیہ ۱ : "سرمہ ہندوستان میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ کچھ تو دوا کی غرض سے اور کچھ آنکھوں کے سنگار کی غرض سے۔ سرمہ پپوٹوں میں ایک بڑی کھٹل سوئی (سلائی) سے لگایا جاتا ہے۔ شاہی لشکر کے لوگ راجاؤں کے ضعفِ بصارت کے لیے اپنے نیزے استعمال کرتے تھے۔ سرمہ عام طور پر لکڑی اور ہاتھی دانت کی سرمہ دانیوں میں رکھا جاتا ہے۔''

۱۔ صفحہ ۴۲ سطر ۱ ترجمہ انگریزی خزائن الفتوح۔

۲۔ نور جہانی ، جہانگیر کے ایک خاص سکّے کا نام ہے۔ اس شعر کے لیے دیکھو فہرست مسکوکات مغلیہ لکھنؤ میوزیم از مسٹر برون۔ (حاشیۂ مصنف)

میں جناب مترجم کے اصل الفاظ بھی نقل کر دیتا ہوں:

"Antimony (SURMA) is extensively used in India, partly as a medicine and partly as a toilet for the eyes: SURMA is put on the eyelids with a large blunt needle; the imperial army used its spears instead to cure the dim sight of Rais. SURMA is generally kept in small phials of wood or ivory."
(note 1, page 43)

ہم نہیں جانتے کہ اس موقع پر جناب مترجم کا ذوقِ سلیم زیادہ مستحقِ داد ہے یا ان کی معلومات جو انہوں نے ، نہایت مہربانی سے ، ہمارے لیے اس حاشیے میں محفوظ کر دی ہے ۔ خصوصاً راجاؤں کے ضعفِ بصارت کا نسخہ جو اب تک کسی طبی تالیف میں بھی نمودار نہیں ہوا ۔

(۹) صفحہ ۶۴/۵ : ''پادشاہ بینا کہ میان سیاہی چتر بالعین انسان عین است عین اللہ علیہ ۔''
اور ترجمہ :

"The wise king under the shadow of his canopy is like the 'Idea of Man,' for the 'Eye of God' is over him."[3]
(p. 46, line 18)

ہمیں حیرت ہے کہ پروفیسر صاحب 'بالعین' (ہُوبہُو ، عین مین) کا ترجمہ 'مانند' اور انسان عین (مردمکِ چشم ، آنکھ کی پُتلی) کا ترجمہ 'خیالِ انسان' کرتے ہیں ۔ گویا یہ لغزشیں اس فقرے کے لیے کافی نہیں تھیں کہ سونے پر سہاگہ حاشیۂ ذیل اضافہ کیا ہے :

3. An allusion to the Platonic Doctrine of Ideas.

ہم اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ 'افلاطون کا یہ نظریۂ تصور' ان کے ناظرین کو کعبے پہنچانے کے بجائے ترکستان لے جا رہا ہے ۔

میں بہ خوفِ طوالت انھی بعض حواشی کے تبصرے پر قناعت کر کے ان کے بعض جدید نظریوں کا جائزہ لیتا ہوں ۔

بعض جدید نظریے

ملک نایک آخربک ہندو تھا ؟

پروفیسر حبیب کی تحقیقات کی رو سے ملک نایک آخر بک ، علاءالدین خلجی کا سپہ سالار ، جو علی بیگ اور ترتاق ، دو مغل حملہ آوروں کو ہزیمت دے کر گرفتار کرتا ہے ، حقیقت میں ایک ہندو تھا[1] ۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ کوئی اسلامی مؤرخ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتا ۔ پروفیسر کی اصل عبارت حسب ذیل ہے :

> "The commander of the army of Islam, on this occasion, was a Hindu. The MIR'AT-I-SIKANDARI says that Naiks are a tribe of outcaste Rajputs. Be this as it may, the surname 'Naik' is common enough today. The following lines from Khusrau's Dawal Rani leaves no doubt as to Malik Naik's religion 'As he (Targhi) wished to injure the Faith through his infidels, fate decreed that he should meet his death at the hands of an infidel (Hindu). The soil of the wilderness drank the blood of the armies of Ali Beg and Tartaq when the two Turkish Khans were suddenly captured by a Hindu slave (servent) of the Court and the conflagration was quelled by the sharpness of the Imperial sword."
>
> (page 29)

اس بیان میں پروفیسر نے دو مختلف مہموں کو خبط کر دیا ہے ۔ دول رانی میں خسرو نے قتلغ خواجہ کی مہم کے بعد ترغی کی مہم کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہے :

"ازان پس بست در ترغی کمر سخت
فگند او هم بخاک از تیغ شه رخت

۱- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ترجمہ انگریزی ، صفحہ ۲۸ - ۲۹ ، حاشیہ ۵ -

اگرچہ سخت چشمی ہا بسی کرد
ہم از کیش محمد بیلکی خورد
چو از کفار در دین خواست آزار
کشایندش زمانہ ہم ز کفار''

(صفحہ ۶۱/۷ ، دول رانی)

آخری شعر کا مطلب ہے کہ چونکہ کافروں کے ذریعے سے اس نے دین اسلام کو آزار دینا چاہا تھا ، زمانے نے انھی کافروں کے ہاتھ سے اسے مروا دیا ۔ یہاں کفار سے مراد کفارِ مغل ہیں نہ ہندو ۔ پروفیسر نے 'کفار' کا ترجمہ 'ایک کافر' جو کیا ہے ، وہ درست نہیں ۔

ترغی کی مہم کے بعد امیر خسرو ترتاق اور علی بیگ کے حملے کا ذکر کرتے ہیں ۔ و ہو ہذا :

''پس اندر دشت خون آشام شد ریگ
ز لشکر ہای ترتاق و علی بیگ

سپاہ دین کہ چون دریا درآمد
مغل را موج دریا بر سر آمد

شد از یک بندۂ ہندوی درگاہ
گرفتار آن دو خان ترک ناگاہ

ز تیغ شاہ کابی بود و بس تیز
فرورفت آن دو خان آتش انگیز''

(صفحہ ۶۱/۱۱)

مصرع 'شد از یک بندۂ ہندوی درگاہ' میں ہندو سے مراد 'ہندو مذہب کا مقلد' نہیں بلکہ 'غلام' ہے ، یعنے ایک 'بندہ' کے ذریعے سے ، جو غلام درگاہ شاہی ہے ۔ ''بندۂ ہندوی درگاہ'' کے معنے درگاہ کا ہندو غلام ، جو پروفیسر سمجھے ہیں ، یقیناً درست نہیں ۔

ہمیں اس ملک کے نام کے متعلق بھی کسی قدر غور کرنا چاہیے ۔ برنی نے اس کا نام (صفحہ ۲۴۱ ، فیروز شاہی) ملک اتابک آخر بک لکھا ہے مگر صفحہ ۳۲۰ پر ملک نایک آخر بک بیان کیا ہے ۔ بدایونی اور فرشتہ ملک مانک بتاتے

ہیں[1] اور کوئی تعجب نہیں اگر صحیح نام مانک ہو ۔ پروفیسر صاحب نے ان مختلف شکلوں 'اتابک' 'نایک' اور مانک' میں سے نایک کو ترجیح دی مگر وجہِ ترجیح بیان نہیں کی ۔ ہمیں اس لفظ نایک پر یہ اعتراض ہے کہ اگرچہ وہ فوج میں ایک عہدے[2] کا نام ہونے کے علاوہ ایک ادنٰی درجے کی ہندو ذات کا بھی نام ہے مگر کسی شخصِ واحد کے نام کی حیثیت سے استعمال نہیں ہوتا ۔ اور ظاہر ہے کہ اس نام میں ملک کے بعد جو لفظ ہے وہ علم شخصی کے طور پر آیا ہے ۔

پروفیسر صاحب نے 'مرآت سکندری' کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ نایک راجپوتوں کا ایک خارج شدہ فرقہ ہے ۔ لیکن حوالہ دیتے وقت انھوں نے بڑی بے احتیاطی سے کام لیا ہے کیونکہ 'مرآت سکندری' میں 'نایک' نہیں ہے ، بلکہ 'نانک' جس کو راجپوتوں کا نہیں بلکہ کھتریوں کا ایک ذات باہر فرقہ بتایا ہے ۔ چنانچہ اس تاریخ کے مصنف سکندر بن منجھو کے الفاظ ہیں :

''اول کسی کہ ازیشان بشرف اسلام مشرف شد و بصفت ایمان موصوف گشت سہارن بودہ ، المخاطب بہ وجیہ الملک ۔ مشارالیہ از قوم نانک (کذا) است و در تاریخ ہنود مسطور است کہ نانک (کذا) و کھتری برادران یکدیگراند ، یکی ازیشان بشرب شراب رغبت نمود ، او راکھتریان از قوم خود اخراج نمودند و چنین مخرجی را بزبان ہندوی نانک (کذا) گویند یعنی از قوم برآوردہ شد ۔ ازین رسم و آئین و دین نانک (کذا) امتیاز یافت ۔''

(مرآت سکندری ، صفحہ ۳۰۲ ، بمبئی ۱۸۳۱ع/۱۲۴۶ھ)

مگر ہم دریافت کرتے ہیں کہ پروفیسر صاحب نے 'مرآت سکندری' سے آخر کیا فائدہ اٹھایا کیونکہ نانک اس حوالے میں بھی ایک قوم کا نام ہے ، نہ کسی

۱۔ بدایونی ، مُلک کافور کا نام ملک مانک بتاتا ہے ۔

۲۔ 'خزائن الفتوح' میں نایک کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر عہدے کی حیثیت سے ، نہ بحیثیت اِسم شخص ۔ چنانچہ :

''بعد ازان بالک دیو نایک را ، کہ بالک دیو در شیطنت و فتنت موازی بود ، فسون و نیرنگی کہ دانست در آموخت ۔'' (صفحہ ۱۵/۱۴۵)

اس عبارت میں بالک دیو نام ہے اور نایک عہدہ ۔ (حاشیۂ مصنف)

شخص خاص کا ۔ قصہ مختصر پروفیسر کا یہ نظریہ کہ ملک نایک آخر یک ہندو تھا ، بالکل غیر مدلل اور بے بنیاد ہے ۔

خطاب سہکش

ایک جدید نظریہ محترم پروفیسر کی تحقیقات نے یہ پیش کیا ہے کہ چونکہ ملک کافور ہزار دیناری نے دکن پر تین حملے کیے تھے لہٰذا اس کو ''سہکش'' کہا جاتا تھا ۔ ایک اور موقعے پر وہ لکھتے ہیں کہ ملک کافور ہزار دیناری ، سلطنت کا قائم مقام اور حملہ آور فوج کا سالار تھا ۔ مصنف اس کے واسطے ہر قسم کے تعریفی الفاظ استعمال کرتا ہے ۔ اکثر اوقات اس کو ''سہکش'' (تین مہموں کا سر کرنے والا) کے خطاب سے یاد کرتا ہے ۔

ہم حیران ہیں کہ یہ نرالی وضع کا خطاب ''سہکش'' کون سی زبان سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ فارسی زبان میں تو اس کا پتا کہیں نہیں چلتا ۔ بہرحال یہاں چند مثالیں عرض ہیں :

(۱) صفحہ ۵/۷۱ : ''ملک سہکش فرمان داد کہ غنایم لشکر ھرچہ بابت سپاهیان بود ، بدیشان باز گذاشتند ۔''

ترجمہ :

" . . . the Malik-i-Sah-kash ordered that such booty, as was fit for the troopers, should be given back to them . . ."
(page 52, line 5)

اور حاشیہ ذیل اضافہ ہوا ہے :

"Malik Kafur, so called because he had, till then, led three expeditions to the Deccan."

نیز صفحہ ۵۷ پر حاشیہ ہم یوں دیا ہے :

"The Malik Naib Kafur Hazardinari. He was the regent of the empire and Commander-in-Chief of the invading army. The author finds every kind of laudatory title for him. He is often referred to as the 'Sah-kash' winner of three compaigns and sometimes simply as the Malik."

(۲) صفحہ ۱۰۰ ، تیرھویں سطر : ''و مستعد جہاد اکبر روی بہ محراب آورد ۔ سہکش مجاھد نیز قامت تعبد را باقامت فرض خدای راکع و ساجد گردانید ۔''

"... they were ready for prayer and turned their faces towards God. The Sah-kash also bowed in the obligatory prayer ..." (67, 7)

اس ترجمے کی اغلاط سے قطع نظر کر کے اور مثالیں عرض کی جاتی ہیں :

(۳) صفحہ ۸/۱۲۰ : ''چون سہکش یگانہ بر سر ہندو خراجی بیرون از حصار وضع میکرد ۔''

"When the singular Sah-kash had fixed on the Hindu a tribute that surpassed all computation. . ." [78, 5 (bottom)]

(۴) صفحہ ۱۵۱ سطر چہارم از آخر : ''سہکش بیل حملہ ، گرفتن آن پیلان را فالی بزرگ گرفت ۔''

"The Sah-kash considered the acquisition of the elephants a very good omen." (94, 1.)

(۵) صفحہ ۸/۱۶۹ : ''بعد آن سہکش اسلام بافوجی از غزاۃ متجہد بعزیمت قلع معبدۂ کفرہ و قمع عبدۂ اصنام در بتخانۂ زرین درآمد ۔''

"Next, the Muslim Sah-kash came with a body of holy warriors to destroy the golden temple in which the idols were kept." [102, l. 9 (bott.)]

(۶) صفحہ ۱۸۲ ، آخری سطر : ''بندۂ سہکش پادشاہ کہ سرط بندگی چنانچہ در تحریر نگنجد بجای آوردہ بود ۔''

"The emperors' servent the Sah-kash, who had performed more services than can be described . . ." (109, 14)

میں اس لفظ پر کافی غور کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس موقع پر فاضل پروفیسر کو ایک مضحک مگر نہایت فاحش مغالطہ پیش آیا ہے ۔ یہ امر

یقینی ہے کہ 'سہکش' ایک مہمل لفظ ہے اور جو معنے اس کی طرف پروفیسر نے منسوب کیے ہیں ، بالکل بے بنیاد ہیں ۔ اس لفظ کو بامعنی بنانے کے لیے ہمیں اسے بصورت ''سپہکش'' بمعنی سپہ سالار پڑھنا چاہیے ۔

سپہ کش ، امیر خسرو کے کلام میں بے شمار موقعوں پر ملتا ہے ؛ مثلاً دول رانی خضر خان :

سپہ کش بود الغ خان معظّم
کہ بر ہر فتح فتحی می شدش ضم

(صفحہ ۵۹)

دیگر

سپہ کش پنچمین نزدیک تر بود
رسید و در عنانش پنجہ زد زود

(صفحہ ۸۷)

اور مثنوی 'نہ سپہر' سے یہ مثالیں :

صواب آنچنان دید خان سپہ کش
کہ سوی خسان حملہ آرد چو آتش

دیگر

بزرگان روئین تن تہمتن وش
شدند انجمن پیش خان سپہ کش

مثنوی 'تغلق نامہ' سے یہ شعر :

چو برد آن جملہ در پیش سپہ کش
سپہ کش گشت ازان فتح گران خوش

اس عنوان کے ذیل میں بہ خوفِ طوالت ہم انھی چند مثالوں پر اکتفا کر کے اور امور کی طرف توجہ دیتے ہیں ۔

کعبہ و مکہ

کعبہ و مکہ میں جو فرق ہے ، وہ ہر مسلمان جانتا ہے مگر ہمارے محترم

پروفیسر اس فرق سے بالکل اعراض کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک کعبہ و مکہ بلکہ قبلہ ، بیت العتیق اور بیت المعمور تک سب ایک دوسرے کے مرادف ہیں اور ان سے مراد مکہ ہے ۔ امیر خسرو جہاں کہیں یہ الفاظ لائے ہیں ، پروفیسر نے ان کا ترجمہ 'مکہ' کیا ہے ۔ پروفیسر کے نزدیک یہ عقیدہ ، کہ کعبہ بیت اللہ کا نام ہے اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ اس کے بانی ہیں اور عمارتِ کعبہ مکہ معظمہ میں تعمیر ہوئی ، چنداں قابل التفات نہیں ۔ ان کا بیان ہے کہ یہ مکہ ہے جسے حضرت ابراہیم نے تعمیر کیا تھا ۔ بعض امثال حوالہ' قلم ہیں :

(۱) صفحہ ۸/۲۵ : ''کہ سپہر چہارم دوم بیت معمورش خواند ۔''

" . . . that the fourth heaven may call it a second Mecca."
(p. 14, para. 2, l. 8)

(۲) صفحہ ۲/۵۲ : ''پس بتخانہ' سومنات را سوی کعبہ' معظم در سجود آوردند ۔''

"So the temple of Somnath was made to bow towards the Holy Mecca ;" [p. 35, l. 3 (bott.)]

(۳) صفحہ ۴/۵۲ : ''و آن بتان را کہ در نیم راہ بیت الخلیل خانہ گیر شدہ بودند و رہزن گمراہان گشتہ ، سنت خلیل بشکستن ایشان درست کردند ۔''

"The idols, who had fixed their abode midway to the House of Abraham (Mecca), and their waylaid stragglers, were broken to pieces in persuance of Abraham's traditions."[2]
(36, 1)

اس عبارت پر دو حاشیے ہیں ۔ پہلا حاشیہ کسی اور مقام پر ترجمے کی شکل میں نقل ہو چکا ہے ، یہاں دوسرا حاشیہ درج ہے :

2. "Allusions to Qibla (Mecca) and Abraham. The Holy Mecca was built by the Prophet Abraham."

(۴) صفحہ ۳/۶۶ : ''اما عیسیٰ از بیت المعمورش نوید عمارت دین مہدی

میداد ۔''

"But Jesus from the Baitul Mamur (Mecca) sent the good news of the building of Muhammad's faith;" (48, 3)

بیت المعمور کے سلسلے میں یہ عبارت ، جو ایک قدیم تفسیر سے نقل کی جاتی ہے ، یاد رہے :

''ابن عباس را گفتند کہ ضراح چہ باشد ؟ گفت خانہ ایست اندر آسمان کہ او را بیت المعمور گویند و ضراح گویند و نہر النور پیش درگاہ ضراح روان است ۔''

(۵) صفحہ ۲/۸۰ : ''پنداری سحابی است باد قبلہ سوی دریاش می برد ۔''

" . . . you would think it was a cloud, which Mecca-going winds were carying towards the sea." (56, 14)

(۶) صفحہ ۱۰/۸۰ : ''آفتاب کہ قبلۂ ہندوان است ۔''

" . . . the sun, the Mecca of the Hindus," (57, 2)

(۷) صفحہ ۵/۱۲۱ ع : ''بین نسبت کعبۂ معظم ۔''

4. "Allusions to Holy Mecca." (p. 79, note 4)

(۸) صفحہ ۱۰/۱۲۱ : ''محرمان بندگی در نائب بیت العتیق یعنی حضرت دهلی ، بحرم من دخلہ کان امنا پیوستند ۔''

". . . the imperial officers reached Delhi, the deputy of the sacred Mecca, and whoever enters it shall be secure."

(p. 79, l. 11)

گویا یہ جو پنج وقتہ نمازوں میں نیت باندھتے وقت مسلمان ''منہ میرا طرف کعبہ شریف کے'' کہتے ہیں ، پروفیسر کے نقطۂ نظر سے غلط ہے ۔ ان کے حسابوں 'منہ میرا طرف بیت معمور شریف کے' کہنا مناسب ہوگا ، بلکہ 'طرف مکہ شریف کے' کہنا زیادہ صحیح ہوگا ۔

سنگ

یہ لفظ فارسی زبان میں ، اس کے مشہور معنوں ، پتھر کے علاوہ وزن اور وقار کے معنے بھی دیتا ہے مگر پروفیسر حبیب صرف پہلے معنے تسلیم کرتے ہیں اور پچھلے دونوں معنوں سے تجاہل برتتے ہیں ۔ امثال :

(۱) صفحہ ۱۲/۱۵ : ''پیلان گران بار را فرمود تا در کشتی وزن کردند و ھم سنگ آن زر بسبائل دادند ۔''

اس عبارت میں سنگ بمعنی وزن ہے مگر مترجم کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا ، چنانچہ :

"He has ordered large elephants to be weighed in boats, and the gold-bricks used in weighing them have been given away to the poor." (9, 5)

(۲) ''وھر سیہ دلی کہ بسنگ قلب سودا می کرد ، بزخم درۂ بی سنگش کردند'' صفحہ ۱۷/۷ ۔

یہاں سنگِ قلب سے مراد کھوٹے باٹ اور بے سنگ سے مراد بے وقار و بے حرمت ہیں ۔ اس ترجمے کی باقی اغلاط سے مجھے سروکار نہیں :

"Every dishonest (seller), who used his own black heart for his 'stone', had all hardness knocked out of him." (p. 10, l. 2)

(۳) ۲۹/۴ : ''و در محل وغیر محل فروتنی می نمود و نمی توانست کہ باسنگ خود باشد ۔''

'سنگ' اس جملے میں بمعنی عزت و وقار ہے :

" . . . it had fallen down in place and out of place, quite unable to keep its stones together," (p. 17, para. 3, l. 6)

(۴) صفحہ ۲۹/۱۰ : ''فرمان داد کہ از خزانۂ معمورہ ھم سنگ خاک و خشت زر بر کشیدند ۔''

" . . . the emperor ordered stones and bricks of gold to be taken out of the flourishing exchequer . . ." (18, 6)

(۵) صفحہ ۶۶/۴ : ''بدان بنیاد باسنگ خویش می بود ۔''
(سنگ بہ معنی عزت و وقار ہے)۔

"Consequently, the stones of the building remained intact . . ." (48, 4)

(۶) صفحہ ۹۱/۱۴ : ''راوتان جنگی ، باہمہ سنگ گران ، خود را در فلاخن بلا نہادہ بودند ۔''

'سنگ گران' سے مقصد اقتدار عظیم ہے۔ مگر ترجمہ :

"The warlike rawats, with all their heavy stones, hold thrown themselves into the sling of destruction ;" [p. 62, l. 6 (bott.)]

(۷) صفحہ ۱۱۱/۵ : ''آخر بندہ سنگ رایان دارد ، نہ ترازوی بقالان ۔''

" . . . after all I hold the stout heart of a Rai and not the balance of a grocer." (73, 10)

مرکب الفاظ

ایک عجیب خصوصیت اس ترجمے کی قابلِ ذکر یہ ہے کہ اس میں فارسی کے معمولی معمولی مرکب الفاظ و اسماٗ کا لفظی ترجمہ کر دیا گیا ہے ، جس کو مصنّف کے مطلوبہ معنوں سے کوئی تعلق نہیں ۔ مثلاً 'گلبانگ' جس کے معنے چہچہاہٹ اور سریلی آواز وغیرہ کے آتے ہیں ، مترجم نے اس مرکب کو دو مختلف لفظ مان کر ان کا لفظی ترجمہ 'گلاب و فریاد' کر دیا ۔ علی ھذا 'بیستون' (ایران کے ایک مشہور پہاڑ کا نام) کا ترجمہ 'ستون بغیر' کیا ۔ 'پنج پایہ' کا ، جو آبی جانور ہے اور جسے اردو میں 'کیکڑا' ، عربی میں 'سرطان' اور انگریزی میں 'کریب' کہتے ہیں ، 'پانچ ٹانگ والا' ترجمہ کیا ۔ 'ہزار پایہ' یعنی کنکھجورے کا ترجمہ 'ہزار ٹانگ والا' 'ھندوی سبز رنگ' کا ترجمہ 'ہرا ہندو' 'کمان رستم' (قوس قزح ، دھنک) کا 'رستم کی کمان' 'آبِ مروارید' (موتیابیند) کا 'پانی کا موتی' ترجمہ کیا ۔ اسی طرح 'مردم گیاہ' (ایک قسم کی گھاس ، جسے استرنگ بھی کہتے ہیں) کا ترجمہ 'آدمی اور گھاس' اور 'گرد کوہ' (دامغان میں ایک پہاڑ کا نام) کا ترجمہ

'گیند اور پہاڑ' کر دیا ۔ بعض امثال یہاں درج کی جاتی ہیں :

(۱) صفحہ ۵۵/۲ : ''و مغربیہای سلطانی از بینی سارہا کوہ [بینی کوهسارها ؟] خرطوم برآورده و هر کروهه برسان گرد کوهی سوی آن قلعهٔ ملحد روان گشت ۔''

"The Imperial westerners (maghrabis) appeared like the trunk of an elephant on its summit and shot large earthen balls. A mountain moved against the infidel fort. . ." (39, 12)

(۲) صفحہ ۵۷ ، سطر آخر : ''چون رای آنجا رسید مطربی بلبل نوا برابر او می‌آمد ، گلبانگی زد ۔''

"The melody of the bulbul accompanied the Rai as he advanced. The rose raised a cry." (41, 5)

(۳) صفحہ ۱۰/۶۶ : مصرع

''دست را سازد ستون در زیر کوہ بیستون''

" . . . made his hand a pillar for the hill that had no pillars." (48, 13)

(۴) صفحہ ۶/۱۱۴ : ''بیستونی روان و ایستادش بر چهار ستون ۔''

'بیستون' سے یہاں مراد وہی مشہور پہاڑ ہے کیونکہ یہ فقرہ ہاتھی کے وصف میں ہے ۔ مگر ترجمہ :

"It moved without props and yet stood on four columns." (75, 6)

(۵) صفحہ ۷/۶۸ : ''و فرمان داد کہ هندوی سبز رنگ را هر جا کہ دریابند چون سبزه [تر] وکاه خشک بدروند ۔''

"He ordered that wherever a green Hindu was found, he was to be cut down like dry grass." 49, 10

ہندوؤں میں لال تو اکثر سنے جاتے ہیں مگر ہرے ہندوؤں کا پتا پروفیسر حبیب نے نکالا ۔ لیکن یہ شعر ملاحظہ ہوں :

دول رانی خضر خان :

بسی زیبا کنیزی سبز فام است
کہ صد چون سرو آزادش غلامست
(صفحہ ۱۳۳/۱۳)

غنی کشمیری :

سبز رنگی بخط سبز مرا کرد اسیر
دام هم رنگ زمین بود گرفتار شدم

(٦) صفحہ ۹/٦۸ : ''چنانکہ تماسی سبزہ زار خضر آباد بران گونہ نمود ، کہ گوئی مردم گیا رستہ است ۔''

"It seemed that the meadows of Khizrabad had grown men instead of grass." (p. 49, para. 2, l. 10)

(۷) صفحہ ۷/۸۳ : ''و چہار پایان جون پنج پایہ در آب می غلطیدند''۔

". . . the quadrupeds rolled like five footed animals." (58, 21)

(۹) صفحہ ۱/۷۸ : ''خسرو اردشیر غلام شیرویہ چاکر ملک کمال الدین گرگ را ، کہ گرگین این عہداست ، بہ نخچیر کردن گرازان آن بیابان نصب فرمود ۔''

" . . . the intrepid Emperor ordered his lion-hearted slave Kamal-ud-din Gurg, to hunt the beasts of the forest." (55, 1)

اس نقرے میں اگرچہ کوئی اشکال نہیں لیکن دیکھا جاتا ہے کہ حضرت مترجم نے 'ارد شیر' کو ، جو ساسانی خاندان کا مورثِ اعلیٰ ہے ، دو مختلف لفظ سمجھ کر 'ارد' کو 'خسرو' کی صفت قرار دے کر اس کا ترجمہ 'نڈر بادشاہ' اور ''شیر غلام'' کا ترجمہ 'شیر دل غلام' کیا ۔ حالانکہ 'اردشیر غلام' اور 'شیرویہ چاکر' خسرو کی صفت میں لائے گئے ہیں یعنی اردشیر کو غلام اور شیرویہ کو چاکر رکھنے والا بادشاہ ۔ الخ

(۱۰) صفحہ ۱۱/۸۷ : ''ھنوز عقرب زین بر پشت اسپان نیش می زد ۔''

عقرب زین وہ تسمہ ہے جو زین اور دمچی کے درمیان واسطہ ہے مگر پروفیسر اس کا ترجمہ بچھو اور زین کرتے ہیں :

"The soddles were still stinging like scorpions on the backs of the horses." (p. 60, para. 2, l. 12)

(۱۱) صفحہ ۱۱/۸۸ : ''چون بیرون حصار از سوختہ شدن آن کندھای جہنم روشن شد۔''

یہاں 'کندہ' بالضم انھی معنوں میں ہے جن معنوں میں اردو میں عام طور پر مستعمل ہے ، جیسے کندۂ ناتراش اور دوزخ کا کندہ وغیرہ ۔ حضرتِ مترجم نے اسے بالفتح پڑھ کر خندق یا غار کے معنوں میں لیا ہے :

"The exterior of the fort became bright owing to this illumination of the pit of hell." (61, 5)

(۱۲) صفحہ ۵/۹۲ : ''رایت آسمان سای ملک الشرق بعزیمت کوچ ارتفاع یافت ۔''

ملک الشرق (شاہ شرق) ایک قدیم خطاب ہے جو سلاطین خراسان کے لیے مخصوص تھا ۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کو بھی ملک الشرق کہا جاتا تھا لیکن اس عہد میں یہ خطاب امرا کے لیے مخصوص ہے اور کئی امیر اس خطاب کے مالک ہیں اور یہاں بھی اس کی حیثیت خطاب کی ہے ۔ لیکن ترجمہ :

"The sky-towering standard of the Eastern empire was raised up. . ." (63, 2)

(۱۳) صفحہ ۹٦ ، سطر آخر : ''ھر روز دیوانہ سواران لشکر را درپی' مقدمان لدردیو تاختن فرمودہ بود ۔''

یہاں دیوانہ سوار بمعنی دیو سوار (دیو مانند) ہے ۔ دیوجامہ ایک خاص پوستین ہے ، جسے الٹ کر پہنتے ہیں اور پشم اوپر آ جاتی ہے ۔ اس کا پہننے والا دیو سوار کہلاتا ہے ۔ مگر پروفیسر نے تحت اللفظی 'مست سوار' ترجمہ کیا ہے ۔ چنانچہ :

" . . . he ordered his enthusiastic men to go on playing the game against the muqaddams of Laddar Deo, day after day." (p. 65, para. 2, l. 2)

(۱۴) صفحہ ۳/۱۰۲ : ''کمان ترکان اگر ھمہ خنک پی بود از بلندی

بآسمان پہلو می زد ، کہ کمان رستمم ۔" (کمان رستم = قوس قزح)

"The excellent bow of the Turks rubbed its sides with the sky and claimed to bethe bow of Rustam." (p. 67, para. 2, l. 15)

(۱۵) صفحہ ۱۰۶/۱۴ : "و از تصور جواهر بسیار آب مروارید درون دیدۂ باطنش فرود آمد ۔" (آب مروارید = موتیا بند)

"... and watery pearls trickled down his inner eye at the thought (of losing his enormous treasures)." (70, 17)

(۱۶) صفحہ ۱۰۷/۱۲ : "بندہ لدّر دیو ناچار روئین تنی خویش را در گوشہ نهاد ۔"

"... the servent, Laddar Deo, has been forced to lay aside his own bronze body in a corner." (71, 4)

یہاں 'روئین تن' کا لفظی ترجمہ ، جیسا کہ پروفیسر نے کیا ہے ، ٹھیک نہیں ۔ روئین تن ، اسفندیار کا لقب ہے ۔ اسی لیے اس کے معنی پہلوانی ، بہادری و دلاوری کے آنے لگے اور یہی معنی اس فقرے میں مقصود ہیں ۔

(۱۷) صفحہ ۴۲/۱۳ : "و علی بیگ و ترتاق کہ دو شہ شطرنج بودند ، از استخوان کلان ملک آخر بک بر سر ایشان حریفی درشت افتادہ بود ۔"

یہاں 'استخوان' ایک ہتھیار کا نام ہے (ارۂ پشت نہنگ) ، لیکن پروفیسر نے اس کا ترجمہ بڑی ہڈی والا کیا ہے ۔ یعنی :

"Ali Beg and Tartaq, the two kings of the chess-board, were checkmated by their large-boned enemy, the Malik Akhur Beg." (28, 2)

(۱۸) صفحہ ۶۴/۵ : "پادشاہ بینا کہ میان سیاهی چتر بالعین انسان عین است ۔"

انسان عین بمعنی مردمک چشم (آنکھ کی پتلی) ہے ۔ پروفیسر اس کا ترجمہ 'خیال انسان' کرتے ہیں :

"The wise king under the shadow of his canopy is like the 'idea of man.'" [46, 6 (bott.)]

(۱۹) صفحہ ۱۰/۶۴ ع : ''و یصون من عین الکمال کمالہ -''

'عین الکمال' بمعنی نظر بد و چشم زخم ہے - پروفیسر نے چشمِ کامل (کامل آنکھ) اس کا ترجمہ کیا ہے - چنانچہ :

" . . . and guard his perfection with a perfect eye."

(46, last line)

الفاظ

بعض نہایت آسان آسان الفاظ کا ترجمہ بالکل غلط دیا گیا ہے - پروفیسر کے نزدیک 'سیمرغ' بمعنی 'شتر مرغ' اور 'عنقا' بمعنی 'عقاب' ہے - نیز دیکھا گیا ہے کہ لفظ 'مشترک' کو پروفیسر اس کے غیر مرادی معنوں میں لکھتے ہیں مثلاً 'غل' (جمع اغلال) کو زنجیر کے بجائے 'شور' کے معنوں میں لانا - 'نقل' (بالضم) بمعنی 'گزک' کو بالفتح پڑھ کر 'نقل' ترجمہ کرنا - 'گل' بالکسر کو بالضم پڑھنا - 'سہم' فارسی بمعنی 'خوف' کو عربی تصور کرکے 'تیر' کے معنوں میں لینا - 'کشتن' بالکسر کو 'کشتن' بالضم پڑھنا - 'گز' بمعنی درخت (جھاؤ) کو ماپنے کے گز کے معنوں میں لانا - ہندی 'جوہر' کو فارسی 'جوہر' تصور کرنا - 'خشت' (نیزۂ کوچک) کو اینٹ کے معنوں میں لینا وغیرہ وغیرہ -

(۱) صفحہ ۲/۳۴ :

''بین گنبد و حوض کش بہ تشبیہ صواب
شد نیمۂ از بیضۂ سیمرغ خطاب''

"If you see the dome and the tank rightly, you will say that the former is like an ostrich egg . . ." [20, 3 (bott.)]

سیمرغ کا ترجمہ شتر مرغ صحیح نہیں - گنبد اور حوض کے درمیان واو غلط معلوم ہوتی ہے -

(۲) صفحہ ۱۱/۳۸ : ''طوق آهنین کہ مشتاق آن گرد نہا بود ، بتواضع تمام شان معانقہ بہ غل میکرد -''

یہاں 'غل' بمعنی زنجیر ہے - حضرت مترجم یا تو اس لفظ کو ترجمے سے

اڑا جاتے ہیں یا غلط ترجمہ کرتے ہیں :

"The iorn collar, which loves the Mughal's necks, enclosed them with the greatest affection . . ." (24, 16)

بعض اور مثالیں دی جاتی ہیں :

(۱) صفحہ ۳۰/۱ :

نمودار فتح دگر بر مغل
علی بیگ و ترتاق بستن بہ غل

یہ شعر ترجمے[۱] سے چھوٹ گیا ہے - 'غل' یہاں زنجیر کے معنوں میں لایا گیا ہے -

اس شعر سے لفظ 'مغل' کے تلفظ پر بھی روشنی پڑتی ہے - اگرچہ مصنّف 'مغول' بضم اول و دوم لکھتے ہیں جس سے قدرةً مغل بضمتین آنا چاہیے ، نہ بفتح دوم جیسا کہ فی زماننا مروج ہے - فیضی ایک شعر میں لکھتا ہے :

فتادند گجراتیان و مغل
زمین گشت سرسبز و بشگفت گل

امیر خسرو کا شعر آیندہ بھی اسی عقیدے کی تائید کر رہا ہے -

(۲) صفحہ ۳۳/۱۳ :

"شرح فتح دگر و قتل تمنهای مغل
وان بہ حلق کبک سگ صفت افگندن غل"

اس شعر میں 'غل' بمعنی زنجیر ہے نہ بمعنی شور - پچھلے مصرع کا مطلب ہے ، سگ صفت کبک کے گلے میں زنجیر کا ڈالا جانا -

"Account of another victory and the slaughter of the Mughal tumans, who had raised an uproar under the dog, Kapak." (p. 29, l. 1)

(۳) صفحہ ۳۹/۸ : "و طبقہ اسارا را کہ نقل دندان پیلان مست بودہاند ، در جرعہ گاہ قصاص آورد -"

۱- دیکھو انگریزی ترجمہ ، صفحہ ۲۶/۱ -

یہاں 'نقل' بمعنی گزک ہے ۔ حضرت مترجم نے بالفتح پڑھ کر بمعنی مثال و نمونہ استعمال کیا ہے :

"The prisoners, who looked like the teeth of mad elephants, were put to death." (25, 7)

(۴) صفحہ ۴۰/۸ : سہم بیلک زنان غزا در دل گزرانید و هم از عقب خلہ کرد ۔"

اس جملے میں 'سہم' بمعنی 'خوف' ہے نہ بمعنی 'تیر' :

"But he was at last shot by an arrow which penetrated his heart passed to the other side." (26, 9)

یہ ترجمہ ہمارے خیال میں بالکل غلط ہے لیکن اس کے متعلق آیندہ ۔

(۵) صفحہ ۴۴/۹ : "و گل خوشبوی ناگور را کہ از چندن سودہ حکایت میکند منتن گردانید ۔"

یہاں 'گل' بکسر ہے نہ بہ ضم سعدی :

گل خوشبوی در حمام روزی
رسید از دست محبوبی بدستم

" . . . the sweet Nagori rose, which smells like rubbed sandalwood, turned fetid." (29, 11)

(۶) صفحہ ۴۷/۱ : "و در آن کشت زار اجل سر میکشتند و گردن می درودند ۔"

یہاں 'کیشتن' (بونا) بکسر اول ہے

"In that garden of death heads were struck off and necks were cut open. . ." (31, 7)

(۷) صفحہ ۴۷/۸ : "موکلان مالک ۔"

مالک داروغہ' دوزخ کا نام پروفیسر خدا کے معنوں میں لائے ہیں ۔

" . . . angels of the Lord . . ." (31, 17)

(۸) صفحہ ۴۷/۱۰ : در آن عرصہ' عرصات چون کافر بی حساب را بدوزخ فرستادند ۔"

اس عبارت میں 'عرصات' بمعنی قیامت ہے ، نہ وسیع علاقہ ، جیسا کہ جناب مترجم نے سمجھا ہے :

"Countless infidels having been sent to Hell in that extensive territory." (31, 19)

(۹) صفحہ ۶/۵۱ :

تا دران شادی کہ هندو جملہ قربان گشتہ بود
دام و دد خوردند تنبول و حنا بستند دست"

'شادی' بمعنی کتخدائی و بیاہ اُردو زبان میں آتا ہے ، نہ فارسی میں :

"In the marriage banquet, at which the Hindus were sacrificed, animals of all kinds ate them to their satisfaction." (35, 18)

(۱۰) صفحہ ۴/۵۳ : "شہر نہروالہ کہ دران دیار دریای دیگر است و شہر کنبایت کہ دریا بپا شستن آن سرفرازی می نماید ۔"

چونکہ کنبایت دریا کے کنارے پر واقع ہے اور سمندر میں مد و جزر ہوتا رہتا ہے ، اس سے مصنف کے یہ نکتہ ہاتھ آیا کہ دریا اس شہر کے پاؤں دھونے آتا ہے ۔ صنعتِ حسنِ تعلیل ہے ، مگر ترجمہ :

"As to the city of Naharwala and the city of Kambayat (Cambay), which the sea raises its head to swallow up . . ." (36, 19)

(۱۱) صفحہ ۱۵/۶۰ : "کالحمار فی الوحل ۔"

حمار گدھے کو کہتے ہیں ۔ فارسی والے اس ضرب المثل کا ترجمہ 'چون خر در گل' کرتے ہیں ۔ انوری : ع

گاؤ پا اندر میان دارد مرانْ خر در خلاب

اور ترجمہ :

" . . . like black earth in the mire." (44, 6)

(۱۲) صفحہ ۲/۶۱ : "مہندسان بینا ۔"

مہندس ، ہندسہ دان و معمار و انجینیر کو کہتے ہیں لیکن پروفیسر نے اس

کا ترجمہ جغرافیہ دان کیا ہے ۔ چنانچہ :

"... even clear sighted geographers..." (p. 44, para 2, l. 1)

(۱۳) صفحہ ۲/۶۲ : "ترا از عین عتاب ماتغیر چشم باید داشت ۔"

یہاں 'تغیر' تبدیلی اور منصب میں کمی کے مفہوم میں آیا ہے مگر پروفیسر اسے 'غصہ' کے معنوں میں لائے ہیں :

" ... you are to expect nothing but anger from me." (45, 6)

(۱۴) صفحہ ۱۰/۶۵ : "و از جوش جیش تا سواحل بحرین زلزلہ درافگند ۔"

بحرین خلیج فارس میں چند جزیروں کا مجموعہ ہے ۔ اس کے علاوہ عربستان کا مشرق سواحلی علاقہ جس میں 'الحصا' بھی شامل ہے ، مع جزائر مذکور کے ، بحرین کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔

"The enthusiasm of the army shook the two seashores like an earthquake." (47, 10)

(۱۵) صفحہ ۱۰/۶۹ : "اگر درین عہد برای نام رافض حق طلب کنند ، سنتیان پاک را برروی این خلیفہ' بحق سوگند یاد باید کرد ۔"

رافض حق = منکر خدا ، نہ 'رافضی' جیسا کہ جناب مترجم سمجھے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر فی زماننا کسی ایسے شخص کی تلاش کی جائے' جو برائے نام بھی منکر خدا ہو تو تمام سنیوں کو اس خلیفہ' برحق کی خدمت میں قسم کھا کر یہ گواہی دینی پڑے گی کہ :

لعمرک عاص لایری فی زماننا
بسیفک ان یزید فی الہند عصیانا

" ... that should Muslim schismatics (Rafizis) in these days even nominally demand their rights, the pure Sunnis would swear in the name this rightful Caliph of God." (50, 4)

(۱۶) صفحہ ۸/۸۵ : "و ہر رودی چنان ناہموار کہ رفتن آن بر بط بلکہ برعنقا دشوار باشد ۔"

مترجم نے عنقا کا ترجمہ عقاب کیا ہے :

"The river-banks were so steep that it would have been difficult for a duck or even an eagle . . ." (52, 19)

(۱۷) صفحہ ۲/۸۶ : "درین اثنا ابر سیہ روی در مزلات خلق گوھر ناتمام خویش پیدا میکرد ۔"

'مزلات' بمعنی لغزش ہے ۔ 'گوہر ناتمام' سے مراد فطرتِ ناقص و خام طبعی ہے ۔ مگر ترجمہ :

"Further more, as the dark-faced cloud brought forth its unfinished pearls to worry the people of the army. . ." [p. 59, l. 8 (bott.)]

(۱۸) صفحہ ۹/۸۸ : "از غایت خاسی جوھر آتش را سر بہ اثیر برکشیدند ۔"

مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حماقت سے آگ اتنی بلند روشن کی کہ کرۂ اثیر تک پہنچ گئی :

"In the excess of their folly, they drew the fire on to themselves." (61, 2)

(۱۹) صفحہ ۸۸ - ۸۹ : "مقدمان باقی ماندۂ حصار نیز خواستند کہ بقاء خود را فداء جوھر کنند ۔"

" . . . the remaining muqaddams of the fort also wished to sacrifice themselves in the same elephant." (61, 14)

'جوہر' ہندی لفظ ہے ، جس سے مراد وہی جوہر کی رسم ہے ۔

(۲۰) صفحہ ۵/۹۰ : "هنگام نصب علم طوبیٰ شکوہ ، ملک نائب باربک طوبیٰ ، کہ کارفرمای بہشتیان است ۔"

"While the pious standard was being planted, the Malik Naib Commander of the army of heaven . . ." (62, 3)

اس فقرے میں 'طوبیٰ شکوہ' کا ترجمہ 'متقی' درست نہیں ۔ 'طوبیٰ' بہشت کے درخت کا نام ہے ۔ طوبیٰ بمعنی بلند قد و عالی مرتبہ ہے جو ترجمے سے

خارج کر دیا گیا ہے۔

(۲۱) صفحہ ۹۰، سطر آخر: ''از تیغ کوہ نظر تیز میکردند کہ چہار تیزی سوار ہندو در نظر آمد۔''

'تیغ' کا ترجمہ پہاڑ کی چوٹی اور 'تیزی' بمعنی اسپ تازی ہے۔

"On looking carefully from the hill four swift Hindu horsemen came into sight." (62, 13)

(۲۲) صفحہ ۹۱، سطر آخر: ''و بعضی کہ بی سنگ بودند، خشت و ژوبین می انداختند۔''

"Others, who had no stones, were busy in throwing bricks and javelins." [p. 62, l. 4 (bott.)]

خشت اس فقرے میں اینٹ کے معنوں میں نہیں بلکہ بمعنی 'نیزۂ کوچک' کہ:
''درمیان حلقۂ ابریشم یا ریسمان بافتہ بہ بندند و انگشت سبابہ دران کردہ بجانب دشمن اندازند۔'' نظامی:

یکی خشت پولاد الماس رنگ
برآورد و زد بر دلاور نہنگ

(۲۳) صفحہ ۹۳/۵: ''حصار را کہ ہندوان دروی برمان گز پای در دامن استراحت دراز کردہ بودند و خفتہ، بیداران لشکر بہ گز بیداری می پیمودند۔''

عبارت بالا میں پہلا 'گز' ایک درخت کا نام ہے جسے اُردو میں جھاؤ کہتے ہیں اور زمین پر پھیلتا جاتا ہے۔ دوسرا 'گز' ماپنے کا آلہ ہے۔ مگر ترجمہ:

"Inside the fort the Hindus slept at ease, like reclining yard measures: outside the watchmen of the imperial army were wide awake." (p. 63, para. 2, l. 12)

(۲۴) صفحہ ۹۴/۱۰: ''چون شام ہندو چہرہ بر آفتاب شبخون آورد، و خواب شبرو بر دروازہای چشم تاختن برد و حصار دیدۂ در بندان شد۔''

"When the Hindu faced evening had made a night-attack on the sun and sleep had closed portals of the eyes and besieged

the fort of the pupil . . ." (64, 5)

'شام هندو چهره' کا ترجمہ هندو کے سے چہرے والی شام ٹھیک نہیں ۔ یہاں ہندو بمعنی سیاہ ہے ۔ 'در بندان' بمعنی دربیدی ہے ، یعنے حصار چشم کی دربندی ہوگئی ۔

(۲۵) صفحہ ۱۲/۹۴ : "چون نزدیک دل شب شد ، و شہاب سوی دیوان ظلمت تیرانداز گشت ، و ماہ کامل سپر مکوکب برسرآورد ۔"

"Near midnight, when the meteors had begun to shoot towards the besieged demons and the moon had brought forth its full shield. . ." (64, 10)

'دیوان ظلمت' کا ترجمہ تاریکی کے دیو ہونا چاہیے ۔ 'کامل' ماہ کی صفت ہے یعنی پورا چاند ، چودھویں کا چاند ۔ حضرت مصنّف اس سے پیشتر فرما چکے ہیں کہ شاہی لشکر منتصف شعبان میں ارنگل پہنچا ہے ۔ مکوکب (کوکبی ، ستارہ‌دار ، سپر کی صفت ہے) ۔

(۲٦) صفحہ ۲/۱۰۲ : "کاوندگان سخت بازو ، بہ کاو کاو تمام در قلع حصار در نشستہ بودند ۔"

"Powerful diggers, with the greatest noise, sat down to open a way into the fort." [p. 67, l. 7 (bott.)]

'کاو کاو' مصدر کاویدن کا حاصل مصدر ہے ، جس کے معنے محنت و کاوش و جستجو وغیرہ ہیں ۔ پروفیسر صاحب نے نہ معلوم کس سند پر اس کے معنے 'شور' دیے ہیں ۔ 'قلع معنی کھودنے اور بیخ کنی کے ہیں ، نہ راہ پیدا کرنے کے ۔

(۲۷) صفحہ ۸/۱۰۲ : "نردبان چوبین هر فرو تری را از سوی اسلام ، برای درجۂ جہاد پایۂ هرچہ بالاتر میداد ۔"

"The wooden ladders raised their feet to the highest elevation from the greatest depth for the sake of Islam." (68, 3)

'هر فرو تری را' یعنے ہر ادنیٰ سپاہی کا) پروفیسر نے 'بڑی گہرائی' ترجمہ کیا ہے جو درست نہیں اور 'از سوی اسلام' کا ترجمہ 'برای اسلام' نہیں بلکہ 'اسلام کی طرف کے '۔ مطلب یہ ہے کہ زینۂ چوبین اسلام کے ادنیٰ ادنیٰ سپاہی کو جہاد

میں درجہ حاصل کرنے کے لیے پایۂ بلند دیتا تھا ۔

(۲۸) صفحہ ۹/۱۰۳ - شعر :

شب هانجا به زبردستی خود بنشستند
زبردست آمده را پای شدن بشکستند

"That night they established themselves there in force, and broke the legs of those who wanted to dislodge them."
(p. 68, para. 1, last line)

به زبردستی کا ترجمہ (in force) ٹھیک نہیں بلکہ زبردستی سے ۔ دوسرا مصرع ترجمے میں بالکل غلط ہوگیا ہے ۔ شاعر کا مطلب ہے کہ جو ان کے قابو چڑھ گیا اس کے جانے کا پاؤں توڑ دیا یعنے جانے نہیں دیا بلکہ وہیں مار رکھا ۔

(۲۹) صفحہ ۱۱۳/۲ :

به کیمیائی گشتند بعد ازان مشغول
که چون دهند زری را که کرده‌اند قبول

'کیمیا' اس شعر میں بمعنی چارہ و تدبیر ہے ۔

'شاہنامہ' میں بکثرت آتا ہے :

یکی آن که گفتی که کین نیا
بجستم من از چاره و کیمیا

"Next they busied themselves with alchemy in order to pay the gold they had promised." (74, 21)

(۳۰) صفحہ ۱۱۴/۱۰ : "برنج خواری برنج بر دندانش مانده ، حوض آشامی چشمها از بینی بیرون رانده -"

"Contented to live on rice in its anger it could nevertheless, drink up a whole pond." (75, 13)

یہ فقرہ ہاتھیوں کے ذکر میں ہے اور پروفیسر اس کے ترجمے میں راہ راست سے بھٹک گئے ہیں - امیر کہتے ہیں ، وہ چاول کھاتا تھا اور پیتل (برنج) اس کے

دانتوں پر چڑھا ہوا ہے ، حوض پی جاتا ہے لیکن چشمہ اس کی ناک (سونڈ) سے جاری ہو جاتا ہے ۔

محاورات

فارسی زبان محاورات میں خصوصیت کے ساتھ مالا مال ہے ۔ اس زبان میں اگر کوئی مشکل چیز ہے تو یہی محاورے ہیں ۔ مگر پروفیسر حبیب شروع ہی سے ان کے وجود کے قائل نہیں معلوم ہوتے اور نہ ان تغیرات کو ، جو عبارت کے معانی و مطالب میں ان کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں ، تسلیم کرتے ہیں ۔

(۱) صفحہ ۱۶/۷ : "و بعضی ازان بسر تازیانہ چابک پیچان را میدهد کہ هنگام سواری ، تازیانہ چابکی ، بپای خیززانی آهو رسانند ۔"

اس عبارت میں 'بسر تازیانہ' محاورہ ہے جس کے معنے در حال و معاً ہیں ۔ انوری :

خسرو بہ سر تازیانہ بخشد
چون ملک عراق او هزار باشد

پروفیسر نے اس کا ترجمہ تازیانہ کی ضرب کیا ہے جو بالکل ناواجب ہے ۔

> "Some of these horses he gives to the horse-breakers, so that with the strokes of their whips they may make the horses run as swift as deer." (9, 16)

اس ترجمے میں اور غلطیاں بھی ہیں لیکن ہم یہاں ان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ۔

(۲) صفحہ ۱۷/۱۰ : "چون محترفہ آن حدت معائنہ کردند ، از میزان آهن نگذشتند ۔"

'از چیزی گذشتن' کنایہ 'از ترک آن چیز کردن' ہے ۔

> "When the shop-keepers saw this severity, they did not meddle with the iron-weights." (10, 9)

مطلب یہ ہے کہ جب دوکانداروں نے یہ سختی دیکھی ، لوہے کے باٹ اختیار کر لیے اور پتھر کے باٹ ترک کر دیے ۔ پروفیسر کا یہ خیال کہ دکانداروں

نے لوہے کے باٹوں سے کوئی سروکار نہیں رکھا، بروی سیاق و سباق درست نہیں -

(۳) صفحہ ۱/۳۲ : ''امسال خود باشتعال سخون فلک متحرک یکبار کہ بروی گرم شد بی آبش کرد ، چنانکہ درونہ حوض ازبن بی آبی بترقید و پارہ پارہ گشت -''

اُردو میں 'حرکت' اور 'حرکتی' بمعنی شرارت و شریر اب بھی مستعمل ہیں - یہ استعمال غالباً تورانی اثر کی بنا پر فارسی سے ہماری زبان میں آیا ہے - عبارت بالا میں 'متحرک' بمعنی شریر آیا ہے - اس کو خواہ استعمال ہند کہو یا جیسا میں نے اوپر عرض کیا ہے، تورانی اثر کہو مگر یہ یقینی ہے کہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں 'متحرک' بمعنی شریر ہندوستان میں عام طور پر رائج ہے - برنی کی تاریخ میں اس قسم کا محاورہ موجود ہے - اگرچہ متحرک بمعنی حرکت کنندہ و گردش کنندہ ہے لیکن فقرہ بالا میں بحیثیت محاورہ بمعنی شریر استعمال ہوا ہے ، مگر ترجمہ :

> "This year the revolving sky flared up all of a sudden and the water of the tank evaporated throughly that its bottom cracked and broke into pieces." (p. 19, para. 3, l. 9)

اس فقرے میں فاعل آفتاب ہے ، نہ آسمان جیسا پروفیسر سمجھتے ہیں -

(۴) صفحہ ۱/۳۹ : ''و شگالان دشت را برلب آب عشرت فرسودند و شیرگیر گردانیدند -''

> " . . . the jackals of the forest collected together and held a feast by the river side." (p. 24, para. 2, line 2)

پچھلا فقرہ ترجمے میں چھوٹ گیا ہے - 'شیرگیر' سے مراد 'دلیری بحالت مستی' ہے - شیرگیر تلمیح ہے ایک کفش دوز کے قصے کی طرف ، جو شراب کے نشے میں شیر پر سوار ہو گیا تھا ، جب بہرام گور نے شراب خواری کی ممانعت کر رکھی تھی - اس وقت سے یہ مثل بنی ہے : "شراب نہ چندان باید خورد کہ افتد و کلاغ چشم آدمی را بر آورد بلکہ آن قدر باید خورد کہ مست و شیرگیر شود -"

خسرو در سلطان نامہ :

پذیرفتہ بر شیر پایہ سریز
شد از بس طرب مشتری شیرگیر

(۵) صفحہ ۱۲/۳۳ :

منصوبۂ لعب او چنان راست افتاد
کو جان عزیز برد بازی بازی

یہاں 'بازی بازی' محاورہ ہے ، جو ہمارے محاورے سے بہت قریب ہے ، یعنی کھیل کھیل میں ، ہنسی ہنسی میں ، مفت میں ۔ صائب :

بنای طاقت من گرچہ بود از بیستون افزون
بہ بازی بازی آخر پایمال نی سواران شد

"The Emperor was so successful in the sport that he took their lives in one game after another." [p. 28, (last line)]

(۶) صفحہ ۸/۳۵ : "بر سر آب علی در حصن موجی از جیوش دریا جوش مسلمانان در رسید ، و کپک لعین میان تبزاب تیغ افتادہ و دست و پا زدن گرفت ۔"

'دست و پا زدن' محاورہ ہے ۔ اس کے معنے ہاتھ پاؤں مارنا ، جدوجہد کرنا اور کوشش کرنا ۔ اُردو میں اسی محاورے کا لفظی ترجمہ کر لیا گیا ہے ۔

"On the banks of the Ab-i-Ali the Mughals were overtaken by a weak wave from the swelling stream of Muslim enthusiasm. The accursed Kapak fell into a rushing torrent of swords and began to strike out his hands and feet." (30, 2)

(۷) صفحہ ۱۱/۳۵ : "تا آن سگ آبی را با آبیان دیگر بدرگاہ دولت مآب اعلیٰ رسانند ۔"

'آبی' بمعنی سرکش و منکر ۔ دول رانی ، صفحہ ۱۳/۲۶۲ :

منم سنبل ترا یک بندہ داغی
نہ آن سنبل کہ شد آبی و باغی

اور 'خزائن الفتوح' صفحہ ۵/۹۵ :

"در یکدم آن ہمہ مردم آبی میان سیل خون غرق گشتہ بودند ۔"

مگر ترجمہ سنیے :

"In order to send the water-dog with the other aquatics to the Imperial Court." (30, 7)

(۸) صفحہ ۳/۵۰ : ع

کنون گویم فتوح هندو از گجرات گیرم سر

'از سر گرفتن' از سر نو شروع کرنا اور تجدید کرنا ، مگر ترجمہ :

"I now come to the conquest of the Hindus of Gujrat."

(35, 4)

مصرعے کا اصل مطلب ہے 'اب میں فتحِ ہند کی داستان لیتا ہوں اور گجرات سے شروع کرتا ہوں ۔'

(۹) صفحہ ۱۱/٦۸ : "و رعایای خوشه چین را که ازیشان خار خاری سر برنزند نہال کرد"

'خار خار' کے معنے خلش و داغ و دغدغہ و خدشہ ہیں ۔ 'نہال کردن' مالا مال کرنا وغیرہ ۔ مگر ترجمہ :

"... and helped the raiyats, the cultivators of the land, among whom no thorn raises its head, to grow."

(p. 49, para. 2, l. 13)

خار خار کا ترجمہ 'کانٹا' اور 'نہال کرد' کا ترجمہ 'مدد دی' دونوں غلط ہیں ۔

(۱۰) صفحہ ٦/۷۰ : "سی هزار چابک پیچان را به سر تازیانه برای ارتیاض شموسان آن لشکر برابر و روان کرد ۔"

"With him were sent thirty thousand horse-breakers scourge in hand, to train the haughty horses of the rebel army."

(51, 10)

'بسر تازیانہ' پروفیسر پھر نہیں سمجھے ۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ چابک سوار چابک ہاتھ میں لیے ہوں بلکہ یہ مقصد ہے کہ بادشاہ نے باشارۂ تازیانہ یا فوراً روانہ کر دیا ۔ یہ محاورہ پہلے بھی آ چکا ہے ۔

(۱۱) ۵/۷۸ : "تا آن همه بزان باگر را از خار خار (گرگان) آن زمین بازرهاند ۔"

خار خار کے معنے وہی تشویش و دغدغہ ہیں ۔ باگر (باگڑ) ایک علاقے کا نام ہے ۔

"... in order that he may guard the young she-goats from the thorns of the territory." (55, 6)

(۱۲) صفحہ ۲/۸۱ "و از ہر درذی صد ہزار جوال دوز سربر زدہ ۔"

درز = دراڑ ، جوال دوز = سُوا ، بوری ، ٹاٹ وغیرہ سینے کی سوٹی سوئی ۔ سربر زدن = ابھرنا ، سر نکالنا ۔ مطلب یہ ہے کہ زمین کے شگافوں سے سوے کی طرح موٹے موٹے لاکھوں کانٹے سر نکالے ہوئے تھے ۔ مگر ترجمہ :

"Every mound had hundred thousand pointed thorns stuck to its head." (57, 10)

(۱۳) صفحہ ۱/۸۲ : "و از جنبش بارکشان سم شکافتہ زہرۂ زمین شکافتہ می شد ۔"

'زہرہ شگافتہ می شد' = پتّہ پھٹ جاتا تھا ۔

"The movement of cloven footed baggage bearers despoiled the earth of its bloom." [p. 57, l. 6 (bott.)]

'زہرہ شگافتہ می شد' سے پروفیسر یہ سمجھے کہ زمین کی بہار ماری گئی ۔ وہ زہرہ کو کلی کے معنوں میں سمجھ رہے ہیں ۔

(۱۴) صفحہ ۱۴/۸۴ : "زمینی پر از سنگلاخہای درشت کہ ہندوان را بارہا در گزشتن آن دل افتادہ بود ۔"

دل افتادن = دل چھوٹنا ، دل بیٹھنا ۔ سلطان نامہ :

چو ہندو ز پیلک بگل می فتاد
غران را ازان زخم دل می فتاد

مطلب یہ ہے کہ زمین سخت پتھریلی تھی اور ہندو بھی اس کے طے کرتے وقت اکثر جی چھوڑ بیٹھتے تھے ۔ ترجمہ :

"The ground was overlaid with hard rocks, which the Hindus had often (vainly) attempted to cross." (59, 10)

(۱۵) صفحہ ۸۹/۵ : ''وحالی آن چراغ مردۂ ہندوان را برای زندگانی زبان دادند۔''

زبان دادن = قول دینا ، زبان دینا ۔ خسرو در سلطان نامہ :

امان دادش از خنجر لاابالی
بپاداش تیغش زبان داد حالی

" . . . but, next, this low-burning lamp of the Hindus (i.e. Ananir), was given a tongue (to ask) for his life. . ."
[61, 13 (bott.)]

(۱۶) صفحہ ۹۰/۷ : ''تا بی‌دینی چند را اگرچہ خنجر چون برگ بید بردست گرفتہ باشد زبان گیر گیرند و اخبار آن زمین پرسند۔''

" . . . and capture a few infidels, though the daggers of the latter may be as numerous as the leaves of a willow, in order to make inquiries from them about the condition of the country." (62, 6)

'زبان گیر' ترجمے میں ترک کر دیا ہے۔ اس کے معنے ایسا شخص ہیں جو دشمن کی فوج سے گرفتار کیا جائے اور اپنی فوج کی تعداد اور نقل و حرکت کے متعلق مفید اطلاع دے سکے۔ ظہوری :

با آن ہمہ جاسوسی خود گوش گرفتم
خاموشی مارا چہ زبان گیر برآورد

(۱۷) صفحہ ۹۱/۱ : ''یکی را بہ تیر چہار پری سپری کردند و کاچکش بخدمت سر لشکر فرستاد او خود فالی دید درین پوست باز کردہ۔''

"They succeeded in knocking down one of the four with a four-feathered arrow and sent him to the Commander-in-Chief. The latter took it as a good omen." (62, 15)

'سپری کردن' بمعنی 'ختم کردن' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک کو کھیت رکھ لیا اور اس کا سر (کھوپڑی) سپہ سالار کی خدمت میں بھیج دیا۔ 'پوست باز کردہ' = صریح و علی‌الاعلان ، ترجمے سے چھوٹ گیا ہے۔

(۱۸) صفحہ ۱۲/۹۲ : ”و دران شب خواجہ نصیرالملک سراج الدولہ اضاء اللہ برات عمرہ بذات خویش چراغ برکردہ لشکر را قسمت میکرد ۔“

"On that night Khwaja Nasirul Mulk Sirajuddoulah (may God illuminate the nights of his life !) personally arranged the troops with alighted lamp." (p. 63, para. 2, l. 3)

اور امور سے قطع نظر 'چراغ بر کردن' ، چراغ روشن کرنے کے معنوں میں آتا ہے ۔ مگر یہاں بحیثیت محاورہ استعمال میں آیا ہے یعنے 'کمال تحقیق و تدقیق اور غور و احتیاط' مراد ہے ۔ برنی کے ہاں یہ محاورہ استعمال ہوا ہے ۔ چنانچہ :

”و هر سال در ایام زمستان با لشکر خاص خود از دیبالپور بیرون آمدی و تا سرحدهای مغل برفتی مغل را چراغ برکردہ طلب کردی و مغل را مجال نماندہ بود کہ بر سرحدهای خود بر طریق گشت بیایند ۔“ (صفحہ ۲/۳۲۳ ، تاریخ فیروز شاہی)

(۱۹) صفحہ ۳/۹۷ : ”هر تازیانہ بالای مرد [کذا ۔ تازیانہ بالا مردی ؟] کہ در لشکر بود ، بچابکی بر اسپ می پیچید و بازی بازی ازان سر بازان گوی می برد ۔“

"Every horseman in the army whipped his animal and in several matches brought away the 'balls' of those desperate Hindu warriors." (p. 65, para. 2, l. 9)

اس ترجمے کو صحیح تو نہیں کہا جا سکتا ۔ تازیانہ بلا مرد = تازیانہ کے سے قد والا آدمی ۔ بہ چالاکی = چالاکی سے ۔ براسپ می پیچید = گھوڑے سے لپٹ گیا ، چپک گیا ، مطلب یہ کہ سوار ہوگیا ۔ بازی بازی = کھیل کھیل میں ، آسانی سے ۔ گوی می برد = غالب آتا تھا ۔

(۲۰) صفحہ ۶/۱۱۰ : ”و اگر درسیاست معاندان فرمان نفاذ یابد ، از بن دندان در پذیرند ، خدای شان پیشانی دادہ است کہ خاص خدمت درگاہ سلطنت را شاید ۔“

'از بن دندان' مراد از کمال رغبت و رضا ـ مجد ہمگر :

گر شبی بر لب شیرین تو فرمان بدہم
جان شیرین بہ سرت کز بن دندان بدہم

علی ہذا 'پیشانی' یہاں بمعنی اہلیت و شایستگی ہے : "واینکہ میگویند فلانی پیشانی این کار ندارد و مراد آنست کہ شایستگی و لیاقت این کار ندارد" ـ صائب :

مشکل کہ کشاید گرہ از رشتۂ کارم
ابروی تو پیشانی این کار ندارد

" . . . and if order for the punishment of rebels in given, the elephants will execute it with their teeth. God has given them a forehead peculiarly fitted to render obedience at the Imperial Court." (72, 22)

(۲۱) صفحہ ۱۱۲/۱۵ : "رای نیز چون برگ زر لرزان گشت ، ہرچند روی سخن را ملمع کردند استوارش نمی آمد ـ"

" . . . and he too began to shake like a gold leaf. The ambassadors ornamented their speech, but the Rai could not regain his slability. . ." (74, 17)

'برگ زر' کی جگہ 'برگ زرد' زیادہ موزوں ہے ـ 'سخن را ملمع کردند' یعنے بات بنائی 'استوار آمدن' = یقین آنا ـ

عام اغلاط

اس عنوان کے ذیل میں ہر قسم کی اغلاط شامل ہیں مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ فہرست تمام غلطیوں پر حاوی ہے ـ کیونکہ اول تو بہت سے مقامات مجھ کو 'خزائن الفتوح' کے متن کی نادرستی کی بنا پر چھوڑنے پڑے ـ اگرچہ عبارت متن کی درستی میں حتی الامکان کوشش کی گئی ـ اسی طرح خفیف خفیف غلطیوں کو بھی ترک کردیا گیا ہے ـ

صفحہ ۳/۷ : "و جواہری کہ بحتری و ابو تمام را عطا نہ فرمودہ بود در ذیل صحیفۂ انشاء من ریخت اگرچہ ہر دری ازانہا بود کہ مشتری قیمت آن نداند

معهذا از در آن نمی نمود کہ نشر (نثر ؟) آن جناب فلک مآب را شاید ۔''

''Gems such as had never been bestowed on Bokhtari and Abu Tamam were showered on my pages; though every one of them was such as Venus could not afford to purchase, yet none was worthy of being used in praise of the celestial monarch.'' (2, 9)

'بختری' غلط ، صحیح 'بحتری' بضم با و سکون حاء حلقی ۔ علیٰ ھذا ابوتمّام بتشدید میم اول ہے نہ بہ تخفیف ۔ پروفیسر صاحب کو ان ناموں پر حاشیہ دینا چاہیے تھا ۔ مشتری کا ترجمہ انگریزی میں 'جوپیٹر' (Jupiter) ہے ، نہ وینس(Venus) جیسا کہ پروفیسر نے لکھا ہے لیکن مشتری کے معنے یہاں خریدار زیادہ مناسب ہیں ۔

صفحہ ۲/۱ : ''و ھر نظمی کہ بندہ پیش می برد ، اگرچہ ھمہ در وی جز بحر خشک نمی باشد از عین عواطف آن را آبی تمام بحاصل می آید ، چنانک سفائن نفائس بندہ بمدد این موج الطاف در خشکی و تری روان می گردد ۔''

''For every poem I present to the emperor, though it may be nothing else but a dried up river, is yet filled with water through the stream of his kindness, and aided by the favourable current, the boats of my mind can float through all the regions of land and sea.'' (p. 2, para. 2, l. 3).

امیر نے اس فقرے میں صنعتِ ایہام سے کام لیا ہے ۔ چنانچہ 'بحر' سے مراد عروضی اوزان کا باب ہے نہ دریا ۔ 'عین' تخصیص کے واسطے آیا ہے نہ بمعنی چشمہ ، 'آب' بمعنی رونق و آب ہے ، نہ پانی کے معنوں میں ۔ 'سفائن' سے مراد بیاضیں ہیں نہ کشتیاں ۔ حضرتِ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ جو نظم میں پیش کرتا ہوں ، اگرچہ خشک وزن کے سوا اس میں کچھ نہیں ہوتا لیکن بادشاہ کی خاص مہربانی سے اس کو رونق مل جاتی ہے ۔ چنانچہ (میرے کلام کی) بیاضیں شاہی لطف کی بنا پر بحر و بر میں جاری ہیں ۔

صفحہ ۴/۶ : ''خواستم کہ برای ستّدہ والا نثری نیز بیارایم ۔''

''I also wished to adorn some pages of prose for the high festival.'' [2, 7 (bott.)]

اس جملے میں 'ستّدہ' بتشدید دال بمعنی آستانہ ہے ، نہ بمعنی جشن ۔ پروفیسر کو ایرانیوں کے جشن 'سدہ' کے ساتھ التباس ہوگیا ہے ۔

صفحہ ۴/۱۰ : ''و سلسبیل سخن نیز ہمان قدر [است] کہ تا لب گور زبانی بدان ترکنند ۔''

''The fountain of my words will only enable the reader to moisten his lips.'' (3, 4)

یہ جملہ معطوف ہے ایک اور جملے پر ، جس کا مطلب ہے کہ سرمایۂ حیات بس اسی قدر ہے کہ انجام کار اس سے ہاتھ دھو لیں ۔ اور جملۂ بالا کا مطلب ہے کہ سلسبیل نطق بھی بس اتنا ہی ہے کہ کنارۂ گور پہنچنے تک اس سے لب تر کیے جا سکیں ۔

صفحہ ۱۱/۵ : ''و اگر از بی ہنری صیقلی کژ طبع چیزی از تصویر آتش برعکس افتادہ بود اشارت راند کہ بحد امکان راست کردہ شود امّا ازین آئینہ روی نگرداند کہ خیال ذو وجہین کان لم یکن گردد ۔''

'' . . . but if from inartistic or crooked execution, there is anything in it contrary to the picture of fire, he will signify so, in order that I may correct it so far so possible. I hope, however, that he will not turn away his face from it, for then my images will vanish as if they had never been.'' (3, 19)

میں 'صیقلے کژ طبع' کی جگہ 'صیقلی گر طبع' اور 'تصویر آتش' کی جگہ 'تصویر اتش' پڑھتا ہوں ۔ حضرت مصنف کا منشا یہ ہے کہ اگر میری طبیعت کے صیقل ساز کی نا قابلیت کی بنا پر اس کی تصویریں درست نہ ہوں تو مہربانی کر کے ارشاد کر دیا جائے تاکہ ان کی درستی کردی جائے لیکن اس آئینے (خزائن الفتوح) سے اعراض نہ کیا جائے تاکہ اس کے تعلق میں دو رائیں پیدا ہونے کا سوال معدوم ہو جائے ۔

صفحہ ۹/۶ شعر :

تا ازین نور و دخان احداب دین روشن کنند
فضل رحمٰن و تبارک در حق این شاہ عصر

" . . . so that the success of the faith may be estimated from the light and the smoke. May the kindness of the merciful bless the Emperor." [3, 3 (bottom)]

'احداب' کی جگہ میں 'احزاب' بمعنی گروہ پڑھتا ہوں ۔ 'رحمٰن' اور 'تبارک' کے درمیان واو غلط معلوم ہوتی ہے ۔ نور ، دخان ، احزاب ، رحمٰن اور تبارک قرآن مجید کی سورتوں کے نام ہیں ۔ روشن کردن = معلوم کردن ۔ اور شعر کا مطلب ہے کہ اس نور اور دخان سے اصحاب دین خدای تبارک و تعالٰی کی مہربانی اس شاہ عصر کے حق میں معلوم کر لیں ۔

صفحہ ۱۳/۶ : "کہ عثمان وار آیات رحمت رحمانی را در جلد مصحف وجود چکونہ جمع آوردہ است ۔"

" . . . how, like Usman, he has brought the benevolent words of God into the book of realization. . ." (4, 3)

مصنف کا مقصد ہے کہ حضرت عثمان کی طرح (پادشاہ نے) رحمت الٰہی کی آیتوں کو اپنے وجود کے مصحف میں جمع کر دیا ہے ۔

صفحہ ۱۱/۸ : "و ہر جا کہ در جنگلہا مواسات خاری و باغی بود یا در کرانہای آب خود رستہ آبی ہمہ را پایمال لشکر کرد ۔"

"Whenever in the forest or by the bank of the river, there was a mawas, whether in cultivated land or wilderness, he trod it under foot with his army." (5, 6)

'مواس' = جائے پناہ وحصن ، تاریخ فیروز شاہی میں بھی آتا ہے : "وہم دران نزدیکی مواسی بود دران خزیدند و بعد چند روز مقدم آن مواس اورا بہ سلطان جلال الدین فرستاد ۔" (صفحہ ۱۸۲ ، فیروز شاہی ، از برنی)

'مواس' ہندی لفظ ہے ۔ خاری = فتنہ ساز و آزار رسان ۔ باغی سے مراد باغ نہیں ہے بلکہ بغاوت کرنے والے ۔ 'خود رستہ' = آزاد و سرکش ، 'آبی' = منکر

و باغی - مطلب ہے کہ جنگلوں میں جہاں جہاں فتنہ پردازوں اور باغیوں کی گڑھیاں تھیں یا دریا کے کنارے خود سر و سرکش تھے ، سب کو اس نے اپنے لشکر سے پائمال کردیا -

صفحہ ۹/۳ : ''برسان بادتند کہ بر شاخسار زند تاختن آورد و از برگ و منالش خالی فرمودہ و رای رامدیو را کہ دران ریاض شجرۂ بود بس عالی اصل و ہیچ گاہ صرصر حوادث بروی آسیبی نیاوردہ اول بعاصف قہرش مستاصل گردانید و بار دیگرش از سر نہال کرد تا درخت آزاد گشت'' (فاعل علاء الدین ہے) -

> " . . . and striking its branches like a storm, cleared them of their leaves and fruits. Ram Dev, a tree of noble origin in that garden, had never before been injured by the tempestuous wind of misfortune ; but (the Sultan) in his anger first uprooted him and then planted him again, so that he once more grew into a green tree." (5, 10)

اس فقرے میں بھی صنعتِ ایہام ہے - 'برگ' یہاں بمعنی بعید 'سامان و رخت' اور 'نہال' بمعنی 'مالا مال' ہے - مترجم کے بیان کردہ معانی یہاں چسپاں نہیں -

صفحہ ۱۰/۶ : ''بعد ازین تاریخ خیراتی کہ ازین تاجدار عالی مآثر بر طبقات زمین ظاہر شود ، امید از حضرت ملک بخشی کہ آثار تاجوران دیندار را بر صحائف روزگار رقم خلود بخشد چنانست کہ تحریر آن بر نمطی در قلم آید کہ عزیز السیر سلاطین آفاق گردد -''

> "I hope from Almighty God that he will for ever preserve the memory of pious kings on the pages of time. And may the exceellnt virtues of the emperor be recorded (in this book) in such a way as to become famous, throughout the world . . ." (5, 25)

اس فقرے کا ترجمہ ہے کہ اس تاریخ کے بعد جو خیر و خیرات اس تاجدار معالی آثار سے زمین کے پردے پر ظاہر ہوگی خدائے ملک بخش سے (جو دیندار سلطان کے آثار کو زمانے کے صحیفوں میں پایندگی کی رقم بخشتا ہے) امید ہے اس کا بیان اس طرح حوالۂ قلم کروں کہ شاہان عالم کے مطالعے میں مقبول ہو -

صفحہ ۱۰/۱۰ : ''و سخن بمثابتی بلند گفتہ شود کہ آوازۂ نوبت سنجری را فرو پوشد و غلغل کوس محمودی را مغلوب گرداند ۔ اگرچہ ہر مقامہ حکایتی ازین مغازی در تدبیر جہانبانی و کشورستانی رای آرای شاہان گیتی دار و خسروان ظفر شعار است ۔''

" . . . and may the pitch of (my) voice rise high enough to drown the drums of Sanjar and Mahmud, though in affairs of government and conquests they were great and successful monarchs." [5, 1 (from bottom)]

اس فقرے کا پچھلا حصہ قابل اعتراض ہے ، جس کا مطلب ہے کہ اگرچہ اس جنگ نامے کا ہر مقامہ (فصل) ملک داری اور ملک گیری کی تدبیر میں شاہان عالم آرا کی تہذیب و تزئین کرتا ہے ۔

صفحہ ۱۱/۲ : ''کہ این محمد موسیٰ قوت نیل شمشیر از سرجملگی فراعنۂ کفر بگزارد و گنجہای قارونی رایان از زیر زمین بر کشد و جانب کشندگان کا فرعون فرماید ۔''

"That this Moslem Moses was to seize their powerful swords from all infidel Pharaohs and dig out of the earth the immense (Qaruni) treasures of the rais. . ." (6, 5)

محمد ، علاءالدین کا نام ہے ۔ پہلے فقرے کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ یہ موسیٰ کی سی قوت والا محمد اپنی نیلی تیغ کفر کے فرعونوں کے سر پر چلائے گا ۔ آخری فقرہ ترجمے سے چھوٹ گیا ہے ۔

صفحہ ۱۲/۱۳ : ''آنکہ بگیرد و نتواند درشت آن گرفت بروی گرفتہ بود و واجب است کہ جہانی بروی گرفت کند تا آواز آن گرفت جہان گیرد ۔''

" . . . the man, who conquers but can not retain, is in fact himself conquered. And it is inevitable that when he seizes the world, the world should seize him also." (7, 20)

یہ ترجمہ قابلِ گرفت ہے ۔ حضرتِ مصنّف کا تو یہ مطلب ہے کہ جو شخص ملک گیری کرتا ہے مگر ملک داری سے ناواقف ہے ، ایسی ملک گیری

قابلِ گرفت ہے ۔ سب کو لازم ہے کہ اس پر اعترض کریں تا کہ اس اعتراض کی آواز سے تمام عالم گونج اٹھے ۔

صفحہ ۱۵/۴ : ''و بمیزان سنبلہ زر می بخشد تا ہر کہ صفر است حوت وار غرق تنکۂ زر و سیم می شود ۔''

"He gives away treasures by the balance of Virgo, so that people, who only possessed copper, are drowned under tankas of gold and silver like the pisces." [p. 8, l. 5 (from bottom)]

'صفر' سے مراد خالی اور نادار ہے یعنے جو غریب ہے ۔ اہلِ تنجیم کے ہاں صفر برج حمل کی علامت ہے ۔

صفحہ ۱۶/۵ : ''و این وافر جود ہر روز چندین جواد را بمحتاجی می بخشد ۔''

" . . . and the emperor everyday gives away fortunes to the necessitious." (9, 12)

یہاں 'جواد' گھوڑے کے معنے میں ہے ، نہ دولت کے معنوں میں کیونکہ اس عبارت میں گھوڑوں کا ضلع چل رہا ہے ۔

صفحہ ۱۶/۷ : ''و بعضی ارزان [بسر] تازیانہ چابک بیچان را میدھد کہ ہنگام سواری تازیانہ چابکی بپای خیز رانی آہو رسانند و بعضی تیزی یمانی و ہندی بپایکان احاد روا میدارد تا بموافقت تیغ زیر رکابی سپرکش ایشان میگردد ۔''

"Some of these horses he gives to the horse-breakers, so that with the strokes of their whips they may make the horses run as swift as deer. Others are given to the paiks (footmen) so that they may ride on them with the help of their sharp stirrups." (9, 16)

'بسر تازیانہ' = باشارۂ تازیانہ ، فوراً و معاً ، 'تازیانہ چابکی' = تازی گھوڑے کی سرعت ، 'خیزران' = بید ، 'تیزی' = تازی (مجازاً اسپ) 'سپرکش' = ڈھلیت ۔ بارکش ، 'تیغ زیر رکابی' = تیغی کہ زیر دامن زین ہمراہ اسپ

سواری باشد ۔ وحید :

به پیش ابروی پر چین تو زبان عتاب
چو تیغ زیر رکابی همیشه بیکار است

مطلب یہ ہے کہ بعض ان میں سے فوراً چابک سواروں کے حوالے کر دیتا ہے تا کہ شاہی سواری میں اسپانہ شتاب ، بید کے سے پاؤں والے ہرن کی برابر پہنچا دیں ۔ بعض تازی و یمنی و ہندی اسپ پیدل نفروں کے لیے روا رکھتا ہے تا کہ تیغ زیر رکابی کی موافقت میں ان کی ڈھلیتی کا کام انجام دے ۔

صفحہ ۱۲/۱۶ : "و بعضی پای کوب و جستہ زن گلہ بر گلہ بمطربان میدھد ، تا امیرانی کہ پیش ازین اسپان دست زن بی اصول داشتند ، بغایتی کہ معروفک رباب خفتہ ازیشان تک ببردی درین وقت همہ بر رہ نوردانی دنک می‌نهند کہ در طریق با باد سخن گویند ۔"

"Some horses are given to the amirs, who formerly owned unbroken colts but now ride horses swift as the wind."
(p. 9, para. 2, l. 14)

پای کوب = قدم باز ، جستہ زن = جست باز ، امیر = مطرب و قوال ۔ گویتوں کو آج کل بھی میر صاحب کہا جاتا ہے ، دست زن = تال دینے والے ، معروفک = گھوڑی ؟ رباب خفتہ = رباب خاموش ۔ اور بعض قدم باز اور چھلانگ مارنے والے گھوڑوں کے گلتے کے گلتے مطربوں کو بخش دیے جاتے ہیں تا کہ ایسے گویتے ، جو اس عہد سے قبل بے اصول تال دینے والے گھوڑے رکھتے تھے ، جن سے نہ بجنے والے رباب کی معروفک بازی لے جاتی ، اب ایسے ایسے گھوڑوں پر اپنے دف باندھتے ہیں ، جو چلنے میں ہوا کا مقابلہ کرتے ہیں ۔

صفحہ ۳/۱۸ : "زهی عادل کہ از سہابت عدل او پیلان مست در راہ مور پف کنان پای بر زمین نهادہ ۔"

"Wonderful, indeed, is his justice, when from fear of his punishment mad elephants kneel down before panting ants . . ." (10, 20)

اس جملے میں 'پف کنان' حال ہے جس کا ذوالحال 'پیلان مست' ہیں ، نہ

'مور' جیسا کہ مترجم نے خیال کیا ہے ۔ 'پای بر زمین نہادن' کا ترجمہ 'جھکنا' ہمارے خیال میں بالکل ناہموار ہے ۔ 'زمین پر قدم رکھنا' درست ہوگا ۔ مطلب یہ ہے کہ مست ہاتھی اس کے عدل کی ہیبت سے چیونٹی کے راستے میں پھونک کر قدم رکھتے ہیں ۔

صفحہ ۸/۱۸ : ''ذکر اصلاح امور خاص و عام ۔''

Reforms of the affairs of nobles and commons:
(p. 10, para. 3)

امور خاص و عام سے مقصد امورِ رفاہ عامّہ ہیں ۔

صفحہ ۱۱/۱۸ : ''باز ازانجا کہ آب دادن عین شریعت خاصۂ آن ذات مطہر است ۔''

"Though the giving of water (to the thirsty) is one of the most noble virtues of the pious emperor. . ." (10, 29)

'آب دادن' = رونق دادن ۔ عین = چشمہ ۔ مطلب یہ ہے کہ چشمہ' شریعت کی آبیاری یعنی ترویجِ شرع بادشاہ کی ایک شخصی خصوصیت ہے ۔

صفحہ ۸/۲۰ : ''سحرۂ خون آشام یعنی کفتاران آدمی خوار کہ در گوشت و پوست اولاد و اطفال مردمان دندان بی خردی تیز میکردند ۔''

"Blood-sucking magicians, who by the use of (magical) words sharpened their unwise teeth on the flesh of other people's children. . ." (p. 11, para. 3, l. 2)

کفتار = بجّو ۔ مطلب یہ ہے کہ خون پینے والے جادوگر، یعنی آدم خوار بجّو، جو انسانوں کی اولاد کے گوشت میں بے خردی کے دانت تیز کرتے رہتے ہیں ۔

صفحہ ۱۰/۲۰ : "و از ناگوارائی آب هم ایشان را فرو [نمی برد] در خاک شان تا حلق فرو می بردند ۔"

"—were buried in the earth upto their necks . . ."
[p. 11, (last line)]

یہ انھی جادوگروں کا ذکر ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ بسبب ِ کراہت پانی بھی انھیں غرق کرنے کے لیے تیار نہیں تھا ۔ زمین میں انھیں گلے گلے تک دفن کر دیا گیا ۔

صفحہ ۱۲/۲۰ :

"همی شدند خراب اندران دم سکرات
بلی خورندهٔ آن می چنین خراب بود

"All men have to suffer the agonies of death, but those who drink this wine (i.e. human blood) are thus destroyed."
(12, 2)

'همی شدند' کے فاعل وہی جادوگر ہیں ، جن کا ذکر ہو رہا ہے ۔ حضرت مترجم مصرع اول کی ترکیب سمجھنے سے قاصر رہ کر اس کو ایک منطقی کلیّہ مانتے ہیں ، یعنے یہ کہ تمام انسانوں کو سکرات ِ موت کی چاشنی چکھنا ہے ۔ یہ کلیّہ بجائے خود صحیح ہے لیکن امیر خسرو کا یہ مقصد نہیں ہے ۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ جادوگر سکرات ِ موت کی حالت میں نہایت خراب ہوتے تھے ، اور بعد میں اضافہ کرتے ہیں کہ بے شک ایسی شراب کا پینے والا ایسا ہی خراب ہوا کرتا ہے ۔

صفحہ ۳/۲۳ : "و هر قماش و رختی کہ کشاد کار مردم بدان بربستہ است ، فرمان داد کہ از اطراف بہ بندند و جز آنجا نکشایند ، چنانکہ آن کشاد را بر بستی نباشد ۔ نظم :

هر کسی کان کشادہ بر بندد
بند بندش بہ تیغ بکشایند

"He ordered that all packages of cloth brought from the provinces were to be opened here and nowhere else; and once opened, they were not to be tied up again. And if anyone opened his packages elsewhere, the joints of his body were to be opened with the sword . . ." (p. 13, para. 2, l. 4)

مطلب یہ ہے کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ جنس جنس کا کپڑا ، جس کے ساتھ انسانوں کی ضرورت وابستہ ہوتی ہے ، اطراف سے فراہم کیا جائے اور یہاں

کے سوا کہیں فروخت نہ کیا جائے ۔ چاہیے کہ اس اجرائی حکم سے کوئی سرتابی نہ کرے ۔ نظم : جو شخص اس نفاذ یافتہ حکم کی بندش کرے گا اس کا جوڑ جوڑ تلوار سے الگ کر دیا جائے گا ۔

صفحہ ۱۶/۲۵ : "کہ قواعد الصلٰوة عماد الدین دروی از سر اقامت یافت ۔"

"... so that they once more became the 'pillars of faith', and prayers were said in them." (15, 7)

'الصلٰوة عماد الدین' (نماز دین کا ستون ہے) ۔ مطلب یہ ہے کہ ان مسجدوں میں قواعد نماز از سر نو قائم ہوگئے ، یعنے نمازیں پڑھی جانے لگیں ۔

صفحہ ۱۳/۲۶ : "بیک اشارت والا جملگی گردونہای سیّارہ کہ دوگان گاو فلک در زیر داشتند بکار آمدند ۔"

"On a sign from the emperor, the planets, who are the shop-keepers of the sky, began to move their chariots." (16, 11)

'گردونہای سیّارہ' = چلنے والی گاڑیاں ، نہ سیّارۂ گردوں ، جیسا کہ جناب مترجم سمجھے ۔ 'دوگان' = دو دو ، نہ دکان ۔ مطلب : اشارۂ عالی سے ساری کی ساری چلتی گاڑیاں جن میں دو دو بیل (آسانی) جتے تھے کام میں لگ گئیں ۔

صفحہ ۱۴/۲۷ : "و بارکشان آهنین اندام نیز ربودۂ سنگ شدہ سنگ می ربودند ۔ از بتکدهای صد فرسنگ تا فرسنگ مسجد پشت سنگین بارکشان گران بار سنگ بود ۔ بگردون سنگ می کشیدند کہ گردون نکشد ۔"

"... and labourers with bodies of steel brought these stones from temples a hundred farsangs away. The stony back of the mosque had a large mass of stones put upon it; stones, such as the sky could not have drawn to itself, were taken to the sky;" (17, 4)

'ربودۂ سنگ شدہ' = پتھر پر فریفتہ ہو کر ۔ پہلے 'گردون' کے معنی گاڑی ، مطلب ہے کہ آہنیں جسم مزدور پتھر پر ریجھ کر پتھر ڈھونے لگے ۔ سو سو فرسنگ فاصلے کے بت خانوں سے لے کر مسجد سے ایک ایک فرسنگ تک بوجھ

ڈھونے والوں کی پیٹھ پتھروں سے لدی نظر آتی تھی ۔ گاڑیوں میں ایسے ایسے پتھر لدے تھے جنھیں خود آسمان نہ اٹھا سکے ۔

صفحہ ۱۲/۲۸ : ”و آب و گل بندہ را نیز اگر درین منظر مست چندگاہ بستگی باشد ، باشد کہ کتابہٗ ازین منارہ را بشرف تمام مطالعہ کند و دعاء بانی خیز بخواند ۔ نظم :

”و گر نظارۂ من تا نہایتش نرسد
بسا کسان کہ رسند و نگہ کنند و روند“

“And though I wish to see it finish, my life will have to be long before I am able to witness its completion and send my blessings to its pious founder.

Besides my sight cnanot reach its end ; I am one of those who come and see and depart.” (p. 17, para. 2, l. 13)

’آب و گل‘ = وجود ، ’منظر مست‘ = دنیا ، ’بستگی‘ = ترکیب ، بندش ، ’کتابہ‘ = کتبہٗ تاریخی ۔ اگر میرے وجود کی کچھ عرصے اور دنیا میں ترکیبِ عنصری قائم رہے ، یعنے زندہ رہوں ، تو ممکن ہے کہ اس منارہ کا کتبہ مطالعہ کر سکوں ، یعنے اسے تکمیل شدہ حالت میں دیکھ سکوں اور بانیٗ خیر کے حق میں دعائے خیر کروں ۔ نظم :

اگر میری نگاہ اس کے خاتمے پر نہ پڑے ، بالفاظ دیگر اس کے اختتام تک زندہ نہ رہوں ، تو اور بہت لوگ ہوں گے جو آئیں گے اور اسے (سکمل شدہ) دیکھیں گے اور رخصت ہو جائیں گے ۔

صفحہ ۱۱/۲۹ : ”و دست بدست حصاری دیگر قائم مقام آن اقامت کردند کہ ساعد برجش باصابع کنگرہ باکف خضیب ثریا پنجہ کرد ۔“

“ . . . a new fort was quickly built in place of the old. The new fort with its strong fore arm and seven towers shakes hand with the coloured Pleiades . . .” (18, 9)

’ساعد برج‘ = برج کا پونچا ۔ ’اصابع کنگرہ‘ = کنگرہ کی پوریں ۔ ’کف خضیب‘ = کف رنگین ۔ متن میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کے معنے سات برج ہوں ۔

صفحہ ۱/۳۲ : ''و حوض از گرمیہای او برخود خشک می شد ۔ امسال خود باشتعال سخون فلک متحرک یکبار کہ بروی گرم شد و بی آبش کرد چنانکہ دورونہ' حوض ازان بی آبی بترقید و پارہ پارہ گشت ۔''

گرمی = تیزی ، غصہ ۔ متحرک = شریر ۔ 'حرکتی' اُردو میں 'حرکت' آج بھی شرارت کے معنوں میں آتی ہے ۔ خسرو کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ حرکت بمعنی شرارت استعمال میں آ رہی ہے ۔ شمس سراج عفیف اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں ''با ما آن قلندران حرکت کردہ لشکر ما را بہ بقیہ از درون حصار بیرون آوردہ ۔'' (صفحہ ۱۱۵ - ۱۶ ، تاریخ فیروز شاہی) اور مفرح القلوب :
''ای ھدھد ھر کہ سخن متحرک استوار دارد ھمان معاینہ کند چنانچہ ملتانی ۔''

(صفحہ ۲۱۵) : 'بی آب' = بے آبرو ۔ 'بی آبی' = بے آبروئی ۔

اس جملے کا مطلب ہے کہ حوض (آفتاب کی) شدت کی بنا پر خشک ہو گیا ۔ اس سال شریر آسمان کی اشتعال انگیز باتوں سے پھر (آفتاب) حوض پر بگڑا اور اسے بے آبرو کر دیا ۔ چنانچہ اس آبرو ریزی سے حوض کا دل شق ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ۔

"And the tank dried up from fear. This year the revolving sky flared up all of a sudden, and the water of the tank evaporated so thoroughly that its bottom cracked and broke into pieces." (p. 19, para 3, l. 8)

صفحہ ۵/۳۲ : ''چون در خشک کردن حوض اشتعال آفتاب از فلک بود ، بمجازات فلک گنبدی بنا کردند کہ آفتاب را از دیدن او دوران آورد ۔''

"And as the sun from on high had been drying up its water, a dome, such as put that luminary into falling fits, was built over it." [19, 7 (from bottom)]

مطلب یہ ہے کہ چونکہ حوض کے خشک کرنے میں آسمان نے آفتاب کو اشتعال دلایا تھا اس لیے اس کی سزا میں بادشاہ نے حوض پر ایک گنبد تیار کرایا جس کے دیکھنے سے آفتاب کو چکر آ گیا ۔

صفحہ ۱/۳۳ : ''بادشاهی کہ شمشیر نیلگون او فراعنہ کفر را در آب نیل فرو برد بلکہ نیل تیغ را در خون زرد قبایان یهودی مزاج غرق گردانید ۔ ازین عطش عام چون الٰهی بود خشک آورد اما کلیم وار یدبیضا باستسقا برداشت ۔''

"The Emperor, whose sharp sword has thrown the Pharaohs of infidelity into the Nile, or, to put it differently, whose Nile-like sword has been ground in the yellow blood of Jewish tempered tunic-wearers in this general scarcity of water, when even the Jumma had become dry, raised up his 'white hand' like Moses, to pray to God for water."

(20, 8)

'نیل تیغ' = بلحاظ رنگ تلوار کو 'نیل' سے تشبیہ دی ہے :

نیل تیغش چون سکاهن سوختہ خیل خزر
لاجرم هندوستان زان دودمان انگیختہ

دریائے نیل مقصد نہیں ہے ۔ 'خون زرد قبایان' اس ترکیب میں 'زرد' قبا کی صفت ہے نہ خون کی ۔ خون زرد نہیں ہوا کرتا یعنے زرد قبا پہننے والوں کے خون میں ۔ 'ازین عطش عام چون الٰهی بود ۔ متن میں چون ہے نہ جون (جمنا) اس لیے یہ مطلب نہیں کہ جمنا خشک ہو گئی بلکہ 'اس امساک باران سے جو خدا کی طرف سے تھا' ۔ 'خشک آوردن' = کنایہ از تن زدن و خاموش بودن ۔

صفحہ ۱۳/۳۵ :

فتح اول کہ ظفر یافت سپاہ منصور
بر بلاعین کدر در حد جارن منجور

"The first victory of the (Imperial) army over the gluttons of Kadar in the confines of Jaran Manjur." (23, 1)

مصرع آخر میں پروفیسر نے 'بلاعین' کا ترجمہ "gluttons" کیا ہے ۔ مگر ہم سمجھتے ہیں یہ لفظ 'بلاعین' نہیں ہے بلکہ ملاعین (جمع ملعون) ہے ۔

جارن منجور یا جالندھر

پروفیسر حبیب کی جلد بازانہ نظریہ بازیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جارن منجور اور جالندھر کو ، جو صریحاً دو مختلف مقامات معلوم ہوتے ہیں ، ایک کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں جارن منجور کو جالندھر کے ساتھ شناخت کرنے میں برنی بلکہ اس کے مرتّب کے ساتھ اتفاق رکھتا ہوں ۔ (صفحہ ۲۶ ، حاشیہ)

برنی (صفحہ ۲۵۰) بذیل ہجری ۶۹۶ مغلوں کے ایک حملے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مغل دریائے سندھ سے گزرے اور ولایت (؟) میں آئے ۔ الغ خان اور ظفر خان ان کی سرکوبی کے لیے مقرر ہوئے ۔ حدود جالندھر میں لشکرِ اسلام کا ان سے مقابلہ ہوا اور مغل کثرت سے مارے گئے ، ان کے سر دہلی میں لائے گئے ۔ برنی کا یہ بیان بہت نامکمل ہے ۔

اس کے برخلاف امیر خسرو کا بیان زیادہ واضح اور مفصل ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب سے پہلی فتح ہے جو علاء الدین کی تیغ کو مغلوں پر ہوئی ۔ مغل سردار کا نام 'کدر' ہے ۔ ان کا بیان ہے کہ تاتار کوہ جودی کی طرف سے آ کر بیاہ اور جہلم و ستلدر کی طرف بڑھے ۔ کھوکھروں کے دیہات میں آگ لگا دی حتیٰ کہ قصور کو بھی نقصان پہنچا ۔ اس پر الغ خان مع تمام امرائے دست راست ان کے دفیعہ کے لیے تعین ہوئے ۔ روز پنجشنبہ ۲۲ ربیع الآخر ، ۶۹۷ھ کو حدود جارن منجور میں جنگ ہوئی ، جس میں بیس ہزار کے قریب مغل کام آئے ۔ (خزائن الفتوح ، صفحہ ۳۵ - ۳۷) ۔

دول رانی میں امیر پھر اسی مہم کا ذکر کرتے ہیں :

نخست اندر حد منجور جارن

الغ خان بر مغل زد همچو قارن (صفحہ ۱/۹۰)

اور ہمیں مترجم کے ساتھ اتفاق ہے کہ ضرورتِ شعری کی بنا پر یہاں اس نام میں تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے ۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ صحیح لفظ جالندھر ہے جو بگڑ کر جارن منجور ہوگیا ، درست نہیں ۔ امیر کے ہاں یہ لفظ چار جگہ آتا ہے ۔ تین مرتبہ اسی 'خزائن الفتوح' (صفحہ ۱۳/۳۵ ، صفحہ ۳/۳۶ ، اور

صفحہ ۱/۳۷) - اور ایک مرتبہ 'دول رانی' میں اور ہر جگہ جارن منجور ملتا ہے -
چونکہ قافیہ میں بھی جارن منجور آتا ہے اس لیے اس نام کی صحت کے متعلق رہا
سہا شک بھی جاتا رہتا ہے -

مترجم کو اعتراف ہے (حاشیہ صفحہ ۲٦) کہ 'طبقاتِ اکبری' میں یہ لفظ
بشکل 'قار میخور' ملتا ہے جو جارن منجور کی بگڑی ہوئی شکل ہے - اس کے باوجود
جارن منجور کو جالندھر کے ساتھ شناخت کرنا نہایت حیرت آفرین ہے - ہم تو یہ
بھی کہنے کے لیے تیار ہیں کہ برنی کے مطبوعہ متن میں ، کوئی تعجب نہیں ، اگر
کسی نے جارن منجور کا جالندھر بنا دیا ہو - برنی یوں تو بہت کم واقعات کی
تاریخ دیتا ہے لیکن وہ اس کی تاریخ ٦۹٦ھ دیتا ہے - ادھر امیر خسرو اس واقعے
کی تاریخ ۲۲ - ربیع الثانی ٦۹۷ھ بتاتے ہیں ، جس سے یہ سوال پیدا ہونے کی
گنجائش ہے کہ برنی کی بیان کردہ اور خسرو کی بیان کردہ مہمیں ایک نہیں ہیں
بلکہ مختلف ہیں - جارن منجور کی جنگ دریاے ستلج کے کنارے پر ہوتی ہے ،
جس کو علائی فوجیں تیراندازی کرتی ہوئی عبور کرتی ہیں - جالندھر ہرگز ہرگز
دریاے ستلج پر واقع نہیں ہے -

صفحہ ٥/۳٦ : ''و موج آن دوزخیان آتش در نی بست تلوارها کھوکھر
بزد -''

" . . . the advancing wave of the hellites burnt down all the villages (talwarah) of the Khokhars . . ." (23, 8)

اس جملے میں 'نی بست' قابلِ تشریح ہے - جس طرح کانٹوں کی باڑ 'خاربست'
اور پتھر کی 'سنگ بست' کہلاتی ہے ، سرپتّی کے جھونپڑے 'نی بست' کہلائے -

صفحہ ۸/۳۷ :

''گذشتند ازان آب بیلک زنان
بر آن گونہ کز بیل کشتی بر آب''

" . . . they swam over the river, striking out their hands like oars impelling a boat." (23, 24)

'بیلک' = تیر - یعنی تیر اندازی کرتے ہوئے اُنھوں نے دریاے ستلج کو
عبور کیا -

صفحہ ۱۶/۳۷ : ''در چشم زدنی بعضی را بزخم تیر دیدۂ سنگین چون جزع [از] الماس سفتہ شدہ بود ۔''

" . . . in the twinkling of an eye, they had sewn up the stony eye-balls of some Mughals as you might sew up the eyes of a hawk . . ." (24, 3)

'دیدۂ سنگین' = 'دیدۂ منحوس' نہ پتھر کی آنکھ ، جیسا کہ پروفیسر نے ترجمہ کیا ہے ۔ 'جزع' کو پروفیسر نے 'چرغ' پڑھ کر اس کا ترجمہ hawk کیا ہے ۔ یہاں صحیح لفظ 'جزع' بمعنی 'مہرۂ سلیمانی' ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی منحوس آنکھیں تیر کے زخم سے اسی طرح چھیدی گئیں جس طرح مہرۂ سلیمانی کو الماس سے چھید دیتے ہیں ۔

صفحہ ۳۸/۳ :

''بسینہ، کہ ز بس زنگ قفل او نکشاید
کشادن دل او جز بدین کلید نکشاید''

"When a breast, like a rusty lock, refuses to open, it should be opened in no other way then this." (24, 6)

مطلب یہ ہے کہ جس سینے کا قفل (دل) بوجہ ِ کثرت ِ زنگ نہیں کھل سکتا اس کے دل کی کشایش اس کنجی کے سوا نہیں ہوسکتی ۔

صفحہ ۴۰/۶ : ''ترغی سرا صلع خود را برسر نیزۂ شجاعان اسلام طاس پرچم میدید و یک دوبار از صدمت شمشیر غازیان بحیلہ جستہ بود اگرچہ دل آہنین درشت اما پیش سندان شکافان جہاد دل نتوانست نہاد ۔ سہم ایلک زنان غزا در دل گذرانید و ہم از عقب خلہ کرد ۔''

" . . . Targhi, who had once or twice fled away from the attacks of the victors, already saw his bold head on the spears of the champions of Islam, like a wine cup placed over a ladle. Although he had an iron heart, yet he dare not place it within the reach of the anvil-breaking warriors of God. *But he was at last shot by an arrow, which penetrated his heart and passed to the other side.*" (26, 5)

پروفیسر نے غالباً 'طاس پرچم' کا ترجمہ 'کفچہ پر جام شراب' کیا ہے جو بالکل غلط ہے ۔ لیکن میں اپنے ناظرین کی توجہ آخری عبارت کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں ۔ پروفیسر کا خیال ہے کہ ترغی ایک ایسے تیر سے ، جو اس کے دل کو چھیدتا ہوا پشت کے پار نکل گیا ہے ، مارا گیا ۔ 'مارا گیا' کا لفظ میرا اضافہ ہے کیونکہ جس شخص کا دل تیر سے چھد جائے اور تیر پشت کو توڑ کر نکل جائے ، اس کا مارا جانا یقینی ہے ۔

امیر خسرو کا بیان ہے کہ علی بیگ اور ترتاق اور ترغی ترکستان سے دریائے سندھ تک آئے ، آگے بڑھے اور جہلم بھی پار کر گئے ۔ ترغی ، جو ایک دو بار پہلے بھی غازیان اسلام کی تلوار کا مزا چکھ چکا تھا ، ان کے خوف سے واپس بھاگ گیا ۔ مگر علی بیگ اور ترتاق پچاس ہزار سواروں سے بڑھتے ہوئے چلے آئے ۔ ہمیں ان کی باقی سرگزشت سے تعلق نہیں ۔ 'دول رانی خضر خاں' میں امیر کا صاف بیان ہے کہ ترغی کفتار کے ہاتھ سے مارا گیا ۔ ع :

کشایندش زمانہ ہم ز کفتار

ترغی کا ذکر تاریخ ہند میں سب سے پہلے قتلغ خواجہ کی مہم میں آتا ہے ۔ اس مہم میں وہ قتلغ خواجہ کی فوج میں شامل ہے اور اپنے تمن کا افسر ہے اور ظفر خاں کو گھیر لینے میں حصہ لیتا ہے (صفحہ ۲٦۰ ، فیروز شاہی) ۔

اس کے بعد بارہ تمن لے کر ترغی آتا ہے اور حوالیٔ دہلی میں آ کر دم لیتا ہے ۔ کچھ عرصے تک دہلی کو گھیرا پڑا رہتا ہے ۔ علاء الدین فتح چتوڑ سے لوٹا ہی تھا ۔ اسے اپنی فوجیں طلب کرنے کا موقع نہیں ملا (صفحہ ۳۰۰ - ۳۰۱ ، فیروز شاہی) ۔

تیسری مرتبہ وہ علی بیگ اور ترتاق کے ساتھ آتا ہے لیکن دریائے جہلم ہی سے لوٹ جاتا ہے ۔ (صفحہ ۴۰ ، خزائن الفتوح)

اب میں اصل فقرے کو لیتا ہوں :

سہم = خوف ، بیلک زنان = تیر اندازان ، در دل گذرانیدن = در دل آوردن ، خلہ کردن = خالی کردن ، چھوڑنا ۔ تغلق نامہ :

چو ناصر گشت بی نصرت ز تقدیر
خلہ کرد از سنان و تیر چون تیر

(صفحہ ۱۴۵ ، شعر ۲۸۰۲)

مخزن اسرار :

خانۂ غولند بہ پرواز شان
در خلبِ دان عدم انداز شان

(صفحہ ۱۸ ، طبع مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۲۲ء)

اور فقرے کا مطلب ہے کہ تیر انداز مجاہدوں کا خوف اس کے دل میں آیا اور وہ پیچھے ہی سے اپنی جگہ خالی کر گیا ، یعنی واپس چل دیا ۔

صفحہ ۲۸/۱۳ : '' و علی بیگ و ترتاق کہ دو شہ شطرنج بودند از استخوان کلان ملک آخر بیگ بر سر ایشان حریفی درشت افتادہ بود ۔''

"Ali Beg and Tartaq, the two kings of the chessboard, were checkmated by their large boned enemy, the Malik Akhur Beg, . . ." (28, 2)

'استخوان' ایک ہتھیار کا نام ہے یعنی 'ارّۂ پشت نہنگ' مگر پروفیسر نے استخوان کلان ، کا ترجمہ 'بڑی ہڈی والا' کر دیا ہے ۔

صفحہ ۲۹/۱۱ : ''پادشاہ ابوالمظفر کہ فوایح اخلاق او نافۂ آہوست رغم الانف آن گندہ دماغان از بیضۂ معنبر اسلام بر جنود غالیۂ مصاف فرمان داد کہ اشہبان عنبر غبار را نورد راہ بر نہجی فرمایند کہ این آوازہ نشر نگردد ۔ نباید کہ تا بوی گندہ بروت از ہیبت صندلی آلودہ کند و سوی مشک بیدہای خراسان[1] فرار نماید ۔''

"[The victorious Emperor] whose virtues are fragrant like the naval of a musk-deer. In abhorence of those men with stinking brains, he ordered the Muslim army to proceed against them; but the news was to be kept a secret, least in fear of the approaching sandal, the horrid stench should fly back to the fragrant willows of Khurasan." (29, 13)

میں بعض فقروں کی یہاں درستی کرتا ہوں ۔

'رغم الانف آن گندہ دماغان' = ان سرکشوں کے برخلاف ۔ 'اشہبان عنبر

۱۔ اس عہد کی اصطلاح میں تمام ایران کو خراسان کہا جاتا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

غبار را نورد راه بر نہجی فرمایند' یعنی عنبر کے سے غبار والے گھوڑوں کو اس طریقے سے روانہ کریں ۔ 'نباید کہ تا بوی گندہ بروت از ہیبت صندلی آلودہ کند' = ایسا نہ ہو کہ گندہ بروت تابو[1] خوف سے اپنی کرسی میلی کر دے ۔

صفحہ ۲۵/۲ : ''تا بمقصد غزا بر طریق پلنگان در پی نخچیر بوی کنان در رسیدند ۔''

'' . . . till they had reached their stinking prey. . .'' (29, 22)

مطلب یوں چاہیے کہ چیتوں کی طرح شکار کی بو لیتے چلے ۔

صفحہ ۳۵/۱۴ : ''لشکر دیگر از آن اقبال مدبر و مدابیر تائی بو ۔''

''Another Mughal army under Iqbal Mudbir and Mudabir Tai Bw, . . .'' (p. 30, para. 2, l. 1)

مدبر اور مدابیر ، اقبال اور تائی بو کی صفت ہیں ۔ پروفیسر کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ ان ناموں کا حصہ ہیں ۔ مدابیر کی جگہ مدابر چاہیے ۔

صفحہ ۳۶/۷ :

''در کہ و غار ہمی رفت فرو پر شر و شور
ہمچو سیلی کہ نگونسار فتد در لر و لور''

'' . . . that goes over mountains and caverns with tumult and noise.'' [p. 30, 5 (bott.)]

پچھلے مصرعے کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے ۔

صفحہ ۳۶/۱۴ : ''در حال بہ فرمان سر لشکر چیرہ دست قوی بازوان غزا

۱۔ اس حملے میں تین مغل سردار متحد ہو کر آئے تھے : پہلا مذکور الصدر تابو جسے تیبو بھی کہتے ہیں ، دوسرا اقبال ، تیسرا کبک ۔ دول رانی خضر خان :

یکی تابو دگر اقبال مدبر
کبک سویم برزم و کین مدبّر

(صفحہ ۶۲/۱)

دست در مشت تیغ بردند ۔"

"So by the firman of the commanders of the army, bold and strong armed warriors took their swords in hand . . ." (31, 4)

'در حال' = فوراً ۔ 'چیرہ دست'، 'سر لشکر' (واحد) کی صفت ہے، نہ 'قوی بازوان، غزا ۔ کی 'دست در مشت تیغ بردن' = یعنی قبضۂ تیغ پر ہاتھ ڈالا ۔

صفحہ ۱۳/۴۸ : "و از آمیزش قرونہ و مغل در هر برجی قران زحل و مریخ معاینہ شد ۔"

"Owing to the mixture of the Mughal bodies with the material of the towers, the confluence of Mars and Saturn was witnessed, . . ." (32, 10)

قرونہ = ایک مخلوط النسل قوم جو ہندی ماں اور ترک باپ کی آمیزش سے وجود میں آئی ۔ خاندان تغلقیہ اسی قوم سے تعلق رکھتا تھا ۔ جملۂ بالا میں زحل سے مراد قرونہ اور مریخ سے مراد مغل ہیں ۔ مطلب ہے کہ قرونہ اور مغل کے اجتماع سے ہر برج میں زحل اور مریخ کا قران نظر آتا تھا ۔

صفحہ ۵۰/۲ ع :

"کنون گویم فتوح ہند و از گجرات گیرم سر"

"I now come to the conquest of the Hindus of Gujrat." (35, 4)

'ہند' کے بعد 'واو' عاطفہ ہے نہ جزو کلمہ جیسا کہ پروفیسر سمجھے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ میں اب (علاءالدین کی) فتوحات ہند ک ذکر کرتا ہوں اور فتح گجرات سے شروع کرتا ہوں ۔

صفحہ ۵۰/۹ :

"یعنی چهار شنبہ وز اولیٰ جاد بست
تاریخ سال ششصد و هشت و نود شده"

" . . . on Wednesday the 20th Jamadiul Awwal, 699 A.H. . ." (35, 7)

یہاں ۶۹۸ھ چاہیے، نہ ۶۹۹ھ جیسا کہ پروفیسر صاحب نے تحریر کیا ہے ۔

صفحہ ۱۱/۵۰ : ''درین تاریخ خجستہ [شاہ یم یمین] عارض والا را فرمان فرمود ۔''

" . . . he issued a firman to the ariz-i-Wala[2]. . ." (35, 8)

فرمان کا ترجمہ انگریزی میں موجود ہے اس لیے اصل فارسی لفظ کا ادخال مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ یہی حالت عارض کی ہے ۔ پروفیسر انگریزی میں بجسنہ 'عارض والا' لکھ رہے ہیں ۔ حالانکہ 'والا' صفت ہے 'عارض' کی ۔ میرا مطلب ہے کہ 'عارض' عہدے کا نام ہے نہ 'عارض والا' ۔ اس لفظ پر حسبِ ذیل حاشیہ دیا گیا ہے :

2. Minister of war. The office was then held by Hizhabrud-Din Tafar Khan. (p. 35)

'عارض' بخشی کو کہتے ہیں ، نہ وزیر جنگ کو ۔

صفحہ ۱۵/۵۱ :

''وان نقطہا دو نیمہ ہمی شد ز سہم راست
مانند دائرہ کہ شود از و تر دو نیم''

یہ شعر ترجمے سے چھوڑ دیا گیا ہے ۔

صفحہ ۵۲/۲ : ''و چون خیال بتخانہ سرنگو سار در دریا انداختند ۔''

" . . . as the temple lowered its head and jumped into the sea . . ." (35, 30)

مطلب تو یہ ہے کہ جس طرح بت خانے کا عکس پانی میں اوندھا نظر آتا ہے ، اسی طرح اسے دریا میں اوندھا گرا دیا گیا ۔

صفحہ ۵۲/۴ : ''شہر نہروالہ کہ دران دیار دریای دیگر است و شہر کنبایت کہ دریا بپاشستن آن سرفرازی می‌نماید ۔''

"As the city of Nahrwala and the city of Kambayat (Cambay), which the sea raises its head to swallow up . . ." (36, 19)

'نہروالہ' کو نہر کی رعایت سے دریا کے ساتھ مثال دی یعنی شہر نہروالہ کہ

اس ملک میں بمنزلہ دوسرے دریا کے ہے اور شہر کھمبایت کہ دریا اس کی پاشوئی کی عزت حاصل کرتا ہے ۔ اشارہ ہے سمندر کے جوار بھاٹے کی طرف ۔

صفحہ ۱۵/۵۵ : ”دلاوران بہرام صولت در چنان آتشی کہ شیر سپہر ازان رم خورد سمندر وار می رفتند و پایکان معلق زن ببانگ نی تیر بر آتش پای میکوفتند ۔“

"With the impetuosity of Bahram the brave warriors penetrated like salamanders through a fire hat scared away the lion of the sky (the sun). To the sound of pipes, the paiks footmen) from above made their arrows dance over the fire . . ." (39, last line)

’شیر سپہر‘ سے مراد برج اسد ہے ، نہ آفتاب ، جیسا کہ پروفیسر نے اپنے ترجمے میں دکھایا ہے ۔ دوسرے فقرے کے ترجمے میں پروفیسر کی عبارت سے یہ مطلب اخذ ہوتا ہے کہ بلندی سے پیادوں نے نے کی آواز پر اپنے تیروں کو آگ میں نچانا شروع کیا لیکن ہمارا خیال ہے کہ مصنّف کا یہ منشا ہے کہ قلابازیاں لگانے والے پیادوں نے تیر کی سنسناہٹ کی آواز پر آگ میں ناچنا شروع کیا ۔

صفحہ ۱۱/۵۷ : ”نزدیک بود کہ زہرۂ او بترقد ۔“

یہ فقرہ ترجمے میں چھوٹ گیا ہے ۔

صفحہ ۱۶/۵۷ : ”چون رای آنجا رسید مطربی بلبل نوا برابر او می آمد گلبانگی زد ۔“

"The melody of the bulbul accompanied the Rai as he advanced. The rose raised a cry." (41, 5)

اس عبارت میں پروفیسر کا ترجمہ بالکل غلط ہو گیا ہے ۔ یہ وہ موقع ہے جب رائے ہمیر دیو والیٔ رنتھنبور راجپوتی رسم جوہر کے مطابق اپنے اہل و عیال کو نذرِ آتش کر کے علاءالدین کی فوجوں کی طرف قتل ہونے کی نیت سے بڑھتا ہے ۔ چنانچہ امیر فرماتے ہیں : ’جب رائے وہاں پہنچا ، ایک شیریں آواز مغنی اس کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا ۔ اس نے ایک سریلی صدا نکالی ۔

امیر خسرو کے ایک بیان سے ، جو ’سلطان نامہ‘ میں ملتا ہے ، معلوم ہوتا ہے

کہ جنگ کے موقع پر راجاؤں کے ساتھ ان کے مغنی ہوا کرتے تھے ، جو ظاہر ہے کہ اپنی رجز خوانی سے ان کے حوصلے بڑھاتے ہوں گے :

"خطابات هندو که گویند بردش
همی گفت مدحت سراگرد گردش
معین برآورد نغمه سرایان
سرودی که گویند در جنگ رایان"

صفحہ ۱/۵۸ : "[کمین داران] شمشیر های سوسنی کشیده چون نسیم صبح از جای بجستند و حمله آوردند و سر گل آگین رای را که باد در سر داشت بر پرانیدند ۔"

"The watchmen drew their swords of lily, sprang up from their places like the morning breeze and put the Rai to flight as the winter wind annihilates the blooming cypress." (41, 6)

'باد در سر' = مغرور ، 'سر بر پرانیدن' = سر اڑا دینا ، سر کاٹ دینا ۔ نہ بھگا دینا جیسا کہ پروفیسر نے ترجمہ کیا ۔ امیر کا مقصد ہے کہ رائے کا سر ، جو بادِ غرور سے بھرا تھا ، اڑا دیا گیا ۔ اس کی تائید شعرِ آیندہ سے بھی ہوتی ہے جو ترجمے میں ترک کر دیا گیا ہے :

"آری چو کژی در سر بیدین باشد
بی دینان را سزای سر این باشد"

یعنی جب کسی بے دین کے سر میں کجی سما جائے ، ایسے بے دینوں کے سر کی یہی سزا ہے ، یعنی اڑا دینا چاہیے ۔

لفظ 'ہمیر' ہندوستان میں مسلمانوں کی یادگار ہے ۔ یہ لفظ سب سے پہلے مسکوکات پر نظر آتا ہے اور سری ہمیر (امیر) کی شکل میں ملتا ہے جو بخط سنسکرت 'امیر المؤمنین' کے واسطے لایا جاتا تھا ۔

تمام مسلمان تاریخیں متفق ہیں کہ ہمیر دیو ، فتح رنتھنبور کے وقت مارا گیا ۔ برنی کا بیان ہے :

"حصار رنتھنبور فتح کرد و رای همیر دیو را و نو مسلمانانی که از بلغاک

گجرات گریختہ بودند و در پنہ او خزیدہ ہمہ را بکشت ۔''

(صفحہ ۲۸۳ ، فیروز شاہی)

ہمیر دیو ، پرتھی راج کی طرح ہندوؤں میں ایک نہایت مقبول شخصیت ہے ۔ اس کی یادگار میں ایک سے زیادہ راسے لکھے گئے ہیں جو 'ہمیر راسا' اور 'ہمیر کاویہ' کہلاتے ہیں ۔ بلکہ فرشتہ کے بیانات اور فتحِ رنتھنبور کے متعلق ضروری تفصیل غالباً 'ہمیر راسا' سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں ۔

صفحہ ۶۲/۹ : ''و چشم حزم و تیقظ بپاس کاری کہ از پیش تخت سلیمانی بدان مامور بود ، باز کشاد ۔''

" . . . and opened wide his joyous eyes to accomplish the task entrusted to him by the emperor." (p. 45, para. 2, l. 1)

'حزم' = احتیاط ۔ پروفیسر نے اس کو 'خرم' پڑھ کر اس کا ترجمہ شادان کر دیا ہے ۔ 'تیقظ' = بیداری ۔

صفحہ ۶۸/۱۰ : چون باد قہر خدایگانی جملگی مقدمان بیخ فرو بردۂ آن زمین رابی بدو رنگی مستاصل گردانید ۔''

"After the wind of Imperial wrath had uprooted all the muqaddams,[2] he rid the land of its two colours, . . ." (49, 14)

'مقدمان بیخ فرو بردۂ آن زمین' یعنی اس علاقے کے قدیمی سربرآوردہ اور ذی رسوخ اشخاص ۔ 'بیدرنگ' = بلا تامل ۔ اصل کتاب میں 'بی بدورنگی' غلط ہے 'بیدرنگی' چاہیے ۔

صفحہ ۶۹/۵ :

''عنان دولتش بگرفت فیروزی کہ فرماید
چرای سبز خنگان رکاب از سبزۂ سیری''

" . . . we took hold of his successful bridle and brought his stirrups from the green meadows (of Khizrabad) to Siri."
[49, 4 (bott.)]

ہمارے نزدیک اس شعر کا مطلب ہے کہ فیروزی نے اس کی عنانِ اقبال پکڑی تاکہ سیری کے سبزے کو اس کی رکاب کے سبز خنگوں کی چراخوار بنا دے ۔

لیکن پروفیسر اس کے معنی یوں بیان کرتے ہیں :

اس نے اپنی کامیاب باگ پر قبضہ کیا اور اپنی رکاب کو (خضر آباد کے) سبز مرغزار سے سیری کی طرف لایا ۔

صفحہ ۱۳/۷۰ : ''سواران را فرمان داد تا عنان غزا براکب دادند و تیزی شمشیر را کہ خنک سوسنی است براخوک گردن گبران سیراب خون گردانیدند ، چنانکہ با چندان سیلاب تند گرد ازیشان برآوردند و تفرقہ عظیم دران جمع اشتات راه یافت ۔''

> " . . . the (Imperial) horsemen were ordered to lead their horses to charge and to moisten their swords, which were cold as lilies, with blood from the necks of the gabrs.
> The rebel army fled and its scattered ranks were torn by further differences." (51, 15)

اس ترجمے کو تحت اللفظی تو نہیں کہا جا سکتا ۔ 'خنک' کی جگہ 'خنگ' درست ہے ۔ اسی طرح 'اخوک' کی جگہ خوک بمعنی خنازیر صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

صفحہ ۷۳/۳ : [شک نیست کہ] رای را [آئینہ] بخت در پیشانی بود کہ تیغ [هندی] بادشاه جوشن عصمت او گشت و در شرفنامۂ سکندری نیز [ازین] حال روشن باز نموده ۔

نظم

کید هندو را چو بخت کینہ ور بی کینہ گشت
تیغ اسکندر بہ پیش روی او آئینہ گشت''

> "The Rai was indeed fortunate when the Hindi sword of the Emperor became a breast-plate for the protection of his honour. An order (sharf-nama) of Alexander also made this clear. When avenging fate ceased to hate the rebellion of the Hindu, the sword of the Alexander turned into a mirror before his eyes." [p. 52, (last line)]

اوپر کی سطریں رائے رام دیو والیٔ دیوگیر (دولت آباد) کے متعلق ہیں جو بغاوت کرتا ہے اور علائی فوجیں اسے گرفتار کر کے دہلی لے آتی ہیں ۔ علاء الدین خلافِ امید اس کے ساتھ نہایت عزت سے پیش آتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد دیوگیر بھیج دیتا ہے ۔ پروفیسر صاحب 'شرف نامہ' کی تلمیح نہیں سمجھے ، انھوں نے اس کے معنی شاہی فرمان دیے ہیں جو صحیح نہیں ۔ امیر کا مطلب نظامی گنجوی کے 'سکندر نامہ' سے ہے ۔ 'سکندر نامہ' کے دو حصے ہیں : پہلا شرف نامہ یعنی سکندر نامۂ بری ، دوسرا اقبال نامہ ، سکندر نامۂ بحری ۔ 'سکندر نامہ' میں کید ہندی کی داستان آتی ہے جو سکندر کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر لیتا ہے اور جنگ کی نوبت نہیں آتی ۔ سکندر نامہ :

دل کید هندو پر از نور یافت
ز کیدیکه هندو کند دور یافت

خسرو اس واقعے کو موجودہ واقعے کے ساتھ تطابق دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح یہ حال 'شرفنامۂ سکندری' میں مرقوم ہے نظم : جب کید ہندی کے کینہ ساز نصیبے نے اپنا کینہ ترک کر دیا ، سکندر کی تلوار اس کے (کید ہندی) چہرے کا آئینہ بن گئی ۔ پروفیسر صاحب پہلے مصرع کا ترجمہ کرتے ہیں : 'جب بدلہ لینے والی قسمت نے ہندو کی بغاوت سے نفرت کرنا ترک کر دیا' جو قطعی غلط ہے ۔

صفحہ ۷۳/۸ : "یعنی کہ سیزدہ ز محرم چہار شنبہ سال از عدد بہ هفصده و هشت آمدہ ز هجرت ۔"

"... on Wednesday, the 11th Muharram, 710 A. H. ..."
(53, 20)

مترجم نے ۱۱ محرم ۷۱۰ھ لکھا ہے حالانکہ متن میں ، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں ، ۱۳ محرم ۷۰۸ھ درج ہے ۔ یہ مہم سوانہ کی تاریخ ہے ۔ ہمیں معلوم نہیں کہ پروفیسر نے اصل سے ترجمے میں کیوں اختلاف کیا ۔ امیر خسرو اپنی تاریخیں صوری اور معنوی دونوں طریقوں سے دیتے ہیں ۔ چنانچہ یہاں کہتے ہیں :

"در سالی کہ شیر تہی شکم روباہ را چنان گرفتہ بود کہ آہ بیرون میداد و چون روزی در آمد کہ پای صید گرفتار آید و در شہار آن ماہ آھو بمیانہ"

دام بر بستہ شود ۔'' (صفحہ ۷۳/۵)

[شیر بہ تفریق شکم یعنی صرف وسط ، ی] = شر = ۵۰۰ + (روباہ بہ تفریق آہ = روب) = ۲۰۸ = ۷۰۸ھ اور (بای صید = د = ۴) یعنے چہار شنبہ اور آہو = ۱۲ + (میانہ دام = ۱) = ۱۳ ماہ محرم ۔

صفحہ ۷۵/۱۳ : بر تخت شیر پایہ کہ چشم شیرانش از عین الہرّہ ساختہ بودند نشستہ بود ۔''

> " . . . sat on a throne with lion's feet with tiger's eyes engraved over it."

عین الہرّ (بلی کی آنکھ) ، لہسنیا ۔ امیر کا مطلب ہے کہ بادشاہ شیرپایہ تخت پر بیٹھا ، شیروں کی آنکھیں عین الہرّ (لہسنیا) کی بنی تھیں ۔

صفحہ ۷۶/۸ : اگرچہ سرہای ایشان از زخم شمشیر چون فرق گوزن شاخ شاخ می شد یوزی نمی‌کردند و آنکہ در بند یوزی می بود او را آہو می‌گرفتند ۔ بعضی از زخم بیلک شکاری در خواب خرگوش می شدند و بعضی زیر سنگ مغربی کہ زاولہ زوال است ، آرد می گشتند ۔''

> " . . . they did not to fly though their heads were cut into pieces. Those who attempted to fly were closed and caught. Some were sent to sleep like hares with strokes of the hunter's spear ; others were ground down to flour under the maghrabi stone." (54, 15)

اب یہ ترجمہ تحت اللفظی نہیں کہا جا سکتا ۔ اس کے مشکل مشکل ٹکڑے حذف کر دیے گئے ہیں ۔ 'چون فرق گوزن شاخ در شاخ می شد ۔' بارہ سنگے کے سر کی طرح سینگ میں سے سینگ نکل رہے تھے ۔ 'آہو میگرفتند' ۔ نکتہ چینی کرتے اور 'زاولہ زوال' = زوال کی بیڑی ۔ 'بیلک' ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں کے متعلق پروفیسر صاحب مطمئن نہیں ۔ وہ اس کا ترجمہ کبھی کچھ کر دیتے ہیں کبھی کچھ ۔ یہاں نیزہ کر دیا گیا ہے ، حالانکہ 'تیر' صحیح ہے ۔

صفحہ ۷۷/۱۴ : درین تاریخ سنتل دیو وحشی را کشتہ پیش شیران دہلبز اعلیٰ آوردند بشکوہ گرگی گراز . . . [پوست] سختش از زخم تیر انگشتوانہ [شدہ

خلقی از درشتی آن هیکل و بوست برسان] انگشت در دهان بماندند ۔"

"On the morning on Tuesday, the 23rd Rabiul Awwal, the dead body of Satal Deo was brought before the lions of the Imperial threshold. People were struck with wonder at the grandeur of the Gurg (wolf) and the terrific strength of his arrow-shot." [54, 5 (bott.)]

'بشکوہ گرگی گراز' کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ گراز شان و شکوہ میں بھیڑیے سے کم نہیں تھا اور دوسرے فقرے کا مطلب ہے کہ تیر کے زخموں سے اس کی موٹی کھال انگشتوانہ بن گئی تھی - آخری فقرے کا مطلب ہے کہ لوگ اس کے جسم اور کھال کی سختی دیکھ کر حیران رہ گئے ۔

صفحہ ۲/۸۱ : "و از ہر درزی صد ہزار جوال دوز خار سر بر زدہ چنانکہ تیزیان مقراض گوش را در بریدن آن خار خار موی براندام سوزن می شد ۔"

"Every mound had a hundred thousand pointed thorns to its head; the very idea of cutting such rocks and thorns made the hair of the pair of scissors stand upon its body like thorns." (57, 10)

'جوال دوز'=سوزنِ کلان یعنی 'سوا :

آن بخیہ کہ می شود بسوزن
نتوان بجوال دوز کردن

'تیزی' = تازی اسپ ۔ 'مقراض گوش' = قینچی کی سی کنوتیوں والے ۔ خار خار = دغدغہ و خدشہ و تشویش ۔ 'موی براندام سوزن می شد' یعنی جسم کے بال سوئیوں کی طرح کھڑے ہو جاتے تھے ۔ پروفیسر نے 'درز' کا ترجمہ 'پشتہ' غلط کیا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قینچی سے ان چٹانوں کو کاٹا جائے گا ۔ بھلا یہ بھی کوئی گزی لٹھا ہیں ۔ 'مقراض گوش' صفت ہے گھوڑوں کی یعنی قینچی کی سی کنوتیوں والے ۔ 'بریدن' کا ترجمہ کاٹنا مناسب نہیں بلکہ طے کرنا ۔ چٹان خدا جانے پروفیسر نے کس لفظ کا ترجمہ کیا ہے ۔ کوئی تعجب نہیں اگر انھوں نے 'خار خار' کو 'خار و خارا' پڑھا ہو ۔ مگر 'خار خار' ایک ایسا لفظ ہے جس کا

ترجمہ محترم پروفیسر بالعموم کاٹنا کیا کرتے ہیں ۔ حالانکہ خاریدن کا حاصل مصدر ہے ۔

صفحہ ۵/۸۱ : در عرصۂ شش روز کہ کوچ بود پنج آب روان چون جون و چنبل و کنواری و بناس و بھوجی در پایاب بگذشتند ۔''

"After six days of marching, the army crossed five rivers, Jun, Chambal, Kunwari, Banas, Bhoji[2]—at the fords . . ." (57, 15)

اور بناس پر حاشیۂ ذیل ایلیٹ سے نقل کیا ہے :

2. Binas may be read as Bambas. The Kunwari is the Kuhari of the maps, and the Niyas (Binas) and Bashuji (Bhoji) must be the rivers now known as the Sind and Betwa.

بھلا ساٹھ ستر سال قبل کا پرانا حاشیہ آج کیا کام دے سکتا ہے ۔ یہ لفظ نہ بناس بکسر اول ہے نہ بمباس ہے نہ نیاس ہے ۔ اس کا صحیح تلفظ بناس بفتح با ہے جو راجپوتانہ کا ایک مشہور دریا اور چنبل کا معاون ہے اور راجپوتانہ کے ہر اچھے نقشے میں دکھایا گیا ہے ۔ راج محل ، ٹونک ، منڈور اور ایسردہ اسی کے کنارے پر آباد ہیں ۔ ٹونک کے مشہور خربوزے اسی ندی میں پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ ندی علاقہ اودے پور سے نکلتی ہے ۔ تین ریلیں اس کو بذریعہ پل عبور کرتی ہیں ۔ پہلی راجپوتانہ مالوہ ریلوے ہمیر گڑھ کے قریب ، دوسری جے پور ریلوے ایسردہ کے پاس ، تیسری ناگدا متھرا لائن ملارنے کے قریب ۔ اس کے عنقریب بعد وہ چنبل میں ملحق ہو جاتی ہے ۔

صفحہ ۴/۸۲ :

ہم در کف پای سنگ شد پوست
ہم از سر سنگ پوست شد باز

" . . . on one side the stones pierced into the soles of their feet, while on the other, their feet removed the skin from the skull of the stones." [57, 2 (bott.)]

ہمارے نزدیک پوست مبتدا ہے ، نہ سنگ یعنی پاؤں کی ہتھیلی پتھروں پر کثرت

کے ساتھ چلنے سے پتھر کی طرح سخت ہوگئی ۔ ادھر پتھر کی سطح چلنے والوں کی کثرت سے گھٹ گھٹا کر ہموار نکل آئی ۔

صفحہ ۸۲/۷ : ''تا بعد سیزده روز در غرۂ ماه رجب بمنزل کھاندار رسیدند در چنان بیابانی شہر خدای باستقبال لشکر اسلام درآمد و صالحان را مشاهده سہ ماھہ مہر بمہر با برکت بسیار پیش آورد ۔''

> "After thirteen days, on the first of Rajab, the army arrived at Khanda. In such a wilderness the month of God came forward to welcome the Muslim army, and showed great kindness to the pious men, who had travelled under the hot sun for three months." (58, 1)

مطبوعہ نسخے میں 'کھاندار'، پنجاب یونیورسٹی کے نسخے میں 'کھندھار' ہے ۔ معلوم نہیں مترجم نے 'کھندا' کس سند پر لکھا جس کو فاضل دیباچہ نگار ڈاکٹر کرشنا سوامی اے ینگر نے کھنڈوے کے ساتھ شناخت کیا ہے ۔

محترم پروفیسر کہتے ہیں کہ یہ نیک لوگ تین مہینے سے گرم آفتاب میں سفر کر رہے تھے لیکن اس وقت تک تین مہینے کیسے ہو سکتے ہیں ۔ یہ تلنگانہ کی مہم کا ذکر ہے جو ۲۵ جمادی الاول ۷۰۹ھ کو روانہ ہوتی ہے ۔ نو دن کے کوچ کے بعد لشکر مسعود پور پہنچتا ہے ۔ دو دن پڑاؤ کر کے ۶ ۔ جمادی الثانی کو کوچ ہوا ۔ چھ دن کے مسلسل کوچ کے بعد سلطان پور عرف ایرج پور مقام رہا ۔ چار دن کے پڑاؤ کے بعد ۱۹ ۔ جمادی الثانی کو پھر کوچ ہوا [یاد رہے کہ اس تفصیل میں چار دن کا فرق رہتا ہے] اور تیرہ دن کے متواتر سفر کے بعد رجب کی پہلی کو کھاندار مقام کیا ۔ اس حساب سے لشکر کو ۲۵ ۔ جمادی الاول سے لے کر غرۂ ماہ رجب تک صرف ایک مہینہ اور سات دن ہوئے نہ تین مہینے ۔

پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطے میں 'مشاہدہ' کی جگہ 'مشاہرہ' ہے ، جس سے اس جملے کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ شہر خدا دیگر برکات کے علاوہ فوج کے لیے تین تین ماہ کی تنخواہ بھی لایا یعنی یہاں انہیں تین تین ماہ کی تنخواہ دے دی گئی ۔ 'مہر' اس جملے میں بمعنی سکّہ ہے نہ بمعنی آفتاب ، جیسا کہ پروفیسر نے ترجمہ کیا ہے ۔

صفحہ ۸۳/۴ : ”چون روزہ داران استفتاح از شربت افطار روزۂ مریم را آب روی افطار دادند بامداد آن شب لشکر دریاوش در جنبش آمد و مانند سیلاب تند در لرولور [و شیب و فراز] سیر می نمود ۔“

اس عبارت کا اکثر حصہ حذف کر کے حسب ذیل اختصار پر قناعت کی ہے :

"Next morning, after the fast of Mary, the army again advanced like a raging deluge." (p. 58, para. 2, l. 10)

'لرولور' مثلِ سابق یہاں بھی ترجمے سے ترک کر دیے گئے ۔

صفحہ ۸۳/۱۱ : ”جائی کہ چنین آبہای بلند آهن نعال مراکب را برای بریدن راہ آب میداد ۔“

"When these wide rivers make a way for the Imperial army to cross . . ." [58, 8 (bott.)]

حالانکہ جملے کا مطلب ہے کہ جہاں ایسے ایسے بڑے دریا قطع راہ کے لیے گھوڑوں کی نعلوں کو آب (آبداری) دے رہے تھے ۔

صفحہ ۸۴/۱۰ : ”روز سہ شنبہ ، کہ ناف هفتہ است ، ناف زمین از جنبش لشکر در جنبیدن آمد ، و زمین چون شکم خفخنہ [خفقہ ؟] زدگان فرو بالا شدن گرفت ۔“

"On Wednesday, the 26th Rajab, the movement of the army again shook the bowels of the earth, and the ground began to rise up and go down like the belly of a Khafkhana-blower." (59, 5)

'سہ شنبہ' فارسی میں منگل کو کہتے ہیں ، نہ بدھ کو جیسا کہ ترجمے میں لایا گیا ہے ۔ 'خفخنہ' جیسا کہ متن میں ہے یا 'خفخانہ' جیسا کہ ترجمے میں ہے ، معمولی فرہنگوں میں نہیں ملتا ۔ البتہ خفقہ بمعنی درہ و جابک ملتا ہے جو ہمارے نزدیک زیادہ مناسب ہے ۔

صفحہ ۸۵/۱ :

رهی چو حیلۂ رای رکیک شیب و فراز
کرو مہاش چو حرصِ بخیل دور و دراز

" . . . for the road went up and down like the sublte wit of a clever cheat and was at the same time as long as the miser's greed." (59, 13)

'رای رکیک' = رای ناقص ۔ 'کرو مهاش' کی جگہ کروہ هاش (کوس) چاہیے ۔ ہندوستان میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض علاقوں میں چھوٹے کوس ہوتے ہیں اور بعض علاقوں میں بڑے ۔

صفحہ ۸۵/۶ : "ہر جانب راهی از ابریشم موسیقی ، باریک تر و ہر جا عرصہ' از گیسوی چنگ پیچان ، تاریک تر ۔ ہر دراز نای چنان تنگ کہ اگر باد در او آهنگ کند خراشیدہ بیرون گذرد ۔"

"The path was narrower than the guitar string and darker than a beauty's locks. At times it was like a hole in a reed; when the wind attempted to pass through it, it came out reverberating." (59, 16)

امیر کا مطلب گیسوے محبوب نہیں ہے ، بلکہ گیسوے چنگ ۔ 'نای' سے مقصد 'نے' نہیں ، درہ اور گھاٹی ہے ۔ 'خراشیدہ' = زخمی ، یعنی ہوا زخمی ہوکر نکلی ۔

صفحہ ۸۶/۲ : "درین اثنا ابرسیہ روی ، در مزلّات خلایق گوهر ناتمام خویش پیدا میکرد ۔ لاجرم باد بقفاء سختش میراند و آبش ریختہ می شد و ہر بار کہ برق متہتک بر لعزش روندگان می خندید ۔"

"Furthermore, as the dark-faced cloud brought forth its unfinished pearls to worry the people of the army, the wind struck it hard on the neck, and all its water was shed. Whenever the forked lightening laughed at the slipping feet of the army." [59, 8. (bott.)]

'مزلّات' کے معنی ستانا اور پریشان کرنا درست نہیں ۔ یہاں مقصد لغزش اور پھسلنا ہے ۔ 'گوہر ناتمام' کا ترجمہ ناتمام موتی بالکل بے محل ، فطرتِ ناقص اور کجی' طبع چاہیے ۔ 'آبش ریختہ می شد' یعنی اس کی آبرو ریزی کی جاتی تھی ، نہ کہ

پانی برسنا ، اگرچہ مقصود فی الاصل یہی ہے ۔ 'متہتّک' توہین اور ہتک کرنے والا نہ برق شاخسانہ ۔

صفحہ ۸/۸۸ : "روی آن خانہ سوختگان چون دیوار آتش رسیدہ ، سیہ گشت ۔"

". . . their faces grew dark at the approach of this wall of fire." (p. 61, l. 1)

دیوار آتش رسیدہ = وہ دیوار جسے آگ لگی ہو ۔

صفحہ ۱۲/۸۸ : "غازیان ہر یک از تنہائی سنگین و دلہای آهنین چقاق [گشتند] ۔"

"The bodies of the victors were like flint in armours of steel ;" (61, 6)

مگر مصنّف کا مطلب تو یہ ہے کہ مجاہدین اپنے پتھر کے سے جسم اور فولاد کے سے دل کے اعتبار سے چقاق کا حکم رکھتے تھے ۔

صفحہ ۱۳/۹۰ :

کہ بینند ازانجا و جای روند
کہ مردم چو مردم گیا بدروند

یہ شعر ترجمے سے چھوٹ گیا ہے ۔

صفحہ ۷/۹۳ : "و پاس آن محل بہ اهل تیقظ حوالہ [میکرد] ۔"

یہ فقرہ ترجمے سے چھوٹ گیا ہے ۔

صفحہ ۱۳/۹۳ : "در زمان تبرهای بو سلمی برای نصر اسلام [سیّار] شد و لشکریان هر یکی اسحق کندہ شکن گشت ۔"

"Immediately all hatchets became busy and every soldier was transformed into Ishaq, the wood cutter." (63, 3, 3)

'تبر بوسلمی' اور 'اسحق کندہ شکن' پر حاشیہ دینا چاہیے ۔ 'بتر' بہتر قرأت ہے ۔

صفحہ ۲/۹۵ : "نهنگان محیط لشکر خود در کمین آن ماهیان درع پوش بودند

حالی کہ دریافتند ، بزخم بیلک آبدار ہر یکی را دام ماہی ساختند ۔''

''As a matter of fact, the crocodiles of the besieging army, who had themselves been waiting in an ambush for this armoured fish caught the latter with their Hindi swords like fish in a net.'' (65, 15)

اس فقرے میں 'محیط' بمعنی دریا ہے ، نہ بمعنی 'محاصر' ۔ 'حالی کہ دریافتند' ترجمے سے حذف کر دیا گیا ہے ۔ 'بیلک' کے معنی تیر ہیں نہ تلوار ۔ 'ہر یکی را دام ماہی ساختند' کا یہ مطلب نہیں کہ ہر ایک کو جال کی مچھلی بنا دیا بلکہ بالکل بر عکس یعنے مچھلی کا جال ۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا جسم تیروں سے اس قدر چھلنی ہو گیا تھا کہ گویا مچھلی کا جال بن گیا تھا ۔

صفحہ ۳/۹۵ : ''برگستوانیان باخہ وار از زخم گزر و عمود سر در سینہ میدر دیدند ۔''

''From fear of the enemy's maces and clubs, the Hindus draw their head into their armours like tortoise.'' (64, 18)

برگستوانیان (برگستوان پوش) یہاں فاعل ہے ، نہ مظروف ۔ سر سینے میں چھپایا جا رہا ہے ، نہ برگستوان (پاکھر) میں ۔

صفحہ ۵/۹۵ : ''در یک دم آن ہمہ مردم آبی میان سیل خون غرق گشتہ بودند و مانند ماہیان بسمل کردۂ خدای افتادہ ۔''

''In an instant many many of these aquatic creatures had been drowned in a deluge of their own blood and lay like slaughtered fish.'' (64, 21)

'مردم آبی' = مردم منکر و سرکش ، نہ پانی کا جانور جیسا کہ پروفیسر لکھتے ہیں ۔ 'بسمل کردۂ خدای' خدا کی حلال کردہ یعنی قدرتی حلال شدہ ، نہ ذبح شدہ ۔

صفحہ ۸/۹۷ :

تا بزخم گوی سنگین آنچنان میدان [کنند]
قلعہ را کانجا ببازی گوی بتوان باختن

" . . . so that with the strokes of the balls the fort may be won and reduced to dust in another match." [65, 9 (bott.)]

حضرت مصنف کا مطلب ہے کہ قلعے کو پتھر کے گولوں سے ایسا ہموار میدان بنا دیا جائے کہ وہاں گیند (چوگان بازی) کھیلی جا سکے ۔ جناب مترجم فرماتے ہیں کہ گولوں کی ضرب سے ایک اور میچ میں قلعے کو فتح کیا جا سکے اور خاک کی برابر کر دیا جائے ۔

صفحہ ۹۸/۳ : "خندق حصار کہ پیش لشکر اسلام بکاو کاو درونی عمق خویش عرض میکرد هرچند درو ژرف می دیدند و تعمق می نمودند ۔ هجوم چندان سپاه را سوی خویش راه نمی داد و دو لب جهان در جهان باز کشاده از حفظ حصار سخن میگفت ۔"

" . . . the fort ditch began to talk of its great depth to the Muslim army. Though the latter looked sternly at it and took measures of its depth, it would not allow the army to cross; and opening wide its two lips, spoke of the security of the fort." (66, 3)

'کاوکاو' بمعنی کدو کاوش و کوشش و جہد ہے جو ترجمے سے ترک کر دیا گیا ہے ۔ اس سے قبل بھی یہ لفظ حذف کر دیا گیا ہے ۔ 'ژرف دیدن' کے معنی غور سے دیکھنا ہیں ، نہ سختی سے دیکھنا ۔ 'جہان در جہان' سے کثرت مقصود ہے ۔

صفحہ ۱۰۱/۲ : "و نیت خیّبر پادشاہ خیّبر را در حضرت ملک [خبیر] کہ خیر ازو [یابی] است برای قلع آن خیبر شفیع برد ۔"

"He begged the 'King of Khaibar'[2] to plead before God, from whom all good originates, for the reduction of the fort." (67, 10)

اور 'شاہ خیبر' پر یہ حاشیہ دیا گیا ہے :

2. The fourth Caliph, Hazrat Ali, who conquered the fort of Khaibar in Arabia.

'ملک خیر' کی جگہ 'ملک خبیر' مراد 'خدای دانا' چاہیے ۔ 'کہ خیر ازو بابی است' جملۂ حشویہ ہے جو نیت خیر سے تعلق رکھتا ہے اور معنی یہ ہوئے:

اور مختیر بادشاہ (مراد علاء الدین) کی نیک نیت کو ، کہ کرم جس کا ایک باب ہے ، خدائے دانا کی درگاہ میں اس خیبر (قلعہ) کی فتح کے لیے شفیع بنایا ۔

صفحہ ۱۰۱/۷ : "در زمان ملک مجاھد نورالصوم 'جنتہ من النّار [را] سپر عصمت نفس ساختہ و الف و نون و انصرنا علی القوم الکٰفرین را تیر و کمان غزا پرداختہ و کمند حبل اللہ را بردوش توکل حائل انداختہ آھنگ حصار کرد ۔"

تقریباً تمام عبارت حذف ہوکر ترجمۂ ذیل پر قناعت کی گئی ہے :

" . . . Mailk Naib ordered his men to begin the attack . . ."
(p. 67, para. 2, l. 2)

صفحہ ۱۰۱/۱۴ : "دلاوران ترکش بند چون شیران نیستانی بر دیوار حصن جستن گرفتند ۔ تیر چون باران نیسانی می [بارید] و صدفهای سینۂ هندوان می شگافت و گوهر های پیکان در وی می نهاد ۔"

"Bold men with scaling ropes began to jump up to the fort wall like lion in the forest. The arrows fell thick like showers of the rainy season and pierced the breast of the Hindus even as rain drops get into the mothers-of-pearl."
(p. 67, para. 2, l. 8)

ترکش = تیردان ۔ ترکش بند (ترکش باندھنے والے) کا ترجمہ چڑھنے کی رسیاں کسی حالت میں روا نہیں ۔ آخری فقرے کا ترجمہ بھی غلط ہو گیا ہے ۔ سینے کو صدف سے اور تیر کو موتی سے تشبیہ دی ہے ۔ مینہ کی بوندیں مراد نہیں ۔

صفحہ ۱۰۲/۵ : "و تیر قادر شستان با آنکہ یک انداز بود هوا را پوشیده می رفت کہ ابر بهمنم ۔"

" . . . their arrows all flying together, looked like the cloud of Bahman." [67, 3 (fr. bott.)]

'قادر شست' = حکم انداز ۔ 'یک انداز' = تیر حکمی و تیر رسا ۔ سلطان نامہ :

یکی بر صدا- شست را ساز کرده
یک انداز خود را صد انداز کرده

مطلب یہ ہے کہ قادر اندازوں کے حکمی تیروں نے ہوا کو بالکل ڈھانک لیا تھا ، گویا ابر بہمن تھے ۔

صفحہ ۱۰۲/۷ : ''و بعضی تیغ را در گل معول ساختہ ، پنداری حرفی لطیف [را] بزخم زبان در طینتی منجمد در می نشانند ۔''

> "Some had thrust their sword-points into the solidified earth as if determined to carve fine figures out of it." (68, 2)

مشغول بمعنی 'کاشتہ' ہے ۔

صفحہ ۱۰۳/۳ : ''و از غرینش طبل حربی چہار گرہ عنصر نزدیک شد کہ طویلہ ربط بگسلند و بانگ تکبیر غازیان 'ہزاہز' در ملکوت افگند و نعرۂ حیدری مبارزان 'خزاخز' در ناسوت آورد ۔''

> " . . . and it seemed that the four elements of the sphere would dissolve into Chaos at its noise. The war cries of the warriors, the sounds of Huzza ! Huz !, and Khuzza ! Khuz ! resounded through the world." 1 [68, 2 (bott.)]

ایلیٹ کے حوالے سے ایک حاشیہ حسب ذیل دیا ہے :

> "An early eastern use of Huzza ! Huzza ! The same exclamations occur in the Miftahul Futuh."[1]

'چہار گرہ عنصر' = اربع عناصر کی گرہیں ۔ 'طویلہ' ربط' = تعلق کی رسّی ۔ میں اس ''ہـّزاہـُز' اور ''خـّزاخـُز' اور ان پر حاشیے سے کچھ نہیں سمجھا ۔ 'قدیم استعمال' سے خدا جانے ان بزرگوں کا کیا مطلب ہے ؟ 'ہزاہز' بفتح ہاے اول و بکسر و فتح ہاے دوم ، ایک معمولی لفظ ہے جس کے معنے ہلچل اور تہلکہ ہیں اور خزیدن (گھسنا) سے 'خزاخز' حاصل مصدر آتا ہے ۔ ان الفاظ کا استعمال 'شاہنامہ' میں کثرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے ۔ 'ملکوت اور ناسوت' ترجمے سے حذف کر دیے گئے ہیں ۔

صفحہ ۱۰۳/۷ : ''و آن ہمہ خسان ممسک را در بذل جان کثیر الرماد

گردانید ـ"

" . . . the fire turned these stingy people into enormous heaps of ashes." (69, 5)

کثیر الرماد=بہت راکھ والا ، یعنی سخی اور مہمان نواز۔ 'در بذل جان' ترجمے سے رہ گیا ہے۔

صفحہ ۱۰۴/۱۳ : "چون ایام آن در رسید کہ بیض درمیان رمضان امضا یابد روز چہار شنبہ کہ روز تیر است حشم سہمناک سلطانی بہ فیروزی و بہروزی درون حصار گلین چون سہم دلاوران کہ در طینت غران بخرابی بنیت درآید ، در آمد ـ"

"By Wednesday, a day dedicated to mercury (archer), the Emperor's fierce troops had as easily entered the mud fort as a warrior's arrow breaks through and upsets a bubble." (p. 69, para. 2, l. 1)

شروع کی عبارت 'چون ایام آن در رسید کہ بیض درمیان رمضان امضا یابد' کو ترجمے سے نکال دیا گیا ہے۔

اسی طرح آخری حصے کا ترجمہ غلط ہوگیا ہے ۔ امیر کا مقصد ہے کہ جس طرح بہادروں کا تیر نامردوں کی بنیاد وجود برباد کر دیتا ہے۔ پروفیسر کہتے ہیں 'جس طرح بہادروں کا تیر بلبلے (حباب) کے پار ہو کر اسے بگاڑ دیتا ہے'۔ یہ تو ہجو ملیح ہوگئی۔

صفحہ ۱۰۴/۱۵ : "آن خیبر درونی را کہ درست نقش خیبر داشت گرد [گرفتند تا] ہیچ ہندوی از رسن غازیان ، چون سگ از [چنبر] بیرون نجہد ـ"

"The inner fort, which resembled the (Arabian) Khaibar, was invested. No Hindu was allowed to cross the line of besiegers just as dogs had not been allowed to come out of Khaibar (by Mussalman)." (p. 69, para. 2, l. 3)

مطلب یہ ہے کہ قلعہ ہے کو ، جو بالکل خیبر کی مانند تھا ، محصور کر لیا

تاکہ کوئی ہندو محاصرین کی رسّی سے نہ بھاگ سکے ، جس طرح کتّا طوق اور پٹّے سے نہیں بھاگ سکتا۔

صفحہ ۳/۱۰۶ : ''شمشیر زنان لشکر ازانہا هیچ سپر بر آب نینداختند و هر همه بیکبار دل بر آشنا نهادند و هر هنری که در مساحت داشتند بر روی آوردند ۔ طرفة العینی بر آب چنان لنگر کرده بگذشتند که کشتی بر آب نیارد گذشت ۔''

"The swordsmen of the army, however, would not float any boat on the ditch but determined to swim through it together. They practised on the face of the water every rule of mensuration they knew, and, in a moment, crossed the ditch, file after file, more easily than a boat would have done." (69-70)

'سپر بر آب انداختن' (مرعوب و مغلوب ہونا) کے معنے کشتی چلانے کے تو نہیں آتے جیسا کہ جناب مترجم سمجھتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ فوجی اس خندق سے مطلق مرعوب نہیں ہوئے ۔ دوسرے فقرے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ فوجی پانی کی سطح پر مساحت کے ان تمام قواعد پر ، جن سے وہ واقف تھے ، عمل پیرا ہوئے ۔ بھلا پانی کی سطح پر مساحت کی شکلیں بنانے کا کون سا موقع ہے ۔ اس لیے 'مساحت' کی جگہ 'سباحت' بمعنی شناوری چاہیے ۔ مصنّف علام کا مقصد ہے کہ فوجیوں نے ، خندق عبور کرتے وقت ، پیراکی کے ہر قسم کے کمال کی نمائش کی ۔ 'داشتند' کی جگہ 'دانستند' بہتر معلوم ہوتا ہے ۔ 'بر روی آب آوردند' = بر روی کار آوردند ۔ 'آب لنگر کردہ' سے مقصد یہاں آب لنگر دار و آب ایستادہ ہے نہ دستہ کے بعد دستہ ۔

صفحہ ۱۲/۱۰۶ : ''و پیلانش بقوت زر پیل بالا همه از زر سلسله می جنبانیدند از بسکه خیال مارکها [خیالهای مارکهای بدلها] زر کژدمه در چشم فکرتش در آوردہ بود ۔''

"His elephants pulled their chains in pride of the gold they bore ; but the Rai was thinking of his war with the golden scorpians . . ." (70, 51)

پہلے جملے کا مطلب ہے کہ انباروں سونے (ہاتھی کے قد کے برابر اونچے ڈھیر) کی بنا پر اس کے ہاتھی اپنے پیروں میں سونے کی زنجیریں پھڑکا رہے تھے۔ دوسرے جملے کا متن ناقص معلوم ہوتا ہے اور ترجمہ تو یقیناً غلط ہے۔ 'خیال مارکہا' یا 'خیالهای مارکهای' جیسا کہ یونیورسٹی کے مخطوطے میں ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ 'زر کژدمہ' تو آنکھ کی کسی بیماری کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ترجمہ 'سنہری بچھو' اسی معیار کا ہے جیسا کہ لاہور کے ایک پروفیسر نے 'زال زر' کا 'سنہری بڑھیا' ترجمہ کیا تھا۔

صفحہ ۱۰۶/۱۵ : ''ازانجا کہ در حصار داری و دلاوری سنگی داشت، هر بارکہ سکہٴ کار خود را بر دل سنگین عیار میکرد، قلب می یافت۔''

> "He had been brave and courageous in the siege; yet whenever he reflected on the situation in which he was placed, his stout heart began to palpitate;" (70, 19)

'سنگ' بمعنی توقیر و عظمت و شہرت اور 'سنگین' بمعنی سخت ہے۔ 'عیار میکرد' = پرکھتا تھا، جانچتا تھا۔ 'قلب' بمعنی ناسرہ۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ قلعہ کی جنگوں اور شجاعت میں اس کی دھوم تھی، اس لیے جس قدر زیادہ وہ اپنے معاملات کے سکے کو اپنے سخت دل پر پرکھتا تھا، اتنا ہی زیادہ اس کو کھوٹا پاتا تھا۔

صفحہ ۱۰۷/۴ : ''اما باد هیبت خدایگانی چنان بروی زد کہ داش با چندان گرانی بر پرید و او را بی سنگ گردانید۔''

> "But the Emperors' prestige overawed him; all his courage metted away and he was left a broken man." (70, 27)

اس ترجمے کو تحت اللفظی تو نہیں کہا جا سکتا۔ 'ہیبت' کا ترجمہ شہرت و اثر ٹھیک نہیں، خوف و رعب چاہیے۔ با چنداں گرانی (اتنی تمکنت اور وقار کے باوجود) ترجمے سے چھوٹ گیا۔ 'بے سنگ' بے وقار ہے، نہ شکستہ۔

صفحہ ۱۰۷/۱۰ : ''و عرضہ داشت کرد کہ پیش آهنین تنان اسلام هندوی برنجین را خلاف روئیں تنی بدان ماند کہ شاهد سیمین تن با پور زال زر دعوی

پولاد وندی کند۔"

"The opposition of the rice-made Hindu, ran the Rai's petition, to the iron bodies of the Mussalmans is like a silver-faced beauty challenging Rustam to battle." (71, 1.)

'برنجین' سے مقصد چاول کا بنا نہیں ہے بلکہ پیتل کا۔ 'پولاد وند' = پولاد هفت۔ ایک پادشاہ بھی ہے جو افراسیاب کی استدعا پر کوہ چین سے رستم کے ساتھ جنگ کرنے آتا ہے اور مغلوب ہو کر بھاگ جاتا ہے۔ 'روئیں تن' = اسفندیار، مجازاً بہادر۔ 'خلاف' کی جگہ 'لاف' بمعنی دعویٰ چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ آہنی جسم مسلمانوں کے سامنے برنج کے بنے ہندوؤں کا دعویٰ اسفندیاری (بہادری) ایسا ہی ہے جیسے کسی سیم تن محبوب کا زال زر کے فرزند رستم کے مقابلے میں پولاد وندی (فولاد صفتی) کی لاف مارنا۔

صفحہ ۱۰۸/۹: ''و اگر بحقیقت آهن پادشاه را بہ زر چون من خسی میل افتد کهربا را کدام دولت ازان بالاتر کہ گوهر شاهی سوی خودش کشد۔ تبره واری ازان برای خویش ندارم۔''

"And if the Emperor really wants the gold possessed by a poor man like me, so much the better! For what principality is more fortunate than the one which draws the Emperor's heart towards itself. I will keep none of this gold-dust for myself . . ." [71, 10 (bott.)]

امیر نے اس سے قبل شمشیر شاہی کے لیے ایک ضرب المثل حوالۂ قلم کی ہے کہ ''سنگ مقناطیس آهن است و آهن مقناطیس زر'' فقرۂ بالا میں 'آهن بادشاہ' سے مقصد 'شمشیر شاہی' ہے۔ 'کہربا' بعض کہتے ہیں پتھر ہے، بعض کہتے ہیں گوند ہے۔ ہر حالت میں وہ زرد رنگ کا ہوتا ہے اس لیے سونے کو اس کے ساتھ مثال دی۔ 'تبرہ' توبرہ کا مخفف ہے۔ حافظ:

بستہ بر آخور او استر من جو میخورد
تبره افشاند و بمن گفت مرا میدانی

مطلب یہ ہے کہ اگر شمشیر شاہی کو مجھ جیسے خس ناکس کا سونا چاہیے، تو

کہربا کے لیے اس سے زیادہ اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے کہ گوہر تیغ شاہی اسے اپنی طرف جذب کرے۔ میں اس میں سے توبرہ برابر بھی اپنے لیے نہیں بچاؤں گا۔

صفحہ ۱۳/۱۰۸ :

داند همه کس که چون سفالی بشکست
از تبرهٔ زر درست نتوان کردن

"And everyone knows, that when an earthen vessel breaks, you can not repair it with gold-dust." [71, 5 (bott.)]

یہاں بھی وہی توبرہ برابر سونا مقصود ہے، نہ سونے کی خاک۔

صفحہ ۸/۱۰۹ : "افسار آنہمہ هم با طویلهٔ غلامان خاص مربوط خواهد گشت۔"

"All these horses will be banded over, along with the shaves, to the royal stables." (72, 7)

'افسار' = باگ ڈور۔ 'طویلهٔ غلامان خاص' = خاص غلاموں کا طویلہ یعنی شاہی طویلہ۔ پروفیسر کے ہاں 'مع غلاموں کے' بالکل حشو ہے۔

صفحہ ۱/۱۱۰ : "نہ ازانها کہ از کبر سن دندان بلند شده باشد یا از غایت پیری بی‌دندان گشته۔"

یہ عبارت ترجمے سے چھوٹ گئی ہے۔

صفحہ ۴/۱۱۰ : "اینک پای را عمدهٔ کار بندگی ساختہ و فرق را سدهٔ باب طاعت پرداختہ می آیند۔"

"They are coming with their feet like pillars and their heads like dome of the gate of obedience—" [72, 13 (bottom)]

'سدہ' بمعنی دہلیز کو پروفیسر صاحب اس سے پہلے بھی نہیں سمجھے تھے، جہاں جشن سدہ کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ یہاں معلوم نہیں کس سند پر گنبد کے معنوں میں لائے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ محض فراست سے انھوں نے اندازہ کیا کہ جب پاؤں کو ستون کے ساتھ مثال دی گئی ہے (یہ ہاتھیوں کا ذکر ہے) تو قیاس چاہتا ہے کہ سر کو گنبد کے ساتھ مثال دی جائے۔ مگر یہ خیال

نہیں رہا کہ دروازے کو گنبد کے مقابلے میں دہلیز سے زیادہ مناسبت ہے ۔

صفحہ ۲/۱۱۱ : اگر خرمنی جان دارم ہنگام طلب آن برکشیدۂ یزدان بہ کاہ برگی بہ نسنجم و ہمہ را از سنگ گران دل برکشم و بہ کار سنجان ''حضرت سپارم ۔''

"If means of livelihood are left to me, I will collect all my "leaves" and hand them over to the Emperor's officers at his command." (73, 6)

یہ جملہ تو تقریباً سارا ہی غلط ہوگیا ۔ مراد یہ ہے کہ اگر میرے ڈھیروں جانیں بھی ہوتیں ، اس برگزیدۂ خدا کی طلب کے وقت پرکاہ کے برابر بھی انھیں وقعت نہ دیتا اور سب کو اپنے دل سے اتار کر کارپردازانِ شاہی کی خدمت میں حاضر کر دیتا ۔

صفحہ ۶/۱۱۱ : ''خشت آہنین دلاوری کہ سنجیدۂ دست بندہ است برکشم و از رایان خام پوستین ترازو کنم ۔''

"I will take the brave iron spear, which befits my hand, and measure myself against other Rais." (73, 11)

'خشت آہنین دلاوری' یعنی بہادری کا فولادی نیزہ ۔ 'خام پوستن' = کچے چمڑے والے ۔ 'ترازو کردن' = پار کرنا ۔

صفحہ ۱۳/۱۱۱ : "و روی زرد را بر خاک مساس کردند چنانکہ سفال زمین رنگ روی گرفت ۔"

". . . they rubbed their yellow faces on the earth till the ground itself acquired their colour." (p. 73, para. 2, 2)

چونکہ جوہر و معدن کا ضلع چل رہا ہے اس لیے 'سفال زمین رنگ روی گرفت' کا مطلب یہ ہوا کہ زمین کی ٹھیکری تک نے کانسی کی رنگت اختیار کر لی ۔

صفحہ ۱/۱۱۲ : ''خواست کہ آن را چون سیم قلب بر روی ایشان باز زند اما دروھہ' سکندر ثانی کہ از سدّ ھفت جوش بلک از صنع شدّاد محکم تراست بہ قہرمانان لشکر دارد ۔''

". . . he wished to throw back at their faces. But he

communicated to the army the command of the second Alexander, which is more firm than the seven walls of steel and the garden of Shaddad." (73, para. 2, 8)

'سیم قلب' = کھوٹا روپیہ ۔ دروھہ = میں اس لفظ سے ناواقف ہوں ، پہلے بھی آیا ہے ۔ 'سد ھفت جوش' = ساتوں دھات کی دیوار ۔ 'صنع شداد' کی جگہ سبع شداد بمعنی ھفت سمٰوات زیادہ موزوں ہے ۔

صفحہ ۱۱۲/۵ : ''وکترات سکتہ' عفو نیز از [سیمائی] فرخ خدایگانی فرو خوانده بودند ۔ لابد رای بران آسود ، کہ رنجی بر نفس رای نہ نہند و بصدقہ' سر بادشاہ جان بخش جان او را بدان صورت زر بخشد ۔"

" . . . and the coins of forgiveness had also been repeatedly issued from the Imperial Court, the decision arrived at was to the effect that they would subject the Rai to a tribute, but as a charitable offering for the life of the forgiving Emperor, they would spare his life in exchange for the golden statue." (74, 1)

مطلب یہ ہے کہ چونکہ مکرراً معاف کا نقش حضرت اعلیٰ کی مبارک پیشانی سے پڑھا گیا لہٰذا یہ رائے قائم ہوئی کہ رائے کی ذات کو ایذا نہ دی جائے اور شاہ جان بخش کے سر کے تصدق میں اس کی جان اس سنہری مورت کی بنا پر بخش دی جائے ۔

صفحہ ۱۱۲/۷ : "تا رای دران صورت جان یابد اما بشرطیکہ آن صورت جاندار گردد ۔"

یہ عبارت ترجمے سے چھوٹ گئی ہے ۔

صفحہ ۱۱۲/۸ : ''و ھرچہ از جنس نباتی و کانی و حیوانی در ملک رای است بستانند و بدرگاہ اعلیٰ رسانند ۔''

"They would take away and deliver at the Court all animals vegetables and minerals which the Rai's territory contained." (74, 6)

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ رانے کے علاقے کی تمام اشیا از جنس نباتات و کان و حیوان درگاہ شاہی میں پہنچا دی جائیں ؟ پروفیسر نے اس عبارت میں 'مِلک' بکسر میم بمعنی قبضہ کو 'مُلک' بضم میم بمعنی علاقہ و عملداری پڑھا ہے۔ مطلب ان اشیا سے ہے جو رانے کے قبضے میں ہیں ۔

صفحہ ۱۷/۱۱۲ : بحیلہ آن سیماب لرزان را در قالب تسکین ریختند ۔"

"With some difficulty they ran this quicksilver into a vessel . . ." (74, 20)

مطلب یہ ہے کہ بڑی حکمت سے اس لرزنے والے سیماب کو سکون کے قالب میں ڈھالا ، یعنی تسکین دی ۔

صفحہ ۵/۱۱۳ : "چون هندو شب خزائن گوهر شب چراغ بیرون ریخت ۔"

یہ عبارت ترجمے سے رہ گئی ہے ۔

صفحہ ۱۶/۱۱۴ : "کوهی با بینی سیارهٔ دراز اما بی سنگ ۔ کشتیٔ بیل در دنبال و پیش نهنگ مست و سرگران اما نہ از بادہ شرابش در سر و عرق از بنا گوش کشادہ ۔"

"It looked like a kill with a long sash for a nose, or else like a camel with a crocodile stuck to its front. It carried its wine-glass in its head and liquor was distilled from its ears." (75, 23)

یہاں پروفیسر کا نشانہ پھر غلط ہو گیا ہے ۔ میرے خیال میں امیر کا مطلب ہے :

وہ ایک متحرک اور لمبی ناک والا پہاڑ ہے مگر بے پتھر کا ، کشتی ہے جس کے پیچھے چپّو ہے اور آگے نہنگ ، مخمور اور بدمست ہے مگر شراب سے نہیں ، سر میں شراب ہے اور عرق (پسینہ) کان کی لو سے ٹپک رہا ہے ۔

صفحہ ۳/۱۱۵ : "نغانی پیشانیش از شنگرف تر لالہ پوش ابری از سواحل دریا برآمدہ برگهای نیلوفرش در بناگوش ۔"

"It looked like a cloud arisen out of the sea-shore, wearing

vermilion tulips on its forehead and green leaves in its ears."
[75, 8. (bott.)]

'نعمانی' پر حاشیے کی ضرورت تھی اور برگہای نیلوفر کا ترجمہ سبز پتے غلط ہیں -

صفحہ ۱۱۵/۵ : ''ہم ہندو کش و ہم کافر مال ، ہم حمول و ہم قتال ، ہم بار بر پشت و ہم روی بر بار ، ہم گردن کش و ہم فرمان بردار ، ہم سازش عاج و رنگش آبنوس -''

" . . . Hindu-slayer and yet infidel property ; baggage-carrier as well as warrior ; it carried a load on its back and its face looked towards the court, for if strong necked, it was also obedient ; the ebony coloured manufacturer of ivory. . ."
[75, 3 (bott.)]

'کافر مال' یہاں اسم فاعل ہے یعنے کافر کو کچلنے والا ، نہ 'مال کافر' جیسا کہ جناب مترجم سمجھے ہیں - آخری فقرہ : عاج اس کا ہتھیار ہے اور رنگ آبنوسی ہے -

صفحہ ۱۱۵/۱۰ :

صف بصف آندم کہ خرامان شوند
زلزلۃ الفدفد و الصفصف

"And when they move together in a row, there is an earth-quacke of Fad! Fad! and saf! saf!" (76, 4)

پروفیسر صاحب 'فد فد' اور 'صفصف' کا ترجمہ نہیں کرتے - بھلا انگریزی خوان خالی فد ! فد ! اور صف ! صف ! سے کیا سمجھیں گے - وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ 'فد' اور 'صف' کی تکرار کی گئی ہے حالانکہ اصلی لفظ 'فد فد' اور 'صف صف' بمعنی زمین ہموار و مسطّح ہیں - خاقانی :

قاع صفصف دید و صف صف سپہ داران حاج
کوس را از زیردستانِ زبردستان دیدہ اند

صفحہ ۱۵/۱۱۵ : ”بعد گذشتن پیل خزائن پیل بالا در عرض آمد ۔“

"After the elephants had passed, the treasures they carried on their backs were displayed." (76, 6)

’پیل بالا‘ (یعنی ہاتھی کے قد کے برابر اونچا) قابل نظر ہے ۔ اس کے معنی ہیں ’تودہ و خرمن کردۂ بسیار [کہ] آنرا از کثرت عظمت ببالائے پیل تشبیہ کردند ۔ مثل پیلپار ۔ نظامی :

بفرمود تا خازن زود خیز
کند پیل بالا برو گنج ریز

صفحہ ۱/۱۱٦ - ع :

”بیننده را بلادر و دیوانگی دهد“

"... drove the onlooker mad ..." (76, 8)

’بلادر‘ بر وزن ’بہادر‘ مخفف ’بلا دور‘ ۔ صدقہ جو الا بلا ٹالنے کے لیے دیا جائے ۔

صفحہ ۲/۱۱٦ : ”ہر زبرجدی در وی بروشنائی روی از آفتاب یافتہ بلکہ آفتاب از وی روی تافتہ ۔“

"Every emerald (Zabarjad) sparkled in the light of the sun, or, rather, the sun reflected back the light of the emerald." (76, 8)

اس عبارت میں ’یافتہ‘ کی جگہ ’تافتہ‘ اور ’تافتہ‘ کی جگہ ’یافتہ‘ چاہیے ۔ مطلب یہ ہے کہ ان ڈبیوں کے زبرجد چمک دمک میں آفتاب سے منہ موڑتے تھے ، یعنے آفتاب کو حقیر سمجھتے تھے ، بلکہ آفتاب ان سے آبرو حاصل کرتا تھا ۔

صفحہ ۸/۱۱٦ شعر :

گر پرتو او بدانۂ نار افتد
زان دانۂ نار بر زند شعلۂ نار

"... if a ray from them had fallen on a lamp of fire, the lamp would have burst into flames." (76, 11)

پہلا ’نار‘ بمعنی انار (ثمر) ہے ۔ یعنی اگر اس کا عکس انار کے دانوں پر

پڑے تو اس دانے سے آگ کے شعلے بھڑک اٹھیں ۔

صفحہ ۱۱/۱۱۶ : "و لعل آتشین ازان بابت کہ از تاب او آتش در گوہر شب چراغ [گیرد] ۔"

"The lustre of the rubies (la'l) illuminated the darkness of the night . . ." (76, 15)

مگر مقصد یہ ہے کہ لعل سرخ اس معیار کے تھے جن کی روشنی سے گوہر شب چراغ جل اٹھے ۔

صفحہ ۱۳/۱۱۶ :

چنان کان گوہر رخشندہ از وی
بسوزد چون چراغی از چراغی

" . . . and the mine, as you might light one lamp from another." (76, 16)

ہمارے خیال میں 'کان گوہر رخشندہ' سے مراد وہی گوہر شب چراغ ہے اور 'وی' کی ضمیر 'لعل آتشیں' کی طرف راجع ہے جو فقرۂ بالا میں مذکور ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایسا جوہر کانی ، جیسا کہ شب چراغ ہے ، اس (لعل آتشین) سے اس طرح جل اٹھتا ہے جس طرح چراغ سے چراغ جل اٹھے ۔

صفحہ ۱۵/۱۱۶ : "الماس چنانکہ از بس لطافت چون گوہر پولاد در دل آھنین جا کند و بسبب مزاج نازک از [ارزیر] بشکند ۔"

"The diamonds (ilmas) would have penetrated into an iron heart like an arrow of steel and yet owing to their delicate nature, would have been shattered by the stroke of a hammer." (76, 18)

'گوہر پولاد' کا ترجمہ فولادی جوہر (جوہر فولاد) ہونا چاہیے ، نہ فولادی تیر ۔ علیٰ ھذا 'ارزیز' کا ترجمہ رانگ ہونا چاہیے ، نہ ہتھوڑا ۔

صفحہ ۳/۱۱۷ : "و زری چون حلقۂ ھلال دوازدہ ماھی ۔"

"The gold was like the full moon of the twelfth night." (76, 23)

ترجمہ غلط ہے ۔ بارھویں رات کا چاند پورا نہیں کہلاتا ۔ میرے خیال میں دوازدہ ماہی سے مقصد معیار ہے ۔ ایران میں 'زر دھدھی' یعنی دس پایہ والا سونا خالص ترین اور بہترین مانا گیا ہے ۔ ہندوستان میں بارہ پایہ والا جسے بارہ بانی کہتے ہیں ۔ علاء الدین کی اشرفی بارہ پایہ کی مانی جاتی تھی ۔ ابوالفضل کہتا ہے :

''و طلای دینار گرد خورد علائی را پایہ دوازدھمی انکاشتی'' (صفحہ ۱۸ ، آئین اکبری ، نولکشور ، ۱۸۶۹ع) ۔

اگرچہ ہندوستان میں عام طور پر بارہ پایہ والا سونا ہوا کرتا ہے ۔ 'سلطان نامہ' سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ پایہ والا بھی ہوا کرتا تھا ۔ چنانچہ :

زر سیزدہ ماھہ زان بیش بارش
کہ کردن توان سیزدہ ماہ عیارش

صفحہ ۱۱/۱۱۷ : ''ھر مرکبی کہ در طویلہ و قصر رای بود ، از بیم تطویل خصومت بی تقصیر پیشکش کرد تا بحدیکہ کہ رای را بادی ھم درد دست نماند ۔''

> "Lest the struggle should be further prolonged, every horse in the Rai's palace and stables had been brought ; even the wind of them was not left in his hands." [76, 9 (bott.)]

'باد در دست' یا 'باد بدست' ایک محاورہ ہے جو پوری پوری تہی دستی اور ناکامی کے اظہار کے لیے آتا ہے اور 'شاھنامہ' میں بکثرت ملتا ہے :

کہ ما را کنون جان باسپ اندر است
چو زین بگذری باد ماند بدست

صفحہ ۲/۱۱۹ : رسولان منطق سوگند یاد کردند بخدای کہ انسان را مقوّم جوھر گردانید ۔''

> "By the God, who has created man, the finest of "substances"[2] swore the philosophic ambassadors . . ." (p. 77, para. 2, l. 1)

'مقوّم جوھر' کے معنی قیمت کنندۂ جوہر زیادہ صحیح ہیں ۔ پروفیسر صاحب منطق کو رسولوں کی صفت مان کر اس کا ترجمہ منطقی ایلچی کرتے ہیں جو کسی

طرح سے درست نہیں ۔ دراصل منطق 'سوگند' کی طرف مضاف ہے اور بمعنی زبان آیا ہے ۔

صفحہ ۳/۱۱۹ : "میان این اجناس هر جوهری ازانهاست که هیچ انسانی به تقویم آن نرسد ۔ میان این جواهر جوهری باشد که در همه عالم فرد توان گفت ۔ نزدیک فیلسوفان کامل این چنین جوهر خود وجود ندارد ۔"

اس عبارت پر پروفیسر نے یہ حاشیہ دیا ہے :

> "This is the famous Koh-i-Nur, which according to many later writeis (including Khafi Khan) was brought by Alaud-din's army from the Deccan. Though logicians to put the ambassador's words in a different form, declare that there is no such thing as a "Unique substance" except the Divine Being, yet the Koh-i-Noor diamond has no peer and stands in a class by itself. You cannot find a diamond to match it in the whole world." (note 3, p. 77)

یہ حاشیہ بھی محترم پروفیسر کی جلدبازانہ رائے زنی کی ایک اور مثال ہے ، جس میں کہا گیا ہے کہ 'یہ کوہ نور الماس ہے جس کے متعلق اکثر متاخرین (جن میں خافی خان بھی شامل ہے) لکھتے ہیں کہ علاء الدین کی فوجیں دکن سے لائی تھیں ۔' حالانکہ بیان بالا سے کوئی ایسی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ۔ "میان این جواهر جوهری باشد که در همه عالم فرد توان گفت" سے یہ قطعی فیصلہ کیوں کر دیا جا سکتا ہے کہ اس 'جوهر فرد' سے مراد وہی مشہور عالم ہیرا کوہِ نور ہے ۔ جواہرات بے شمار اقسام کے ہوتے ہیں ۔ ان میں ایک قسم الماس بھی ہے ۔ امیر کے بیان کو اگر رنگین اور شاعرانہ نہ مانا جائے ، تب بھی یہ بیان اس قدر عام ہے کہ ہم اس سے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکال سکتے ۔ دوسرے جو روایت کوہِ نور کو علاء الدین کی طرف منسوب کرتی ہے ، یوں ہے کہ علاء الدین کو یہ ہیرا مالوے سے ہاتھ لگا تھا ۔

اس سلسلے میں سب سے قدیم بیان واقعاتِ بابری کا ہے کہ بکرماجیت والیٔ گوالیر کی اولاد نے ، جو ابراہیم لودی کے ساتھ ، پانی پت کی جنگ میں مارا جا چکا تھا ، یہ ہیرا شہزادہ ہمایوں کی خدمت میں پیش کیا ۔ ابوالفضل 'اکبر نامہ'

میں یہی بیان دھرا دیتا ہے ۔ 'خلاصۃ التواریخ' میں سجان رائے نے یہ فرق کیا ہے کہ یہ الماس بکرماجیت کی اولاد سے علاء الدین کو ملا تھا جس سے ظاہر ہے کہ اس کے ذہن میں بکرماجیت مشہور راجہ اجین ہے ، جس کے نام پر بکرمی سمت چلتا ہے ۔ رسالہ کاوہ میں بھی بکرماجیت والی اجین کو مالک بتایا گیا ہے اور کہ فتح مالوہ کے وقت علاء الدین خلجی کے ہاتھ لگتا ہے ۔ مغربی اہل قلم مثلاً ڈوسن ، میسکلین اور بال وغیرہ اسی روایت کو شہرت دیتے ہیں ۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ یہ علاء الدین [محمود شاہ خلجی] مالوی ہے ۔ لیکن خافی خان کے پاس اس بیان کی کہ ''از تسخیر دکن بدست او آمدہ بود'' ہمیں کوئی معتبر سند معلوم نہیں ۔

صفحہ ۶/۱۱۹ : ''ہر چند پیش ازین بارای میگفتند تا قطعی و کسری درین جواہر نہ رسیدہ است قسمی ازین سوی تاجدار عہد باید فرستاد ۔''

> "Before this time we have been advising the Rai to send a part of the jewels, that had never been cut or divided to the Imperial Court." (p. 77, last time)

'تا قطعی و کسری درین جواہر نہ رسیدہ است' مطلب یہ ہے 'پیشتر اس کے کہ ان جواہرات میں کوئی تقسیم یا کمی واقع ہو ۔'

صفحہ ۱/۱۲۰ : حال اینست کہ محل استماع یافت باقی رای عالی برتر بلکہ معقول انگیز - در شکل گفتار ایشان دید ، کہ منطق ایشان از اختلاطات خالی است ۔''

> "The affair is as we have represented. For the rest, your exalted judgement is higher, and even wiser.
> (The Malik) saw from the propositions of their speech, that their logic was clear of all confusion." (78, 17)

اس عبارت میں 'دید' کا فاعل مذکور نہیں ۔ صحیح عبارت یوں ہے : ''باقی رای عالی برتر ۔ ملک معقول انگیز در شکل گفتار ایشان دید . . . الخ'' اور 'اختلاطات' کی جگہ اختلافات چاہیے ۔

صفحہ ۳/۱۲۰ : ''موضوعات ، کہ در قدیم الایام بر ایشان معمول نہ بود ،

احداث کرد ، بر نہجی کہ ہیچ وقت تغیر نپذیرد ۔''

''He applied to them such terms,[2] as had never been applied to them in ancient times, and that too, in a way never to be forgotton.'' (p. 78, para. 2, l. 2)

اس عبارت پر حاشیہ ذیل اضافہ ہوا ہے ۔

2. Apparently of the threats. The terms really used by Khwaja Haji were not to be found in the ancient logic of Aristotle.

ہمیں اس ترجمے میں فاضل مترجم سے اختلاف ہے ۔ ہمارے نزدیک اس کے معنی ہیں : مجدداً ایسا مواظعہ (خراج) ، جو قدیم سے ان پر قائم نہیں تھا ، مقرر کیا جس میں کسی وقت بھی تغیر و تبدل ممکن نہیں تھا ، حاشیے میں مترجم کا یہ خیال کہ مراد خواجہ حاجی کی دھمکیوں اور سب و شتم سے ہے ، جو ارسطو کی کتاب منطق میں نہیں ملتیں ، ہمارے خیال میں کسی اصلیت پر مبنی نہیں ۔ یہاں خواجہ حاجی کہاں ہے ، وہ تو ملک کافور بذاتِ خود سارا معاملہ طے کر رہا ہے ۔

صفحہ ۱۲۰/۱۱ : ''عارض حسیب سوی امرا [ی] محسوب و کتیبہ محاسب اشارت راند کہ حاضر و غائب لشکر را در شمار آوردند ۔''

'' . . . the ariz-i-Hasib ordered the amirs and the Katib-i-mohasib[2] to take the roll of those who were present in, or absent from, the army.'' (79, l. 1)

'عارض حسیب' اور 'کتیبہ محاسب' کا ترجمہ نہیں دیا گیا بلکہ اصل الفاظ کو انگریزی میں داخل کر لیا گیا ، جس سے انگریزی خوانوں کو کچھ پتا نہیں چل سکتا ۔ 'کتیبہ محاسب' پر حاشیہ ۲ میں اس کے معنی 'سیاہہ نویس لشکر' دیے ہیں حالانکہ صحیح ترجمہ 'سیاہہ محاسب' ہیں ۔

صفحہ ۱۲۰/۸ : ''ہندوی بر ہندسہ خطی براستی بنوشت و دہ خزانہ صفر را در تہ آن ثبت کرد کہ از زر مالامال گرداند ۔''

'' . . . the latter made a straight figure and put ten ciphers beside it.[3] [78, 4 (bott.)]

اس عبارت پر ایک حاشیہ بھی دیا ہے و ھو ھذا :

3. He promised to pay 10,000,000,000—ten thousand millions only (?). The figure seems to be purely suppositions. But we are hered ealing not with the revenues but the heirlooms of states.

یہ رقم تو بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتی ۔ دس ارب روپیہ (تنکہ) یقیناً خالی از مبالغہ نہیں ۔ مگر اسی قسم کا طریق بیان سلطان نامہ میں بھی ملتا ہے ۔ چنانچہ قطب الدین کے عہد میں راجہ ارنگل کی زبان سے یہ شعر ادا ہوا ہے :

خطی بود بالای صد صفر گنجم
کنون صفر بی خط شد الفخت رنجم

ہم پروفیسر کے اس خیال سے متفق نہیں کہ یہ دس ارب روپیہ ان خزانوں اور اجناس کی قیمت ہے جو راجا کے ہاں سے خزانۂ علائی میں آئے ہیں ۔ یہ تو محض خراج کی رقم ہے ، جو سالانہ ادا ہوتی ہے ۔ اس کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں ۔ چنانچہ اس عبارت سے سابقہ عبارت یہ ہے :

''چون سپہ کش یگانہ برسر ھندو خراجی بیرون از حساب وضع فرمود ۔''
(صفحہ ۸/۱۴۰)

میں سمجھتا ہوں کہ امیر کا یہ بیان بطریق تعمیہ ہے اور اصل رقم بہت کم ہے ، لیکن آخر وہ رقم کیا ہو سکتی ؟

جب علاء الدین کی وفات پر راجا ارنگل نے سرکشی کی ہے ، قطب الدین مبارک شاہ نے اس پر دوبارہ فوج کشی کی اور صلح کے بعد رقم خراج ساٹھ لاکھ مقرر ہوئی لیکن یہ رقم راجا کے کہنے سننے پر بیس لاکھ رہ گئی ، چنانچہ سلطان نامہ :

خراجی کہ بر شصت لک اجھوزر
ببخشید چل ، بست لک شد مقرر

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد علائی میں بھی بیس لاکھ کے قریب ہوگی ۔

صفحہ ۳/۱۲۴ : ''آن روز گوئی خلق را عید ثانی بود کہ مسافران حجاج بعد

قطع وادیهای بسیار به بیت [الحرم] خدایگانی رسیده بودند و حاجات ایشان که مشاهدهٔ یوسفی خلیفه' حجاج غلام بود ، روا شده ۔''

"The day looked like a second Id for the people, when the pilgrims, after wandering through many valleys, had at last reached the sacred precints of the Imperial Court and their wishes, compared to which the ambitions of Hajjaj Yusuf were slavish longings, had been realized." [79, 10 (bott.)]

اس فقرے میں 'مشاہدهٔ یوسفی خلیفه' حجاج غلام بود' کا ترجمہ قابلِ غور ہے ۔ پروفیسر کہتے ہیں : 'اور ان کی آرزوئیں ، جن کے مقابلے میں حجاج یوسف کی مرادیں محض غلامانہ خواہشات تھیں ، بر آئیں' لیکن اس ترجمے سے ہم مطمئن نہیں ۔ حجاج اور یوسف کے درمیان ایک اضافت ہے جو اضافتِ ابنی کہلاتی ہے ۔ یعنی حجّاج پسر یوسف ۔ محمود سبکتگین میں بھی یہی اضافت ہے ۔ چونکہ اس فصل میں کعبہ کا ضلع لایا گیا ہے اس لیے اوپر کی عبارت میں عیدثانی ، حجاج (جمع حاج) ، قطع وادی ، بیت الحرام ، حجاج (وزیر عبدالملک) اور یوسف (پدر حجاج) وغیرہ الفاظ لائے گئے ۔ ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے : اور ان کی مرادیں ، یعنی حجاج غلامِ خلیفہ کے جمالِ یوسفی کا مشاہدہ ، بر آئیں ۔

صفحہ ۱۲۶/۱ :

''عزم لشکر بسوی دهور سمندر و معبر
همچو دریا که رود جانب دریای دگر''

ع : ''نسبت نگر از ستارگان باز''

چون روز مریخ از آغاز جهاد خبر گفت و شهر ماه جمادی الآخر از کوچ بی پایان و بی کم نوید رسانید و سنه هجرت بشارت آورد که امداد حق که بیش می باید با لشکر یار است ۔ نظم

یعنی سه شنبه و عدد مه چهار و بیست
تاریخ سال هفصد و ده گشته در شمار

بطالعی ، که مشتری ازان سعادت ، خرد و وقتی که آفتاب ازو روز بازار یابد ، سایه بان خاص بر سمت معبر نامزد گشت ۔ الحق سایه بانی که عرصه' آن دو

توی آسمان است ، و آسمان ہیچ توی با آن برابر نہ ، بلکہ اگر آسیب بخیمہ سپہر زند ، توبرتوش در غلطاند ۔ نظم

''چرخ نہ توش بگویم زیراک
سترت فیہ جہات ستہ''

اس عبارت کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے :

"The march of the army to Dhur Samandar and Ma'bar like a river that flows towards another river.[4]

On Tuesday, 26th Jamadi-ul-akhir 710 A. H. a fortunate moment, at about mid-day the *red canopy started for the expedition*. (p. 81, para. 2), (Note 4, Allusions to stars)

اب اس ترجمے کو تحت اللفظی تو نہیں کہا جا سکتا اور ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں ۔ امیر نے اس عبارت میں تاریخ بیان کرنے کا جو پیچدار طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے :

روز مریخ = منگل ۔ آغاز جہاد = ج = ۳ ۔ جس سے پھر اشارہ سہ شنبہ (منگل) کی طرف ہے ۔ گویا منگل کا دن تھا ۔ 'شہار ماہ جمادی الآخر از کوچ بی پایاں' ۔ کوچ = ۲۹ ۔ چ = ۳ = ۲۶ و بی کم = ب = ۲ یعنی ۲۶ ۔ ۲ = ۲۴ جمادی الآخر اور سال کے لیے لکھتے ہیں :

امداد حق = ۱۵۸ ۔ کہ بیش می باید = ۲ یعنی 'امداد حق' میں بے کے عدد (۲) اضافہ کرو ۔ 'با لشکر یار است ، یعنی لشکر کے اعداد = (۵۵۰) میں شامل کردو ۔ بالفاظ دیگر ۱۵۸ + ۲ + ۵۵۰ = ۷۱۰ع ۔

صفحہ ۱۲۷/۵ : و سواد تنکل را از اطلس لعل خویش سرخروئی تمام ارزانی داشت ۔''

" . . . and halted at Tankal, which it made quite red with its ruby velvet." [81, 3 (bott.)]

'سرخروئی' سے مراد چہرے کی سرخی نہیں بلکہ عزت و نیک نامی ۔

صفحہ ۱۲۷/۷ : ''در زیر مظلہ آسمان وش عارض والا سپاہی بعدد قطرات

بازان در شمار می آورد ۔"

" . . . while the ariz-i-wala collected his men like drops of rain under the towering canopy." (82, 1)

'در شمار می آورد' یعنی گنتی کر رہا تھا ۔ 'والا' عارض (بخشی) کی صفت ہے ۔
صفحہ ۱۲۸/ ۷ "و صد هزاران کمان رستم از ہر سوی ھر آمدہ ۔"

"A hundred thousand Rustams appeared on every side with their bows." (82, 10)

'کمان رستم' = قوس قزح ۔ یہاں کمانوں کو قوس قزح سے مثال دی ہے ۔
صفحہ ۱۲۸/ ۷ : "بعضی رستمان سرخ موی کہ از خون سیاؤسان نقش نتوان کرد و بعضی گرگینان اردشیر صولت کہ بزخم مشت استخوان شیر آرد کنند ، و پلنگان بر زین کہ از پوست گودرز افسار رخش سازند ۔"

" . . . some of them were so red haired that you could not have pointed them even with the blood of Siawash. There were Gurgins who, with the impetuosity of Ardshir, could have pounded a tiger with a piece of bone, and lions like Barzin, who could have made a headstall for Rakhsh with the skin of Godurz."[2] (82, 11)

'خون سیاؤشان' ایک سرخی مائل گھاس ہے ، دوا میں استعمال ہوتی ہے ۔ اس سے مطلب سیاؤش کا خون نہیں ۔ 'بزخم مشت استخوان شیر آرد کنند' یعنی گھونسے کی ضرب سے شیر کی ہڈیاں آٹے کی طرح پیس دیتے ۔ یہ مطلب نہیں کہ شیر کو ہڈی کے ٹکڑے سے پیس دیتے ۔ 'پلنگان بر زین' زین کے پلنگ (چیتے) یعنی گھوڑوں کے سوار ۔ یہاں برزین کسی شخص کا نام نہیں ہے بلکہ مرکب ہے 'بر' اور 'زین' سے اگرچہ ایہام کی رعایت ضرور ہے ۔ گودرز پر حاشیہ ذیل دیا گیا ہے :

2. Rakhsh was Rustam's horse and Godurz was his son. The biographies of the heroes of the Shah Nama, whose names occur in this paragraph, need not be detailed here.

اس حاشیے کی روشنی میں یہ معلوم نہیں ہوا کہ گودرز رخش کا بیٹا ہے یا رستم کا ۔ ہم سے اگر پوچھا جائے تو کہیں گے کہ وہ نہ رستم کے رخش کا بیٹا ہے اور نہ رستم کا ۔ خدا جانے پروفیسر صاحب نے یہ ہوائی کیوں چھوڑی ۔ ان میں جو رشتہ ہے ، یہ ہے کہ یہی گودرز ، جسے پروفیسر رستم کا بیٹا بنا رہے ہیں ، رستم کے نواسے بیژن کا دادا ہے ۔ بہت اچھا ہوا کہ پروفیسر نے 'شاہنامہ' کے افراد و اشخاص پر حاشیے دینا ضروری نہیں سمجھا ورنہ خدا جانے کیا کیا نئے گل کھلاتے ۔ مگر منہ پر آئی بات روکنا بھی نہیں چاہیے ۔ وہ یہ ہے کہ پروفیسر مشہور مشہور اشخاص کیخسرو ، نوشیرواں اور ضحاک وغیرہ پر تو حاشیہ دینا ضروری سمجھتے ہیں لیکن جہاں ذرا غیر مشہور نام مثلاً گرگین ، اردشیر وغیرہ آئے ، حاشیے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔

صفحہ ۱۲۸/۱۳ : ''مدت بیست و یک روز رانندگان تیزی تیز رو منزلہای دراز می [بریدند] ۔''

> "For twenty one days the men of the army made long marches . . ." (p. 82, para. 3)

'رانندگان تیزی تیز رو' یعنی 'رانندگان تازی تیزرو' یہ فقرہ ترجمے سے چھوٹ گیا ہے ۔

صفحہ ۱۲۹/۳ : ''اسپان پیل ہیکل ، از بس بلندی کوہ ، بحدی خورد می نمودند ، گوئی تیغ کوہ مورچہ گرفتہ ۔''

> "On the summits of the mountains the horses appeared small like needle-points of rust on the blade of a sword."
> (p. 82, para. 3, l. 6)

اس جملے میں 'تیغ کوہ' پہاڑ کی چوٹی اور 'مورچہ' چیونٹی ہے ۔ مطلب ہے کہ قوی ہیکل گھوڑے بلندی کی بنا پر ایسے چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے تھے جیسے پہاڑ کی چوٹی پر چیونٹی رینگتی ہو ۔ پروفیسر کا یہ کہنا کہ 'تلوار کے پھل پر سوئی کی نوک کے برابر زنگ' بالکل غیر موزوں ہے ۔

صفحہ ۱۲۹/۶ : ''و ہر کوہ بحدی بلند کہ کرگس کیکاؤس با چندان بلند پری

هم در بر رفتن آن مردار شود کہ بہ تیغ نرسد ۔"

" . . . and the vultures of Kai Kaus[4] would have perished in attempting to fly above the mountains." (p. 82, para 3, l. 10)

یہاں پھر تیغ (پہاڑ کی چوٹی) کا ترجمہ حذف ہو گیا ہے اور کیکاؤس پر یہ حاشیہ دیا ہے :

4. Kai Kaus, a famous emperor of Persia, attempted to fly to the sky on a throne carried by birds, but when the birds were tired, he fell down and died.

سبحان اللہ ! ابھی چند سطر پہلے رستم کو گودرز کا باپ بیان کیا گیا تھا ، یہاں کیکاؤس کو مار دیا جاتا ہے ۔ اگر کیکاؤس آسمان پر اُڑتے وقت گر کر مر جاتا تو فردوسی یہ مشہور شعر اس کے پہلوان گودرز کی زبان سے ، جو ملامتاً اسے کہا گیا ہے ، کبھی نہیں لکھتا :

بجنگ زمین سر بہ سر تاختی
کنون باسمان نیز پرداختی

ہم پروفیسر صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ کیکاؤس اس واقعے کے بہت عرصے بعد تک زندہ رہ کر اپنی قدرتی موت مرتا ہے ۔

صفحہ ۱۲۹/۱۵ :

آنکہ سر [برکف] نہد در پیش تیغ از بہردین
[اوز] پاکی ترسد ار خود تیغ روید بر زمین"

"For when a man, for the sake of his faith, carries his head on the palm of his hands before the enemy's sword, the blade of steel in frightened and hides . . ." [82, l. 2 (bottom)]

آخری مصرع کا ترجمہ نشانہ سے دور ہے ۔ امیر کا مطلب ہے کہ جو شخص دین کے واسطے سر دینے کو تیار ہے ، وہ بھلا پاؤں کے واسطے ، اگرچہ تلواریں زمین سے اگنے لگیں ، کیوں ڈرنے لگا ۔ یعنے جو دین کے لیے سر بکف ہے ، اسے پاؤں کی پروا کیوں ہونے لگی ۔

صفحہ ۱۳۰/۴ :

''دو [سی] صد شکر یزدان را کہ بگزشتہ ازان لشکر
کطیر علئے جتّو و فلک علئے ماء''

"A hundred thanks to God, that the army was able to cross the rivers, even as a bird flies through rain or the sky traverses the ocean." (83, 3)

پچھلے مصرع کا ترجمہ قابل اعتراض ہے۔ 'جتّو' = خلا۔ 'فلک' = کشتی۔ یعنی جس طرح پرندہ ہوا میں اور کشتی پانی میں۔

صفحہ ۱۳۰/۹ :

''وفوقہ علم السلطان لور نعوا
کانّہ علم من فوقہٖ علم''

"Like standards[2] fixed on mounds, they were sent as presents to the Sultan, if he would accept them." (83, 10)

صحیح ترجمہ یوں ہوگا : اور اس پر شاہی علم اگر بلند کیا جائے تو ایسا معلوم ہو کہ پہاڑ پر جھنڈا لہرا رہا ہے۔

صفحہ ۱۳۲/۳ : ''و باز در قلع جنگلہا و استیصال باغیان بادی گشت۔''

" . . . and afterwards employed itself in cutting down the jungles and destroying the gardens." (84, 5)

'باغیان' باغی کی جمع ہے - پروفیسر نے باغ بنا لیا۔ 'بادی' = ابتدا کنندہ۔

صفحہ ۱۳۳/۶ : ''رای رایان رام دیو کہ از کوس مہابت مہدی آوازۂ 'اسلام شیطانی' شنیدہ بود ، و دیو نفس خود را رام آن درگاہ ساختہ و رایش بر اخلاص جانی آرام گرفتہ۔''

"The Rai Rayan, Ram Deo, had heard safety to satan proclaimed by the dreadful Mussalman cymbols, and submitting to the Imperial Court, considered himself safe under the protection promised to him." (84, para. 2, l. 8)

'کوسِ مہابتِ محمدی' یعنی محمد کے خوف کا نقارہ ، نہ جھانجھ ۔ 'محمد' علاءالدین کا نام ہے ۔ 'دیو نفس خود را' ترجمے سے چھوٹ گیا ہے ۔ 'رایش بر اخلاص جانی آرام گرفتہ' یعنی اس کی خواہش دلی اخلاص پر قائم تھی ۔ عبارتِ متن میں کوئی ایسے الفاظ نہیں جن کے معنے 'وعدہ کردہ حمایت ہوں' ۔ 'اسلم شیطانی' (میرا شیطان اسلام لے آیا) تلمیح ہے ایک حدیث کی طرف جس میں یہی الفاظ وارد ہوئے ہیں ۔ اگرچہ مجھ کو اصل حدیث ، جس میں ''اسلم شیطانی'' آتا ہے ، نہیں ملی ، مگر میں اپنے اس خیال کی تائید میں اسی کے قریب ایک اور حدیث نقل کرتا ہوں :

''عن ابی مسعود قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مامنکم من احد الا و قد وکل بہ قرینہ من الجن و قرینہ من الملائکۃ قالوا و ایاک یا رسول اللہ قال و ایای و لکن اللہ اعاننی علیہ فاسلم فلا یامرنی الا بخیر ۔ رواہ مسلم (مشکٰوۃ المصابیح ، صفحہ ۱۰ ، باب الوسوسہ ، طبع دہلی ، ۱۲۶۷ھ)

اب ظاہر ہے کہ کسی حدیث میں 'اسلم شیطانی' بھی آتا ہے ۔

صفحہ ۱۲/۱۳۴ : ''و تنکہای سرخ و سپید چون گل سوری و صد برگ توبرتو نہادہ ۔''

"... and red and white tankas lay before them like roses and many petelled flowers." (85, 2)

'صد برگ' کا ترجمہ گلاب درست نہیں ۔ خسرو کے بیان سے ، جو گل کوزہ اور گل صد برگ کے متعلق 'دول رانی خضر خان' میں دیا گیا ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ کوزہ اور صد برگ دونوں ہندوستانی پھول ہیں جو ایران میں نہیں ہوتے اور ان کے یہ فارسی طرز کے نام مسلمانوں کے رکھے ہوئے ہیں :

ز گلہای ترِ ہندوستان ہم
شدہ سرگشتہ باد و بوستان ہم
گل کوزہ کہ دور چرخ گردان
پدید از خاک پاک ہند کرد آن
بہ تری آب را در کوزہ کردہ
لطافتِ آب ازو دریوزہ کردہ

گل صد برگ را خوبی ز حد بیش
نموده صد ورق دیباچهٔ خویش
اگرچه پارسی نامند اینها
ولی در هند زادند از زمینها
گر این گل در دیار پارسی زاد
چرا زو نیست در گفتار شان یاد

(صفحہ ۱۳۰ - ۳۱)

'صد برگ' امیر کے نزدیک ایک زرد رنگ کا پھول ہے ، چنانچہ قران السعدین :

باد ہمہ خاک زمین را بہ بیخت
یافت زر و در بر صد برگ ریخت
بسکہ گرانیٔ زر از حد گذشت
دامن صد برگ بصد پارہ گشت

اس سے ظاہر ہے کہ امیر 'ہزارہ' کو صد برگ کہتے ہیں ۔

صفحہ ۶/۱۳۵ : ''تا ہر کہ ہست عدالی میداد و بقیمت عدل کالای می خرید ۔''

''Everyone gave good money and brought things at a just price.'' (85, 10)

'عدالی' کی جگہ 'عدلی' پڑھنا چاہیے ، جو ایک سکّے کا نام ہے ۔ طامس ، جو مسلمانی مسکوکاتِ ہند پر امامِ فن کہلانے جانے کا مستحق ہے ، اپنی مشہور تصنیف 'تاریخ پٹھان سلاطین دہلی' میں (صفحہ ۲۴۸) 'خزائن الفتوح' سے یہی جملہ نقل کرتا ہے اور صاف عدلی لکھتا ہے ۔ سلطان محمد بن تغلق کے عہد کے مسکوکات اور ان کی قیمت پر بحث کرتے ہوئے طامس کا بیان ہے کہ اس عہد میں دو قسم کے نقرئی سکّے رائج ہیں : پہلا تنکۂ قدیم جو ۶۴ کانی کا ہے اور دوسرا عدلی جو صرف پچاس کانی کا ہے ، جو انگریزی حساب سے بالترتیب ۱۷۵ اور ۱۴۰ گرین وزن میں ہوئے ۔

پیرزادہ محمد حسین ، 'سفرنامۂ ابن بطوطہ' جلد دوم ، صفحہ ۱۱۱ ، ح ۴ ،

لکھتے ہیں کہ معمولی تنگۂ نقرہ کے چونسٹھ جیتل ہوتے تھے اور عدلی کے پچاس۔ اور فرشتہ نے جو لکھا ہے کہ تنگہ کے پچاس ہول آتے تھے ، اس کی مراد عدلی ٹنکہ ہے اور ہول سے اس کی مراد جیتل ہے۔ اسی حاشیے میں (صفحہ ۱۲) موصوف رقم طراز ہیں :

''بطوطہ کے وقت میں تین طرح کے ٹنکے تھے : (۱) ٹنکہ سفید ، جو خالص چاندی کا سورتی کا اور اسّی رتی کا ہوتا تھا۔ اسّی رتی والے کو عدلی بھی کہتے تھے ... ابن بطوطہ نے معمولی ٹنکہ سفید کو ہمیشہ دینار کہا ہے اور عدلی کو درہمی دینار۔''

یہاں میں ایک عدلی کا سکّہ بھی بغرضِ اطلاعِ ناظرین درج کر دیتا ہوں۔

رخ اول = کلمۂ شہادت

رخ دوم = 'الواثق بتائیدالرحمٰن محمد شاہ السلطان'۔ اور حاشیے پر = 'ضرب هذا العدلی بحضرة دهلی۔

سنه خمس و عشرین و سبعمایه'

طامس کے ہاں اس سکّے کا نمبر ۱۸۰ ہے اور وزن ایک سو چالیس گرین ہے (صفحہ ۲۱۳)۔

انڈین میوزیم میں ایک اور عدلی ہے جس کا نمبر ۳۲۳ ہے اور وزن ۱۴۱۰۵ (فہرست انڈین میوزیم کلکتہ ، جلد دوم ، از نیلسن رائٹ)۔

مگر یہ ذکر محمد تغلق کے عہد کا ہے ، جب سکّوں کے تعلق میں جدید تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں۔ حضرت امیر خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عدلی علاءالدین کے عہد میں بھی کسی سکّے کا نام ہے۔ اگرچہ اس عہد میں کوئی چاندی کا سکّہ ایسا نظر نہیں آتا جس کا وزن اسّی رتی یا ایک سو چالیس گرین ہو۔

صفحہ ۲/۱۳۴ : ''آن شکل عهد یعنی رای رایان ، برای رضای بندگان شاه نامهٔ بندگی را برقم اخلاص بیاراست۔''

"In order to please the servants of the Emperor, this model of his generation i.e. the Rai Rayan, wrote a letter of homage with pen of sincerity . . ." (84, 23)

یہاں شنکل (شنکر) چاہیے ، نہ شکل ۔ شنکل ہندوستان کے راجا کا نام ہے جس کے پاس بہرام گور قاصد بن کر آتا ہے ۔ رائے رایان نے خط نہیں لکھا ہے بلکہ 'بندگی' کو 'نامہ' سے اور 'اخلاص' کو رقم کے ساتھ مثال دی گئی ہے ۔ بالفاظِ دیگر اس نے اپنی خدمت کو اخلاص کے ساتھ آراستہ کیا ۔

صفحہ ۹/۱۳۴ : ''باشارت رای نیک اصل ، کہ نہال کردۂ درگاہ خلافت پناہ است ، بازار های شہر را چون بوستان ارم بیاراستند ۔''

> ''At the order of the noble Rai, who was a tree planted by the Imperial Court, the markets of the city were decorated like the garden of aram, . . .'' [84, 5 (bott.)]

'نہال کردن' وہی محاورہ ہے جو اردو میں بھی آتا ہے ، یعنے نہال کرنا ، مالا مال کرنا ، سر افراز کرنا ۔ 'ارم' بکسر اول ہے ، نہ بفتح ۔

صفحہ ۱۵/۱۳۴ : ''میوهای بہ از بہ و نغز تر از نغز بار بر بار انبار کردہ ۔''

> ''Fruits better than pomegranates, and rare than naghz lay in heaps.'' (85, 6)

'بہ' انار کو تو نہیں کہتے ، بلکہ وہی بِہی ہے جسے آبی بھی کہتے ہیں ۔ پروفیسر کا ترجمہ قابلِ اطمینان نہیں ۔ 'نغز' کسی میوے کا نام نہیں ۔ آم کے معنوں میں نغزک آتا ہے ۔ ہمارے خیال میں یوں ترجمہ ہوتا :

اچھے سے اچھے اور عمدہ سے عمدہ میوے کا ڈھیر پر ڈھیر انبار لگا ہوا تھا ۔

صفحہ ۱۳/۱۳۴ : ''بزازان جامہای گوناگون کہ از بہار ھند تا باورد خراسان ، امثال آن بورود صبا [نشان] نتوان یافت ۔''

> '' . . . the cloth-merchants had every variety of cloth from Bahar-i-Hind to the bawardi Khorasan, the like of which you cannot find among the flowers of the gardens . . .'' (85, 3)

ترجمے کا آخری حصّہ غلط ہے ۔ مطلب یہ ہے جس کی مثال ورود و صبا میں بھی نہیں مل سکتی ۔ ورود اور صبا (سبا ؟) شہروں کے نام معلوم ہوتے ہیں ۔

صفحہ ۲/۱۳۹ : ''وازان سہابت ، چون زحل منعکس ، بحال بد و طالع معکوس ، بسوی برج ھبوط خویش راجع شدہ ، و از سیارہ سیر و نسر طائر طیر دام شدہ ، در

بیت الحفیض خویش رسیدہ ۔"

"—Bilal Deo like an upturned and unlucky saturn, marched down to his own low constellation." (87, 8)

یہ ترجمہ تحت اللفظی نہیں مانا جا سکتا ۔ اس کا آخری نصف ترجمے سے حذف ہو گیا ہے ۔

صفحہ ۱۳۹/۱۳ : "و تیغ زنانی کہ بیک ضرب شمشیر [گرد] کوہ را چون جوزی ، بدونیم سازند ۔"

" . . . and swordsmen who could cut a hill into two like a net." (87, para. 2, l. 7)

گرد کوہ ایک پہاڑ کا نام ہے ۔ اسی قسم کی غلطی اس سے پہلے بھی نظر سے گزری ہے ۔

صفحہ ۱۴۰/۴ : "و از [زبر] دیدن آن باد بقفا افتد ۔"

" . . . and the attempt to gaze at the heights took away the onlooker's breath." (87, para. 2, l. 10)

یہ مطلب نہیں کہ تماشائی کا دل الٹ جائے ، بلکہ یہ مطلب ہے کہ ہوا اوندھے بل گرے ۔

صفحہ ۱۴۲/۷ : "روزگارھا باید تا چون تو [دودۂ] از دودمان آتش پرستان در دھور سمندر بر آید خود دراں شبہ نیست : ع

من النار یبدو بالدھور سمندر "

"Ages will be required, said they, before the pillar of fire-worshipping tribes can be raised in Dhur Samandar again. There is no doubt that our origin is from fire and from Dhur Samandar (Salamandar)." (p. 88, para. 2, l. 13)

یعنے بڑا زمانہ درکار ہے تب کہیں دہور ، سمندر میں تیرے جیسا خاندان آتش پرستوں کے قبائل میں پیدا ہو سکتا ہے ۔ اور مصرع کا مطلب یہ ہے کہ بہت زمانہ گزرنے کے بعد آگ میں سمندر پیدا ہوتا ہے ۔

صفحہ ۱۱/۱۴۲ : ”آخر این قلعہ کہ بیرو دھور سمندرش میگویند ، نزدیک خویش آبی دارد ، و پیوستہ درین زمین [با آب] بودہ است ۔“

“ . . . our fort is called Dhur Samandar (sea) ; water is, and always has been, within reach.” [88, para. 2, l. 6 (bott.)]

’آب‘ یہاں بمعنی عزت و احترام ہے ، نہ پانی کے معنوں میں ۔

صفحہ ۱۱/۱۴۳ : ”و آن همه ساغرهای دریاوش را کہ گردا گرد دور حصار بود ، میدان کمیت تصور کردند ۔“

“He thought that the flasks by the side of the ditch were like a wine table laid out.” (p. 89, para. 2, l. 4)

یہ ترجمہ نا قابلِ قبول ہے ۔ ’ساغر‘ یہاں ہندی لفظ ’ساگر‘ (تالاب) کا مفرّس ہے ۔ یہ لفظ دہلی میں مسلمانوں کے داخلے کے بہت جلد بعد فارسی میں لے لیا گیا ہے ۔ قِران السعدین میں بھی آتا ہے ۔ چنانچہ :

چوترہ و قصرِ بلندش در آب
گشت ازان ساغر صافی حباب

(صفحہ ۳۴ ، علی گڑھ ایڈیشن)

قلعہٴ بیر کے گرد ، امیر خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ، ساگروں (تالابوں) کا ایک سلسلہ جاری رہا ہے ۔ چنانچہ اس سے قبل بھی کہا ہے : ع

محیط گشتہ ز ہر سو بگرد بیر غدیر

(صفحہ ۱۴۱/۶ ، خزائن الفتوح)

غدیر سے مطلب یہی ساگر ہیں ۔ اس کے علاوہ اس مصرع کے ساتھ والی عبارت میں ، جس کے متن کی صحت سے میں عاجز ہوں اور پروفیسر نے اپنے ترجمے میں حذف کردی ہے ، پھر ان ساغروں کے سلسلے کا ذکر آتا ہے ۔ وھو ھذا :

گوئی میان گرداب بنیاد بست محکم
با چندان دور ساغرهای لبالب خرابیش کم [1] (کذا)

۱- میں نے یونیورسٹی کے مخطوطے سے اس عبارت کو نقل کیا ہے ، جہاں وہ شعر کی شکل میں لکھا گیا ہے ۔ مطبوعہ متن تو نہایت غلط ہے ۔ (حاشیہٴ مصنف)

ہمارے نزدیک اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ان ساگروں کو ، جو قلعے کے چاروں طرف اور دریا کی طرح وسیع تھے ، اسپ دوانی کا میدان خیال کیا ۔

صفحہ ۱۴۳/۱۲ : ''و النگ ھای شیران مست و سرگران ہشیاران شیرگیر ، مجلس بہ مجلس ، مرتب گردانید ۔''

> "The ferocious lions and tigers (of the army) were organized, party by party . . ." (p. 89, para. 2, l. 5)

'النگ' (= جمعی را گویند کہ مردم بیرون قلعہ جابجا بجہت گرفتن قلعہ تعین نمایند) کا ترجمہ اصل نہیں ۔ 'شیران مست و سرگران' کا ترجمہ شیر ببر اور شیر مناسب نہیں ۔ 'هشیاران شیر گیر' بھی ترجمے سے حذف کر دیا گیا ہے ۔

صفحہ ۱۴۴/۱۶ : ''تا چون بامداد آن روز خجستہ جمعہ جامع عالم را بہ بساط نور بیاراید ، آن جماعت مجاہدان بہ سنت غزا کار جہاد پیش [برند] ، دیوار حصار را چون مصلائی صف بر روی زمین پست بگستردند و در آن دیو خانہ با صفہای ملائک در روند و بعزت تمام ۔ شعر

یقیمون فیہا خطبۃً و جماعۃً
الی ان اضاسا تقر و تسجد''

> " . . . next morning they would commence the struggle and enter the houses of demons in full force to establish the Khutba and prayer where the idols had been worshipped." (p. 90, para. 2, l. 11)

یہ ترجمہ نہ مرادی ہے نہ تحت اللفظی ، اوراس کی خامیاں میرے بتائے بغیر ظاہر ہیں ۔

صفحہ ۱۴۵/۷ : ''چون گیسو مل در گیسوی مل دام شب چو عساکر انبوہ تر از موی [سر عظمہ] اللہ را سراسر معاینہ کرد ۔''

> "When through the locks of teh night, Gaisu Mal saw the enormous army spread out like the hair on a man's head." (p. 98, para. 3, 1. 1)

یہ لفظ 'کیسومل' ہے یا 'کیسوسل'؟ 'مل دام' اور 'عظمہ اللہ' کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۴۶/۶: ''و اگر بنیاد کاو کاو برای خرابی این چہار دیوار باشد، پیش خویش دیوار بر نتوان آورد حصار حصار پادشاہ است۔''

"If all this noise and tumult is for the destruction of the four walls of this fort, they are, as they stand, no obstacle to your advance. The fort of the sultan ; take it." (91, 7)

'کاو کاو' کے معنے کاوش و محنت و لقب ہیں، نہ شور و غوغا، جیسا کہ مترجم نے لکھا ہے۔ یہ لفظ اس سے پہلے بھی آ چکا ہے اور مترجم ہر جگہ اس کے لیے نئے معنے دیتے ہیں۔ 'پیش خویش دیوار بر نتوان آورد' یعنے اپنی حفاظت کی غرض سے دیوار تک نہیں بناؤں گا۔ 'اس پر قبضہ کر لو' اس مطلب کی کوئی عبارت متن میں موجود نہیں۔

صفحہ ۱۴۶/۷: ''گیر کہ بندہ بلال دیو از سر قلعہ سنگی چند پرتاب کرد۔ لاحول کہ آن سنگ دیو بر آدمیان آسیب تواند آورد۔ پس چہ بہ ازانکہ سنگ خود باخود نگہ دارم و چون ہندوان دیوگیر سر در پریشانی نہ نہم۔''

"The servant, Bilal Deo, has thrown a few stones from the top of his fort; but God forbid that the stones of a demon should do any harm to men ! And what can be better for me than to keep my stones to myself, and remain out of harm's way like the Hindus of Deogir ?" (91, 9)

'گیر' یہاں 'فرض کرو' کے مفہوم میں لایا گیا ہے۔ پروفیسر نے 'اس پر قبضہ کرو' معنے دے کر جملۂ سابق سے اسے متعلق کر دیا۔ 'سنگ خود' یعنے 'آبروے خود'۔ امیر کا مطلب ہے کہ مجھے چاہیے کہ میں اپنی آبرو کی حفاظت کروں اور دیوگیر کے ہندوؤں کی طرح اپنے آپ کو (مقابلہ کرکے) پریشانی میں مبتلا نہ کروں۔ یہ اشارہ ہے رام دیو والیٔ دیوگیر کی سرکشی کی طرف۔ اس کی تنبیہ کے لیے ۷۰۶ھ میں بہ سرکردگی ملک نائب باریک ایک مہم روانہ ہوئی۔ رام دیو گرفتار ہوا اور دہلی لایا گیا۔ (خزائن الفتوح، صفحہ ۷۰–۷۳)

صفحہ ۱۴۶/۱۱ : ''بنگر کہ چند جانہای دیوان ہندو در غبار لشکر بادشاہ گرد باد شدہ می گردد۔''

"Behold! the spirits of so many Hindu demons are revolving in the dust round the Imperial Camp." (91, 16)

'گرد باد' = بگولا۔ بگولے کے متعلق ہندوؤں (راجپوتانہ) میں آج بھی اعتقاد ہے کہ اس میں بھوت ہوا کرتا ہے۔ امیر خسرو کی عبارت میں اسی عقیدے کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

صفحہ ۱۴۷/۶ : ''کہ اول شمع دو زبانہ' لاء شہادت پیش ایشان داریم۔''

"First I am to place before them the two negatives of the oath of affirmation." (p. 91, para. 2, l. 5)

یعنے سب سے پہلے ہم لاء شہادت کی دوہرے شعلے والی شمع (بغرض ہدایت) ان کے سامنے رکھیں۔ کلمہ' شہادت میں لاء نافیہ صرف ایک ہے نہ دو۔ شمع دو زبانہ' سے مراد کلمہ' شہادت کا لاء نافیہ جس کی شکل، اگر اس کو کوفی خط میں لکھاجائے، تو شمع دو زبان سے ملتی ہے یعنی اس طرح :

صفحہ ۱۴۷/۱۰ : ''ازین سہ شرط بلال دیو بر کدام می آساید ما نیز بارای زنان لشکر بدان میزان کار بسنجیم۔ جوابی باید بمیزان رای سنجیدہ تو نیز اندیشہ' خویش۔ مصرع :

بصدق سنج بدان سان کہ ما ترا 'زوری''

" . . . which of these three conditions pleases Rai Bilal Deo most, so that I may consult the heads of the army and give you a reply suited to your judgement as well as mine? Weigh your reply carefully, even as I weigh you." (92, 1)

اس عبارت میں پچھلے حصے کا ترجمہ غلط ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان تینوں شرطوں میں سے بلال دیو کو کون سی منظور ہے۔ وہ ہمیں بتائے تاکہ ہم بھی اس کی بنیاد پر اپنے لشکر کے مشیروں سے مشورہ کر لیں۔ جواب غور و خوض

کے بعد آنا چاہیے ، تیری رائے سچائی پر مبنی ہونی چاہیے جس میں دروغ و فریب نظر نہ آئے ۔

صفحہ ۱۴۷/۱۵ : ''فرستادگان رای از سهم آن پیغام نزدیک بود کہ سپری شوند از سر شکستگی گفتند کہ ما پیکان هندوایم و این پیغامہا کہ از تیر راست تر است چون هندوان را کیش درست نیست ، شاید کہ کژی درانہا راه یابد ۔''

"The Rai's messengers nearly collapsed at the fearful ultimatum. 'We are Hindu arrows', they said with their broken spirits, and Hindus are not good marksmen. May be your message, which is straight as an arrow, will become somewhat crooked (if we deliver it). (92, 4)

'از سر شکستگی گفتند' یعنے عاجزی سے کہا ۔ 'پیکان ہندو' = ہندو قاصد ، نہ ہندو تیر ۔ پیک واحد ہے اور پیکان جمع ۔ 'هندوان را کیش درست نیست' یعنے ہندوؤں کا مذہب سچا نہیں ہے ۔ اس عبارت میں کوئی ایسا فقرہ نہیں جس کا یہ مطلب ہو کہ ہندو اچھے نشانہ باز نہیں ہوتے ۔

صفحہ ۱۴۸/۴ : ''ملک را [این چنین] فرستادنی کہ رمیاً بغیر رام بود ، محض ثواب نمود ، و کس حاجب هندوان پر مار را ، کہ مانند تیر ترکان مار با پر دیو ، بہ نیروی تمام ، با آن دو سہ روندۂ دیگر پرتاب کرد ۔''

"The malik welcomed the idea. He ordered some Hindu Parmar hajibs—who like Turkish arrows, were strong snakes with wings of demons to go along with the two or three ambassadors of the Rai." (p. 92, para. 2, l. 1)

اس فقرے میں 'این چنین فرستادنی کہ رمیاً بغیر رام' (ایسا بھیجنا جس کا اچانک موقع مل گیا) کا ترجمہ چھوٹ گیا ۔ 'مار با پر دیو' کی جگہ 'مار با پر بود' چاہیے یعنے پر دار سانپ ۔

صفحہ ۱۴۸/۷ : ''رای بمجرد شنیدن آن صریر زهره شگاف دیوانہ وار از جای بجست ۔''

"The Rai jumped up from his place like a mad man on hearing their venus—rending voices." (p. 92, para. 2, l. 6)

'زہرہ شگاف' یعنی پتہ پھاڑ دینے والی ، مراد دل ہلا دینے والی آواز ۔ ستارۂ زہرہ سے مراد نہیں جیسا کہ مترجم صاحب سمجھے ۔

صفحہ ۱۴۸/۱۲ : ''بندہ بلال نیز یکی از دھانکان است ۔''

"Bilal is also one of the tribute—payers." (92, para. 2, l. 14)

دھانک ہندی لفظ ہے جس کے معنے تیر انداز ہیں ۔ یہاں مراد خدمت گار و ملازم ہیں ۔

صفحہ ۱۴۹/۳ : ''رسولان چون تواضع رای ، کہ در شکستگی بکمان لزوم می مانست ، درست کردند ، بدان اعتماد ، کہ شکستگی [او] استوارہ ... داشت ۔''

> "Whe... e Imperial messengers had consoled the Rai, who looked like a broken bow, and were sure that his weakness could not be reparied." [92, 4 (bott.)]

'شکستگی' = عجز و لجاج ۔ 'کمان لزوم' = کمان لیزم ۔ کمان نرم برای مبتدیان ۔ 'درست کردند' = تحقیق کر لیا ۔ ثابت کر لیا ۔ اس فقرے میں پروفیسر صاحب نے بالکل راہ غلط کر دی ۔ مطلب یہ ہے کہ جب شاہی ایلچیوں نے رائے کی عاجزی کو جو باںحاظ لجاج و تواضع (جھکنے) لیزم کی کمان کی طرح تھی ، تحقیق کر لیا ، اس اعتماد پر کہ اس کا عجز و الحاح قابلِ یقین تھا ۔

صفحہ ۱۴۹/۶ : ''و خدمتیہای [وجود] خم خوردۂ او ، کہ بابت زہ بود ، بہ کمان کشان لشکر رسانید ۔ چون ملک را درست گشت ، کہ آن متعصب [پی گم] بقربان خویش راضی شدہ ، گرد خشم از سر ابرو یکسو نہاد و کمان غزا را [از] شکنجہ آسایش داد ۔''

> "The Rai's presents, which were suitable for the bow-string, were given over to the archers of the army ; and the Malik, having assured himself that the Rai was sincere in the promise he had made, removed the knot of anger from his brow and placed his bow comfortably on its rack." (92, l. 1)

'بابت زہ' = تحسین کے قابل ۔ 'و کمان غزارا [از] شکنجہ آسائش داد' یعنے جہاد و جنگ کی کمان کو چلہ کشی کے شکنجے سے سکون دیا ۔

صفحہ ۱۴۹/۱۵ : ”و قامت خدمت را پیش سائبان اعلیٰ ، بقدر تیر پرتابی ، کمان خدمتی ساختند ، و سخن پر چاشنی آغاز کردند ، کہ بہ زھی پر زد ۔“

"They brought their presents and bowed before the Imperial canopy, like a bow when an arrow is shot from it; next like an arrow springing from the bow-string, they began their alluring speach." (93, para. 2. l. 5)

یہ ترجمہ صحیح نہیں مانا جا سکتا ۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے سائبان اعلیٰ کے سامنے اپنے خدمت کرنے والے قد کو ایک تیر پرتاب کے فاصلے سے تسلیمات ... کی طرح بنا دیا (جھکا دیا) اور چاشنی دار گفتگو ، جو بہت کچھ تحسین و آفرین تھی ، شروع کر دی ۔

صفحہ ۱۵۰/۱۲ : ”دو شاخہٴ آھن در بنا گوشش ، پنداری لائی لاحول است ۔ ع :

کہ کردہ است آھرمنی را زبون“

یہ عبارت ترجمے سے رہ گئی ہے ۔

صفحہ ۱۵۰/۱۴ : ”سخت سری فرمان بردار [وز] بارھای گران بار ساختہٴ بار بادشاہ ، از در آرایش درگاہ ، قصابی ستور را از کنگر آھن آویختہ و کنگر آھن را از عاج دستہ انگیختہ ۔ زر ناب برتابش کمر کاربستہ ، نایش ھنگام کار در آھن غرق نشستہ بناگوشش از دو جناق زینت و زیبائی سوار در عقب جناق ۔ بی رکاب کارگر خرطومش نشانہ ماھی ، گوشش باد بیزن داخل بادشاھی ۔ فراخ نای باریک آواز ، دستش بی چنگ ، پایش دو طرف دف ساز ۔“

"Hard headed but obedient, it bore on its back the prestige of the Court. From a wide throat it emilted a soft sound. Its hands were without fingers and its feet beat like drums on either side." (93, para 3, l. 5)

عبارتِ بالا میں سے صرف جلی عبارت والے حصے کا ترجمہ کیا گیا ہے ۔ پہلے جملے کے نصف ثانی میں 'وز بارھای' کو 'دربار ھای' پڑھ کر پروفیسر نے اس کا ترجمہ 'وہ اپنی پشت پر جلال و جاہ دربار کا حامل ہے' کیا ہے ۔ حالانکہ صحیح

ترجمہ 'اور بھاری بھاری وزنوں سے لدا ہوا' چاہیے - 'دستش بی چنگ' کے معنے 'اس کے ہاتھوں میں چنگ (ساز موسیقی) نہیں ہے' چاہیے -

صفحہ ۱۵۱/۳ : "کرگ را ازو در شکم [دندان و شیر را از] دندان او پہلو چون دهن خندان ـ"

"It could tear open the sides of a wolf as wide as laughing lips. . ." (93, para, 3, l. 9)

یہاں 'گرگ' کی جگہ 'کرگ' (گینڈا) پڑھنا چاہیے - ہاتھی کے لیے بھیڑیے کا پیٹ پھاڑنا کون سی ناموری کا کام ہے - مطلب ہے کہ اس کے دانت گینڈے کے پیٹ میں گھس جاتے ہیں ، اور شیر کا پہلو اس کے دانتوں سے منہ کی طرح ہنسنے لگتا ہے ، یعنی کھل جاتا ہے -

صفحہ ۱۵۱/۷ : "ناخنش دافع ناخنہ ، اما ہر جا کہ آن ناخن رسیدہ چشم با ناخنہ بیرون پریدہ ـ"

". . . and at the same time carve out their eyes with her nails." [93, l. 2 (bott)]

اس عبارت کا تو یہ مطلب ہے کہ اس کے ناخن آنکھ کی بیماری 'ناخنہ' کو دور کرتے ہیں ، بلکہ جہاں جہاں یہ ناخن پہنچتا ہے ، آنکھ ناخنے سمیت نکل پڑتی ہے -

صفحہ ۱۵۲/۵ : "[اذیال] سایہ بان ، کہ باوتاد جبال پیوستہ بود ـ"

". . . and the canopy, which has the hills for its pegs—" (94, 10)

فقرۂ بالا کا یہ مطلب نہیں کہ سائبان اعلیٰ ، جس کی میخیں پہاڑ ہیں ، بلکہ یوں کہنا چاہیے 'سائبان شاہی کا سایہ جو پہاڑوں کی میخوں سے پیوست ہے' -

صفحہ ۱۵۲/۱۳ : "نقرہ خنگان سیہ سم ، پنداری کہ شب در پای خورشید فتادہ است ـ"

". . . white horses with black hoofs, like an eclipse over-shadowing the sun." (94, para. 2, l. 12)

اس فقرے کے آخری حصے کے اصل اور ترجمے میں تخالف مطالب میرے کہے بغیر ظاہر ہے ۔

صفحہ ۱/۱۵۳ : ''طینت شان از باد انگیختہ چنانکہ از آب نتوان ریخت ۔''

"Their essence was from the wind and rain could do them no harm; (84, para. 2, l. 15)

'طینت' سے مقصد طبیعت اور فطرت ہے ۔ 'انگیختہ' یعنے آفریدہ ۔ 'ریختن' تشکیل دینے اور صورت بنانے کے معنوں میں ہے ۔

صفحہ ۲/۱۵۳ : ''سم شان از آہن ، و ایستاد شان بر ہوا ممکن ۔ کلک شان ، چون نی بر آب ، از غرق شدن ایمن ۔''

"They wore shoes of iron and could, nevertheless, dance in the air. Their limbs were like reeds, and they could not, therefore, be drowned in water." (94, para. 2, l. 17)

'کلک' پاؤں اور ٹانگ کے معنوں میں معلوم ہوتا ہے ۔ اس کا استعمال صفحہ ۱۰/۱۶۸ پر بھی ہوا ۔

صفحہ ۵/۱۵۴ :''آن ہمہ گنجہای خورشید تاب ، کہ از دست او خاک بر سر افگندہ بود ، دامن افشان کردہ ، پیش سایہ بان ہمایونی رسانید ۔''

"... the Rai brought all the sparkling gems, which he had hitherto kept under ground, in his skirt before the august canopy..." (95, 4)

'از دست او خاک بسر افگندہ بود' = جس کی بنا پر وہ خاک برسر یعنے تباہ اور پریشان تھا ۔ یہ مطلب نہیں کہ اس نے زیر زمین دفن کر رکھا تھا ۔

'دامن افشان کردہ' = دامن جھاڑ کر ، دست بردار ہو کر ۔ یہ مقصد نہیں کہ دامن بھر کر لایا ۔

صفحہ ۲/۱۵۵ : ''و سوی تریہای دریا گؤ بر گاؤ بگم شتری راہ برداشتند و ازستہ' [جبال] را رشتہ دراز دادہ ، زمین می پیمودند و در زمینہای شتر گربہ ، کہ شتر در مغاکہای آن گربہ نماید ، چون پلنگ می جستند و موش خانہای مار پیچ ،

کہ دست بختیاں در وی تا موشک [بازو] فرو رود ، بپویۂ شتر می گذشتند ۔"

" . . . and led up and down across the valleys and rivers. The ground was extremely uneven; but the men jumped like lions accross hollows which made the camels weep, and cantered like camels over snake-holes and rat-holes where a bakhti[2] would have sank down to the neck." (95, 14)

'گاو' = فرسنگ ۔ یعنے دریا کی تری کی طرف فرسنگ بفرسنگ اونٹ کی چال چلتے ، اونٹوں کی مہاریں ڈھیل دیے ہوئے راہ طے کرتے اور اونچی نیچی زمین پر ، جس کے گڑھوں میں اونٹ بلی کے برابر نظر آتے ، چیتے کی طرح کودتے پھاندتے جاتے ۔ چوہوں کے پیچدار سوراخ جن میں اونٹوں کا پاؤں بازو کی مچھلی تک دھس جاتا پوئیہ عبور کر جاتے ۔ تیسرے فقرے میں پروفیسر نے 'گریہ' (نالہ و زاری) پڑھا ہے ۔ 'گربہ' (بلی) زیادہ موزوں ہے ۔

صفحہ ۱۵۵/۶ : ''وتیغہای کوہ سمّ اسپان را مانند شید (شیل) شتران می شکافت ۔ تیزہای [چوب] ہودجہای سخت را می درید و جوال دوز ہای خار میدوخت ۔ لشکر فرمان بردار در تحمل مشقت سہم بادشاہ ، ہر روز اگر بار کوہِ گران بر ایشان می نہادند ، بی ہیچ ناقہ و جملی بر میداشتند ۔"

" . . . the pointed stones tore the horse's hoofs with the deceptivity of a camel; the litters were torn by the rapidity of the march and then sewn up again by the throns. Yet the obedient army patiently bore all the labours of the compaign. If a heavy mountain had been laid on its back every day, it would have carried the mountain without hesitation or protest." (95, para. 2, l. 9)

پہلا فقرہ = پہاڑ کی چوٹیاں گھوڑوں کے سموں کو اونٹوں کے پاؤں کے شگاف کی طرح پھاڑ دیتی تھیں ۔ تیغ کوہ (پہاڑ کی چوٹی) کے معنے ابھی تک پروفیسر صاحب کی سمجھ میں نہیں آئے ۔

فقرہ دوم = لکڑیوں کے تیر عماریوں کو پھاڑتے اور کانٹوں کے سوے انھیں سیتے ۔ 'تیزہای' کی جگہ 'تیرہای' زیادہ مناسب ہے ، اگرچہ فقرے کی

گنجلک پھر بھی باقی رہتی ہے -

صفحہ ۱۵/۱۵۵ : ''کوهی پدیدار گشت ، سر بابر سوده و اضلع از رستنیها از بن کوهی کمر بستہ ، و تیغ برداشتہ ، و خبربان را در پناه گرفتہ -''

" . . . a mountain was seen that rubbed its head against the clouds ; on the hills in tront of it, there grew thorny trees, which, spear in hand, protected the garrisons that had taken refuge among them." (95, para. 3, l. 2)

'و اضلع از رستنیها' یعنے گنجا پہاڑ تھا - روئیدگی نہیں تھی - 'از بن کوهی کمر بستہ' دامن کوہ سے کمر باندھے ہوئے - 'تیغ برداشتہ' تیغ اٹھائے ہوئے یعنے اپنی چوٹی بلند کیے ہوئے -

صفحہ ۲/۱۵۷ : ''ولایتی مادۂ فساد هیچ وقت فحول اسلام را بہ خواب ندیده-''

"The rebels of that territory had never seen Muslim horse-men even in their dreams." (96, para. 2, l. 8)

یعنے وہ علاقہ فساد کے مادے سے بھرا ہوا تھا اور کسی وقت بھی اس نے اسلام کے نروں (بہادروں) کو خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا - 'مادہ' کی رعایت سے 'فحول' لایا گیا ہے -

صفحہ ۲/۱۵۸ : ''دروغین شهر بیرو رای بیر - نظم :

آن بیر بلا هردو چون کرد فلک پیدا

با داه شیاطین قد یعمر بیران''

یہ عبارت ترجمے سے رہ گئی ہے -

صفحہ ۵/۱۵۸ :'' چون بیر را گفتند کہ 'واقعہ خواهد افتاد' سرش باز شد ، دهان باز کرده بماند - خواست کہ چون چاه در زمین فرود رود ، اما باز در خود فرو رفت ، کہ نباید رسن در گلویش کنند ، و آبش بہ برند -''

"An event is going to happen, they told Bir, your head will be taken off and you will be left with your mouth open. Bir wished to sink into the earth like a well, but on further

reflection, he felt afraid that they (the Mussalmans) might throw a rope down his throat and take out all his water."
(97, 3)

'واقعہ خواهد افتاد' یعنے بڑا حادثہ پیش آنے والا ہے - 'سرش باز شد' مطلب یہ ہے کہ اس کی آنکھیں کھلیں - 'دهان باز کردہ بماند' یعنے حیران و سراسیمہ رہ گیا - 'و آبش بہ برند' = اور اس کی بےعزتی کریں -

صفحہ ۱۵۸/۱۰ : "اکنون مرا کہ بیرم از انبوهی لشکر ترک بی آبی تمام پیش آمدہ است -"

"But now I, who am Bir (well), suffer from a great scarcity of water owing to the enormous Turkish army." (97, 11)

'بے آبی تمام پیش آمدہ است' یعنے بڑی بے آبروئی کا موقع پیش آیا ہے -

صفحہ ۱۵۸/۱۲ : "ای بیر برین سوی نیائی کہ ما را در چاہ افگنی بلک از دست تو خود را در چاہ افگنیم - ما حوض خشک نہ ایم کہ کاو کاو بیر در ما افتد -"

"O Bir, do not come to this side, for in this fall of kingdoms I will be only overthrowing myself alongwith you. I am not a dry pond, in which you can dig a well (bir)." (97, 14)

اے بیر! اس طرف نہ آنا ، تو ہمیں کنویں میں گرا دے گا بلکہ تیری بنا پر ہمیں کنویں میں گرنا پڑے گا - ہم کوئی خشک حوض تو ہیں نہیں کہ بیر کی کدو کاوش کا ہم پر اثر ہو -

صفحہ ۱۵۹/۱ : "چندین گہ عبرۂ ما بر کف مشتی خس و خاشاک گذر داشت - اکنون کہ من آبی را گرد لشکر بادشاہ خاک گردانید بعد ازین من دریا نیم - گوئی کہ در خرائب حضرت یکی از عملۂ خاشاکم -"

"Very often people have sailed over me upon a handful of wood and straw; but now I will change my water into dust at the feet of Imperial troops. You may consider me one of the meanest of Imperial servants." (97, 23)

'من آبی را گرد لشکر بادشاہ خاک گردانید' یعنے مجھ گنہگار کو لشکر شاہی

کی گرد نے خاک کر دیا ہے ۔ 'خرائب' خرابہ (ویرانہ) کی جمع ہے ۔

صفحہ ۱۲/۱۵۹ : ''ازانجا کہ آن ھمہ آبیان را بی آبی صعب پیش آمد ۔''

" . . . as these aquatic animals were beset with a great scarcity of water. . ." (98, 5)

آبی = گنہگار و سرکش ۔ 'بی آبی' = بے آبروئی ۔

صفحہ ۱۷/۱۵۹ : '' [براھمہ] کبار ، چون رای رایان را از برگ طاقت تہی دست دیدند ۔''

"When the great Brahmans saw that the Rai Rayan was weaker than a leaf. . ." (98, 8)

'از برگ طاقت تہی دست دیدند' یعنے سروسامان طاقت سے خالی پایا ۔ نہ کہ وہ ایک پتّے سے بھی زیادہ کمزور تھا ۔

صفحہ ۱۶/۱۶۲ : ''و بسبب آشنائی دریا جانب ایشان جتہی سخت گرفت ، و ازین طرف نیز مددی عارضی می نمود و میخواست کہ درمیان [غباری] بنشاند ۔''

" . . . owing to its friendliness with the sea, strove hard for the Ma'baris. To the Mussalmans also its gave some formal help. In fact it was very deceptive ;" (99, para. 3, l. 2)

'و میخواست کہ درمیان غباری بنشاند' غبار (گرد ۔ کدورت) کو عیّار پڑھ کر اس کا ترجمہ دھوکہ باز کیا ہے ، حالانکہ حضرت مصنف کا مطلب ہے کہ فریقین میں دشمنی مٹا کر صلح کرا دی جائے ۔

صفحہ ۲/۱۶۳ : '' هم برین طرف چشمۂ شریعت را آب میداد و هم بدان جانب آبیان را مدد میکرد ۔''

" . . . on the one hand, it gave water to the stream of Shari'at, and on the other, it assisted those aquatic animals." (99, para. 3, l. 5)

'آبیان' = نافرمان و عاصی نہ 'آبی جانور' جیسا کہ پروفیسر صاحب نے ترجمہ کیا ہے ۔

صفحہ ۱۳/۱٦۳ : ”و گاہ بیلکھا را از ہند سوی [زنگ] رہ می‌نمود و گاہ بلطف میان تیرو [پر] در می خزید و ہر دو را از یک دیگر جدائی می افگند و گاہ در گوشہای کمان چیزی [فرو می ریخت] و از زہش میگردانید ۔ ثم خود درپئی کمانہا چنان نشستہ بود کہ میخواست کہ بند بند ہریک جدا کند ۔“

" . . . and made the Hindi sword rusty; it got in between the arrow and its (iron) point and separated them from one another; it also whispered something in the 'ears' of the bows and untwisted their strings." (100, 6)

بیلک = 'تیر' نہ تلوار ، جیسا کہ پروفیسر صاحب نے ترجمہ کیا ہے ۔ ہند = سیاسی ، زنگ = زنگار و زنگ یعنے سیاہ سنانیں کثرت بارش سے زنگ آلود ہوگئیں ۔ 'گوشہا' جمع ہے گوشہ' (کونا) کی ۔ یہاں اس کے معنے 'کان' درست نہیں ۔ 'گوشۂ کمان' عام روزمرہ ہے ۔ خط کشیدہ عبارت ترجمے میں شامل نہیں ۔

صفحہ ۱٦۴/۴ : ”راوتان ہندو ، کہ سوارگان آبی بودند ، گنبد کنان در می رسیدند ، و زیر پای مرکبان ترک پست می شدند ۔ سیل خون و سیل آب راہ سیلان گرفتہ می دوید تا پیش سپاہ خلیفۂ عہد قدم آدم را شفیع سازد ۔“

"The Hindu rawats came forth riding in troops but were laid low before the Turkish horse. A deluge of water and blood flowed forward to plead for mercy before the Caliphs' army." (100, 14)

'کہ سوارگان آبی بودند' ترجمے سے چھوٹ گیا ہے ۔ 'سوارۂ آبی' یعنی سوار سرکش ۔ 'گنبد کردن' = نوعی از جست حیوانات کہ ہر چہار پایہ پا جہند مانند جست آہو ، یعنے چوکڑی بھرتے ۔ سیلان = سراندیپ ، مشہور جزیرہ ہے جسے لنکا بھی کہتے ہیں ۔ خسرو :

چو موکبش بہ زمین گوالیر آمد
زموج لشکر او سیل تا بہ سیلان شد

قدمِ آدم اسی جزیرے میں ہے ۔ یعنے ہندو راوت ، جو سرکش سوار تھے ،

جوق جوق آگے بڑھتے اور ترکی گھوڑوں کے قدموں میں پست ہوتے ۔ خون اور پانی کے سیلاب نے سراندیپ کا راستہ اختیار کیا تاکہ خلیفۂ زمان کی فوج کے پاس قدم آدم کو شفیع بنائے ۔

صفحہ ۱۶۶/۲ : ''صدو بیست پیل ابروش در سلسلۂ قید آمد و پیل بالا خزائن ۔''

"... one hundred and twenty cloud-like elephants were captured at the place and on the backs of the elephants were treasures." (101, 12)

پیل بالا = بقدر قد پیل یعنے ڈھیروں اور انباروں ۔

صفحہ ۱۶۶/۷ : ''چنانکہ پیلکان آن سواد ، از آلایش خون آن اصحاب فیل ، طیراً ابابیل شدہ بودند و نوای شکر ربالکعبہ [بہ] پیلان ابر می رسانیدند ۔''

"It seemed that, smeared with the blood of those possessors of the elephants, the elephants of that land became like birds in flocks, and carried to the elephentine clouds the words of thank-fulness to the Lord of Ka'ba" (101, 21)

'پیلکان' کی جگہ 'پیلکان' تیروں کے معنوں میں ہے ۔ پروفیسر صاحب نے ہاتھی ترجمہ کیا ہے ۔

صفحہ ۱۶۶/۱۳ : ''چندان کہ دران خراب آباد کندور بزخم پیلکھای کشتی شگاف طوفان خون راندند ، نشان آن ماھی دریایافتہ نشد ۔''

"Though a deluge of blood was made to flow in the Kharababad of Kandur with the Hindi sword, that could have it a boat into two, yet no trace of the desired fish was found." (101, para. 2, l. 1)

'خراب آباد' (ویران) کندور کی صفت ہے ۔ پروفیسر نے بعینہ انگریزی میں اسے داخل کر دیا جو انگریزی خوانوں کے لیے موجب زحمت ہے ، بلکہ بعض اوقات اس سے دھوکا ہو جاتا ہے ۔ 'پیلک' کے معنے پروفیسر نے تلوار لیے ہیں حالانکہ یہ وہی لفظ پیلک (تیر) ہے ۔

صفحہ ۱۶۷/۴ : ''از آیندگان باخبر صحت اخبار کماهی معلوم گشت ، کہ بیر دران بیرانہ گرد نگشتہ است ۔''

> "But it was discovered for certain from people coming from that direction that Bir had not been anywhere near that birana." (102, 1)

پروفیسر صاحب تو "birana" لکھ کر آگے بڑھ گئے مگر مصیبت یہ ہے کہ ان کے قارئین کو یہ لفظ کسی انگریزی لغت میں نہیں مل سکتا ۔ کیا اچھا ہوتا اگر وہ یہ اضافہ کر دیتے کہ 'بیرانہ' 'ویرانہ' (ویران) کا بدل ہے ۔

صفحہ ۱۶۷/۹ : ''و اگر بہ مثل وہم را مدخل دہند ، پایش درون ماند ، و 'وہ' ازو بیرون آید ۔ در چنین جنگلی با تنۂ چند تنہا ماندہ است ، و جان بردہ ۔ ملوک رای زن گفتند کہ : شعر

کیف الدخول لجیش فی مضائقھا

روح بلا بدن ما خاض بالجبل

> " . . . and if imagination had cutered it, it would have lost its way and never found it out again." (102, 7)

یہ ترجمہ درست نہیں ، یوں چاہیے : مثلاً اگر وہم کو اس جنگل میں داخل کیا جائے تو نکلتے وقت وہم کا پاؤں یعنے 'م' تو وہیں رہ جائے اور باقی 'لفظ' 'وہ' باہر آئے ۔ باقی عبارت ترجمے سے رہ گئی ہے ۔

صفحہ ۱۶۸/۳ : ''ملک [پیل] جوی کہ اگر نقش پیل در بہرمان ہندوی می شنید ، تیزی مقراض گوش را در شب تار بران سوی میراند ۔''

> "The Malik, who, if he heard of so much as the picture of an elephent on silk cloth, would have run his sharp scissors towards it in the darkest night. . ." (102, 12)

'تیزی مقراض گوش را بداں سوی میراند' کا تو یہ مطلب ہے کہ قینچی کی سی کنوتیوں والے گھوڑے (تازی) کو اس طرف چلاتا ، نہ یہ معنے کہ قینچی چلاتا ۔

صفحہ ۱۶۸/۵ : ''و درپی مشتی مروبا برہنہ ، کہ دریافتن ایشان از ذیل امکان

بیرون رفته است بدوا دو درشنید ۔"

" . . . for such a matter of detail as capturing the small party of the Rai. It was impossible to find them." (102, 15)

'مشتی سروپا برهنه' یعنے چند بے سروساماں ۔ 'بدوا دو در شنید' یعنے به تکاپو در شنید ۔

صفحه ۱۰/۱۶۸ : "تادر طلب پیلان گز پیموده کوه های آن زمین را ، به گز های کلک دشت پیمایان ، بپایند ۔ چوں بجهت یافتن پیلان دیبا ، **روی دیباچه نیاز سوی عماری چرخ اطاس آوردند** ۔"

" . . . so that with their staffs they may explore the hills of that region in search of more elephents." (102, 18)

'پیلان گز پیموده' گزوں سے نپے ہوئے یعنے پورے قد آور و جسیم ہاتھی ۔ 'به گز های کلک دشت پیمایان' یعنے صحرا نورد چهارپایوں کے قدموں کے گزوں سے ۔ جلی حروف والا فقرہ ترجمے سے ترک کر دیا گیا ہے ۔

صفحه ۱۱/۱۶۹ : "یا لنک زرین رام است یعنے که دیو [ده] سر آن همه زر [شش] سری را ذخیره کرد و بگذاشت ، تا روزیٔ سلیمان عهد شود ۔"

" . . . or that it was the golden Lanka of Ram, that Rai having collected the golden heads of the idols and left them till the time of Solomon came. . ." [102, 4 (bottom)]

'دیو ده سر' (دس سروں والا دیو) = راون ، لنکا کا راجه جسے رامچندر جی نے قتل کیا ۔ 'زر شش سری' یعنے باره بانی سونا ۔ 'روزیٔ سلیمان عهد شود' یعنے زمانے کے سلیمان (علاءالدین سے مراد ہے) کے نصیب ہو ۔

صفحه ۲/۱۷۰ : "زمین تا آسمان از زر عین میلی برکشیده ، که چشم انجم می خراشید ، و در دیدهٔ خورشید در می رفت ۔"

"It rose from the earth, structure of gold scratching the eyes of the stars and piercing the people (sic) of the sun." (103, 2)

'از زرِ عین میلی بر کشیده' یعنے خالص سونے کی لاٹ بنی ہوئی ۔

صفحہ ۷/۱۷۰ : ''و دیدہ از خیال زر [یرقانی] می شد - و زمرد سبزش کہ تاجوران را سرسبزی دهد خیال رود کہ طوطی است از بیضۂ ماہ پریدہ پیکر مرصع بت تصور افتد ، کہ آفتاب را آبلہ دمیدہ است -''

''The sight of gold was cooling to the sight. The green colour of the emarald would have given prestige to a kingly crown; for it looked like a young parrot flown from its egg in the moon. The jewelled figure of the idol looked like a bubble on the surface of the sun. . . '' (103, 8)

یہ ترجمہ قابلِ اصلاح ہے ؛ مطلب ہے کہ سونے کے خیال سے آنکھیں بالکل یرقانی (زرد) [نہ برفانی] پڑجاتی تھیں - اور اس کے سبز زمرد پر ، جو سلاطین کو کامیابی بخشتا ہے ، ایسا گمان پڑتا تھا کہ چاند کے انڈے سے طوطا اڑ گیا - علیٰ ہذا بت کے مرصع پیکر پر یہ دھوکا ہوتا تھا کہ آفتاب کے چیچک نکل آئی ہے -

صفحہ ۵/۱۷۱ : ''خشت زر کہ سنگی نداشت [فرو] می غلطید و کلابۂ صندل ، کہ آبیش نبود ، [فرو] می ریخت -''

''The golden bricks rolled down and brought with them the plaster of sandel-wood.'' [103, 10 (bott.)]

'سنگی نداشت' یعنے جس کی کوئی قدر و وقعت نہیں تھی - 'آبیش نبود' یعنے جس کی کوئی آبرو نہ تھی -

صفحہ ۳/۱۷۳ : ''چون روز آفتاب از تاج آفتاب سر بر آوردہ و ماہ ذی القعدہ را کہ جیش بی نہایت داشت فرو پوشید -'' مصرع :

''یعنی کہ زمہ سیزدہ و یک شنبہ

غزاۃ منصور بہ سائبان ہمایون پیوستند -''

''On Sunday, the 11th Zill Qa'd, the men of the victorious army arrived before the august canopy. . .'' (104, para. 2, l. 1)

امیر نے دو طرح سے تاریخ بیان کی ہے ؛ یعنے ایک جگہ کہتے ہیں : ''جیش

بی نہایت'' یعنے جیش – ش = جی = ۱۳ ، جو ماہ ذیقعدہ کی تاریخ ہے ۔ دوسری جگہ صاف الفاظ میں کہا ہے کہ چاند کی ۱۳ ویں تھی مگر محترم پروفیسر اپنے ترجمے میں ۱۱ ۔ ذیقعدہ بیان کرتے ہیں ۔

صفحہ ۱۷۳/۱۵ : ''و چون شہار ماہ ، کہ بالا رفتہ است ، بہ 'جوزا' رسید ، و روز برجیس از آخر درجہ روشن شد۔ ع :

یعنی کہ پنجشنبہ و از ماہِ ہفدہ روز

در شہر کیم منزل کردند ۔''

"... on Thursday, the 15th Zil Qa'd, it arrived at the city of Kim." (105, 1)

یہاں متن اور ترجمے میں چاند کی تاریخ میں پھر اختلاف ہے ۔ امیر ہفدہ (۱۷) کہتے ہیں ۔ اس سے پہلے جوزا = ۱۷ کہہ چکے ہیں ۔ حضرت مترجم ۱۵ ذی القعد لکھتے ہیں ۔

صفحہ ۱۷۵/۱۰ ''کوہ سنگ دارد و ساکن بود عجب کوہی کہ آب بی سنگ باشد و رہ سپرد ۔ اگر بمیزان حلمش سنجند کوہ ہم سنگش نبود و [اگر] پالان حملش نہند بادِ ہم تنکش [تکش] نباشد ۔''

"... while other hills contain precious stones and are permanently fixed, these hills contained no treasures and were always on the move." (105, para. 3, l. 10)

مطلب ہے کہ پہاڑ میں پتھر ہوتا ہے مگر ساکن ہے ۔ یہ عجب پہاڑ ہے جس میں پتھر نہیں مگر متحرک ہے ۔ آب بالکل غلط ہے ۔ باقی عبارت ترجمے سے رہ گئی ہے ۔

صفحہ ۱۷۵/۱۲ ۔ شعر :

''حیران شدہ ہر کہ ہست در پیکرِ او

کوہی ہتّرانِ و آدمی لنگرِ او''

"Every one present wondered at their shape-a steep hill and a man guiding it." (105, para. 3, l. 12)

'کوهی‌بتّران' کی جگہ 'کوهی پتّران' اڑنا یعنے متحرک پہاڑ چاہیے۔ 'آدمی لنگر او' آدمی اس کا لنگر ہے ۔ یہ ہاتھیوں کا ذکر ہے ۔

صفحہ ۱۰۵/۱۵ ہنگام جنبش گوئی موج دریاست تند برداشتہ ، و گاہ ایستاد پنداری شہ برج حصاری است بخرطوم منجنیق آراستہ۔"

"When it was moving, you would have thought it a mighty wave in the ocean; when standing, it looked like a main tower of a fort, adorned with a trunk in place of the munjniq." (105, l. 1)

'خرطوم منجنیق' یعنے منجنیق کی سونڈ۔ 'برداشتہ' کی جگہ 'برخاستہ' چاہیے ۔

صفحہ ۱۰۶/۴ : "و یا کوهیست بر چہار کوہ پایہ ، کہ ملحدان را از بینی [سیّارہ] خود فرود افگند ۔ نون دندانش را حرکت بحدی کہ [خریف] خود را بیک تشدید درقاف نشاندہ و الف خرطومش را تجویف کشش بجای کہ تضیف خود را بیک مد مضاعف گردانیدہ ۔ ساکن جنبندہ با چنان روانی ، سبک [دوندہ با] چندان گرانی ۔"

" . . . or to a hill on four rocks, which causes the heretics to slip down its 'nose' . . .
In spite of its weight, it moved gently like the wind; in spite of its movement, it seemed to stand still." (106, 7)

جلی عبارت ترک کر دی گئی ہے ۔ 'بینی سیارہ' ۔ متحرک ناک یعنے سونڈ ۔ 'ساکن جنبندہ با چنان روانی' یعنے اس قدر بھاری ہونے پر بھی پھرتی سے جانے والا ۔

صفحہ ۱۰۷/۱ :

"مرکبانی یمانی و شامی
خواب گاهی زوان بخوش گامی"

"There were 'Yamani' and 'Shami' horses, all going to their stables with alluring steps." (106, para. 2, l. 4)

صفحہ ۱۷۷/۸ :

”رفتہ نوعی [بچشم] خفتہ درون
کہ درون رفتنش نہ بردہ برون“

"Its figure captivated the eye and was never again forgotten."
(106, para. 2, l. 13)

یہاں تو پروفیسر صاحب کا ترجمہ بالکل غلط ہو گیا ہے؛ مطلب یہ ہے کہ سوتے شخص کی آنکھ میں وہ اس طرح سے گھس جاتے کہ ان کے اندر جانے کی خبر باہر نہ آتی۔

صفحہ ۱۷۷/۱۰ :

”[جست] گیر آنچنان کہ [رفت بفن]
ہمچو رشتہ بچشمۂ سوزن“

". . . it finished its journey os quickly as a thread gets into the eye of a needle."
(106, para. 2, l. 15-16)

مطلب یہ ہے کہ جست لگانے میں ایسا ہے کہ اپنی استادی سے سوئی کے ناکے میں اس طرح سے گھس گیا جس طرح دھاگا پرودیں۔

صفحہ ۱۷۷/۱۳ :

”کہ اگر فتح فتح این شاہست
[صد] دیگر [چنینش] در راہ است

" . . . so that in the Imperial battles another wall came along (with the wall of the elephants)."
(106, para. 2, l. 19)

'صد' یہاں 'صاد' سے ہے، نہ 'سین' سے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر فتح ہے تو وہ فتح اس بادشاہ کی ہے اور ایسی ایسی سینکڑوں اور فتوحات اس کی منتظر ہیں۔

صفحہ ۱۷۸/۴ : ”ہر یاقوتی بران گونہ، کہ آفتاب را قرنہا دیدہ خیرہ باید کرد، تایک نقش بدان زیبائی از کارگاہ [خارا] بکشد“۔

"The diamonds were of such a colour that the sun will have to stare hard for ages before the like of them is made in the factories of the rockes."
(106, l. 1.)

پروفیسر نے 'یاقوت' کا ترجمہ 'الماس' کیا ہے جو صحیح نہیں ۔

صفحہ ۴/۱۸۰ : "چون در شب یک شنبہ انجمن کواکب سوی سواد اعظم [شام] رجوع کرد سائبان شفق [وام] را بر عزم اتصال بہ برج آفتاب سلطنت [طی] کردند و از شادی رجعت سوی شہر آواز برکندن میخہای [سرادق] چون غلغل تسبیح اوتاد دلہا را ہزّت آورد ۔"

"On Sunday night the company of stars prepared to return to the Imperial capital. The breaking up of the camp filled all hearts with a deep joy." (107, para. 3, l. 2)

یہ ترجمہ تحت اللفظی نہ ہونے کے باوجود بھی صحیح نہیں ۔ مصنّف کا مطلب ہے کہ 'اتوار کی رات جب ستاروں کی جماعت شام کے شہر کی طرف لوٹی یعنی جب ستارے نکل آئے ، سائبان سرخ رنگ کو آفتابِ سلطنت کے برج (دارالسلطنت) کے ساتھ اتصال دینے کے لیے طے کیا گیا ۔ شہر کی طرف لوٹنے کی خوشی میں خیموں کی میخوں کے اکھاڑے جانے کی صدا اولیاؤں کی تسبیح کی آواز کی طرح دلوں کو انبساط میں لانے لگی ۔

صفحہ ۱۴/۱۸۰ : "و ھزاھز در کفرۂ کالانعام بل ھم اضل می افتاد ۔"

"The noise of Huzza! Huz! rose from the infidels—they are nothing but as cattle; nay they are straying further off from the path." (108, 7)

اہل لغات 'ھزاھز' بفتح ھای اول و دوم یا بفتح ھای اول و کسر ھای دوم لکھتے ہیں ، لیکن پروفیسر نے جو تلفظ دیا ہے ، کبھی نہیں سنا ۔ اس کے معنی ہل چل اور کھلبلی ہیں ۔

صفحہ ۵/۱۸۱ : "آبہای کہ از خیال آن مردم در بحر حیرت غرق شود ، مانند شناوران کامل ، کہ بر آب خفتہ آسنا کنند ، بآسانی عبرہ میکردند ۔"

"They swam through rivers, the thought of which drowns one's imagination in a sea of wonder." (108, 16)

جلی عبارت ترجمے سے رہ گئی ہے ۔ مصنّف کا مقصد یہ ہے کہ ایسے

دریا جن کے تصور سے انسان بحر حیرت میں غرق ہو جائے ، ماہر و کامل پیراکوں کی طرح ، جو سوتے سوتے تیر سکتے ہیں ، بڑی آسانی سے عبور کرتے تھے ۔

صفحہ ۵/۱۸۲ : ''ملوک در صفہای انبوہ بران گونہ کمر با کمر می سودند ، کہ لعل زمرد می شد و زمرد لعل ۔''

"The Maliks in innumberable, rows rubbed their waists together like so many rubies and diamonds."[3]

[108, para. 2, l. 3 (bott.)]

مطلب ہے کہ ان کی کمروں کے پٹکے [جن پر لعل و زمرد ٹکے تھے] اس طرح آپس میں رگڑتے کہ لعل زمرد بن جاتا اور زمرد لعل (عکس کے لحاظ سے) ۔

صفحہ ۱۰/۱۸۲ ''چنانکہ چابک چاؤشان خسرو روم را حبشی می ساخت ، چوب سہم الحشان شاہ [زنگ] را رومی می گردانید ۔''

یہ عبارت ترجمے سے چھوٹ گئی ہے ۔

صفحہ ۹/۱۸۳ : ''اجسام گران پیل بیکران و بی عدیل چشم بسیط خاک را فرو پوشیدہ ، حمل جوہر بر پشت حیوان حامل بہ بدیہۂ نظر اثبات میکرد کہ جوہر بالا تر از چشم است [و] نثار کہ زیر پای انسان و فرس ، علی‌العکس چشم را بالاتر از جوہر می‌نمود ۔''

"The ground was covered by the large bodies of the elephents and faultless gems. While the jewels were on the backs of the animals, they indicated that the 'essence of things' was finer than the eye; but when they were scattered at the feet of men and horses, it was proved that the eye was superior to the jewels." (p. 109, 21)

متن میں 'چشم' کی جگہ تینوں مقام پر 'جسم' ہونا چاہیے بمقابلۂ جوہر ۔ چشم و جوہر میں کوئی مناسبت نہیں البتہ جسم و جوہر میں نسبت ہے ۔ متن میں کوئی ایسے الفاظ نہیں جن کا ترجمہ 'بے عیب جواہرات' ہو ۔ 'جوہر' کا ترجمہ اصل و خلاصۂ شے ہونا چاہیے ، نہ جواہرات ۔

صفحہ ۱۵/۱۸۳ : ''سہ [بُعد جز] دریں [جسم] تمام نتوان گفت ۔ مصرع :
باقی ہمہ قربست نہ بُعد''

'' . . . nor could you see the whole of its back and breast except in three views (from three different points).
[109, 3, (bott.)]

پروفیسر صاحب کا ترجمہ ہمیں غلط راستے پر لے جا رہا ہے ۔ متکلمین کے نزدیک جسم وہ ہے جو عرض و طول و عمق رکھتا ہو۔ 'سہ بُعد' میں حضرت مصنف اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں یعنی ابعاد ثلاثہ جسم کے سوا اور کسی چیز میں نہیں بتائے جا سکتے ۔ باقی جو کچھ ہے قرب ہے نہ بُعد ۔

صفحہ ۲/۱۸۴ : ''از آثار این شکر عجب نباشد ، کہ اگر ھمگی ابعاد جسم [بسیط] زمین را ھشت نقطۂ شمشیر او در گیرد ۔ زیرا کہ اتمام تمامی نعمتہای جسیم بہ نقطہای شکر بستہ [است] ۔''

"And it will not be strange, if, in return for his thankfulness all the creatures of the broad world are conquered by his sword, for gratitude to God is the condition of all great success." (110, 3)

یہ ترجمہ حضرتِ مصنّف کا مطلب ادا نہیں کرتا ۔ 'ھشت نقطۂ شمشیر' میں لفظ 'شمشیر' کے آٹھ نقطوں کی طرف اشارہ ہے ۔ ابعاد تین ہیں ۔ لفظ 'شکر' میں بھی تین نقطے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے شکر کی علامات سے کوئی تعجب نہیں ، اگر وسیع زمین کے ابعاد کو اس کی شمشیر کے آٹھ نقطے ، بالفاظ دیگر اس کی شمشیر ، مسخّر کر لے کیونکہ تمام جسیم نعمتوں کا اختتام شکر کے نقطوں یعنی شکر پر موقوف ہے ۔

یہ تبصرہ اختصار کی کوشش کے باوجود زیادہ دراز ہوگیا ہے ۔ مجھے ہرگز یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ اس قدر طول کھینچے گا ۔ باوجود اس کے کہ وہ ترجمے کی تمام اغلاط پر حاوی نہیں اور نہ کسی تبصرے کا یہ منشا ہوا کرتا ہے ۔ وقت اور جگہ کی قلت کی بنا پر حواشی میں بھی مجھے اختصار سے کام لینا پڑا ہے ، بلکہ اکثر اوقات اشارات سے کام لیا گیا ہے ۔

اگر سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنا ہمارے فرائض میں داخل ہے تو ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ پروفیسر حبیب نے ایک ایسی کتاب کے ترجمے کا اقدام کیا ہے جس کے سمجھنے کی انھوں نے مطلق کوشش نہیں کی ہے اور مترجم کے فرائض کی طرف سے سراسر بے اعتنائی برتی ہے ۔ اس ترجمے میں انھوں نے ہمارے لغات و محاورات اور زبان دانی پر ہر طرح سے کند چھری پھیری ہے اور ہم نے جن روایتی مطالب و معانی پر پرورش پائی ہے ، وہ سب اس ترجمے میں تقویم پارینہ قرار دے دیے گئے ہیں ۔ تنقید ایک تلخ حقیقت ہے ۔ ہمیں پروفیسر صاحب کی اس بے باک جسارت پر تعجب آتا ہے کہ وہ اس ترجمے کو ، جس کی کوئی سطر اسقام سے پاک نہیں ، بڑے وثوق اور اطمینان کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر کوئی شخص اہتمام کے ساتھ غلط نویسی کا التزام کرتا اور اپنی پوری کوشش عمل میں لاتا ، تب بھی پروفیسر حبیب کے اس کارنامے سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا ۔ آخر اس اغلاط کی کھتونی کو منظر عام پر لانے میں کون سی مصلحت ان کو نظر آئی !!

جس طرح ان کا ترجمہ اپنے علمی فقدان کا مرثیہ خواں ہے ، اسی طرح ان کے آراء اور نظریے بھی تاریخی واقعات و اشخاص کے متعلق غیرناقدانہ ہیں جو یقیناً اصل ماخذ پر مبنی نہیں ۔ ان میں سے بعض کی گزشتہ سطور میں تردید کی گئی ہے ۔ اگر پروفیسر صاحب فارسی عربی مواد سے خود براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی غیر منتقدانہ رائیں غیر مسلم اہل قلم سے مستعار لیں گے ، جو ان کے ہاں بہ وجہِ ناواقفیت قابلِ معافی ہو سکتی ہیں مگر مسلم یونیورسٹی کے ایک مسلمان پروفیسر کے لیے ان کا اعادہ قطعاً ناقابل معافی ہے ۔

☆ ☆ ☆

مثنوی ”عروۃ الوثقیٰ“ از شہابی

(از روئدادِ ادارۂ معارفِ اسلامیہ ، اجلاس دوم ، منعقدہ لاہور ، اپریل سنہ ۱۹۳۶ء)

یہ مثنوی ، جو ۸۵۹ھ میں تالیف ہوئی ہے ، ہندوستان کے ایک نامعلوم شاعر شہابی تخلص کی یادگار ہے ۔ شاعر نے اس کا نام 'عروۃ الوثقیٰ' رکھا ہے اور ہندوستان کے کسی بادشاہ کے واسطے ، جس کا نام مذکور نہیں ، لکھی ہے ۔ ابیات کی تعداد بقول شاعر پانچ ہزار ہے ۔ موجود نسخہ ، اگرچہ مصنف کے عہد سے قریب کا لکھا معلوم ہوتا ہے ، ناقص حالت میں ہم تک پہنچا ہے ، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پوری کتاب کے جو منتشر اوراق ہم تک پہنچے ہیں ، ان کی تعداد ایک سو نو ہے اور تخمیناً ساڑھے تین ہزار ابیات کے حامل ہیں ۔ اس حساب سے ڈیڑھ ہزار اشعار اس نسخے سے ضائع ہوگئے ہیں ۔ بالفاظ دیگر چوالیس اوراق جاتے رہے ہیں ۔ موجودہ حالت میں کتاب کی اصل ترتیب سے واقف ہونا بھی دشوار ہے ۔ دیباچےمیں جو فہرستِ مضامین دی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اخلاقی مثنوی ہے جو 'بوستان سعدی' کی طرح پند و موعظت کا دفتر کھولتی ہے اور ان اوصاف و محاسن پر زور دیتی ہے جو انتظام ملک و ملت کے لیے سلاطین کی ذات میں نہایت ضروری ہیں ۔ شاعر کے نزدیک شرائط جہانداری دس امور پر مبنی ہیں اور ان کے مطابق اس نے کتاب کو دس مقالوں میں بہ تفصیل ذیل تقسیم کیا ہے :

مقالۂ اول : 'در پیرویِ شرع' ۔
مقالۂ دوم : 'در معدلت' ۔
مقالۂ سوم : 'در هشیار بودن در کارها' ۔
مقالۂ چهارم : 'در رای و تدبیر' ۔

مقالۂ پنجم : 'در وفای عہد و پیمان' ۔
مقالۂ ششم : 'در شجاعت و دلاوری' ۔
مقالۂ ہفتم : 'در جود و سخاوت' ۔
مقالۂ ہشتم : 'در شرطِ تمکین و وقار' ۔
مقالۂ نہم : 'در سیاست' ۔
مقالۂ دہم : 'در عفوِ گناہ' ۔

ہر مقالے میں ایک ایک تاریخی حکایت مثال میں لائی گئی ہے ۔ کتاب کی ابتدا سے حمد کا تمام اور نعت کا نصف حصہ مفقود ہے ۔ خاتمے کا کچھ حصہ ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا نام 'عروة الوثقیٰ' ہے اور ۸۵۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے ۔ ابیات کی تعداد پانچ ہزار ہے :

تن خاکیم چون باقی نماند
مرا زندہ شمارد ہرکہ خواند

اگر مطلوب ازو نام کتابست
ز غیبش 'عروة الوثقیٰ' خطابست

چہ شبہا کردہ بایستم جگر خون
کہ تا آمد ز کان این لعل بیرون

ز تاریخش ہر آن کو راست مقصود
ز ہجرت ہیصد و پنجاہ و نہ بود

وگر یک رہ شماری بیت ناسش (کذا)
شمار بیت شد خمس ہزارش

بعض اشعار سے ، جو شاعر نے اپنے فرزند کو خطاب کر کے لکھے ہیں ، پایا جاتا ہے کہ اس فرزند کا نام فیض اللہ ہے :

ترا زان روی فیض اللہ شد نام
کہ از فیض خدا یابی ہمہ کام

مصنّف کے متعلق ہم کو اسی قدر علم ہے کہ اس کا تخلص شہابی ہے جو ہر موقع پر سرخ سیاہی سے لکھا گیا ہے ۔ کتاب جس بادشاہ کے لیے لکھی گئی اس کا نام کہیں بھی نظر نہیں آتا ۔ اگرچہ بعض اشاروں اور دیگر قرائن سے پایا

جاتا ہے کہ مصنّف اور اس کا ممدوح دونوں ہندوستانی ہیں ۔

نویں صدی ہجری وہ خاص صدی ہے جس میں علاء الدین کے خواب ، ہندوستان میں مرکزی حکومت کے اصول ، کو برباد کرکے سیاسیاتِ وقت نے صوبجاتی خود مختاری کے اصولوں کو فروغ دے دیا تھا ۔ اس صدی کی ابتدا ہی میں، ایسے واقعات پیش آئے جن کے اثر میں ہندوستان مختلف سلطنتوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا اور اس کے منتصف میں ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں کئی سلطنتیں قائم ہیں ۔ بنگال اور دکن کے علاوہ ، جو اس صدی کی آمد سے بہت پہلے اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے ، گجرات ، مالوہ ، جونپور اور پنجاب میں جدا جدا حکومتیں قائم ہیں ۔ اب ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ان صوبجاتی سلاطین میں سے ہمارے مصنّف کا ممدوح اور مخاطب کون سا سلطان ہے ۔ ایک بات ممکن ہے ؛ وہ یہ ہے کہ مصنّف اور اس کا ممدوح یا بنگالے سے تعلق رکھتے ہیں یا مالوے سے ۔ بنگالے میں اس وقت ناصر الدین محمود شاہ (۸۴۶ھ و ۸۶۴ھ) بر سرِ حکومت تھا ، اور مالوے میں علاء الدین محمود شاہ خلجی (۸۳۹ھ و ۸۸۰ھ) سریر آراء ہے ۔ اگر مثنوی ھذا بنگالے میں لکھی گئی ہے تو بہت ممکن ہے کہ اس کا مصنّف امیر شہاب الدین حکیم کرمانی ہو ، جس کا ذکر ہم ابراہیم فاروقی کی مشہور فرہنگ 'شرف نامہ' احمد منیری' تالیف ۸۷۷ھ میں باربار پڑھتے ہیں ۔ 'شرف نامہ' میں اس شہاب الدین کے حوالے سے بیسیوں لغات اور ان کے اعراب و معانی بیان کیے گئے ہیں ۔ اب اس امیر شہاب الدین کو مثنوی 'عروۃ الوثقیٰ' کا مالک تسلیم کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک کمزور قرینہ یہ ہے کہ بہت ممکن ہے کہ اس نے اپنے نام کی رعایت سے اپنا تخلص 'شہابی' رکھا ہو ۔ اگر اس نے اپنے ممدوح کے لقب و خطاب کی بنا پر یہ تخلص اختیار کیا ہے ، جیسا کہ بعض شعرا کیا کرتے ہیں ، تو اس صورت میں بایزید شاہ (۸۱۲ھ و ۸۱۷ھ) والیٔ بنگالہ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے ، جس کا لقب شہاب الدین ہے ۔ مگر ۸۱۲ھ اور ۸۵۹ھ میں (جو بایزید شاہ کی تخت نشینی اور عروۃ الوثقیٰ کی تصنیف کے سال ہیں) پورے اکتالیس سال کا فرق ہے جو ایک شاعر کے دور شاعری کے لیے ذرا لمبا معلوم ہوتا ہے ، اگرچہ بالکل ممکن ہے ۔ مصنّف خود تسلیم کرتا ہے کہ وہ اس مثنوی کی تالیف کے وقت بہت بوڑھا ہے ۔ ایک بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ 'شرف نامہ' میں امیر شہاب الدین کی شاعری کا کہیں ذکر نہیں آتا ۔

مالوے کے ساتھ مصنّف کو وابستہ کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف یہی قرینہ ہے کہ اس نے جہاں اپنے ممدوح کے محل اور عجائبات کا ذکر کیا ہے، ان میں ایک محل کا نام 'دھارا مندی' بیان کیا ہے ۔ اس نام سے ہمارا ذہن معاً 'دھار' کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو، مالوی خلجیوں کے عہد سے پیشتر، مسلمانی دور میں مالوے کا دارالحکومت رہا ہے ۔ غوریوں کے عہد میں بھی، جو خلجیوں کے پیش رو ہیں، یہی شہر دارالسلطنت تھا اور خلجیوں کے عہد میں، جو ۸۳۹ھ سے شروع ہوکر ۹۳۷ھ پر ختم ہوتا ہے، اگرچہ شادی آباد منڈو دارالملک بن گیا تھا مگر دھار کی وقعت زائل نہیں ہوتی ۔ دھار فی زمانہ ایک ہندو ریاست کی راجدھانی ہے مگر مسلمانی عہد میں مالوے کا حاکم نشین شہر تھا ۔ محمد بن تغلق اس شہر سے اپنے بعض سکّے جاری کرتا ہے ۔ کوئی تعجب نہیں اگر علاء الدین محمود شاہ خلجی نے، جو 'عروۃ الوثقیٰ' کی تصنیف کے وقت مالوے کا بادشاہ ہے، اپنے جدید دارالسلطنت، شادی آباد عرف منڈو میں دھار کے نام پر کوئی محل یا عجائب خانہ بنوایا ہو ۔ 'دھار مندی' کا لفظ ابیاتِ ذیل میں آتا ہے:

۱۔ بدولت کرد کاخی مرد رسّام
کہ در ہند است دھارا مندیش نام

۲۔ درونِ صحنِ دھارامندی ای یار
بود حوضی بخوبی کوثر آثار

مگر اس نظریے کی تردید میں کہا جا سکتا ہے کہ محل مذکور ایک ایسا عجائب خانہ ہے جس میں چونکہ فواروں یا دیگر ذرائع سے، جیسا کہ آیندہ مذکور ہوگا، پانی برسایا جاتا ہے، لہٰذا اس مناسبت کی بنا پر اس کا نام دھارامندی رکھا گیا ہے، نہ شہر دھار کی بنا پر ۔

اس موقع پر ہمارا ذہن طب کی ایک مشہور تالیف 'طبِ شہابی' کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے، جو ۹۰۷ھ کی تالیف ہے ۔ مصنّف اپنے آپ کو ابن عبدالکریم کہتا ہے اور ناگور کا رہنے والا ہے ۔ 'عروۃ الوثقیٰ' اور 'طبِ شہابی' کے سنینِ تالیف میں ساٹھ سال سے زیادہ کا فرق ہے جو بحیثیت معتادہ ایک شخص کی دو تالیف میں مشکل معلوم ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ 'طب شہابی' کے مصنّف کا تخلص شہاب بہ تخفیف 'یا' ہے، نہ شہابی باضافہ 'یا' اگرچہ ایک شعر میں شہابی اپنے آپ

کو شہاب بھی کہتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کا نام شہاب الدین ہوگا ۔ وہ شعر یہ ہے :

ز چندان دادن از ہر جنس مالی
شہاب از بدر باشد چون ہلالی

یہاں یہ کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے ایک سابق مالک نے اس کو شہاب مہمرہ کی طرف ، جو امیر خسرو کے استاد ہیں ، منسوب کیا ہے ۔ مگر یہ بیان صحت سے بہت دور ہے ، کیونکہ یہ مثنوی شہاب مہمرہ کے عہد سے دو سو پونے دو سو سال بعد وجود میں آتی ہے ۔

یہ مثنوی اگرچہ ناقص حالت میں ہم تک پہنچی ہے مگر کئی دلچسپیوں کے سامان اس میں جمع ہیں ، مثلاً یہ کہ وہ ایک ایسے شاعر کی یادگار ہے جس کا ہم معلوم ماخذ و ذرائع سے کوئی سراغ نہیں لگا سکتے ۔ دوسرے یہ مثنوی اپنے خط و املا میں ان تمام خصوصیات کی حامل ہے جو مغلوں سے قبل کے مخطوطاتِ ہندوستان میں پائی جاتی ہیں ۔ مثلاً 'پذیرفتن ، گذشتن اور گذاشتن' کے تمام صیغوں میں 'ذال معجمہ' کے بجائے 'دال مہملہ' کے ساتھ 'پدیرفتن ، گدشتن و گداشتن' لکھنا ۔ 'فرشتہ' کو باضافہؑ یا 'فریشتہ' اور 'دوزخ' کو زاے فارسی کے ساتھ 'دوژخ' تحریر کرنا ۔ 'شین' اور 'ثی' کے نقاط کو 'ہے' کے شوشے کی شکل میں (،) اور 'سود' اور 'شود' کو جب لمبے شین کے ساتھ لکھے جائیں ، درمیان میں پیوند دے کر 'سود' اور 'شود' لکھنا وغیرہ ۔

اہلِ ایران کا یہ قاعدہ کہ اگر دال کے ماقبل حرفِ صحیح ساکن ہو تو دال ہے اور اگر حرفِ ماقبل صحیح متحرک یا حرف علت ساکن ہو تو ذال معجمہ ، توران و غزنین کی تقلید میں ہندوستان میں کبھی تسلیم نہیں کیا گیا ۔

ہم میں بہت کم ایسے اصحاب ہوں گے جو اس خاص خط سے ، جو مغلوں سے پیشتر ہندوستان میں رائج رہا ہے ، واقف ہیں ۔ حالانکہ یہ خط ہندوستان کے طول و عرض میں رائج تھا اور دیگر ممالک کے خطوں سے جداگانہ شان رکھتا تھا ۔ اس نقطہؑ نظر سے بھی یہ نسخہ ہندوستانی طرزِ خط و املا کا ایک اچھا نمونہ قرار پاتا ہے ۔

ہماری دلچسپی کا ایک اور سامان اس تالیف میں یہ ہے کہ شاعر ، جو اپنے

آپ کو حکیم کے لقب سے یاد کرتا ہے ، دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنے ممدوح کے لیے تین ایسے محل تیار کیے ہیں ، جن میں تماشائیوں کی تفریح و حیرت کی غرض سے بعض عجائبات یا طلسمات تعبیہ کیے گئے ہیں ، جنھیں لوگ دیکھتے ہیں اور دنگ رہ جاتے ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے کمالات کا مجموعہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ، چونکہ سلطان کی طبیعت تماشا اور عجائب کی طرف مائل ہے اس لیے میں نے یہ حکمت سرا تعمیر کی ہے جو طلسمی عجائبات کا مظہر ہے :

خرد می‌گفت نیزم کای هنرمند
تنوری گرم داری نان درو بند

چو داری زور بازو پنجه بکشای
جهان را دستبرد خویش بنمای

بدل نیرنگ های عالم افروز
که پنهان داشتی از بهر امروز

چو دیدی رغبت خسرو که بیش است
اگر پیدا کنی بر جای خویش است

بفرمان خرد گشتم گهر سنج
بر آوردم ز خاطر گوهرین گنج

متاعی را که خسرو بد خریدار
برون کردم چو دیدم گرم بازار

ز سینه نقد های خانه خیزم
چو شه خواهد چرا بیرون نریزم

اگر(چه) داشتم گنجینه بسیار
نمودم آنچه خسرو بد طلب کار

نه بینی جوهری را ای برادر
که دارد در گره هر جنس جوهر

و لیک آن آورد بیرون ز دوکان
که یابد مشتری را طالب آن

چو میلِ طبعِ خسرو بر تماشاست
ضرورت بایدم کردن همان راست

ز آب و باد و آتش بر سرِ خاک
بر آوردم طلسماتی خطرناک

در آن حکمت سرا کز من نشانیست
بسی اعجوبهای آسمانیست

وہ مدعی ہے کہ عناصر کے ساتھ کواکب کی تمزیج سے عجیب عجیب حکمتیں ظاہر کی جا سکتی ہیں۔ اس میں کسی قسم کی شعبدہ بازی کو دخل نہیں ہے اور صرف اس حکمت سے کام لیا ہے جو عناصر یا بسائط پر مبنی ہے۔

شہابی، طلسمی عجائب خانوں کے ذکر سے پہلے ایک عمارت کا ذکر کرتا ہے جسے معمّل کہنا چاہیے مگر وہ اسے 'دیوان العمل' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس عمارت میں ایک مقام علیحدہ ہے جو آب و آتش کے واسطے بنایا گیا ہے۔ اس کی وضع ایسی ہے کہ اس کے تین در تینوں عنصروں پر کھلتے ہیں۔ ایک مقام پر کانون بنائی گئی ہے، جس کے ہر طرف دروازے ہیں۔ اس میں آگ جلائی جاتی ہے اور اس کی گرمی بقدر ضرورت ہر جگہ پہنچتی ہے۔ ایک طرف ایک برج ہوا کے لیے تعمیر ہوا ہے جو گچ اور سنگ کا بنا ہے۔ وہ ایک مربع خانہ ہے جس کے چار دروازے ہیں۔ ہوا اس میں حسبِ عادت چلتی رہتی ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ جب ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، باقی کے تینوں دروازے آپ سے آپ کھل جاتے ہیں اور اگر ایک بند کر دیتے ہیں، باقی دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ اس بادخانے کی بہت سی ٹونٹیاں ہیں۔ ہر سمت کی ہوا دروازوں کے ذریعے سے اندر پہنچ جاتی ہے اور ٹونٹیوں میں داخل ہو جاتی ہے اور ان کے ذریعے سے، جہاں جہاں ہوا کی ضرورت ہوتی ہے، پہنچائی جاتی ہے۔ پھر دو حوض ہیں؛ ایک بڑا ہے دوسرا چھوٹا ہے۔ بڑے حوض میں پانی بھرا ہوا ہے جس سے چھوٹے حوض میں پانی پہنچتا رہتا ہے۔ چھوٹے حوض میں ٹونٹیاں لگی ہیں۔ ان کے ذریعے سے حسبِ ضرورت پانی ہر جگہ پہنچایا جاتا ہے۔

اس کے بعد شاعر ان تین عجائب خانوں کا یکے بعد دیگرے ذکر شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شرقی صفہ کی دیوار میں ایک چھوٹا طاق ہے جس کا

منہ اوپر سے ڈھکا ہے ۔ طاق میں ایک صنج (گھڑیال) ہے ۔ طاق سے باہر ایک جالی‌دار صندوق ہے ، اس میں سونے اور جواہرات کا ایک نیلوفر تعبیہ ہے ۔ جب ایک گھڑی (طاس) دن گزر جاتا ہے ، وہ گھڑیال بجتا ہے ، اور اس کی آواز دور دور تک پہنچتی ہے ۔ اس وقت نیلوفر کا پھول صندوق سے نکل آتا ہے اور کچھ دیر باہر تھمتا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ایک گھڑی گزر گئی ہے ۔ قصہ مختصر رات دن کے چوبیس گھنٹے ہر گھڑی کے بعد گھڑیال برابر بجتا ہے ، نیلوفر نکلتا ہے اور پھر صندوق میں غائب ہو جاتا ہے ۔

محل کے شمالی حصے میں ایک اور طاق ہے جسے در بستہ صندوق کہا جاسکتا ہے ۔ اس کے آٹھ دروازے ہیں اور سب بند ہیں ۔ جب گھڑیال بجتا ہے اور کنول برآمد ہوتا ہے ، اسی وقت صندوق کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ہر گھڑی کے بعد ایک ایک دروازہ کھلتا جاتا ہے حتیٰ کہ سات دروازے کھل جاتے ہیں ۔ آٹھویں گھڑی میں دروازے کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں اور گھڑی کے اختتام پر آٹھوں دروازے بند ہو جاتے ہیں اور پھر یہی عمل شروع ہو جاتا ہے ۔

مغربی صفّہ میں ایک اور طاق ہے جس پر سنگِ مرمر کی ایک جالی لگی ہوئی ہے ۔ اس کے اندر مس اور ارزیز کا ایک گھڑیال ہے ۔ اس سنگین طاق کے سامنے ایک تخت ہے جس پر ایک رنگین چھتری لگی ہے ۔ دن کے وقت یہ چھتری آفتاب کی طرح چمکتی ہے ۔ جب شمالی طاق میں گھڑی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے لگتے ہیں ، اس طاق میں پہر کا حساب رہتا ہے جس کے لیے تین سو ساٹھ آوازیں گھڑیال سے نکلتی ہیں :

چو در طاس شمالی درز آغاز
کشاید یک یک و بندد ہمہ باز

دریں طاق خجستہ از پیٔ پاس
برآید سی صد و شست نغمہ از طاس

اس وقت یہ چھتری بند ہو جاتی ہے ، گویا پہر ختم ہو گیا ۔ اس کے بعد شاعر اس عہد کی اوقات شماری کی تشریح میں کہتا ہے کہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ رات اور دن کی ساٹھ گھڑیاں ہوتی ہیں ۔ حساب دان جانتے ہیں کہ اگر ساٹھ کو آٹھ پر تقسیم کیا جائے تو حاصل قسمت پہر ہوں گے ۔ اس حساب سے ساڑھے سات

گھڑی کا ایک پہر ہوا لیکن کسر سے بچنے کے خیال سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ چونکہ پندرہ گھڑیوں کے دوپہر ہوتے ہیں اس لیے پہلے پہر کو سات گھڑی کا اور دوسرے پہر کو آٹھ گھڑی کا مان لیا ۔ اسی قیاس پر تیسرا پہر پھر سات گھڑی کا اور چوتھا پہر آٹھ کا مانا گیا ۔ گویا دن رات آٹھ پہر میں چار پہر سات سات گھڑی کے اور چار پہر آٹھ آٹھ گھڑی کے ہوئے ۔ چونکہ کل گھڑیاں ساٹھ ہیں اس لیے تیس دن کی اور تیس رات کی ہوئیں ۔

شرق شمالی گنبد میں ایک کشادہ طاق ہے جس میں ایک زرین پنجرہ رکھا ہے ۔ پنجرے پر ایک حقّہ ہے جس پر ایک زرین طاؤس ہے ۔ پنجرے کے اندر ایک چوبین مرغ ہے ، جو ہر نماز کے وقت اذان دیتا ہے ۔ جب صبح صادق شروع ہوتی ہے ، اس کی اذان کی آواز آتی ہے ، جب آفتاب ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کا وقت آ جاتا ہے ، مرغا پھر بانگ دیتا ہے ۔ عصر اور مغرب کے وقت پھر اس کی اذان سنی جاتی ہے ۔ عشا کے وقت بھی وہ اذان دیتا ہے ۔ مختصر یہ کہ ہر نماز کے وقت اذان دیتا ہے ۔ مصنف جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے ، اس مرغ کی ساخت اور اصلی حکمت سے ہمیں کوئی اطلاع نہیں دیتا ۔ صرف اس قدر اشارہ کرتا ہے کہ ہوا اور آگ سے یہ طلسم تیار ہوا ہے :

برین هم هیچ کس را دسترس نیست
بغیر از باد و آتش کار کس نیست

زهی حکمت شناسِ سیمیا ساز
که هر دم آورد چوبی در آواز

شاعر نے اوپر جس عمارت کا ذکر کیا ہے وہ گویا اس عہد کا گھنٹہ گھر ہے ، جو رات دن کی ساعت شماری کے علاوہ نماز کے اوقات کی بھی تعیین کرتا ہے ۔ ان ایام میں کچھ اسی قسم کی گھڑیوں کا رواج تھا ۔ ہمیں تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری ہی سے مسلمان ایسے آلات بنا رہے تھے جن کا مقصد اوقات شماری تھا ۔ مسجد دمشق کی گھڑی کا ذکر کئی سیاحوں نے کیا ہے ۔ ابومطیع بلخی نے بھی ایک گھڑی تیار کی تھی[1] ۔ ممالکِ اسلام میں ساعت شماری گھنٹوں

۱۔ ابو مطیع کے ذکر میں کتاب ’گنج دانش‘ من معتمد السلطان محمد تقی خان ، طبع

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کے حساب سے ہوتی تھی یعنی رات اور دن کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کیا جاتا تھا ۔ شہابی چونکہ ہندوستانی ہے اس لیے وہ ہندی طریقے کے مطابق رات دن کو آٹھ پہر اور ساٹھ گھڑیوں میں تقسیم کرتا ہے ۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

طہران میں مرقوم ہے :

''ابو سطیع بلخی مردی حکیم و فاضل و جہاندیدہ بودہ ۔ با علمای اعلام و فضلای انام در آن زمان صحبتہا داشتہ و از علوم عقلی و نقلی و تعبدی و تعقلی باخبر بودہ :

تمتع ز ہر گوشہٴ یافتہ
ز ہر خرمنی خوشہٴ یافتہ

در مدتہای مدید در اقطاع و ارباع زمین گشتہ و ہر گوشہٴ جہان را سیر نمودہ و از اکثر جاہا و کارہا باخبر بودہ ، تادران اوان کہ در بلخ ابوالعباس کوسہ حاکم شدہ بود ، کہ نسبتش بہ ابو اسماعیل سامانی می رسید ۔ ابو مطیع باندیشہٴ این کہ از علوم صنعتی کردہ چیزی ترتیب دھد ، کہ نزد امیر بردہ ہم بوسیلہٴ آن ہنر بدان جا تقربی جوید ، و ہم ناسی گذاشتہ باشد ، لاجرم سہ دستگاہ از چوب وغیرہ بساخت ۔ یکی آنکہ ازانہا ، کہ صورت آدمی بود ، طبلی بگردن در جلورو داشت و مرغی بالای سرش بود ۔ ہر ساعتی کہ از روز برآمدی آن مرغ بال زدی و خواندی و آن آدم طبل زدی کہ صدا و صوتش بسیار دور رفتی و تمام مدت بیست و چہار قسمت شبانہ روز را معین ساختی و بواسطہٴ لنگری بودہ کہ در خودش تعبیہ کردہ بود کہ دیدہ نمی شد ۔''

مسلمانوں کے ہاں گھڑیوں کے رواج کے متعلق مزید اطلاع ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے ، پی ایچ ۔ ڈی کے اس مضمون سے حاصل کی جا سکتی ہے جو موصوف نے رسالہٴ اسلامک کلچر حیدرآباد میں صفحہ ۲۴۵ - ۲۵۱ پر ''مسلمانوں میں ساعت سازی'' کے عنوان سے دیا ہے ۔ سارٹن کی تاریخ سائنس (واشنگٹن ۱۹۳۱ع) میں بھی جستہ جستہ مقامات پر مفید اطلاع محفوظ ہے ۔

ہمارا شاعر اس عمارت کے دو تین اور عجائب بیان کرتا ہے جن کو میں بخوفِ طوالت ترک کر کے دوسرے محل کی طرف توجہ دیتا ہوں ؛ اس کے لیے سب سے پہلے ایک صحن تیار کیا گیا ۔ اس پر ایک صفّہ (چبوترہ) بنایا گیا جس کے سیڑھیاں اور چھت بھی ہے ۔ چبوترے پر مسند بچھی ہے جس پر ایک مرصع چھتری ہے ۔ دونوں جانب دو مورتیں ہیں ۔ ایک کے ہاتھ میں زردوزی رومال ہے ، دوسری کے ہاتھ میں مگس ران ہے ۔ جب بادشاہ زینے پر چڑھتا ہے اور مسند کے قریب آتا ہے ، چھتری بلند ہونے لگتی ہے تاآنکہ چار گز کی بلندی تک پہنچ کر قائم ہو جاتی ہے ۔ جب بادشاہ مسند پر آ کر بیٹھ جاتا ہے ، چھتری کھل جاتی ہے ۔ دونوں پتلیاں اپنا کام شروع کر دیتی ہیں ۔ یہ طلسم اس مشہور طلسم کے مشابہ ہے جس میں ایک آدمی زینے پر چڑھنا شروع کرتا ہے اور بلندی پر کی مورت کے سر اور دیگر اعضا جڑنے لگتے ہیں حتیٰ کہ آخری سیڑھی تک پہنچنے سے پہلے پہلے پتلی کہان میں تیر جوڑ کر تیار ہو جاتی ہے اور جونہی آخری سیڑھی پر آدمی اپنا قدم رکھتا ہے ، پتلی تیر مار کر اس آدمی کا کام تمام کر دیتی ہے ۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا ۔ مصنّف کا بیان ہے کہ جس وقت بادشاہ مسند پر رونق افروز ہوتا ہے ، قریب کے حجرے میں جشن شروع ہو جاتا ہے ۔ پُتلیاں اپنا اپنا ناچ دکھاتی ہیں ۔ مجیرے ، نے ، چنگ اور دنبل بجنے لگتے ہیں ۔ یہ بزم موسیقی کچھ دیر قائم رہتی ہے ۔ جب ختم ہو جاتی ہے ، دروازہ بند ہو جاتا ہے ۔ پاؤ گھڑی کے بعد دروازہ پھر کھلتا ہے اور منظر بالکل بدلا ہوتا ہے ؛ سامنے دو پہلوان نظر آتے ہیں جو خم ٹھونک کر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں ۔ اب وہ ایک دوسرے پر جھپٹتے ہیں اور ایک دوسرے کے بال پکڑ لیتے ہیں ۔ کبھی یہ مغلوب اور وہ غالب ، کبھی وہ مغلوب اور یہ غالب ہو جاتا ہے ۔ الغرض دیر تک کشتی ہوتی ہے ۔ جب دونوں تھک کر چُور ہو جاتے ہیں ، دروازہ بند ہو جاتا ہے ۔ جب دوبارہ کھلتا ہے ، دربار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے ۔ ایک تخت مع چتر ہے ۔ تخت پر ایک شاہ والا جاہ جلوہ فرما ہے ۔ امرا دورویہ کمربستہ کھڑے ہیں ۔ فوجیوں کے گھوڑے پاکھر پہنے ہیں ۔ ہاتھیوں کی قطار ہے ۔ ایک تیر پرتاب کے فاصلے پر دربان وحاجب کھڑے ہیں ۔ جب دربار ختم ہو جاتا ہے ، دروازہ پھر بند ہو جاتا ہے ۔ اب کی دفعہ جب کھلتا ہے ،

شکار گاہ کا منظر آنکھوں کے روبرو ہوتا ہے ۔ کتّے ہرن کا تعاقب کر رہے ہیں ، شیر ، گوزن پر داؤں کرتا ہے اور چیتا کوتاہ پایہ پر گھات کر رہا ہے ۔ اتنے میں دروازہ بند ہو جاتا ہے ۔ جب پھر کھلتا ہے ، میدان جنگ و جدال تماشائی کے سامنے ہوتا ہے ۔ فوجیں زرہ بکتر میں غرق ہیں ، سوار یلغار کر رہے ہیں ، تیر چل رہے ہیں ، تلواریں سر گرا رہی ہیں ۔ آخر دروازہ بند ہو جاتا ہے ۔ اسی رواق میں ایک اور طلسم پنہاں ہے ۔ اس کے شمالی بازو میں ایک مربع طاق ہے جس میں ایک کرسی دھری ہے ۔ طاق کا دروازہ جالی دار ہے ، کرسی مشمّن پہلو کی منقش ہے ۔ اس پر ایک جام زریں رکھا ہوا ہے جو شربت سے بھرا ہے لیکن جام کرسی یعنی میز کے ساتھ چسپاں ہے ۔ جب بادشاہ کسی شخص کے ساتھ مذاق کرنا چاہتا ہے ، اسے کہتا ہے کہ تم پیاسے معلوم ہوتے ہو ، سامنے وہ شربت کا گلاس بھرا رکھا ہے ، جاؤ پی آؤ ۔ جب آدمی جا کر گلاس کے قریب منہ لے جاتا ہے ، دیکھتا ہے کہ گلاس بالکل خالی ہے ۔ شرمندہ ہو کر منہ ہٹا لیتا ہے ۔ اس وقت اسے نظر آتا ہے کہ گلاس بدستور شربت سے بھرا ہے ۔ وہ پھر منہ قریب لے جا کر شربت پینے کی کوشش کرتا ہے ، شربت پھر غائب ہو جاتا ہے اور گلاس خالی نظر آتا ہے ۔

جب یہ حکمت سرا بھی تیار ہوگئی ، شاہی فرمان کے مطابق ایک اور محل تیار ہوا جس کا نام دھارا مندی ہے ۔ جب کوئی شخص اسے دیکھنے آتا ہے ، یہ محل برسنے لگ جاتا ہے ۔ جس طرح بہار کے موسم میں ابر بہار برستا ہے ، اسی طرح یہ محل بھی برستا ہے ۔ اس کے علاوہ اس میں اور بھی حکمتیں ہیں ۔

ایک حجرے میں ایک کمان کی شکل کا طاق ہے جس کے نیچے ایک قانون رکھا ہے ۔ اگرچہ کوئی سازندہ موجود نہیں ہے لیکن اس قانون سے برابر نغموں کی آواز آ رہی ہے ۔

دوسری طرف ایک اور طلاق ہے جس میں دو جنگ آزما پوشیدہ ہیں ۔ دونوں کے ہاتھ میں نیزے ہیں اور ڈھالیں بھی ہیں ۔ طلاق کے پیچھے ایک نقارہ ہے اور علم بھی ہے ۔ نقارہ بجنا شروع ہوتا ہے ، علم بلند ہوتا ہے اور دونوں جنگ آزما اپنی اپنی گھات سے نکل کر حملہ آور ہوتے ہیں اور تاک تاک کر ایک دوسرے کے سینے پر نیزے مارتے ہیں اور اپنا کمال دکھاتے ہیں ۔ اس کے بعد علم اتر جاتا ہے اور نقارہ خاموش ہو جاتا ہے ۔

ایک اور طرف دیوار میں دو کرسیاں نظر آتی ہیں جن پر سنہری پتلیاں قائم ہیں ۔ مشرق سمت والی کرسی پر ایک ہرن ہے اور مغرب کی کرسی پر ایک شیر ہے جو آہو کی گھات میں ہے ۔ جب تم شیر کا کان مروڑتے ہو ، ہرن کے منہ سے پانی بہنے لگتا ہے :

دھی گر شیر نر را گوشمالی
فرستد آھو مشکین زلالی

اگر ہرن کے کان کو مروڑا جاتا ہے ، شیر کے منہ سے پانی بہتا ہے ۔

تیسری طرف ایک نئی حکمت ملاحظہ ہوتی ہے : ایک طاق ہے جس میں ایک پہیہ قائم ہے جو ہر وقت متحرک ہے ۔ وہ لمحہ بھر کے واسطے بھی گردش سے آرام نہیں کرتا ، گویا وہ چکر کھانے کے لیے بنایا گیا ہے ۔ اگر کوئی طاقتور شخص اس گردشِ پیہم سے اسے روکنا چاہے تو پہیے کو پکڑ کر روک سکتا ہے لیکن جہاں چھوڑا گیا وہ بدستور جنبشِ دائمی میں مصروف ہو جاتا ہے ۔ یہ گویا 'چرخ دائم السیر' ہے اور صدائے باز گشت ہے قدما کے اس عقیدے کی کہ ایسا چرخ تیار کیا جا سکتا ہے جو بغیر کسی خارجی طاقت کی امداد کے ہمیشہ متحرک رہ سکے ۔ حالانکہ دائم السیر کا نظریہ بھی اسی قدر بے حقیقت ہے جس قدر کہ کیمیا گری کا خبط ، اگرچہ اس کی دھن میں مغرب و مشرق صدیوں تک پریشان رہے ہیں ۔

شہابی کا بیان ہے کہ جب وہ تینوں محل مع ان کی نیرنگیوں اور عجائب کے تیار ہو چکے ، بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ اب حوض تیار ہونا چاہیے جس میں دانش کے ساتھ نیرنگی کا عنصر بھی ہو ۔ میں نے تعمیل ارشاد شاہی میں استادان چابک دست کو بلوایا اور ضروری سامان فراہم کیا گیا ۔ باغ خاص میں ایک عمارت چار طاق بنائی گئی ۔ اس کی چھت پر ایک حوض تعمیر ہوا جو قد آدم سے زیادہ گہرا ہے ۔ جب آدمی اس حوض میں غوطہ لگاتا ہے ، وہ یہ عجائب دیکھتا ہے کہ پانی کے نیچے اسے ایک دروازہ ملتا ہے ۔ اس دروازے میں گھس کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوتا ہے ۔ اگرچہ انسان دروازے سے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے لیکن پانی کمرے میں نہیں جا سکتا ۔ کمرے میں بزمِ طرب مرتّب ہے ، مسند لگی ہے ، فرش بچھا ہے ۔ مطرب ، بخور اور بادہ و نقل مہیا ہیں ۔

انسان جب ان اشیا سے کچھ عرصے محظوظ ہو کر واپس آنا چاہتا ہے ، دروازے میں سے لوٹ کر پانی میں داخل ہو جاتا ہے اور ایک ہی غوطے میں پانی کی سطح پر آ جاتا ہے ۔

ہمارے افسانوں میں ، جو طلسم اور طلسمات سے تعلق رکھتے ہیں ، ہم کئی موقعوں پر پڑھتے ہیں کہ فلاں طلسم کا راستہ پانی کے حوض میں سے تھا اور طلسم کشا کے لیے لازم تھا کہ طلسم میں داخل ہونے کے لیے حوض میں غوطے لگائے وغیرہ ۔ طلسم ہوشربا اور اس کے سلسلے کی داستانوں میں بے شمار موقعوں پر ہم اس حوض سے دوچار ہوتے ہیں ۔ نسیم نے اپنی مشہور مثنوی میں بھی اس حوض کا ذکر کیا ہے :

اک حوض پُر آب و تاب دیکھا
سر چشمۂ آفتاب دیکھا

غوطہ جو لگا کے سر اٹھایا
وہ حوض ، وہ آب ، کچھ نہ پایا

اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں میں ایسے حوض کا تخیل موجود رہا ہے ، مگر کیا شہابی کے ہاں حوض کا بیان اسی عام تخیل کی صدائے باز گشت ہے یا وہ کسی حقیقت پر مبنی ہے ؟ اس کے متعلق اس قدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف شہابی کے عہد میں بلکہ اس سے کئی صدی بعد تک ہمارے افسانوں میں کسی ایسے حوض کا تخیل تعمیر ہونے نہیں پایا ہے اور نہ اس کے آثار ملتے ہیں ۔ مسلم ہندوستان میں افسانہ نگاری نے اس عہد تک کوئی قابل اعتنا ترقی نہیں کی ہے اور وہ انھی قصص و افسانوں پر قانع ہے جو اسے ایرانی و ہندی ذرائع سے ملے ہیں اور نہ ان میں کوئی قابل ذکر اضافہ کیا ہے ۔

حوض کا خیال بہت ممکن ہے کہ شہابی کے عہد سے قدیم ہو مگر مجھ کو اس وقت تک کوئی ایسا حوالہ نہیں مل سکا ہے اور شاید یہ کہنا بھی قرین صحت ہے کہ وہ ایک حد تک کسی اصلیت پر بنیاد پاتا ہے ۔ شہابی سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد جلال الدین اکبر کے عہد میں ہم ایسے حوض کا ذکر کتبِ تاریخ کے اوراق میں پڑھتے ہیں ۔ عبدالقادر بدایونی اپنی مشہور تاریخ میں ایک موقع پر

لکھتے ہیں :

''اس سال کوئی حکیم فتح پور پہنچا ۔ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ ایسا مکان بنا سکتا ہے جس کی حدود اربعہ پانی میں ہوں گی اور اس میں پہنچنے کے لیے پانی میں غوطہ لگانے کی ضرورت ہوگی ۔ مکان میں آدمی جا سکتا ہے مگر پانی نہیں داخل ہو سکتا ۔ اس مقصد کے لیے ، شاہی محل کے صحن میں ، بیس گز لمبا اور بیس گز چوڑا حوض تیار کیا گیا جس کی گہرائی تین گز تھی ۔ حوض کے اندر پتھر کا ایک کمرہ تیار کیا گیا ۔ اس کی چھت پر ایک بلند منارہ بنایا اور مکان کے چاروں طرف سیڑھیاں تیار ہوئیں ۔ مگر حکیم اس دعوے میں اپنی قرابا دین کی طرح صادق ثابت نہیں ہوا اور اپنا منہ لے کر کسی طرف غائب ہوگیا ۔ لیکن اسی واقعے سے سترہ سال بعد حکیم علی گیلانی نے شہر لاہور میں ایسا حوض واقعی تیار کیا اور میر حیدر معمائی نے ''حوض حکیم علی'' سے ۱۰۰۲ھ اس کا مادۂ تاریخ برآمد کیا ۔ شہنشاہ نے اس حوض کو بیسوں سے بھروا دیا جس میں بیس کرور سما سکے ۔''

میں اصل عبارت بھی یہاں نقل کیے دیتا ہوں :

''درین سال حکیمی در فتح پور آمده گفت که خانۂ می توان ساخت که در هر چهار طرف آن آب باشد و دران غوطه زده بخانه درآیند و آب نفاذ نکند ۔ بایں تقریب حوضی بیست گز از بیست گز و عمقِ آن سه گز در صحنِ دولت خانه ساختند و درون آن حجرۂ سنگین و برسقف آن منارۂ بلند بنا کردند و از هر چهار طرف آن حجره پلّها گذاشتند و دعوئ حکیم چون قرابا دینات دروغ برآمده ، گریخته بجائی رفت ۔ اما حکیم علی گیلانی بعد از هفده سال در لاهور آن چنان حوضی ساخت و میر حیدر معمائی ''حوض حکیم علی'' تاریخ یافت و آن حوض ناتمام را از زر سیاه که مبلغ بست کرور رسید پُر ساختند ۔''

(منتخب التواریخ ، جلد دوم ، صفحہ ۲۲۴ ، نولکشور ، ۱۲۸۴ھ)

یہ بدایونی کا بیان ہے ۔ اسی سلسلے میں ابوالفضل 'اکبر نامہ' میں لکھتا ہے :

''درین ولا حکیم علی گیلانی شگرف حوضی بر ساخت ۔ راهی از درونۂ آن

بکاشانہ سی رفت و شگفت آنکہ آب ازین برکہ بدانجا در نمی شد ۔ مردم فرو شدہ ، براہ پژوھی فراوان رنج بردی و بسیار آزار یافتہ ، از نیمۂ راہ باز گردیدی ۔"

(جلد سوم ، ۱۰۰۴ھ = سال سی و نہم ، صفحہ ۶۵ ، سطر ۲۴ ، ۱ ، س ۔ ب ، سنہ ۱۸۸۶ع)

یہی نہیں بلکہ خود جہانگیر بادشاہ اپنی 'توزک' میں بالفاظ ذیل سنہ ۳ جلوس (م ۱۰۱۷ھ) میں اس طرح ذکر کرتا ہے :

"روز یک شنبہ بیست و سوئم ، بخانۂ حکیم علی ، بتماشای حوضی کہ مثل آن در زمان حضرت عرش آشیانی در لاھور ساختہ بود ، با جمعی از مقربان کہ حوض را ندیدہ بودند رفتم ۔ حوض مذکور شش گز در شش گز است و در پہلوی حوض خانۂ ساختہ شدہ در غایت روشنی کہ راہ بآن خانہ ہم از درون آب است و آب ازین راہ بدرون در نمی آید ۔ دہ دوازدہ کس در آن خانہ صحبت میداشتند ۔ از نقد و جنس آنچہ در وقت او گنجید پیش کش نمود ۔ بعد از ملاحظۂ خانہ و در آمدن جمعی از نزدیکان بدانجا حکیم را بہ منصب دو ہزاری سرفراز ساختہ ، بدولت خانہ معاودت نمودم ۔"

(صفحہ ۷۳ ، توزک جہانگیری)

معلوم ہوتا ہے کہ حکیم علیؒ کے حوض نے ان ایام میں کافی شہرت حاصل کر لی ہے ، جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کی صدائے باز گشت ، کچھ عرصے کے بعد ، جدید افسانوں میں ملنے لگی ۔ ہمارے افسانہ نگاروں کو ایک نیا خیال سوجھا ۔ انھوں نے اپنے ہیرو کو اسی قسم کے حوض کے راستے سے طلسم میں پہنچایا ہے ۔ چنانچہ 'ھفت سیر حاتم طائی' میں جسے 'نگار دانش' بھی کہا جاتا ہے ، اور جس کا مولف رحمت اللہ ولد شیخ محمد بختیار جلیسری ہے ، اور جو ۱۱۶۴ھ بعہد احمد شاہ بادشاہ مرتّب ہوتی ہے ، یہ حوض موجود ہے ۔ قصہ یوں ہے کہ حاتم اپنی پہلی سیر میں آدم ماہی کے ساتھ تین روز گزار کر واپس دریا کے کنارے آ جاتا ہے اور اپنا سفر شروع کر دیتا ہے ۔ چلتے چلتے ایک پہاڑ پر پہنچ جاتا ہے جس پر ایک باغ بنا ہے ۔ باغ میں ایک درویش سے اس کی ملاقات ہوتی ہے ۔ حاتم اپنے مقصدِ سفر یعنی دشتِ ہویدا تک پہنچنے کا شوق اس سے ظاہر کرتا ہے ۔

درویش پہلے تو حاتم کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے ، مگر جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاتم ہے اور شہزادہ منیر شامی کے لیے یہ صعوبت اختیار کر رہا ہے ، وہ پوری پوری دلچسپی لیتا ہے اور کہتا ہے کہ دشتِ ہویدا میں تمھیں طلسم کی پریاں لے جائیں گی ۔ ان میں ایک خاص پری ہے ، جب تک اس پری کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں نہ ہوگا ، تمھیں دشت ہویدا کا راستہ نہیں ملے گا ۔ چنانچہ درویش کی ہدایات کو مدنظر رکھ کر حاتم روانہ ہوتا ہے ۔ چند روز کے بعد ایک تالاب پر پہنچتا ہے جس کے گرد بہت سے درخت ہیں ۔ اتنے میں ایک نوجوان عورت چشمے سے نکلتی ہے ۔ حاتم اس عورت کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے ۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تالاب میں غوطہ مارتی ہے ۔ جب تالاب کی تہہ کو حاتم کا پاؤں چھوتا ہے ، وہ آنکھیں کھولتا ہے اور اپنے آپ کو اس عورت کے ساتھ ایک باغ میں پاتا ہے ۔ پری حاتم کو وہاں چھوڑ کر کسی طرف چل دیتی ہے ۔

آمدم برسر قصہ ؛ شہابی کا بیان ہے کہ جب یہ محل تیار ہوگئے ، میں نے جا کر بادشاہ کی خدمت میں ان کی تکمیل کی اطلاع کی اور ان کے ملاحظے کی دعوت دی :

عروسی کو زند صد طعنہ بر ماہ
همی ارزد بدیدن آخر ای شاہ
تماشا کن درین فیروزہ گلشن
کزو فیروزہ گلشن گشت روشن
بیا از مقدمِ میمونش بنواز
شہابی را و او را سر برافراز

بادشاہ شاعر کے التماس کو قبول کرتا ہے ۔ ان عجائبات کا معاینہ کرتا ہے اور بے حد خوش ہوتا ہے ۔ صلے میں شاعر کو نقدی کے علاوہ قبائے خاص اور تاج و کمر عطا کرتا ہے ۔ رومی دیبا کے بقچوں اور خطائی زربفت کے علاوہ دس گاؤں جاگیر میں ہمیشہ کے لیے عنایت ہوتے ہیں اور اکاسی گھوڑے دیے جاتے ہیں ۔

اب میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں اور آخر میں عرض کرتا ہوں کہ ہم شہابی کے بیانات کو ، خواہ بیان واقع سمجھیں یا محض شاعرانہ تخیل کا پرتو مانیں

لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کی یہ مثنوی ہر حال میں ہماری سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے۔

صفحاتِ آیندہ میں اصل کتاب کا وہ حصہ درج کیا جاتا ہے جو مذکورۂ بالا عجائب خانوں اور ان کے عجائبات کا بیان دیتا ہے۔

از مثنوی عروۃ الوثقیٰ

صفتِ عمارت کہ عبارت از دیوان العمل است

برون این عمارت کردہ استاد
محلّی بہر آب و آتش و باد

بوضعی کش مہندس ساز کردست
سہ در بر ہر سہ عنصر باز کردست

بیک جا دادہ کانونی عجب ساز
وزو کردست در ہر سو دری باز

اگرچہ آتش کند در وی بہر ماہ
ولی گرمی رسد دایم ازان راہ

بہر جای کز آتش گرم باید
حرارت می رسد چندانکہ شاید

دگر جا کردہ برجی را بفرہنگ
برای باد خانہ از گچ و سنگ

بقدر بیست گز بالای دیوار
مربع خانۂ کردست معمار

درو جز چار در نبود زیادت
کہ دروی می بزد بادی بعادت

بود در هر دری رازی نهانی
که کرد استاد راز از کاروانی

چو بکشایی دری جمله شود باز
یکی بندی همه بستن کند ساز

بسی انبوبها زین باد خانه
بحکمت کرد هر جانب روانه

ز هر جانب که باد آید به تقدیر
بگیرد باد را آن در به تدبیر

دران در ها شود چون باد را راه
در انبوبه در آید باد آن گاه

به تدبیری که مخفی کرد استاد
رسد جای که باشد حاجت باد

سلیمان نیست لیکن چون سلیمان
بود پیوسته بادش زیر فرمان

دگر جایی دو حوض از سنگ کردست
یکی بکشاده دیگر تنگ کردست

بود پر دائما حوض کلان آب
وزو در حوض خورد آید روان آب

بود در حوض خورد انبوبه بسیار
که آب از وی رسد هر جا به مقدار

چو آب و باد و آتش شد روانه
نباشد عالمی جز این سه گانه

اگرچه هر طرف بے حکمتی نیست
بجز تمزیج عنصر علتی نیست

چنان این راز را پوشیده کردست
که جز حیرت نیاید هیچ در دست

اگر خواهی که دانی سرّ این راز
بگویم یک بیک با خدمتت باز

صفتِ طاسی و نیلوفری کہ طاس لیلوفر از رشک او سرگردالست

نخستین صفۂ کو سوی شرقست
کہ عقل از صنعتش در خویش غرقست

رواق بس عجب کز طاق گردون
بخوبی و متانت باشد افزون

طلسمی بس عجایب ساز دارد
زمان را در زمین در باز دارد

بہ دیوار صفہ طاقیست بس خورد
کہ نتواند خرد رہ سوی او برد

رخ آن طاق بر بستست هموار
درون طاق صنجی نا پدیدار

برون طاق صندوقیست از مس
کہ از خویش والہ می شود حس

مشبک کردہ صندوقش بفرهنگ
کہ بنماید درونش از رخنۂ تنگ

زر و گوهر بہم ترکیب کردست
وزو نیلوفری ترتیب کردست

دران صندوق می دارد نہانش
چو غنچہ بستہ می باشد دهانش

اگر مقدار طاسی بگذرد روز
بفریاد آید از صنج دل افروز

طنین طاس آن صنج فلک ساز
بود با طاس گردون چون هم آواز

برون آید ازان صندوق آنگاہ
گل نیلوفری بشگفتہ چون ماہ

بدان رو تازگی ماندن زمانی
دهد از طاس بگذشتہ زمانی

دران صندوق باز آید بصد ناز
چو در صندوق سینه جان دمساز
ازینها هر کسی گیرد قیامی
که بگذشت از زمان مقدار طاسی
همیشه روز و شب آن صنج و آن گل
شود بشگفته دان دیگر بغلغل
گرت باشد خرد باور بداری
که اینجا نیست مطلق دست کاری
طلسماتی که می گردد هویدا
ز تاثیر عناصر گشت پیدا

صفتِ صندوق هشت در که هشت در بهشت بروی هر درش کشاده است

دران صفه که رویش در شمالست
بود طاق [که] مانندش محالست
نه طاق بلکه صندوقی مضمّت
که دروی هشت در باشد چو جنت
ولیکن جمله درهای خجسته
بود بر روی هر نا اهل بسته
چو آن نیلوفر و صنج خوش آواز
دهند از طاق بگذشته خبر باز
ازان صندوق پیشانی کشاده
شود یک در بآسانی کشاده
بهر مقدار طاسی کز زمان رفت
یکان در می کشاید تا شود هفت
نماند طاس هفتم را چو مقدار
همه درها شود بسته بیک بار
برینسان باز یک یک میکشاید
چو طاس هشتمی را آخر آید

شود هر هشت در بر بسته دیگر
نخستین طاس دیگر باز از سر

یگان در بار دیگر می کشاید
چنین تا باز طاس هفتم آید

چو طاس هفتمی آهسته گردد
همین درها بیک ره بسته گردد

کند چون بار دیگر صنج آواز
بهر طاسی یگان در می شود باز

چو طاس هشتم آرد رو بانجام
شود بر بسته درها باز در شام

بدین ترتیب شب تا روز روشن
کشاید چار نوبت در بدان فن

درین هم دست کس را نیست مدخل
بسان آن گل و آن صنج اوّل

صفتِ طاق که درو تخت و چتریست که خسرو تخت نشین طاق سپهر در زیر سایهٔ اوست

بود در صفهٔ غربی یکی طاق
که نبود مثل او دیگر در آفاق

رخ آن طاق را از سنگ مرمر
مشبّک کرده بر بست است یکسر

درون طاق طاسی را بترتیب
ز ارزیر و ز مس کردست ترکیب

زده تختی به پیش طاق سنگین
بروی تخت چتری کرده رنگین

بود در روز چتر شادی اندوز
بسان آفتاب عالم افروز

چو در طاس شالی درز آغاز
کشاید یک یک و بندد همه باز

درین طاق خجسته از پی پاس
بر آید سی صد و شست نغمه از طاس

بر آید چتر و زه گردد بتمکین
کشاید هر کسی لب را به تحسین

بآوازی که بر خیزد ازان طاس
شود معلوم هر کس را که شد پاس

بداند بر حساب آن را که دست است
که طاس روز و شب همواره شست است

کنند ار این عدد بر هشت قسمت
بود پاس حقیقی نزد حکمت

شناسد هر کرا ذهن سلیم است
که یک پاس حقیقی هفت نیم است

محاسب چون بکسر او نظر کرد
حساب پاس را نوع دگر کرد

چو هفت و نیم آمد حصهٔ پاس
دو پاس البته باشد پانزده طاس

نخستین پاس کرد از هفت تدبیر
دوم را هشت پاس آمد به تقدیر

سیم را نیز حصه هفت فرمود
چهارم کرد باز از هشت موجود

همیشه چار پاسش هفت طاس است
دگر کان هشت باشد چار پاس است

چو شست آمد همه پاس دل افروز
بود سی در شب و سی پاس در روز

بهر طاسی که آرد صنج آواز
بر آید آن گل و سازد دهن باز

یکی در نیز ازان در ها کشاید
به بندد چونکه وقت پاس آید

بروز و شب برآید بانگ ازان طاس
بخوبی هشت نوبت از پیٔ پاس

همیشه صنج و طاس و در کند کار
که ناید هیچ تغییری پدیدار

بخدمت این سه باهم یار باشند
همیشه روز و شب در کار باشد

درین چتر و درین طاس نواسنج
که دانا اندرو برده بسی رنج

نباشد حاجتِ آن سان به تقدیر
که سازد از عمل از دست تدبیر

صفتِ خروسی که وقت نماز گلبانگ برکشد و گوش خروس عرش را برکشاید

بود در گنبد شرقی شمالی
طلسمی پرهنر وز عیب خالی

بود طاق دران جای کشاده
درو یک پنجرهٔ از زر نهاده

نهاده حقهٔ بالای پنجره
که باشد بر سرش طاؤسی از زر

خروسی در درون پنجره هست
ستاده چون خروس عرش پیوست

خروسی کو تنی از چوب دارد
ولیکن نغمهٔ بس خوب دارد

خروس عرش چون بر دارد آواز
همان نغمه خروس اینجا کند ساز

خروسی نی بتی کردست استاد
کہ وقت ہر نماز آید بفریاد
اگر بت مرد را از دین بر آرد
نگر این بت کہ راہ دین سپارد
چو صبح صادق از جیب افق سر
برون آرد شود عالم منوّر
ببانگ آید چو مرغی مرغ چوبین
کہ تا طاعت کند مرد نکو بین
وگر ظلّ خور از مقیاس علمت
شود از سایۂ اصلی زیادت
در آید اول ظہر ای خردمند
زند آن مرغ زرین نعرۂ چند
چو از مثلین ظل را بگزرد کار
شود گویا خروس نغز گفتار
چو در جیب افق خور سرفرو برد
چراغ دیدۂ شمّاسیان مرد
بود ہنگام شام آن دم بہ تمییز
بر آرد مرغ زیرک نغمۂ تیز
عشا باشد شفق چون شد مستتّر
برآرد مرغ چوبین بانگ دیگر
کند ہرگہ کہ مرغ زیرک آواز
ہمان طاؤس پر ہا را کند باز
دران آواز میدانی چہ رازست
کہ داند ہر کسی وقت نماز است
بہر وقت نماز آن مرغ عابد
نہد رو بر زمین چون مرد ساجد
برین ہم ہیچکس را دسترس نیست
بغیر از آب و آتش کار کس نیست

زهی حکمت شناس سیمیا ساز
که هردم آورد چوبی در آواز

صفتِ صندوق که چون صندوق سینه محل واردات اسرار غیب است

بغربی و شمالی گنبد ای یار
طلسمی بس عجب آمد پدیدار

درون حجره صندوق بکار ست
که در هاش از دو رسته بست و چارست

مهندس گر چه در کرده دو رسته
ولیکن جملهٔ درهاست بسته

بود در صدر صندوق یگانه
دو تخته هر یکی سی در و خانه

بهر یک خانه اش دانا به تدبیر
یگان اسماء حسنٰی کرد تکسیر

بود بر راست اسماء جلالی
بدیگر سوی اسماء جلالی[1]

نوشته زیر هر اسمی به تمییز
ز نیتهاء باطن لیتی نیز

بهرکاری که رو دارد عزیزی
و یا دارد کسی حاجت به چیزی

بباید پیش آن صندوق فرخ
کند بر قبلهٔ حاجات خود رخ

نظر بر خانها اندازد از دور
که تا بیند سوال خویش مسطور

۱- قافیے میں ایک جگہ 'جلالی' اور دوسری جگہ 'جمالی' موزوں معلوم ہوتا ہے ۔ (مرتّب)

چو از یک خانه سازد مشکل خویش
نگهدارد چو ایمان در دل خویش

بصدق نیت و اخلاص همدم
توجه آورد بر اسم اعظم

بر آن همت نهد بر عالم غیب
چه رو بنهاید از درگاه لاریب

ازان درها شود تاکه یکی باز
شود پیدا ازان در جملهٔ راز

بر آید تختهٔ چون لوح محفوظ
که تا سائل شود زان لوح محظوظ

چو زان در فتحیاب خویش یابد
ازان تخته جوابِ خویش یابد

شود آن رسم و آن نیت نمودار
کند از نفع و ضرّ آن خبردار

ز یک در چون که بر خواند جوابی
پدید آید ز غیبش فتح بابی

زهی دانا که صندوق چنان کرد
که علم غیب ازو حاصل توان کرد

صفتِ گلبنی که گلهای چمن بهشت ازو رنگ و بو گیرند و بلبلان باغ جنت از مرغانش لغمه پذیرند

بوَد در گنبد غربی جنوبی
درخت بارور چون شاخ طوبی

بروی کرسی ای [کذا] از سنگِ مرمر
بود بر پاستا ده آن صنو بر

بزیبائی نهال سرو قامت
نهد بر سدره و طوبیٰ غرامت

تنش از سیم و برگ و بارش از زر
مرصّع کرده سر تا سر بگوهر

ز هر نوعی بر او گلهای رنگین
بزیبائی همه درخورد تحسین

نشسته بر سرش طاؤسی از زر
چو طاؤس بهشتی خوب منظر

به جلوه بال و پر از هم کشاده
چوان طاؤس نر از شوق ماده

بهر شاخی بود مرغان دمساز
بسرسبزی چو طوطیٔ خوش آواز

ازان گلهای بشکفته فراوان
فرو می آید آبی همچو باران

چو در باریدن آید شاخ پر بار
چو هنگام بهاران ابر در بار

همه مرغان به رقص آیند یکسر
و لیکن رقص هر یک نوع دیگر

که اندر سایهٔ آن سرو آزاد
شکفته جان نیلوفر بود شاد

درون هر یکی باشد بصد ناز
ستاده صورتی همچون بط و قاز

بهنگام عمل بی عیب و بی نقص
به نوبت هر یکی باشند در رقص

بخیزد زان گل و زان مرغ باران
چو خیزد ز ابر بهمن در بهاران

دگر کردست دانای خردمند
درین گنبد بدانش حکمتی چند

بقرب پنج گز بالای دیوار
که آن را پای گنبد خواند معمار

بود بر چار حدش چار کرسی
بگویم با تو شرحش گر بپرسی

بروی هر یکی صندوق از سنگ
مرتب کرده استادش بفرهنگ

بود بالای هر صندوق سنگین
دوگان صورت همه زیبا و رنگین

ولیکن هر یکی از چوب باشد
که در پا کوفتن مرغوب باشد

درین گنبد بود هم طاقکی خرد
که گوی از طاق نه گنبد بدر برد

نهالی در درون طاق خوردست
که از خورشید وز مه دست بردست

پس این طاق صندوقیست دیگر
دران صندوق پنهان صنجی از زر

بهردم کان نهال طوبی آثار
بسان ابر نیسان گشت در بار

بر آرد صنج آوازی ز صندوق
رساند نغمه را در گوش عیوق

همان صورت که باهم رای دارند
بدان صندوق سنگین جای دارند

بسان دلبران در جلوه آیند
دگرگون هر یکی رقصی نمایند

برقص و نغمه گرچه یار باشند
بنوبت هر یکی درکار باشند

گهی این رقص و گه آن نغمه آرد
گهی زین مرغ و گه زان نخل بارد

صفتِ حمامی که درو خادمه قایم و بخدمت کمربسته دایم اند

ببین در گنبد شرق جنوبی
که رضوان زو کند دریوزه خوبی

ازان گنبد که چون حمام گرمست
بهشت عدن از سردی بشرمست

بود دیوار آن گنبد گچ و سنگ
که بنّاراست کردستش بفرهنگ

بقدر چار گز بالای دیوار
مهندس کرده نیرنگی نمودار

بران بالا کنیزک پیکری هست
که باشد دایمش افتابه بر دست

بود پیوسته آن تمثال قائم
دران افتابه باشد آب دائم

بود انبوبهٔ افتابه هموار
کشاده آب ازو باشد پدیدار

ز افتابه نمی ریزد گهی آب
مگر آن دم که شه جوید ازو آب

دری پایانِ آن دیوار باشد
که آن در محکم و مسمار باشد

درون در یکی حجره نهانیست
درو از حکمتِ یونان نشانیست

دران حجره کنیزی هست پر فن
بدستش اسله بر با ظرف روغن

ز چوبست آن کنیز خوب رخسار
کزو آید چنین حکمت پدیدار

برون در نهاده کرسیٔ خوب
ز سنگ مرمر آن کرسی به از چوب

چو وقت غسل فرمودن شهنشاه
نشیند بر سر کرسی یکی جاه [کذا]

به تقدیر خدا آن در شود باز
همان صورت بر آید با صد اعزاز

دهد آن ظرف روغن از سر رای
بجائی که باشد پیش برپای

چو بدهد آنله خود باز گردد
بدان خلوت سرا دمساز گردد

چو وقت آید که ریزد آب بر سر
اشارت گر کند شه سوی پیکر

فرود آید ازان افتابه آبی
که نی آهسته باشد نی شتابی

اگر گوید شه آب گرم باید
فرستد آنچنان آبی که شاید

وگر سردی بود از آب دلخواه
فرود آید ازان انبوبه ناگاه

وگر شه معتدل آب آرزو کرد
دهد آبی همی نی گرم نی سرد

وگر دیگر نباشد حاجت آب
بگوید شه برای آب مشتاب

اگرچه نایزه باشد کشاده
شود از نایزه آب ایستاده

فلک هرچند دارد دیدها باز
کجا دیدست شاهی گو بدین ساز

نفاذ امر او را بی درنگی
کمر بربسته باشد چوب و سنگی

زهی فرمان دهی کز ناگزیری
جهادش می کند فرمان پذیری

صفتِ رواق و پاشیبی که تا رواق فلک شیب پا دارد

چو فارغ شد ز کار یک محل دل
بترتیب دوم جا گشت مائل

نمود اندیشهٔ از راه فرهنگ
که پیدا شد چنین فرخنده نیرنگ

عمل داران کمر بستند درکار
هنرها یک بیک کردند اظهار

نخستین مرتفع صحنی کشادند
که بر صحن جنان ترجیح دادند

یکی صفه بر آن صحن دل آرای
چو کاخ آسمان کردند بر پای

نهاده بر صفه پاشیبی الحق
که بتوان رفت ازو بر چرخ ازرق

چه پاشیبی که پایش چرخ سایست
بشیبی چرخ و چرخش شیب پایست

زهی پاشیب کز بس استواری
مجره زیر پاش افتد بخواری

بران صحن صفه کردند برپای
رواق کز بلندی شد فلک سای

برآمد چار سویش چار منجوق
که هر یک میل زد در چشم عیوق

چنان منجوقها سر بر فلک برد
که چرخ کوژ را شد پشت خم خورد

درخت سدره را تنشیر کردند
بصورت جنّتی تدبیر کردند

رواق نی که از نزهت بهشت ست
گلش از چشمهٔ حیوان سرشت است

ز نورش خیره چشم آفتابست
ز مینایش دل مینو خرابست

گر اقلیدس به بیند نقش بندیش
کند تعویذ جان از ارجمندیش

خجل از رفعتش فیروزه طارم
ارم از نزهتش در خویشتن گم

جهان چون دید از رفعت عروجش
همی خواند ز جان ذات البروجش

سر منحوق تیر چرق سایش
فلک را آنچنان در شد بپایش

که گرتی بر ستونش تکیه می کرد
فتادی بر زمین از غایت درد

صفت مسند و چتری که چون اورنگ جمشید و چتر خورشید با رونق و بهاست و نعت دو هیکل که چون دو پیکر بمروحه برپاست

درون آن رواق چرخ بنیاد
چو تختی مسندی بنهاد استاد

نه مسند کو فره از تخت جم بود
که تخت جم ازو صد پایه کم بود

دگر نزدیک او چتری مهیّاست
که پنهانست دایم گرچه پیداست

ز چرخی اطلس است آن چتر اسلس
که دارد زیر سایه چرخ اطلس

بخوبی باشد آن چتر زر اندوز
مکلّل چون سپهر عالم افروز

نگویم تخت شه تخت سلیمانست
که باد هرزه گردش زیر فرمانست

بود بر هر دو بازو هیکل خوب
مهیّا کرده شخصش از مس و چوب

دو جانب چون دو خادم ایستاده
کمر دربسته و بازو کشاده

بدست آن یکی رومال زردوز
بکف این را مگس رانی دل افروز

چو خسرو بر سر پاشیب آید
ز جان آن چتر زر جنبش نماید

بمقداری که شاه از راه تحریک
شود بر مسند فرخنده نزدیک

برفعت سر کشد چتر معلاّ
چو سروی نوجوان و راست بالا

بدینسان چتر چون از جا برآید
بقدر چار گز بالا برآید

چو بر مسند نشیند شه باعزاز
شود زه چتر بکشاید ز هم باز

بماند چتر پیشانی کشاده
چو دولت بر سر شاه ایستاده

بنوبت هر دو خادم نیز دلشاد
گه این راند مگس گاه آن کند باد

چو [شه] بنشسته ماند ساعتی چند
پدید آید ز نونو حکمتی چند

وگر شه باز گردد با دل شاد
نهد چتر سریر باد خود یاد

فرود آید بجای خود شتابان
شود دیگر ره از هر دیده پنهان

همان تمثالها بیکار مانند
ز دوری شهنشه خوار مانند

چو دیگر بار شاهنشاه آید
همان نیرنگها دیگر نماید

صفتِ حجره که چون حجلهٔ عروسان هر زمان عروسی بنوعی دیگر در جلوه آرد

بدیوار رواق آسمان رنگ
بحکمت کرده دانا حجرهٔ چند

دری درپیش آن حجره نهاده
که بربستست نی آن در کشاده

دری خردست در معنی کلانست
درو از حکمت یونان نشانست

دری کورا هزاران فتح بابست
تمام خلق ازان در فتح یابست

دری کش فتح باب از حد فزونست
نمی دانم که دایم بسته چونست

چو مسند شد ز پای شه سرافراز
دری دولت بروی شه شود باز

چو در بکشاده شد از بخت بیدار
دران حجره شود جشنی پدیدار

برقاصی ز هر سو دلبری مست
عطارد دیده و دل داده از دست

مجیره عالمی پر شور کرده
بسیلی چشم بد را کور کرده
ز یک [سو] بانگ نای و نغمهٔ چنگ
بر آورده ز یک سو دنبل آهنگ
چو آن رامش گران زهره دیدار
ز کار خویشتن گردند بی‌کار
در آن حجره ناگه بسته گردد
وزان مجلس نظر بگسسته گردد
بقرب ربع ساعتی چونکه بگذشت
شود بکشاده در مجلس دگر گشت
شود هنگامهٔ ناگاه پیدا
دران هنگامه برپا یک دو برنا
دو کشتی گیر باشد روی در روی
گرفته یک دگر را موی در موی
گه این حمله برو چون شیر آرد
گه آن چون روبهش در زیر آرد
در قرخاش را بکشاده دائم
دران هنگام سال و ماه قائم
چون آن هر دو جوان هنگام بازی
بتنگ آیند ازان هنگامهٔ سازی
دگر ره بسته گردد در بیک بار
شود از دیده پنهان آن نمودار
درنگ افتد چو دیگر ره زمانی
کشاده گردد آن در ناگهانی
پدید آید فضای شاد و خندان
درو شیری و پیلی تیز دندان
فرود آورد شیر از قوت خویش
ته چنگال پیل کینه اندیش

درو پیچیده پیل سخت خرطوم
به نرمی کشته شیرش شیری از موم
بقصد یک دگر در کینه سازی
نموده هم بخون خویش بازی
گه آن گیرد تنش در زیر پنجه
گه این سازش بخرطومش شکنجه
گهی کان پیل مست کارزاری
جدا گردد ازان شیر شکاری
به بندد ناگهان آن در دگر باز
شود غائب ز دیدن آن همه ساز
ازین بستن زمانی چون برآید
بدولت در بروی شه کشاید
پدید آید درو درگاهی از دور
که باشد خاک آن در بیت معمور
دران درگاه و ایوان کشاده
ستاده چتری و تختی نهاده
فراز مسند و تخت سر افراز
نشسته پادشاهی با صد اعزاز
سران از هر دو رخ استاده بر پای
دلیران از دو سو گشته صف آرای
دو بازو غرق در آهن مراکب
مراتب را در افزوده مراتب
بخدمت هر طرف پیلان جنگی
بسر سختی همه چون کوه سنگی
دران موقف بقدر تیر پرتاب
ستاده دست بسته پیش حجاب
چو بار عام بنهد به تدبیر
شود بربسته در دیگر به تقدیر

چو ماند آنچنان بسته زمانی
کند قصد کشادن ناگهانی
جو بکشاده شود آید پدیدار
شکارستانی و نخچیر بسیار
سگ و آهو بهم در حیله سازی
گوزن و شیر در روباه بازی
هزاران گور گوران کنده از چنگ
فراخی بر دل ایشان شده تنگ
سگان را دیده روبه خواب خرگوش
وزان شیر ژیان را سینه در جوش
پلنگ سرفراز از کینه سازی
بکوته پای کرده دست درازی
ازان نخچیر گه چون چشم شد شاد
دگر ره بسته شد آن درج بنیاد
پس از یک لحظه دیگر در کشاید
دگرگون سیمیائی نو نماید
شود پیدا سپاهی صف کشیده
بمردی تیغها از کف کشیده
در آهن غرقه گشته از دو جانب
ز فرق مرد تا سُمّ مراکب
ستوران مبارز از کمین گاه
درآورده بجولان روی در راه
ز شست مرد ناوک کرده پرواز
به پیکان دیده دوزی کرده آغاز
کمین کرده کمند پیچ خورده
کمر گاه عدو را هیچ کرده
خدنگ تیز پر در سینه سوزی
گران سر گرز در آتش فروزی

دلیران تیغ هندی بر کشیده
بسرها خط بطلان در کشیده

چو بنماید بدین هنجار لشکر
شود بربسته دیگر بار آن در

بدین سان هر زمانی در شود باز
دهد بر نوع دیگر محفلی ساز

بدولت چونک شاه مسند آرای
بعزم خاستن برخیزد از جای

فرود آید بهم چتری که زه بود
ز قدر نه فلک قدرش فره بود

مجالس را شود در باز بسته
دو خادم هم شوند از کار رسته

همان خادم و شان خوب دیدار
شوند از باد کردن نیز بیکار

صفت جامی که چون جام جمشید طرب افزای و چون آئینه خرشید جهان نمایست

ببین هم در رواق آسمان سا
طلسمی مختفی نیرنگ پیدا

مهندس کرده از نیرنگ سازی
ببازوی شهالی طاس بازی

نه طاسی بلکه جامی شربت آمیز
کزو آید مزاجی رغبت انگیز

بود طاق مربع زو کشاده
درون طاق کرسی نهاده

دری بر روی آن طاقست هموار
مشبّک کرده استادش بهنجار

مثمّن کرسیٔ خوب و منقّش
بصورت جانفزا وز شکل دلکش

بود بالای آن کرسی همان جام
ز زرّ پخته نی از نقرهٔ خام

برای طیبت و تفریح خاطر
عجایب حکمتی کردست ظاهر

ز شربت پُر بود آن جام جمشید
ولی نبود ازو نوشیدن امید

چنان محکم بود بر کرسی آن جام
که یک پارست گوئی هر دو مادام

چو شه خواهد که طیبت ساز گردد
بشخصی هم نفس همراز گردد

به خوش خوئی بفرماید کزان جام
بنوشد جرعه داری شربت خام

چو شخص تشنه لب بر جام آرد
که تا زان شربتی در کام آرد

چه بیند جامی از شربت تهی ساز
ز حسرت واپس افتاده دهن باز

چو لب از جام بردارد بناکام
پر از شربت بود باز دگر جام

چو بیند پر قدح از شربت ناب
دلش از حرص افتد در تک و تاب

دگر ره چون برد لب جانب جام
ازان شربت نیاید هیچ در کام

چنان مخفی شود شربت ز چشمش
که آتش در درون افتد ز خشمش

چو تشنه از قدح دوری گزینند
قدح را پر ز شربت باز بینند
بقصد شربت ار صد ره کند رای
بجز حسرت نه بیند هیچ بر جای
اگرچه قصد نوشیدن کند کس
ازان شربت همین حسرت خورد بس

صفتِ صندوق که بی زبان از علم رمل سخن گوید

درین زیبا رواق آسمان وش
مهندس کرده صندوق منقش
زبس حکمت کند عاقل توهم
که در وی هست صندوق فلک گم
ز سر تا پا دران صندوق زیبا
نگردد چشم و دل سیر از تماشا
دران صندوق استاد خرد مند
ز علم رمل بکشاده دری چند
دو رسته کرده در استاد دانا
که گردد هر نهان زو آشکارا
بران رخ کاندرو اشکال فردست
بصنعت صانعش در هشت کردست
وزان سوئی که زوج آمد شمارش
چو جفت هشت در باشد بکارش
نوشته بر رخی هر در خطی خوب
کزان خط حاصل آید جمله مطلوب
بزیر هر خطی شکلی ز اشکال
بآب زر نوشته مرد رمّال
ز منسوبات اشکال و کواکب
نوشته از پی حفظ مراتب

گر اهل حاجتی آید فراپیش
خبر جو گردد از نفع و ضر خویش

برارد نیستی ز اخلاص جانی
شود زان در طلبگار امانی

نظر بگمارد هر جانب بتدبیر
ضمیر خویش بیند کرده تحریر

چو برخواند نوشته مرد طالب
کند بر شکل وهم خویش غالب

قوای وهمیه چون شد مدد ساز
شود ناگه ازان درها یکی باز

دران در صفهٔ آید پدیدار
ز نیک و بد درو گردد نمودار

دران صفه ز عقل حکمت اندیش
چو سائل دید شکل طالع خویش

شود پیدا برو خیروشر کار
شود روشن برو زان نیت اسرار

اگر نیکست نیکی پیش آید
وگر زانسان بود زانسان نماید

جواب هر که از وی راز جوید
ز علم رمل گوید آنچ گوید

زهی آن بی زبان چوبی که گویاست
همی گوید ضمیر هر کسی راست

نه غیبت اینک رملست ای خردمند
ببین از غیب تا او فرق تاچند

بداند هر که او دانش خصال است
که علم رمل علم دانیال است

صفتِ چهار طاق مشیّد که از لہ طاق زبرجد برتر است

بہ یمن دولت دارای عالم
مرتّب شد چو این حکمت سرا هم

خرد بر وفق فرمان همایون
نمود آخر نموداری دگرگون

ز راه بندگی وز روی اخلاص
مهندس کرد اساس حکمتی خاص

بدولت کرد کاخی مردستام
که در هند است ـ دهارامندیش نام

کسی کانجا ز بهر دیدن آید
بسان ابر در باریدن آید

فرو ریزد چو ابر نوبهاران
که گوئی آب حیوانست باران

ورای این بسی حکمت درو هست
که نبود هیچ دانا را بدو دست

بهر یک زاویہ استاد بنّا
بخوبی حجرۂ آورد پیدا

مرتّب چار حجره آنچنان کرد
کہ ـ در هر حجره نیرنگی عیان کرد

ز نیرنگش کہ بادا چشم بد دور
هزاران تنکاوشا[1] راست دستور

۱ـ ''تنگلوشا : با زیادتی الف بمعنی تنگلوش ست که کتاب و صفحہ' لوشای حکیم باشده ، چہ 'تنگ' بمعنی صفحہ و 'لوشا' نام حکیمی ست رومی و بعضی گویند با بای بوده و او صاحبِ علم سیمیا و کیمیا و تکسیرات است و در صنائع و بدائع نقاشی و مصوری ثانی مانی بوده است چنانکہ کتاب مانی را ارتنگ می خوانند

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

طلسمش کز حد دانش فزونست
کجا داند فلاطونش که چونست

کند از جان ارسطو بیش رازی
که یابد راز آن نیرنگ سازی

بنای فرخش می شد چو آغاز
مهش کج و کرد عطارد آمدش راز (کذا)

چنان افراشت طاقش را خردمند
که با سبع شدادش داد پیوند

بقامت بی ستونی هر ستونش
که صد فرهاد و مانی شد زبونش

مربع کرده حوضی درمیانه
که حوض کوثرش آمد نشانه

مجنح نیم ترکی کرد هر سوی
که با خلد برین شد روی در روی

ز چوب ساج کرد استاد نجّار
بنای نیم ترکش را بهنجار

همه ترکش ز مینا ساخت الحق
چو سقف نه فلک کردش مطبق

چنان بر چوب از شیشه رقم کرد
که مانی دید دست خود قلم کرد

(بقیه حاشیه گذشته صفحه)

کتاب او را تنگ می گویند و بعضی گفته اند تنگلوشا و ارتنگ نام دو کتاب است و نام علم خانهٔ رومیان هم هست در نقاشی و صورت گری و با ثای مثلثه هم آمده است ـ''

(برهان قاطع ، جلد اول ، صفحه ۲۸۵ ، نولکشور ، سنه ۱۸۸۷ع) - (مرتّب)

بنوعی شیشه اش را بر فلک برد
که چرخ شیشه وش را شیشه شد خرد

اگر یک ره به بیند پور سیناش
شود خیره دو چشم از نور میناش

شعاع شیشه اش چون بر درخشد
چراغِ مهر و مه را نور بخشد

بهشتش عبده از جان نوشته
شده از خاکروبانش فرشته

چو دیدش از نزاهت بهتر از خویش
سر خجلت ارم افگنده در پیش

اگر این خلد را رضوان بدیدی
ز خلد خویش دامن در کشیدی

اگرچه کاخ گردون جمله دیدست
بدین خوبی دگر کاخی ندیدست

بحکمت گشت فردوسی مرتّب
که فردوسش نهد بر آستان لب

طلسماتِ که در هر حجره برپاست
بگویم شرح هر یک روشن و راست

بود تا در سرای بیم و امید
بیک خانه قرین عیسیٰ و خورشید

ازان خورشید باد این خانه پر نور
چو از عیسیٰ سرای بیت معمور

صفتِ بزمی که درو ماه وشانِ فتنه آشوب بگاه رقص زهره را لکدکوب کنند

بیک حجره بود طاق مقوّس
بسانِ طاق نه گنبد مقرنس

بخوبی به ز طاق آسمانست
که طاق آسمان ازوی نشانست

بزیر طاق قانونیست پرساز
که آرد مردگان را جان بتن باز

ولیکن نیست پیدا هیچ سازش
مگر ز آواز او دانند رازش

اگرچه نیست عامل درمیانه
ازان قانون بگوش آید ترانه

درون طاق باشد چار پا کوب
ز گیسو کرده دل ها را به جاروب

چو شمشاد جوان و سرو آزاد
دو رقاص و دو پاکوبند استاد

مهندس آن دو رقاص و دو پا کوب
بحکمت کرده از پرکالهٔ چوب

رخ هر یک نگویم کافتابست
که خور با آن دو رخ بی نور و تابست

به نوبت زان دو رقاص هنرمند
چو هر یک پای خود بکشاید از بند

برقص آید چو سرو آن ماه قتّال
کند جان و دل عشّاق پامال

که رقص ار شود در چرخ سازی
کند با زهره هم در رقص بازی

برقاصی اگر دستی برآرد
فلک چون گو بزیر پا در آرد

بدان کو بوالعجب کاری نماید
ستاند جان و دلداری نماید

گهی در چرخ و گه در رقص باشند
که رقص و چرخ او بی نقص باشند
وزان سو آن دو پاکوب سرافراز
خرامان گشته با صد عشوه و ناز
گر آید زان یکی در جلوه سازی
خورد زو زاهد صد ساله بازی
به عشوه گرچه پا آهسته دارد
شیاطین در جلاجل بسته دارد
و گر در پای کوبی سرفرازد
سر ناهید زیر پای سازد
گه چرخ ار نهد رومال بر دست
فتد در پای او چرخ زبردست
به صنعت پای را بر پا چو افشرد
عطارد را کند زیر لکد خورد
بدین خوبی بدین حسنی بدین ساز
همه بایکدگر باشند دمساز
باستقبال هم گشته روانه
بر آورده نشید عاشقانه
بقانونی نماید نغمه قانون
که آسوده شود روح فلاطون
کند چون نغمهٔ مستانه آغاز
بیفتد بربط ناهید از ساز
نوازد ساز دستی درمیان نی
همی گوید سرود اما دهان نی
بشادی و خوشی آخر دمی چند
چو بی غم بگذرد بر بیغمی چند
بعیش و خوشدلی در نصف طاسی
بود در بزم آرائی اساسی

چو کار بزم در باقی کند ساز
کند زان سو مبارز رزم آغاز

صفتِ رزمی که میدان او معرکهٔ مریخ وشان فیروز رزمست

بدیگر سوی طاق ساز دادست
که پا بر طاق نه گنبد نهادست

دو جنگ آور دران طاقست پنهان
میان هر دو بکشادست میدان

بود زان دو یکی تازی سواری
به تیزی آن دگر شکره شکاری

بدست هر یکی رمحی است پیچان
کزو گردد دل بد خواه بیجان

سپردارند هر یک نیزه بر کف
چو بر دست مبارز تیغ در صف

پس آن طاق عالی با صد افسوس
چو کوس نه فلک باشد یکی کوس

نهان هم رایتی باشد سرافراز
کزان رایت شود پیدا همان راز

بهنگامی که رقص و نغمه و ساز
نماید هر یکی از کار خود باز

همان رقاص ترک اندیشه گیرد
همان قانون خموشی پیشه گیرد

بفریاد آید [آن] کوس فلک ساز
که کوس آسمان ماند دهن باز

بر آید رایت شمشاد قامت
نماید سرو قدان را قیامت

دران میدان سواران از کمین‌گاه
بروی یک دگر تازند ناگاه

یکی سو این زند از کینهٔ آن
به تیزی نیزه را بر سینهٔ آن

وزان سو مرد با رمح و پلارک
گزارد نیزهٔ بر فرق و تارک

چو هر یک دست برد خود نمایند
ز راه کینه سازی باز آیند

همان رایت فرود آید دگر بار
شود از چشم هر کس ناپدیدار

دمامه نیز خاموشی پذیرد
دل بینندگان آرام گیرد

بنوبت بزم آراید دگر باز
کند رقاص رقص و ساز آواز

گهی بزمی برآراید دل افروز
گهی رزمی پدید آید جگر سوز

گهی شادان گهی غمخوار باشند
بنوبت همچنین درکار باشند

صفت نخچیر گاهی که شیر گردون و غزال سپهر کمترین شکار اوست

مهندس یک طرف از حیله سازی
بلعبت باز گردون کرده بازی

نموداری عجب آورده بیرون
که عقلش واله آمد وهم مفتون

دو کرسی ساخته استاد صفتار
برون آورده سر هر یک ز دیوار

بهر کرسی بود تمثالی از زر
یکی آهو و دیگر یک غضنفر

دران کرسی که از شرقش نشانست
کنام آهو مشکین همانست

بکرسی دوم کز حد غربست
بود شیری که با آهو بحربست

دهی گر شیر نر را گوشمالی
فرستد آهوی مشکین زلالی

چو یابد گوش آهو پیچش و تاب
روان گردد ز کام شیر نر آب

صفت چرخی که از چرخ گردون سریع السیر تر است

بحکمت فیلسوفی کار پرداز
بدیگر سوی داده حکمتی ساز

چو ابروی بتان طاق کشید است
که طاق چرخ از رشکش خمید است

درون طاق چرخی کرده قائم
که باشد چون فلک در سیر دائم

نگیرد لحظهٔ از گشتن آرام
سپهر آسا بود خود رای و خود کام

که و بیگاه آرامی ندارد
بجز گشتن دگر کامی ندارد

گهی گر فی‌المثل شخصی تنومند
بخواهد تا نهد برپای او بند

بگیرد بازوی چرخ سرفراز
مگر آید ز سیر خویشتن باز

بود در دست او تا چرخ در بند
ز گشتن باز ماند آن دمی چند

چو ازوی دست بردارد دگر بار
کند چرخ سریع السیر رفتار

به تیزی آنچنان دوران نماید
که عقل تیز بین در حیرت آید

کند گردندگی هر صبح و هر شام
نه در روز و نه در شب یابد آرام

چو دیوانه که زنجیری ندارد
دران تدویر تدبیری ندارد

نه بر تحریک او دارد کسی دست
نه ظاهر نیز گردانندهٔ هست

دران عقل خرد مندان زبونست
که بی تحریک آن گردش چگونست

صفت حوضی که از حوض کوثر با آب ترست

درون صحن دهارامندی ای یار
بود حوضی بخوبی کوثر آثار

بحکمت در ته حوض کشاده
ستونی بینی از مس ایستاده

ببالای ستون استاد صفّار
ز مس کردست کرسئی بهنجار

بمرکز های کرسئی مسدّس
مدور قبهٔ بینی مکلّس

بود بر کاس او طاؤسی از زر
چو طاؤس بهشتی خوب منظر

بران کرسی بود نخچیر گاهی
درو کرده سگ و روبه پناهی

بدیگر سوی آهوی تتاری
که باشد در پیش شیر شکاری
هران وقتی [که] دهارامندی ای یار
بباریدن شود چون ابر دربار
برقص آید همان طاؤس حالی
چو طاؤسان مست برشکالی
بروبه سگ کند روباه بازی
بآهو شیر آرد صید سازی
دو سگ [بر] راستا دنبال روباه
کند چپ شیر آهو را کمین گاه
نه بر روبه ظفر یابد سگ تیز
نه شیر آهو بگیرد با تگ تیز
دران سیر ارچه بس عجلت نمایند
ولی نزدیک هم هرگز نیایند
عجب کان قبّهٔ بازیب و رونق
بود چون قبّهٔ گردون معلّق
بزیر قبّه آن نخچیر که نیز
معلق بینیش از روی تمییز

صفت قصری که از قصر فلک برتری و با قصور بهشت برابری می نمود

مرتّب گشت چون آن هر سه گلشن
بکام دوستان و رغم دشمن
بمن فرمان شد از شاه جهاندار
که باید کرد حوضی کوثر آثار
که نیرنگی بود در وی بفرهنگ
که از سازش شود بی ساز نیرنگ
سر طاعت بامر شه نهادم
بروی دل در حکمت کشادم

ز استادان راز کار پرداز
طلب کردم همه با برگ و هم ساز

که تا در باغ خاص استاد دانا
رواق چون فلک سازد مهیّا

بکار آمد چو راز صاحب اسرار
رواق مرتفع آمد پدیدار

رواق نی که قصر دل نشان ساخت
مطبّق همچو قصر آسمان ساخت

برفعت چار طاق آنچنان کرد
که طاق نه فلک از رشک خم خورد

چنان شد طاق مرفوعش مشیّد
که گشتش زیر پا طاق زبرجد

بدین طاق که از نو گشت بنیاد
جهان را طاق کسری رفت از یاد

خم طاقش که چون پهلوی مه بود
ز رفعت با فلک پهلو همی سود

ز بام او که مه را بود منزل
توان خرشید را اندودن از گل

علوی سقف او گر عرش دیدی
برویش آیۃ الکرسی دمیدی

خجستہ طارمی چون روضۂ حور
بہ نزهت نور بخش بیت معمور

بہ زیبائی ز جنت دست برده
گرفتہ بر قصور خلد خورده

زهی زیبا مقامی کز نضارت
نیارد ناطقہ کردش عبارت

ازین قصری که بر روی زمین شد
جهانرا نسخۂ خلد برین شد

که ابداع آن سقف معلاّ
د[و] پوشش کرده است استاد دانا

عجب بالای یک سقفش بفرهنگ
مربع ساخته حوض از گچ و سنگ

نه حوضی بلکه دریای چو عمان
که در هر گنج او دریاست پنهان

درو آبی ست کو را مثل کوثر (کذا)
چو آب زندگانی روح پرور

زلالی کز لطافت رشک جانست
چو آب زندگی در تن روانست

خیالی گر بشب در دل در آید
درو چون آئنه یک یک نماید

ز بس جانها که آساید ز آبش
بود همشیرهٔ کوثر خطابش

درون حوض هر کو گشت غوّاص
بچشم بسته بیند حکمتی خاص

اگرچه باشدش نایاب . پایاب
دری بیند کشاده در ته آب

ازان در چونک بیرون شد شناور
پدید آید رواقی خوب منظر

اگرچه میرود مرد از همان راه
نباشد آب را مدخل دران راه

که دادست این چنین حکمت نشانی
که باشد مرد را ره آبدانی

غرض چون آشناور [شد] شتابان
وزان در رفت بیرون تا بپایان

چه بیند مجلس و بزم مهیّا
درو اسباب عشرت جمله پیدا

خجسته بزم و مجلس روح پرور
خوشی از هرچه بر گویند خوشتر

فگنده مسندی چون تخت جمشید
بگسترده فراشی همچو خورشید

مغنّی و بخور و نقل و باده
همه باشد بکام دل نهاده

زمانی چون درو آرام گیرد
وزان جشن مهنّا کام گیرد

دلش بر بازگشت آید دگر بار
وزان در پا نهد بیرون بهنجار

بدم بستن نهد بر خویشتن تاب
بیک غوطه بر آید از ته آب

سپهر ارچه بسی دریا بدیدست
چنین دریای پر حکمت ندیدست

صفتِ حوضی که سرچشمهٔ حکمتهای بسیار و منبع نیرنگهای بی شمارست

مهندس باز در حوض مصفّا
چه شیرین حکمتی کردست پیدا

بهنگامی که مرد آشنا ور
بغوّاصی برون خواهد شد از در

بر آید از میان آب طاسی
که بر بینندگان آید هراسی

چو نیکو بنگری از گرم مهری
بود سربسته چون طاس سپهری

درون طاس حلوای بود گرم
که شکّر زو گدازان گردد از شرم

چه حلوا نعمتی نغز و تر و خوش
بکام بادشا درخورد و دلکش

بر آب سرد حلوا گرم ازانست
که پر آتش ز شوق آن دهانست

چو گردد هر کسی زو چاشنی گیر
فرود آید بدل چون شکر و شیر

بکام و لب چو با آزرم باشد
درون سینها زو نرم باشد

شود چون خورده آن حلوای بیدود
بآب اندر رود طاس زر اندود

چو بیرون آید از آب آن شناور
نهان گردد ز چشم خلق دیگر

دگر کردست دانا حکمتی ساز
که حیرانست زان چرخ شناباز

صفت بوتیماری که آب طرب بارد و ماهی و باخه را در رقص آرد

چنین حکمت بگیتی کس ندیدست
نه چشمی دیده نی گوشی شنیدست

بود بر طرف آن حوض خجسته
چو بوتیمار تمثالی نشسته

تنش باشد سراسر از زر ناب
دو پایش تا بگردن غرقه در آب

به نزدیکش یکی باخه ست از سیم
دو ماهی دگر چون ماهی سیم

بوقت غوطه کان مرد دلاور
شود در حوضهٔ آب آشناور

بر آید شاه بوتیمار ازان آب
فرود آید ز منقارش روان آب

کند چون مرغ آب انداختن ساز
کشاید باخهٔ تشنه دهان باز
بجان و دل چو مستسقی بکوشد
که تا آبی که او باشد بنوشد
چو نوشد آب باخه بی کم وکاست
برقص آیند ماهی از چپ و راست
بچرخ آید چگونه کاه از باد
همان گونه بچرخ آیند دلشاد
شناور چون برون رفتن کند ساز
بماند هر یکی از کار خود باز

صفت چهار سپردار تیغ گذار بی کینه که باهم در کارزاراند

عجایب حکمتی دیگر نمود است
که از سر عقل دانایان ربود است
بزیر قصر صحن دل کشایست
که چون آئینه سطحش رونمایست
بروی سطح آن صحن طرب خیز
بخردی حوضکی بینی دل آویز
بزرگ آید بمعنی گرچه خورد ست
که از کوثر بخوبی دست‌بردست
میان حوض بینی چشمهٔ آب
که از وی چشمهٔ حیوان خورد آب
بود در ناف چشمهٔ یک ستون راست
بمقدار گزی استاده برپاست
بود بالای او صندوق از مس
برو واله شده عقل مهندس
نهاده هر دو جانب چار کرسی
وزان کرسی اگر تو حال پرسی

بود بر روی هر کرسی ستاده
سپر داری بکف تیغی نہادہ

ز ہر جانب دوجنگ آور بکارند
کہ در میدان مردی پایدارند

گہ این بر فرق او تیغ آزماید
گہ آن یک دست برد خود نماید

اگرچہ اشتہا بسیار شان نیست
بغیر از تیغ خوردن کار شان نیست

ہمیشہ خوردن ایشانست شمشیر
شکمہا شان نگردد لیک ازان سیر

در ذکر اتمام قصور بی قصور کہ چون روضۂ حور بی فتورست

چو حکمتہا کہ شاہنشاہ فرمود
مرتب گشت و زانم خاطر آسود

ملک از نہ فلک احسنت گویان
فرود آمد مرا خواہان و جویان

کہ رحمت بر تو باد ای سحر پرداز
کہ کردی بر دل از حکمت دری باز

طلسماتی چنان زیبا نمودی
کہ از میدان حکمت گو ربودی

بلیناس ار بہ بیند این نمودار
کند از جان بشاگردیت اقرار

ازین روضہ کہ جان را زندگی داد
بجان رضوانش خط بندگی داد

اگر رضوان بہ بیند روی این را
نہ بیند رو دگر خلد برین را

چو دولت این عمارت یاد آرد
ممالک را مبارکباد آرد

ترا زیبد چنین نیرنگ سازی
ترا شاید بحکمت سرفرازی

چو کردی این چنین حکمت سرائی
ز حکمت در جهان دادی صلائی

ز اتمامش بدان نوعی که دانی
بگوش خسرو گیتی رسانی

بفرمان سروش راز پرداز
شدم بر شاه و گفتم کای سرافراز

باقبالت چو وقت آن درآمد
در از دریا و لعل از کان برآمد

مرتّب گشت نیرنگی بفرهنگ
کزو حیران بماند اهل نیرنگ

نه نیرنگی نگارینست دل دزد
که بهر رونمایش جان بود مزد

اگرچه شاه را بازیب و رونق
محلها هست بهتر از خَوَرنق

دگر دولت‌سرا شد بیت معمور
که چشم بد ازان دولت‌سرا دور

کجا باشد چنین کز روی زیبا
بنگذارد دلی در بر شکیبا

عروسی کو زند صد طعنه بر ماه
همی ارزد بدیدن آخر ای شاه

تماشا کن درین فیروزه گلشن
کزو فیروزه گلشن گشت روشن

بیا از مقدم میمونش بنواز
شهابی را و او را سر برافراز

سرافرازیش حاصل گردد آنگاه
که باشد پایهٔ تخت شهنشاه

یقین چون تخت گاه شاه گردد
ز رفعت بوسه گاه ماه گردد
چو یابد از جمالت پرتو نور
خزد در سایهٔ او بیت معمور
گرش بخت است شه در وی نهد پای
وگر نی خاکروبان را بود جای
برو دوری ز تخت گرچه سخت است
مقام خاکروبت هم ز بخت است
نمودم چون بشه کز راه خدمت
برون آمد در از دریای حکمت
شه جمشید فر از لطف سازی
چو خورشیدی شد از ذره نوازی
شکیبش از دل و صبرش ز جان شد
بدولت از پیٔ دیدن روان شد

ذکر انعام عام حضرت عالم پناه خدایگانی و نوازش نمودن بندهٔ دولتخواه جانی

بدولت شاه انجم روز نوروز
چو در بزم حمل شد مجلس افروز
بصد شادی عروس غنچه گستاخ
برآمد جلوه گر از حجلهٔ شاخ
هوای نوبهاری جلوه‌گر شد
چمن را زیب و آئینی دگر شد
ز خواب خوش برآمد نرگس مست
صبوحی کرده جام باده در دست
صبا گیسوی سنبل باز میکرد
بصد برگ و نوا گل ناز میکرد
ندانم بلبل بی دل چه سرداشت
که برقع از نقاب غنچه برداشت

شگوفه بر سر گل سایه میکرد
ز خیری باغ را پیرایه میکرد

ز نو سر بر لب جو سرو آزاد
چمن را باز خط بندگی داد

صبا زلف بنفشه تاب داده
ریاحین را ز شبنم آب داده

ز شبنم دامن گل بس که شد تر
گریبان چمن را گوی شد در

سحرگه در چمن با نغمهٔ تر
بمدح غنچه شد سوسن زبان در

دهان بکشاد غنچه در شکر خند
بشکر کرد سوسن را زبان بند

سهی سرو از شمایل چون عروسان
بسرسبزیش سبزه پای بوسان

شقایق بر فراز سبزهٔ تر
چو طوطی کو نهد منقار بر پر

بعشق گل هزار آواز می داد
جوابش سار و قمری باز میداد

چنان شاخ شگوفه شد درم ریز
که نسرین نسترن را گفت برخیز

که وقت عیش و ایّام بهار است
جهان را جز خوشی دیگر چه کارست

بوقتی این چنین میمون و فرّخ
بعزم آن گلستان کرد شه رخ

بسان مشتری در خانهٔ قوس
قدم رنجه نمود آمد بفردوس

ز خورشید رخش شد خانه پر نور
چو از دیدار عیسیٰ بیت معمور

چه بیند گلشن عکس خورنق
جهان زو گشته زرد و سرخ و ازرق

نه گلشن روضهٔ چون روضهٔ حور
کزو رضوان بدریوزه برد نور

مهندس خانهٔ حکمت سرائی
مروّح طارمی راحت فزائی

نه طارم بلکه محراب مه نو
درو تابنده چون خرشید خسرو

نظر فرمود و گشت از دیدنش شاد
شهابی را سبک گنج گران داد

زرافشان شد چو خورشید زرافشان
کزان تشویر خورشد زرد و لرزان

درآمد همچو ابر نوبهاری
بدر پاشی و مروارید باری

کف بخشندهٔ جمشید ثانی
بنوعی کرد بر من زرفشانی

که شد کند از نوشتن کلک وصّاف
فرو ماند از شمردن دست صرّاف

نه آن مقدار زر یکجا کسی دید
نه گوهر هیچ کس زین گونه بخشید

زر و گوهر چو گشت انبار و خرمن
زمین شد حامله کان بد سترون

ز گنج افشاندن دریای شاهی
همه پر سیم شد مه تا بماهی

ز چندان دادن از هر جنس مالی
شهاب از بدرها شد چون هلالی

چو دست گنج بخشش گنج درداد
ز امید دل من بیشتر داد

ز گنج زر که عقل از دست میرفت
دلم هشیار جانم مست میرفت

پس از بخشش که شاهم از گهر داد
قبای خاص با تاج و کمر داد

قبا از بس که در زر گشته بد غرق
ز خورشیدش نه کردی هیچ کس فرق

اگرچه ابرهٔ از لعل و زر داشت
بسی به ز اطلس چرخ آستر داشت

مکلل تاج چون اکلیل گردون
بزر ترکیب کرده در مکنون

درخشان تاج کو درخورد زه بود
ز زرین تاج خور صدره فره بود

نه تاجی بلکه چرخی گوهر آمود
که از گوهر سرش بر چرخ می سود

چه گویم وصف آن زرین کمر را
که آب و تاب ازو بودی گهر را

چنان در و گهر پر زر شده رست
که جوزا را ز خجلت شد کمر سست

ز یاقوتی که بر طرف کمر بود
درون لعل پر خون جگر بود

ز دیباهای رومی بقچها پر
که ناید صد یک آن در تصوّر

ز اطلسهای زربفت خطائی
وزان در چرخ اطلس روشنائی

ز کالا و متاع رخت و اسباب
نه چندانی که بتوان دید در خواب

وز املاک مخلّد نیز ده ده
بحاصل هر یکی از یک دگر به

نه ده هر یک ازان شهری معظم
که یک گنجش نه گنجد در دو عالم
که آن ملک موبد تا قیامت
بماند بر نژاد من سلامت
نه تنها داد ملک و گوهرم بخش
که بخشید از درم هشتاد یک رخش
دهش تازی کمیت خیزران دم
دگر ده نقره خنگ آهنین سم
ده دیگر سیاه تیز آهنگ
ستاره چشم و به دیدار و شبرنگ
دگر ده بور چوگانی چالاک
که بربایند از سم گوی افلاک
ده دیگر سمند سیم سیما
کشیده خط مشکین فرق تا پا
دگر ده زردهٔ خورشید دیدار
چو خور آتش فشان و گرم رفتار
ده دیگر قلای کوه پیکر
بسختی آهن امّا کوهی از زر
دگر ده ابلق رومی و زنگی
وزیشان روز و شب برده دورنگی
دگر بهر سواری مرکب خاص
بجولان پای کوب و جلوه رقاص
چه مرکب ابرشی گل بوی گل رنگ
چو آتش کو جهد از آهن و سنگ
نه آتش باد پائی آب رفتار
که ناید بر رخ خاک از وی آزار
نگویم آتشی بر خاک پویان
که آبی در قفص بادی در انبان

گرو برده ز برق از گرم خیزی
جهان را زیر پا کرده ز تیزی

ز رفتارش ملک در خویشتن گم
ز جولانش بحیرت عقل مردم

بگاه حمله ره بر دیو بسته
پری را در پریدن پر شکسته

. . . .

به جولان گه چون آید (به) رفتار
بگردد بر یکی نقطه چو پرکار

چنان بیرون رود از مخرج تنگ
که نتواند شدن باد شبآهنگ

گرو بندد چو گاه جلوه دم را
نهد بر یک پشیزه چار سم را

ز تیزی بشنود گوشش بفرسنگ
صدای رفتن مور از ته سنگ

ز چشم دور بین در شام دیجور
به بیند هر چه در غیبست مستور

ز رای فیلسوفان ره روان تر
ز فکر زیرکان چابک عنان تر

. . . .

چو در قبض خود آوردم عنانش
بکام خویش کردم زیر رانش

شدم ـ از دولت شاه زمانه
سلیمان وار بر بادی روانه

چو شد باد جهانم زیر فرمان
عجب نبود که خواندم سلیمان

چو شاه تاج بخش و بنده پرور
بدین سان ریخت بر من گنج و گوهر

نوازش کرد و دل دادم ز حد بیش
مشقتها ز دل شد جمله فردیش

چو گل شد دامن و جیبم پر از زر
چو دریا گشتم از گوهر تونگر

ازان روزی که حق جود آفرید ست
طمع جودی چنین هرگز ندیدست

تقاضا و طمع گشتند سیراب
امید و آز زو رفتند در خواب

ازان احسان که جانم گشت ازو شاد
جهان را تا جهان باشد بود یاد

خدایا تا درین فیروزه گلشن
بود بخشنده مهر و ماه روشن

جبینش نوربخش مهر و مه باد !
سرش رونق فزای نه کله باد !

سعادتهای انجم باد یارش !
همه فتح ممالک یادگارش !

☆ ☆ ☆

صلائی

(از اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ فروری و مئی سنہ ۱۹۳۵ع)

فارسی تذکروں میں اس تخلص کے دو شاعر ملتے ہیں جو اتفاق سے ہم عصر بھی ہیں ۔ ان میں پہلا جلال الدین حسن ہے جو عباس ماضی کے ہاں منصب صدارت پر سرافراز تھا اور ۱۰۲۰ھ میں وفات پاتا ہے[1] ۔ اس شاعر سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ۔

دوسرا حسن بیگ ہے جو ہندوستان آتا ہے ۔ خان آرزو نے 'مجمع النفائس' میں بحوالۂ تقی اوحدی اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا مولد و منشا اسفراین ہے اور حسن بیگ نام ہے ۔ تقی اوحدی کا بیان ہے کہ وہ میرے عہد کے زندہ شاعروں میں سے ہے ۔ ۱۰۰۵ھ میں میری اس سے ہندوستان میں ملاقات ہوئی ۔ اس کا دیوان تقریباً سات ہزار ابیات پر مشتمل ہے ، جس کے کئی نسخے استادوں کے ہاتھ کے نوشتہ مطلا و مذہّب اس نے مجھے دکھائے ۔ خان آرزو قوت شاعری میں حسن بیگ کو جلال الدین سے بہتر بتاتے ہیں ۔

'تذکرۂ 'مخزن الغرائب' اور 'روز روشن' میں بھی صلائی کا تذکرہ ملتا ہے ۔ مگر یہ تذکرے تقی اوحدی کی خوشہ چینی کرتے ہیں ۔ 'روز روشن' میں اس کا تخلص 'صلا' لکھا ہے[2] جو کاتب کے سہو پر محمول کیا جا سکتا ہے ۔ اس کی نسبت کاشانی یا خراسانی دی ہے ، اگرچہ اصل اسفراین بیان کی ہے ۔ یہ وہ مختصر اطلاع ہے جو ہمیں صلائی کے تعلق میں فارسی تذکروں سے ملتی ہے ۔ سطور ذیل صلائی کے ایک ایسے دیوان پر مبنی ہیں جو کھمبایت (گجرات) میں ۱۰۱۷ھ

۱- شمع انجمن ، صفحہ ۲۶۶ ، ۱۲۹۳ھ ۔

۲- روز روشن ، صفحہ ۳۷۸ ، طہران ، ۱۳۴۳ شمسی ۔ (مرتّب)

میں بہ عہد جہانگیر بادشاہ قلمی ہوا تھا ۔ صلائی کے دیوان کی تلاش میں میں نے کوئی زیادہ تفتیش تو کی نہیں مگر جو معمولی ذرائع معلومات ہیں ، ان سے پتا چلتا ہے کہ اس کا دیوان کسی کتب خانے میں موجود نہیں اور یہی خیال ان سطور کی تحریر کا محرّک ہوا ۔

ہندوستان میں فارسی زبان کی قدر و پرسش کی بنا پر ہر زمانے میں ایرانیوں کی آؤ بھگت ہوتی رہی ہے ۔ سلطنت کے ادنٰی سے لے کر اعلٰی مناصب تک ان کو مل سکتے تھے ۔ دیوان و انشا کی خدمات تو خاص طور پر ان کے لیے وقف تھیں ۔ ادھر ذوق شعر و ادب نے ہر ایرانی شاعر و ادیب کو ہندیوں کی نگاہ میں محبوب و محترم بنا دیا تھا ۔ ہزاروں پریشاں حال تلاش معاش میں اپنی قسمت آزمانے یہاں آتے تھے اور اس ملک کے خوان کرم سے اپنی امیدوں کا دامن بھرتے تھے ۔ کچھ اسی قسم کا مقصد صلائی کو ہندوستان آنے کی ترغیب دیتا ہے جس کو وہ سکلفانہ انداز میں سیر ہند کے نام سے تعبیر کرتا ہے ۔

صلائی ۹۵۵ھ میں پیدا ہوتا ہے ۔ اس کا مولد ساحل مرغاب ہے ۔ تربیت اور نشو و نما اسفراین میں پائی اور یہی مقام اس کا آبائی وطن ہے ۔ وہ نسلاً چغتائی ہے اور ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو قدیم الایام میں طوس میں نہایت معزز اور مکرم مانا جاتا تھا ۔ تعلیم کا حال معلوم نہیں لیکن وہ حکمت و فلسفہ ، نجوم و ریاضی میں اپنے آپ کو ماہر بیان کرتا ہے ۔ ۹۸۱ھ میں جب اس کی عمر چھبیس سال کی تھی ، سیاحت ہند کا شوق دل میں گدگدایا اور یہاں پہنچ کر اس نے اس ملک کے طول و عرض میں کئی مرتبہ سیر کی ۔ اس زمانے میں بارگاہ اکبری میں اہل خدمت کے زمرے میں داخل تھا اور تنخواہ پاتا تھا ۔ ۹۸۹ھ کے بعد وہ گولکنڈے میں ہے اور قطب شاہ سے اپنے قرضے کی ادائیگی کے واسطے ، جو انیس سو ستر لاری ہے اور گجرات میں دادنی ہے ، امداد کا طالب ہے ۔ ۹۹۷ھ میں ہم اس کو احمدنگر واقع دکن میں مقیم پاتے ہیں ۔ اسی سال جب دکنیوں کے جذبات پردیسیوں کے خلاف برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور ایک ہفتے تک ، جیسا کہ مؤرخ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے[1] ، پردیسیوں کا قتل عام کیا جاتا ہے ، صلائی اپنی پیاری جان بچا کر احمدنگر

۱۔ فرشتہ ، جلد دوم ، صفحہ ۱۴۹ ، نول کشور ۔

سے رخصت ہوتا ہے ۔ یہ قتل عام دکنیوں کے انتقامی جذبات کا مظاہرہ تھا جو میران حسین شاہ بن نظام شاہ والیٔ احمد نگر (۹۹۷ھ) کی واردات قتل پر ، جس میں بدقسمتی سے آفاقی شریک تھے ، عمل میں آیا ۔ معلوم نہیں صلائی نے کس طرف کا رخ کیا ۔ اسی اثنا میں اس کے فرزند کی وفات کا واقعہ پیش آتا ہے اور شاعر ان پیہم مصائب سے تنگ آ کر وطن کا عازم ہوتا ہے اور سندھ پہنچ کر جہاز میں بیٹھتا ہے ۔ بحری سفر نئے مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے ۔ کچھ دن آرام سے گزرنے کے بعد جہاز پر طوفانی آندھیاں قابض ہو جاتی ہیں اور خطِ مستقیم سے ہٹا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں ۔ طوفانی موجیں اس کے اوپر سے گزرتی ہیں اور جہاز کے ڈوبنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہتا ۔ بالآخر دو مہینے اور تین دن سمندر کی مسلسل آفتیں سہنے کے بعد یہ جہاز مع الخیر ساحلِ گجرات پر آ لگا اور شاعر نے خشکی پر قدم رکھا ۔ صلائی عنقریب بعد عازم بیت اللہ ہوتا ہے اور ۹۹۹ھ میں فریضۂ حج ادا کرتا ہے اور برابر دو سال تک دیار عرب میں قیام رکھتا ہے ۔ آب و دانہ کی کشش دوبارہ اس کو ہندوستان لے آئی ۔ اس مرتبہ اس کی بےچین طبیعت سکون و آرام کی متمنی معلوم ہوتی ہے اور صلائی اپنی ہرزہ روی سے دست کش ہو کر صوبۂ گجرات کے شہر کھنبات میں مستقلاً سکونت اختیار کر لیتا ہے اور تجارت میں مصروف ہو جاتا ہے ۔

گجرات میں ان ایام میں مظفر شاہ ، آخری تاجدار گجرات (متوفی ۹۷۰ھ) کا فرزند بہادر ، جسے شاعر ابن ننّوں[1] کے نام سے یاد کرتا ہے ، اپنی تاخت و

۱۔ اس نام کو مختلف مصنّفین مختلف شکلوں سے لکھتے ہیں : پروفیسر نواب علی مرتّبِ 'مرآت احمدی' جزء اول ، صفحہ ۱۷۵ و ۱۷۹ 'ننھو' لیکن فہرست مطالب میں 'نتھو' دیتے ہیں ۔ اسی تاریخ کا انگریز مترجم جیمز برڈ بھی 'نتھو' لکھتا ہے (صفحہ ۳۱۲ ، لندن ۱۸۳۵ع) ۔ توزک جہانگیری کا مترجم صفحہ ۳۲۹ و ۳۳۰ ، جلد اول میں نبتّو (ننّو ؟ نتّھو ؟) ، توزک جہانگیری طبع سید احمد خاں میں 'نبو' (صفحہ ۲۱۳) لیکن پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطۂ توزک میں جو جہانگیری عہد کا معلوم ہوتا ہے ، 'ننّو' ہے (ورق ۲۲۴ و ۲۲۵) ۔ صلائی عام طور پر 'ننوں' لکھتا ہے جس میں وسطی 'نون' مشدّد

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

تاراج شروع کر دیتا ہے ۔ اس کی ان یورشوں کی تفصیلی اطلاع ہم عصر تاریخوں میں نہیں ملتی مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ ۱۰۰۵ھ سے ، جو اکبر کا زمانہ ہے ، شروع ہو کر ۱۰۲۳ھ تک ، جو جہانگیر کا زمانہ ہے ، جاری رہتا ہے اور جب تک موت بہادر کو ہمیشہ کے لیے فنا کی نیند نہیں سلا دیتی ، وہ اپنے آبائی ملک کے لیے جد و جہد سے باز نہیں آتا ۔

بہادر ایک رات کھنبایت پر بھی دھاوا بولتا ہے اور اس کی فوج شہر کو لوٹ لیتی ہے ۔ اس میں صلاتی کا بھرا گھر بھی لوٹ لیا جاتا ہے اور اس کا تیس سال کا اندوختہ ، جس میں قیمتی شال ، سیلے ، مندیل ، قیمتی جواہرات ، تحفہ تحفہ کپڑے ، گھوڑے اور بہل بھی شامل ہیں ، لٹ جاتے ہیں ۔ ہمارے شاعر کو اس کا بےحد قلق رہتا ہے اور کئی قصائد میں بہادر کی تاخت کا ماتم دار ہے ۔ اسی سلسلے میں وہ جہانگیر تک بھی پہنچ جاتا ہے اور بادشاہ اس کی اشک شوئی کے لیے ایک سو بیگھہ زمین کھمبایت میں عطا کر دیتا ہے ۔ شاہی فرمان کی تعمیل میں حاکم کھمبایت نے فوراً زمین ناپنے اور چک بندی کے لیے حکم دے دیا ، لیکن گوبند نے : جو شہر کا پٹیل ہے اور جس کا کام زمین ناپنا تھا ، اونچی نیچی اور غیر آباد زمین حوالے کر دی ۔ اس پر صلاتی بگڑ کر گوبند کی ہجو کرتا ہے ۔ لطف اس وقت آتا ہے جب شاعر جوش غضب میں خود گوبند کے الفاظ بعینہ نقل کر دیتا ہے جو غالباً اردو سے تعلق رکھتے ہیں :

در ضمن ریشخند چنین گویدم کہ میر
ہمکاں بیار کرتہ و دایم بلی جہار

میر جیو خدا کسوں کہ تو دیوان کو کہتہ جا
اس برس دن بتی موہ کوں بند کوں اوار

بہرحال شاعر گوبند کو تو ہموار کر لیتا ہے مگر نئی مصیبت یہ آئی کہ نو مہینے زمین پر قبضہ رہنے کے بعد دیوانِ گجرات ، جو کوئی ہندو راجہ ہے ، اس

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

ہے ۔ اردو میں 'نتّھو' یا 'نتّھوں' آج بھی رائج ہے ، اگرچہ اس کی دوسری شکل 'نتّھا' زیادہ عام ہے ۔ (حاشیہ مصنف)

زمین سے اسے بے دخل کر دیتا ہے اور نئی سند مانگتا ہے۔ قصہ مختصر ہم شاعر کو زمین کے ان قضیوں اور جھگڑوں میں مبتلا دیکھتے ہیں ، جب دیوان ۱۰۱۷ھ میں ختم ہو جاتا ہے۔ بعد کے حالات معلوم نہیں کہ وہ کب تک زندہ رہا اور کس سال وفات پائی۔ یہ دیوان بہرحال اس کی زندگی کا نوشتہ متصور ہونا چاہیے جس کو کسی ہندوستانی کاتب نے لکھا ہے۔

دیوان هذا میں شروع کے اوراق میں غزلیات ہیں اور باقی اکثر حصے میں قصائد بترتیب ابتثی درج ہیں۔ لیکن قصائد میں ردیف 'الف' سے لے کر ردیف 'تا' تک کا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ باقی قصائد جن کی تعداد چالیس سے کم نہیں ، ذیل کے سلاطین و امرا کی شان میں ہیں :

۱۔ خان اعظم میرزا عزیز کوکلتاش	ایک قصیدہ
۲۔ نواب مرتضیٰ خان	دو قصیدے
۳۔ خانخانان (داراً ؟)	ایک
۴۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ	سہ قصائد
۵۔ حسن مکی	یک
۶۔ قاضی محیؒ الدین علی	یک
۷۔ میرزا ابوالقاسم	دو قصائد
۸۔ جہانگیر قلی خان (شمس الدین) فرزند خان اعظم مذکورۂ بالا	یک
۹۔ سلطان سلیم	یک
۱۰۔ جہانگیر پادشاہ	دو عدد
۱۱۔ سید عبداللہ خان غازی	یک
۱۲۔ مصطفیٰ خان	یک
۱۳۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ	دو عدد
۱۴۔ خواجہ نظام	یک
۱۵۔ وزیر عراق	یک

۱۶- مقرب خان	دو عدد
۱۷- قلیج محمد خان	یک
۱۸- شیخ الاسلام عبدالرحیم	دو عدد
۱۹- شاہ عباس صفوی	سہ عدد
۲۰- صفی‌الدین	یک
۲۱- مسعود	دو عدد
۲۲- ہجو امین	یک
۲۳- ہجو انصاری لاری	یک
۲۴- ہجو گوبند پٹیل	یک

قصائد کے بعد ایک مثنوی اور چند قطعے ہیں اور قطعوں پر دیوان ختم ہوتا ہے۔

صلائی کے ممدوحین کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو نورالدین جہانگیر (۱۰۱۴ھ و ۱۰۳۷ھ) کے عہد میں بر سر کار آتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) قلیج خان جو ۱۰۱۴ھ میں صوبہ دار گجرات مقرر ہوتا ہے۔ جہانگیر ایک لاکھ روپیہ اسے خرچ کے نام سے دیتا ہے (توزک، صفحہ ۹)

(۲) مرتضیٰ خان بخاری، ۱۰۱۵ھ میں صوبہ دار گجرات بنتا ہے اور صلائی اس کی مدح میں تین قصیدے لکھتا ہے۔ 'مرآت احمدی' میں اسے سید مرتضیٰ خان لکھا ہے (جزء اول، صفحہ ۱۸۸) لیکن جہانگیر شیخ فرید لکھتا ہے۔ سال اول جلوس میں جب شیخ فرید خسرو کو شکست دیتا ہے، جہانگیر اسے مرتضیٰ خان کے خطاب سے شاد کام کرتا ہے (صفحہ ۳۲، توزک)۔ جب مرتضیٰ خان کے بھائیوں کی زیادتیاں بہت بڑھ گئیں، پادشاہ نے سنہ ۳ جلوس میں مرتضیٰ خان کو گجرات سے ہٹا دیا اور۔

(۳) خان اعظم کو صوبہ دار مقرر کردیا (صفحہ ۳۷، توزک) اور۔

(۴) جہانگیر قلی خان کو نائب بنا دیا۔ شمس الدین خان کو جہانگیر قلی خان کا خطاب سنہ ۳ جلوس جہانگیری میں عنایت ہوتا ہے (توزک، صفحہ ۶۸)

(۵) مقرب خان (شیخ حسن بسر شیخ بینا[1] پانی پتی) - جہانگیر بزمانۂ شہزادگی اسے مقرب خان کا خطاب دیتا ہے - (توزک ، صفحہ ۱۲) - مقرب خان اگرچہ صوبہ دار گجرات دیر میں ہوتا ہے ، یعنی سنہ ۱۱ جلوس میں ، عبداللہ خان غازی کے بعد ، لیکن اس سے قبل گجرات میں وہ کسی عہدے پر ضرور ہے اور کھمبایت سے بھی تعلق رکھتا ہے - سنہ ۳ جلوس میں وہ کھمبایت سے ایک فرنگی پردہ ، جو فرنگی نقاشی کا بہترین نمونہ مانا گیا تھا ، جہانگیر کی خدمت میں بھیجتا ہے (توزک ، صفحہ ۶۸) - اسی سال وہ امیر تیمور کی ایک تصویر ، جو کسی فرنگی مصور کے ہاتھ کی تھی ، دربار میں بھیجتا ہے (توزک ، صفحہ ۷۳) -

(۶) مصطفٰی خان - اصل نام میر ضیاء الدین قزوینی ہے ، جو سادات سیفی سے ہے - یہ معلوم نہیں کہ مصطفٰی خان کا خطاب کب دیا گیا - توزک سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ''در زمان دولت من بخطاب مصطفٰی خان سرفرازی یافتہ'' (صفحہ ۱۷۸ ، توزک) -

(۷) خواجہ نظام - ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے - توزک سے اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ جلوس میں ، جب جہانگیر منڈو میں مقیم ہے ، خواجہ نظام موخا کے اناروں کے چودہ دانے ، جو سورت تک چودہ دن میں پہنچے تھے ، لے کر آٹھ روز میں جہانگیر کی خدمت میں منڈو پہنچاتا ہے - (صفحہ ۱۹۳ ، توزک) -

(۸) مسعود - توزک میں ایک مسعود بیگ ہمدانی ہے جو جہانگیر قلی خان کے ساتھ سنہ ۳ جلوس میں بخشیٔ صوبۂ گجرات بنایا جاتا ہے -

ان ناموں سے ، جو زیادہ تر جہانگیر کے عہد کے ابتدائی سالوں سے تعلق رکھتے ہیں ، یہ قیاس مترتّب ہوتا ہے کہ دیوان ہذا صلائی کی آخری عمر کی کمائی ہے اور اس دیوان سے ، جو اس نے تقی اوحدی کو ۱۰۰۵ھ میں دکھایا ہے ، مختلف ہے ، اسی لیے وہ بعض رباعیاں ، جو تقی اوحدی نے صلائی کے نمونۂ کلام میں درج کی ہیں اور دوسرے تذکرہ نگار نقل کرتے آئے ہیں ، اس دیوان میں موجود نہیں -

---

۱- مآثرالامرا ، جلد سوم ، صفحہ ۳۸۰ 'بھینا' - توزک ، صفحہ ۱۲ 'بہا' - انگریزی ترجمہ صفحہ ۲۷ 'بہا' اور حاشیے میں 'بھینا' - لیکن پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطے میں ، ورق ۱۳ پر 'بینا' ہے - (حاشیۂ مصنف)

صلائی ان ایرانیوں میں سے ہے جو طبعاً خودبیں اور مغرور کہلائے جانے کے مستحق ہیں ۔ رعونت کے ساتھ بددماغی اس کی سرشت میں داخل ہے ۔ مزید براں مغلوب الغضب اور معاف نہ کرنے والی طبیعت کا مالک ہے ۔ اس کے مزاج کی سختی اور تندی نے اسے اپنے معاصرین میں نہایت غیر مقبول بنا دیا ہے ۔ ساتھ ہی اس کے قلم کی ہجو نگاری اور زبان کی تلخ گوئی نے دشمن پیدا کر لیے اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ بھی اس سے انتقام لینے اور اس کے کاموں میں روڑا اٹکانے کی کوشش کرتے ہوں ۔ اس کو اپنے وطن ایران پر بے جا ناز ہے اور ہندوستان کو ، جو اس کا وطنِ ثانی ہے ، دل سے ناپسند کرتا ہے ۔ اس ملک کو ، جو تیس چالیس سال تک اس کا کفیل رزق رہا اور جس کی خاک میں وہ آخرکار مدفون بھی ہے ، عجیب عجیب ناموں سے یاد کرتا ہے ۔ کبھی 'کشور بی مروت نہاد' کہتا ہے ، کبھی 'بوم ویران' اور کبھی دارالناسقین' ۔ وہ اس کے تمام احسان اس کے منہ پر مارتا ہے ۔ قصہ مختصر یہ کہ نہایت خفا ہے ۔ علی ہذا ہندوستانیوں سے بھی ناراض ہے ۔ ان کو عام طور پر بے مروت بتاتا ہے ۔ اس کا قول ہے کہ ہندوستانی اگر بوعلی سینا بھی بن جائے تب بھی اس کی طینت عیب کے شائبے سے خالی نہیں ہو سکتی ۔ میں بعض شعر یہاں نقل کرتا ہوں :

عطای ہند و لقایش بہ یکدگر ہشتم
خدا نصیب کند سیرِ کشورِ ایران

در آن کشور بی مروت نہاد
ہمہ حاصل سعی دادم بباد

با خرد ہر کو قرین زین بوم ویران می رود
آنچنان دان کز جحیم او سوی رضوان میرود

نخواہم آنکہ بہند افکند ز پا اجلم
کہ نیست درگل این بوم و برگل بہبود

با صلائی بستہ ام احرام پابوست زهند
زانکہ نبود جای اهل فضل دارالفاسقین

چون مروت نیست اندر ساکنان این بلاد
صاحب ِ همت بری از فکر سامان میرود

هندی ار بوعلی بود بمثل
طینتش نیست پاک از نقصان
هست شان خود عداوت دینی
ز شقاوت بہ مردم ایران

ہمیں معلوم نہیں کہ صلائی اپنے وطن میں کس حیثیت کا مالک تھا لیکن اس کی طبیعت اور طنطنے سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہایت بلند رتبے کا مدعی ہے ۔ چنانچہ ایک مثنوی میں ، جو دیوان کے آخر میں ہے ، یہ بیت ملتا ہے :

چو پرداختم جای از تخت مہد
شدم همچو اجداد والی ِ عہد

ایک قصیدے میں ، جو شاہ عباس صفوی کی مدح میں ہے ، یہ شعر آتا ہے :

از وطن گشتم جدا از محنت یعقوب بیگ
کز ستم ملکم گرفت و عالمی شاہد برین

لیکن اس کا یہ ادعاے فخر و تکبر اور والا نسبی کی تعلّی ہمارے نزدیک ایک دھوکے کی ٹٹی ہے ، جس کی آڑ میں اس نے اپنی اصل حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے ۔ بالفاظ دیگر وہ ایک شریف گدا ہے جو ایران سے ہندوستان ، جس طرح اور اس کے ہزاروں ہم وطن آتے رہے ہیں ، گدائی کی غرض سے وارد ہوا ہے ۔ اس نے اپنی گدائی کے لیے بعض شرعی حیلے تراش رکھے ہیں ، جنھیں ہر ادنی خان اور امیر کے سامنے بار بار بیان کرنا ہے ؛ مثلاً روضۂ امام رضا کی زیارت کا شوق ، نجف پہنچنے کے لیے زاد راہ کا سوال وغیرہ وغیرہ :

بسلاح مروت و احسان
فکر رہ توشہ کن بسامانم

تا رساند امانت جودت
بدر والیِ خراسانم

والیٔ خراسان سے مراد امام رضا ہیں -

وزیرِ عراق سے ملتجی ہے :

کنون بہ ہمت توفیق عازم سفرم
بہ مشہدی کہ بہ طوفش ملک بود مشتاق

اور مصطفٰی خاں کو عرض کرتا ہے :

بر آن سرم کہ ز امداد ہمتت امسال
شوم ز راہ نجفِ گرم پویہ چون صرصر

ادھر مرتضٰی خاں کی خدمت میں مستدعی ہے :

چو رو بہ درگہ شاہ رضا نہم بر خاک
بقا طلب شوم و گردمت ثناگستر

یہی گزارش میرزا ابوالقاسم سے کی جاتی ہے :

ز اہتمام عنایتِ ز لطف حق خواہم
کہ جا بروضۂ شاہ رضا کنم مسرور

اسی میرزا سے ایک اور قصیدے میں یہ امید کرتا ہے :

زاد راہ طوفِ سلطان نجف می بخشدت
ز آل برمک در کرم صد گام برتر می زند

خان خانان سے حسن طلب ہو رہا ہے :

خراسان پویم اما بی‌بضاعت
کفیل توشہ ام جود فلان باد

حسن مکی سے التماس گزار ہے :

دانا دلا ہوای نجف کردہ ہمتم
خواہم کہ یمن لطف تو سامان آن دہد

ایک مرتبہ اور نواب مرتضٰی خاں سے گزارش پرداز ہے :

ہوای طوف شہ روضۂ رضا دارم
برخصت تو کہ این ملک میکنم پدرود

ز التفات تو خواهم کہ تا وطن برسم
ز راہ بندر کمرود و ساحلِ قهرود

وہ بار بار اس ملک سے جانے اور ایران پہنچنے کا آرزومند ہے لیکن بقول نظیری :

من نخواهم رفت اما بهر تسکین دلش
هر کجا بینید گوئیدش کہ فردا می رود

وہ اس آرزو کو قوۃ سے فعل میں لانے کی کوشش نہیں کرتا۔

صلائی کو اپنی مطلب برآری کے نئے نئے ڈھب یاد ہیں۔ بعض موقعوں پر وہ اپنے ممدوحین سے کہتا سنا جاتا ہے کہ جس طرح ملتان میں قاسم خان[1] نے حیدری شاعر کو نہال کر دیا تھا ، تم بھی میرے ساتھ فیاضانہ سلوک کرو۔

۱۔ مآثرالامرا میں اس کا نام قاسم محمد خان دیا گیا ہے۔ چنانچہ ردیف قاف میں اس کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ابوالفضل ، بدایونی اور صاحبِ 'طبقات' اس کو محمد قاسم خان لکھتے ہیں۔ وہ نیشاپور کا ایک دولت مند رئیس تھا۔ ازبکوں کے حملے کے وقت ہندوستان بھاگ آیا اور بیرم خان کے ساتھ نوکری کرتا رہا۔ سکندر سور کے ساتھ جنگ میں اس نے نمایاں خدمت انجام دی اور ہیمو کی جنگ میں خان زمان کا ہراول رہا۔ عنقریب بعد وہ حاجی خان کے خلاف بھیجا گیا ، جس نے رانا اودے سنگھ والیٔ میواڑ کو شکست دے کر ناگور اور اجمیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ حاجی خان شیرشاہ کا ملازم قدیمی تھا اور اپنی دانائی اور دلاوری کے لیے شہرۂ آفاق۔ شاہی افواج کے نمایاں ہونے پر حاجی خان کی فوج متفرق ہوگئی اور حاجی خان خود گجرات کی طرف چل دیا۔ محمد قاسم خان نے بغیر جنگ کے ناگور اور اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ یہ شہر ایک دراز عرصے تک سلطنتِ اکبری کی جنوب مغربی سرحد بنے رہے۔

پانچویں سال جلوس میں محمد قاسم خان ، بیرم خان کا ساتھ چھوڑ کر چغتائی امرا کا شریک ہوگیا اور جس جنگ میں بیرم کو شکست ملی اس میں شمس الدین اتکہ کی فوج یسار کا افسر تھا۔ فتح کے بعد ملتان اس کی جاگیر میں دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس کو سارنگ پور (مالوہ) بھیج دیا گیا جہاں سنہ ۹

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

چنانچہ مرتضیٰ خان سے عرض کرتا ہے :

چنانکہ کرد بملتان عطای قاسم خان
بحیدری نظری خواهم از تو زان بهتر

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

جلوس میں اکبر شکار کے بہانے سے اچانک آدھمکا ۔ عبداللہ خان ازبک کی گرفتاری ، پادشاہ کا مدعا تھا اور اس بارے میں محمد قاسم خان نے خان کا تعاقب کر کے پادشاہ کی امداد کی ۔ اس واقعے کے جلد بعد محمد قاسم خان نے سارنگ پور میں وفات پائی ۔ الغرض یہ قاسم خان ہے جس کے نام کو صلائی ، حیدری کے تعلق میں شہرت دیتا ہے ۔

حیدری شاعر خو بو میں کسی طرح صلائی سے کم نہیں ۔ اگرچہ ہندوستان میں اس نے روپیہ کمایا اور قدردانی بھی پائی تاہم اس حق ناشناس اور خود کام شاعر کی رائے اس ملک کے متعلق نقل کیے جانے کے قابل ہے ۔ وہو هذا :

در کشور هند شادی و غم معلوم
آنجا دل شاد و جان خرّم معلوم
جائیکہ بہ یک روپیہ دو آدم بخرند
آدم معلوم و قدر آدم معلوم

امین رازی کا قول ہے کہ حیدری کی باتیں حیدری کے اشعار سے زیادہ خوش آیند تھیں ۔ اس کی مثنوی بہ تقلید بوستان بہت بےلطف و غیرمعروف ہے ۔ وہ تین بار ہندوستان آیا گیا ہے ۔ جب پہلی دفعہ آیا ، محمد قاسم خان نیشاپوری کی خدمت میں رہا ۔ اس وقت بالکل نوجوان تھا ۔ جب دوسری مرتبہ ہندوستان آیا ، خان اعظم (مرزا عزیز کوکلتاش) کی سرپرستی میں رہا ۔ خان نے ایک غزل پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا ۔ محمد خان اتگہ کی وساطت سے دربار شاہی میں پہنچا اور ردیف فیل کے قصیدے پر اکبر نے دو ہزار روپے نقد اور ایک گھوڑا صلے میں انعام دیا ۔ تیسری مرتبہ ہندوستان آنے پر اس نے خان خانان کی سرکار میں تعلق پیدا کیا اور خان خانان کے ساتھ گجرات پہنچا ۔ فتح سرکیچ کے موقع پر قصیدہ سنایا اور بیش قرار جائزہ حاصل کیا ۔ (حاشیہ مصنف)

اور شیخ الاسلام عبدالرحیم سے التماس کرتا ہے :

حیدری را داد قاسم خان بہ ملتان دہ ہزار
روپیہ نقد و چہل اشتر پر از بار گزین

ایک نیا طریقہ حسن طلب کا جو اسے سوجھا ہے ، ذیل کے اشعار میں درج ہے ۔ اس کا مخاطب قطب شاہ ہے :

کنون دو واقعہ را پایمال اندوہم
کزان دلم شدہ مجروح و تفتہ گشتہ جگر

یکی مطالبۂ قرض خواہ از گجرات
دویم تظلم فرزند و قید سہر پدر

ہزار و نہ صد و ہفتاد لاریم وام است
بکشور گجرات ای شہ نکو محضر

رہین آن بودم جنس نام نیک کنون
پی ادای ویم گشتہ عاجز و مضطر

ز فرقتم مژہ یعقوب وار گریانست
فغان ز عسرت و داد از فراق نور بصر

بہ بیقراری خواہش ترحمی فرمای
کہ وارہم ز غم قید قرض و ہجر پسر

بہ حیثیت شاعر صلائی کسی ممتاز رتبے کا مستحق نہیں ہے ۔ وہ اسی عام معیار کے شعرا میں محسوب ہونے کے قابل ہے جو ہزاروں کی تعداد میں ایران نے پیدا کیے ہیں ، اگرچہ اس کو اپنے متعلق بہت کچھ غلط فہمی ہے ۔ اس کی شاعری کا یہ پہلو کہ وہ خیالی نہیں بلکہ حالی ہے اور اس کا دیوان اس کے خیالات و جذبات و حالات کا آئینہ دار ہے ، یقیناً قابل توصیف ہے ۔ اس کے ہاں زندگی اور شاعری دو غیرمتجانس اشیا کا نام نہیں ۔

اس کی معلومات خود اپنی زبان کے مشاہیر ، شعرا و سلاطین کے تعلق میں ناقابل اعتبار ہے ۔ وہ انوری کو سروان سامی خاندان کا مداح بیان کرتا ہے اور طغان شان کو جو افراسیابی سلاطین سے ہے ، شروان کا بادشاہ مانتا ہے ۔

چنانچہ :

گرا نوری نہ نمودی بیان کہ دانستی
کہ خود طغان شہ و شروان شہی بشروان بود

حالانکہ شروانیوں کے مداح خاقانی اور فلکی شروانی ہیں ۔

صلائی کی شاعرانہ تعلّیوں میں سے بخوف طوالت صرف دو یہاں قابلِ گزارش معلوم ہوتی ہیں ۔ پہلی یہ کہ بایںہمہ بے بضاعتی وہ نظیری نیشاپوری جیسے اُستاد فن کے منہ آتا ہے ۔ اس نے نظیری کا نام صراحۃً تو نہیں لیا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اشعارِ ذیل میں اس کا روئے سخن نظیری کی طرف ہے ۔ نظیری اس وقت گجرات میں موجود ہے اور تجارت سے بسر اوقات کر رہا ہے ۔ جہانگیر اسے اپنے دربار میں بلاتا ہے ۔ وہ پانچویں سال جلوس میں حاضر خدمت ہوتا ہے اور انوری کے قصیدے : ع

باز این چہ جوانی و جمالست جہان را

کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھ کر گزرانتا ہے ۔ جہانگیر ایک ہزار روپیہ ، گھوڑا اور خلعت صلے میں دیتا ہے (توزک ، صفحہ ۹۱) ۔

صلائی ایک قصیدے میں ، جو میرزا ابوالقاسم کی مدح میں ہے ، نظیری کی طرف تلمیح کرتے ہوئے لکھتا ہے :

ازان میان ملک‌الافصح آنکہ میدانی
کہ شد تصوف او هجو اهل نیشاپور

میان فهم و وی آن رہ بود کی می‌گویند
بود میانۂ انسانِ و درک نطق ستور

باین تکلم و تقریر و وسع استعداد
کند ارادۂ رزمم بقوت این زور

اگرچہ یہ زمانہ فیضی ، عرفی ، نظیری اور ظہوری جیسے شہسوارانِ فن کا ہے جن کی گھٹی میں استعارے کی چاشنی پڑی تھی مگر صلائی کا دعویٰ ہے کہ استعارہ این جانب کا فیضان ہے ۔ چنانچہ کہتا ہے :

چون صلائی ز استعارات بہ مشرب متصل
تازہ طرزی درمیان شیخ و شاب افگندہ ام

دوسرے مقام پر گویا ہے :

طعنہ استعارہ بر شعرم زدہ اند این لجاج خاذلکان
عیب جو را هنر نماید عیب گرچہ باشد ز حکمت لقمان
استعارہ بہ شعر سحر بود کور باطن کند تدارک آن

صلائی نے غزلیں بہت کم لکھی ہیں ، اور جو لکھی ہیں ، ان میں عشقیہ مضامین ندرت کے ساتھ ملتے ہیں ۔ حسن و عشق کے لطیف جذبات سے اس کا خانہ بالکل خالی معلوم ہوتا ہے ۔ البتہ حکمت و پند اور جوش و بےخودی نے اس کی غزلیات میں جگہ پائی ہے ۔ مگر سب سے زیادہ خودی اور انانیت ، دشمنوں سے چھیڑ چھاڑ ، ان پر طعن و طنز ، ان کی دعائے مرگ ، اپنا افلاس اور ناداری ، دنیا کی نا قدری اور بخت کی شکایت پر اس کا قلم رواں ہے ۔ شاندار الفاظ اور بندشوں نے اس کی غزل کو قصیدے کی چاشنی دے دی ہے ۔ مثلاً چند غزلیں یہاں درج کی جاتی ہیں :

ما لعبت بازلدۂ این خیمہ کبودیم
زین پردہ بالواع صور چہرہ نمودیم

این نیستی و هستی ما بی سببی نیست
جبز و هنر معرکہ آرای وجودیم

افزون زحساب ازسُی این ساقی خود کام
مخمور ز جا خاستہ مستانہ غنودیم

در معرکۂ گفت و شنید از همہ اقران
صد مرتبۂ این گوی بانواع ربودیم

صد نکتہ نهفتیم بزیر لب هر آز
سازی نگرفتیم و سروری نہ سرودیم

حاصل همہ اوراست چہ بتخانہ چہ مسجد
یا رب ز چہ ما روی مسلمان و یهودیم

با آنکہ صلائی صفت از گنج معانی
رہ توشہ دہ قافلۂ گفت و شنودیم

دیگر

زورق سعی به بحر اضطراب افگنده ایم
طرفه شوری در بلاد انقلاب افگنده ایم

دهشتی کز بیم طوفان نوح را آشفته داشت
در دل معمار خرگاه حباب افگنده ایم

پرنیان ما که نقش تار و پودش از کتانست
بهر زیب امتحان در ماهتاب افگنده ایم

کسوت تر دامنان ضد تب اندیشه را ؟
در فضای معرفت بر آفتاب افگنده ایم

آنچه از اظهار پنهان عشق را در پرده بود
بی محابا از رخ رازش نقاب افگنده ایم

رونق ایجاد انسان نیست جز در بی خودی
بیخودی ورزیده خود را در سراب افگنده ایم

چون صلائی ز استعارات به مشرب متصل
تازه طرزی درمیان شیخ و شاب افگنده ایم

دیگر

آن قدر ذلت که در عهدت ز عسرت میکشم
گر کنم تقریر از اظهار خجلت می کشم

تا ز حال آگه نه گردد خصم حاسد پیشه ام
پردها از صبر بر رخسار طاقت می‌کشم

بسکه حرف خبث من پیشت مکرر گفته اند
گشته معلومم نمی‌گویم که ذلت می کشم

گر ز سختی بایدم مردن نمی سازم عیان
عیب صنعت باشد ار گویم که محنت می کشم

آنکه می خواهد نباشد اعتبارم بر درت
رخصت عمرش به بازار جسارت می کشم

آنکه می خواهد به خواری دستگاه عزتم
عصمتش را بر سر کوی ملامت می کشم

ترک بودن را درین کشور بخود دادم قرار
بعد ازین کی طعنهٔ اهل سماجت می‌کشم

ملک ایران رشک جنت گشته از عباس شاه
با دعایت رخت تا آن رشک جنت می کشم

بر در شاه خراسان گر بقا بخشد اجل
رایت مدحت بدوش استطاعت می‌کشم

عنقریب از درگهت تصدیع خواهد بست بار
با حلاوت انتظار وقت و ساعت می کشم

مرگ اعدا دیده خواهم رفت ازین کشور برون
گر چه ز استعجال تنگ رخش سرعت می کشم

می کنم از مرگ او دلشاد خلقی را و خود
نام او را در قطار اهل لعنت می کشم

بعد ازین بر وفق مطلبهای کام آرزو
بختی تعجیل دربار تجارت می کشم

چون صلائی از توکل غیرت من منعم است
کی ز هر مدبر نژاد سفله منت می‌کشم

بر کریمی شاه مردانم براقی کرده است
انتظار موسم و وجه بضاعت می‌کشم

دیگر

حاصل عمر گرامی به سفر باخته ام
داو آخر بحریف گل تر باخته ام

حیف صد حیف که سرمایهٔ این عمر عزیز
از سر سهو خطا کرده و در باخته ام

دغلهای طمع خار عزیزانم کرد
نقد عزت مگر آخر بہ هدر باختہ ام

بر در معصیت اسباب صلاح و تقوی
بردہ در چار سوی خوف و خطر باختہ ام

آنچہ در گنج عمل داشتم از بخت لژند
در مقمّر کدۂ شام و سحر باختہ ام

هر چہ اندیشہ بہ تسخیر فراهم آورد
برسر داو خسارت بہ دو سر باختہ ام

رائجُ الوقت نقودی کہ فراست را بود
بر در بی خبری فضل و هنر باختہ ام

تحفہای خلف کیسۂ کان و عمان
نزد نشناختۂ لعل و گہر باختہ ام

حاصل سعی ز غفلت چو صلائی در هند
من بہ یغمای بہادر بہ ضرر باختہ ام

قصائد کی زبان نہایت سیدھی سادی اور صاف ہے اور وہ مکلفانہ انداز، جو عام طور پر قصیدے کی زبان میں پایا جاتا ہے، صلائی کے ہاں بہت کم نظر آتا ہے۔ وہ لمبی چوڑی تشبیب کا قائل نہیں، حتی الامکان مختصر تمہید پر قناعت کرتا ہے اور فوراً نفس مطلب پر آ جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے ہاں مدحیہ حصہ تعداد اور مقدار کے لحاظ سے بھی قلیل ہوتا ہے۔ ذیل میں اس کے بعض قصائد سے ایسے اقتباسات دیے جاتے ہیں جو اس کے حالات یا اس عہد کے تاریخی واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب سے پیشتر ناظرین کی خدمت میں ایک ایسا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو احمد نگر میں پردیسیوں کے قتل عام کا ذکر کرتا ہے۔ قصیدۂ هذا حضرت علی کی شان میں ہے:

شبی ز گلشن این زال نیلگون چادر
گلی شگفت کہ شد خیرہ زان سواد بصر

چہ گل کہ شعلۂ از آتش فساد افروخت
نسیم مروحۂ فتنہ در ریاض صور

وزان نہال کہ آن فتنہ است آفت خاست
وزان نسیم کہ آن گل شگفت ریخت شرر

ز ابر تفرقہ بار سپہر رستاخیز
صدای الحذر آمد ز گنبد اخضر

سموم فتنہ وزیدن گرفت بر چمنی
کہ بود رائحہ اش رشک طینت عنبر

ریاض خرمی کشور طراوت سوخت
نماند اثر ز نہالان سبز و تازہ و تر

دویدہ شحنۂ بیداد از پیٔ یغما
بمامنی کہ درو باد را نبود گذر

دریدۂ پردہ ناموس عصمت قومی
کہ عطف عصمت شان از نقاب داشت حذر

گسیخت رشتۂ پیمان عافیت ز میان
ستم بہ ضربت زہراب دادہ گون خنجر

ز تیغ اهل جفا گشتہ عالمی مجروح
ز تیر کج روشان مرغ روح ریختہ پر

ز بی ترحمی فتنہ در فضای امید
جہان نمودہ بہ چشم نظارگی محشر

مپرس ای فلک از من کہ این معاملہ را
بود بیان مآل از حد بیان برتر

ولیک اینقدر اظہار میکنم ناچار
کہ بود باعث این کار ناستودہ سیر

بساط خرمی روزگار برہم زد
چو انقلاب حوادث یکی نگون اختر

ز خام کاریٔ برگشتہ بختیٔ از ادبار
ہزار خانۂ امید گشتہ زیر و زبر

بہ نہ صد و نود و ہفت این شرر افروخت
بہ احمد نگر از مدبران یکی ابتر

خراب گشتۂ تدبیر کودکان گردید
دکن کہ داشت درو جا ہزار دانشور

ز سنگ تفرقہ رم خوردہ ہر کجا مرغی
نشستہ بود در آن بیشہ بہر آبشخور

ز بیم آن شرر فتنہ بار ہر جانب
ہوا گرفتہ گزیدند شاخسار دگر

ولی ز ناوک بیدادیان کوی ستم
نہ بال بر تن شان تندرست ماندہ نہ پر

کنون یکی منم از خستگان آن بیداد
اسیر صد ندم و محنت و بلاۂ بتر

چنان سپہر ز افلاس ناتوانم کرد
کہ نقد آہ نیابد مرا کسی بہ جگر

ز ضعف منفعلم پیش ناتوانی ہا
ز دردِ دل خجلم از بیان شرح ضرر

فلک نہاد بسر باریم درین اندوہ
ہزار بستہ غم بیکران ز مرگ پسر

احمدنگر میں پردیسیوں کا قتلِ عام :

غریب کشی دکنی تاریخ کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر دنیا کے اور ملکوں کی تاریخ میں مشکل سے نظر آتی ہے ۔ اس موقعے پر ہمارے لیے ضروری ہے کہ ناظرین کی آگاہی کے لیے بعض تاریخی واقعات ، جو اس قتلِ عام کے اسباب ہیں ، ابوالقاسم فرشتہ کی تاریخ سے لے کر مختصراً یہاں درج کر دیں ۔

دسویں صدی ہجری میں احمدنگر پر نظام شاہیوں کی حکومت تھی ۔ ۱۸ ۔ رجب ۹۹۶ھ کو مرتضٰی نظام شاہ معروف بہ دیوانہ ایک حمام میں بند کرکے قتل کیا جاتا ہے اور اس کا فرزند میران حسین باپ کے خون سے رنگین ہاتھوں کے ساتھ سولہ سال کی عمر میں تخت سلطنت پر جلوس کرتا ہے ۔ ان ایام میں احمد نگر کی سیاسیات کے مدّ و جزر نے سلطان حسین سبزواری کو جو وکالت کے منصب پر ممتاز

اور میرزا خان کے خطاب سے سرفراز تھا ، مختار مطلق بنا دیا تھا ۔ نئے پادشاہ اور میرزا خان کے درمیان تعلقات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں ایک دوسرے کی جان کے خواہاں ہو گئے ۔ ۱۲- جمادی الاول ، ۹۹۷ھ کو پادشاہ نے دعوت کے بہانے سے میرزا خان کو انکس خان کے گھر بلایا مگر وہ بیماری کا بہانہ کرکے نہیں آیا اور ٹال گیا ۔ ساتھ ہی اس نے پادشاہ کو قلعے میں بلا کر دھوکے سے قید کر لیا اور اس کے چھوٹے بھائی اسمٰعیل کو ، جس کی عمر بارہ سال کی تھی ، اس کی جگہ تخت پر بٹھا دیا ۔ اس انقلابی تحریک میں زیادہ تر پردیسی شریک تھے ۔

ادھر جمال خان مہدوی نے جس کے ساتھ بعض دکنی اور حبشی بھی شریک ہو گئے تھے ، قلعہ والوں سے اپنے بادشاہ کا مطالبہ کیا ۔ اس پر میرزا خان نے ایک رعونت آمیز لہجے میں کہلا بھیجا کہ میراں حسین پادشاہی کی اہلیت نہیں رکھتا تھا لہٰذا معزول کر دیا گیا ۔ اب تم اسمٰعیل نظام شاہ کو اپنا پادشاہ تصور کرو ۔ جمال خان اس جواب پر آمادۂ شورش ہو گیا :

کسی کو ہوای فریدون کند
سر از بند ضحاک بیرون کند

اس نے فوراً دیسی اور پردیسی کا جھگڑا کھڑا کر دیا اور شہر میں منادی کرا دی کہ میرزا خان اور دیگر پردیسیوں نے قلعے میں جمع ہو کر ہمارے جائز پادشاہ کو قید کر دیا ہے اور اس کی جگہ دوسرے کو تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں ، لہٰذا اہل دکن کو چاہیے کہ اپنے بادشاہ کی رہائی کی کوشش کریں اور ان پردیسیوں کے تسلط کی لعنت کو اپنے سر سے دور کریں ۔ اس منادی پر دو تین گھنٹوں کے اندر اندر ہزاروں دکنی قلعے کے گرد جمع ہو گئے ۔ ان میں شہری ، بازاری ، فوجی اور حبشی شریک تھے ۔ میرزا خان نے ان کے دفعیے کے لیے ایک فوج ، جس کی تعداد دو سو پردیسی سے زیادہ نہیں تھی ، بھیجی ۔ لیکن یہ مٹھی بھر لوگ دکنیوں کے اس بڑھتے سیلاب کا کیا علاج کر سکتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مارے گئے اور بقیۃ السیف ، جو زیادہ تر زخمی تھے ، قلعے میں پہنچے ۔ میرزا خان سے دوسری حماقت یہ سرزد ہوئی کہ اس نے میراں حسین شاہ کا سر کٹوا کر ایک نیزے کے ساتھ قلعے کے برج پر لٹکوا دیا اور کہلا بھیجا کہ اگر میراں حسین کے لیے تمھارا جھگڑا ہے تو اس کا سر نیزے پر لٹک رہا ہے ، دیکھ

لو ـ اب تمھارے لیے یہی مناسب ہے کہ اسمٰعیل کی حکومت پر قانع ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور فساد سے باز آؤ ـ دکنیوں کی رگِ حمیت کو جنبش میں لانے کے لیے یہ پیغام کافی تھا ـ اب جمال خان کا نعرۂ جنگ یہ تھا کہ پردیسیوں سے حسین کے خون کا بدلہ لو اور معاملاتِ سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھو ـ چنانچہ قلعے پر حملہ ہوا ؛ اس کے دروازوں میں آگ لگا دی گئی ـ میرزا خان اپنی ٹولی کے ساتھ نکل گیا اور دکنیوں نے داخل ہو کر باقی ماندہ پردیسیوں کو ، جن کی تعداد تین سو کے قریب تھی ، تلوار کے گھاٹ اُتار دیا ـ اس کے بعد وہ شہر کی طرف بڑھے ـ اسمٰعیل نظام شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا اور شہر و دیہات کے پردیسیوں کے قتل عام کا حکم دے دیا گیا ـ مؤرخ فرشتہ ، جو ان ایام میں احمد نگر میں مقیم تھا اور ان واقعات کا عینی گواہ ہے ، تحریر کرتا ہے :

''و مجدداً بہ قتل غریبان و تاراج اموال ایشان و سوختن و کندن عمارات آنہا حکم فرمود ـ لشکریان و غارتگران دست بیداد از آستین ظلم برآوردہ وضیع و شریف و توانگر و گدا و نوکر و سوداگر و مسافر و غریب را بزجر تمام و رسوائی مالا کلام بہ معرض ھلاکت رسانیدند و آتش در عمارات عالیۂ ایشان زدہ سرکسانی کہ بفرق فرقدان می سود زمین سا و پایمال جفا گردانیدند و دوشیزگانی را کہ روی از سہر و ماہ می پوشیدند موی کشان بہ بزم مستان کشیدند و روز چہارم میرزا خان را در حوالی جنیر گرفتہ آوردند و بہ حکم جمال خان نخست برخر سوار کردہ در شہر گردانیدند و بعد ازان پارچہ پارچہ کردہ بر سر بزارھا آویختند و جمشید خان شیرازی را با برادرانش سید حسین و سید محمد و پسرش سید مرتضٰی را بدین تقریب کہ با میرزا خان ہم داستان بودند کشتہ اجساد آنہا را در دھن توپ نہادند آتش دادند تا ھر ذرہ از اعضای ایشان بہ جای افتاد و مدت ھفت روز یک ھزار غریب در شہر و قصبات بہ قتل آمدہ اسباب و اموال ایشان بہ تاخت و تاراج رفت ـ'' (صفحہ ۲۹۳ ، تاریخ فرشتہ ، جلد دوم)

مقتولین کے علاوہ تین سو پردیسی ، جو فرہاد خان حبشی کی شفاعت کی بنا پر قتل سے بچ گئے تھے اور قید میں تھے ، عین عید کے روز خارج البلد کیے گئے ـ ان مخرجین کو بیجاپور میں دربار عادل شاہی نے پناہ دی اور ملازم رکھ لیا ـ ملائی کو اس قتلِ عام سے بچ نکلتا ہے لیکن اسی زمانے کے قریب اس کے فرزند

کی وفات کا سانحہ' ناگزیر پیش آتا ہے ۔ اس کی بقیہ سرگزشت اشعار آیندہ سے معلوم ہوتی ہے :

بعزم خاک درش بستہ نیت احرام
بہ بحر سعی بہ زورق نہادہ بار سفر

ز جام حب شہ امید گشتہ لا یعقل
بہ سعی گشتہ روان سوی سندہ چون تندر

و لیک بی خبر از کید حادثات زمان
نخوانده سرعت تدبیر درس لا بقدر

چو چند روز دران بحر بیکران زورق
دوید همچو حبابی بہ یاری صرصر

هوا مزاج بدل کرد بعد یک چندی
نهاده بر سر آتش مسافران یکسر

چہ گویم از ستم بحر و موج طوفانش
کہ گہ باوج و گہی در حضیض داشت مقر

نہنگ و ضعدف (کذا) و سنسار گرد آن زورق
کشیده هر طرفی صف برون ز حد و مر

درو ز شبنم غم جملہ دست شستہ ز جان
چہ ناخدا و معلم چہ تاجر و لشکر

بصد هزار مشقت پس از دو ماه و دو روز
بساحل گجراتم سفینہ شد لنگر

هزار شکر کہ بر وفق مدعا دیدم
سپاه و خیل عدو را چو دفتر ابتر

کھمبایت میں بہادر ابن مظفر کی تاخت :

کھمبایت میں بہادر کی تاخت کے متعلق صلاتی کے قصائد میں متعدد بیان اور اشارے ملتے ہیں ۔ وہ اس واقعے کی کوئی تاریخ نہیں دیتا ۔ مغلیہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا مظفر حسین ۹۸۵ھ میں کھمبایت کو لوٹتا ہے ، ۹۹۱ھ

میں مظفر گجراتی اس شہر سے روپیہ وصول کرتا ہے لیکن بہادر کی تاخت کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا ۔ صلائی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاخت ایک بڑے پیمانے پر ہوئی ہے ۔ بہادر اچانک ایک رات مع اپنی فوج کے شہر پر آ گرتا ہے اور دل کھول کر لوٹتا ہے ، جس میں شاعر کا تیس سال کا اندوختہ غارت ہو جاتا ہے ۔ قسم قسم کی اجناس ، کشمیری شال ، پاٹن کے سبلے ، برار کے گرپھسوتی کپڑے ، خاصے کے تھان ، بنگالی مندیل اور دیگر بلاد کی تحفہ تحفہ اشیاء ، موتی اور لعل و یاقوت ، دو راس گھوڑے اور بہل وغیرہ غارت میں جاتے ہیں ۔ وہ تنہا غارت زدہ نہیں ہے بلکہ اس کے اشاروں سے پایا جاتا ہے کہ باقی شہریوں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا ہے ؛ مثلاً ایک جگہ وہ ''ابتلای ستم دیدگان کمبایت'' استعمال کرتا ہے ۔ دوسری جگہ 'تاراج بندر سلطان' کہتا ہے اور تیسری جگہ 'انتقام من و جمہور' کا فقرہ لاتا ہے ، جن سے پایا جاتا ہے کہ سارا شہر لوٹا گیا ہے ۔

اب میں ایسے اشعار ، جو اس واقعے سے متعلق ہیں ، اس کے مختلف قصائد سے لے کر ، بمعہ ان قصائد کے ممدوحین کے ناموں کے یہاں درج کرتا ہوں ۔

(۱) در مدح شاہ عباس صفوی (۹۸۵ھ و ۱۰۳۸ھ) :

سخن ز غارت و جور بہادر آغازم
کزو درین کبر من چہ دیدہ ام آزار

بسان راهزنان بی خبر بکمبایت
شبی درآمد و برد آنچہ داشتم دربار

زقسم اقمشہ و شالهای کشمیری
ز سیل های فتن ، گربسوتهای برار

ز خاصها و ز مندیلهای بنگالی
دگر نفیس تحفهای هر بلاد و دیار

سخن بہ طول کشدگر بیان کنم یک یک
مرا تعدد تکرار آن بود دشوار

بهند آنچہ بہ سی سال کردہ بودم جمع
ز لعل دلکش و یاقوت و گوهر شاهوار

بہ برد آنہمہ در یک نفس ز خانۂ من
سپاہ بی سر آن ابتر قبیح اطوار

ز مال دنیویم آنچنان مبرا کرد
کہ باد بی محلی نخل بارور ز ثمار

بہ بارگاہ تمیزش کہ مرجع فضلاست
ازین زیادہ چگویم ز جور آن غدار

امیدوار چنانم کہ خیل بی سر او
چنان شوند کہ اولاد لوط را آثار

(۲) مدح همال جہانگیر شاہ :

آن بہادر کہ گم شود ز جہان
بردہ یغمای او مرا اموال

باد و راس اسپ و بہل و جنس مرا
با بضاعات بی شبیہہ و مثال

آنچہ سی سال کردہ بودم جمع
از گزین تحفہای و مال و منال

جملہ برد و مرا نمود گدا
آن نگون بخت مظلمہ دلّال

خسروی را نہ زیبد آن مدبر
کش نباشد نظر بحسن مآل

(۳) ممدوحِ نا معلوم :

این نتّون کہ از جہان گم باد
کردہ تصدیعی عزیزانم

آنچہ سی سال کردہ بودم جمع
آمدش زجر کرد تالانم

بعد یغمای او چو ماتمیش
هست پیوسته چشم گریانم
که بهنگام پیری از من برد
هر ذخیره که بود پنهانم
حسرت اندوز باد تا محشر
آنکه ز جرش نمود تالانم
از لباس امید عریان باد
آنکه محتاج کرد و نالانم

(۴) در مدح جهانگیر پادشاه :

اما سخنی که هست واجب
نتوان کردن نهان ز خدام
زین حادثهٔ که این نشّون
در کمبایت نمود ز ابرام
غارت زده شد متاع صبرم
این واقعه را چسان برم نام
جز پوست بر استخوان نه هشتند
آن قوم بمن ز هیچ اقسام

(۵) در مدح مقرب خان و ذکر بهادر :

. . . .
. . . .

(۶) مدح شاه عباس :

چو ز طوف کعبه گشتم کامیاب و کامجو
توبهٔ عصیان مرا شد مونس محفل نشین
از بضاعت بود در تحت تصرف سعی را
مایهٔ راحت چو تجاران ملک روم و چین

اندرین اوقات در کمبایت آن یغما نمود
تا جوانمرد آن بهادر نام کم از هر کمین
لعنت از حق باد و نفرین از منش کز اهل ظلم
همچو او بیداد آئین دگر نبود لعین
آنچه در سی و دو سالم حاصل تحصیل شد
برد آن بدبخت و کردم چون گدایان گوشه شین

(۷) مدح جهانگیر قلی خان :

شمهٔ حال من ار عرض کنم جائی هست
زان جفا کم بسر از سرور دزدان آمد
ابن نتهون که مبیناد بعالم رحمت
چون بتاراج سو بندر سلطان آمد
آنچه در هند بسی سال مرا شد حاصل
برد آن دزد دغل چون پی تالان آمد
دارم امید که گویند سر آن مدبر
بر سر دار فنا بر زده داماں آمد
تا بگویم ز پی ماتم او تاریخی
که دلم سخت به تنگ از غم نقصان آمد
انتقام من و جمهور تو خواهم گیری
زان جفاجوی که بی بهره ز نقصان آمد

(۸) مدح جهانگیر پادشاه :

ابن نتهون که باد مقهور تاراج وی ام نمود مضطر
از شدت زجر آن جفا جو وز محنت ظلم آن ستمگر
افتاده ترم ز ناتوانی آشفته چو بخت آن بداختر

(۹) خطاب به مسعود :

به ابتلای ستم دیدگان کمبایت
ز ظلم زادهٔ نتهون بهادر مردود

که بر صلائیت از جور آن سفیه تبار
رسید آن که ندارد بیانش حد و حدود
چو شرح نقل الم باعث ملال بود
به آنکه قصه کنم مختصر ازان نابود

اگرچہ اس واقعے کی تاریخ کی صلائی نے کوئی تصریح نہیں کی ہے ، وہ صرف اسی قدر کہتا ہے کہ میرا تیس سال کا اندوختہ غارت ہوا ۔ چنانچہ اشعار بالا میں چار جگہ اس نے 'سی سال' لکھا ہے اور ایک جگہ 'سی و دو سال' کہا ہے ۔ مگر اس بیان سے تاریخ حاصل کرنے کی ایک ظنی دلیل یہ پیدا ہوتی ہے کہ شاعر ۹۸۱ھ میں ہندوستان آتا ہے ۔ اس پر اگر اس کی مدتِ اقامتِ ہندوستان — تیس سال — اضافہ کی جائے تو حاصل جمع ۱۰۱۱ھ ہے ۔ اگر بتیس سال جمع کیے جائیں تو ۱۰۱۳ھ برآمد ہوتے ہیں ۔ بہرحال ان سنوں میں یا ان کے قریب کسی سال میں بہادر نے بندر کھمبایت پر تاخت کی ہوگی ۔

تاریخوں میں بہادر کی دو یورشوں کا ذکر آتا ہے ۔ پہلی یورش بہ زمانۂ اکبر اس وقت ہوتی ہے جب شاہزادہ مراد ، صوبہ دار گجرات ، دکن کی مہم پر تعین ہوتا ہے اور راجا سورج سنگھ اس کی نیابت میں گجرات میں کام کرتا ہے ۔ ان دنوں جاگیرداران گجرات بھی خدمتِ دکن پر متعین تھے ۔ بہادر موقع پاکر ۱۰۰۵ھ میں علمِ فساد بلند کرتا ہے اور دیہات و قصبات کو لوٹتا ہے ۔ راجا سورج سنگھ اس کے مقابلے کے لیے احمد آباد سے روانہ ہوتا ہے اور جب صفوفِ جنگ آراستہ ہو جاتی ہیں ، بہادر بغیرلڑے بھڑے میدانِ رزم سے چل دیتا ہے اور راجا مظفر و منصور واپس لوٹتا ہے ۔ (مرآت احمدی ، صفحہ ۱۸۲ - ۸۳ ، جزو اول)

دوسری یورش ۱۰۱۴ھ میں جہانگیر کی تخت نشینی کے موقعے پر عمل میں آتی ہے جس کے متعلق توزک جہانگیری میں حسبِ ذیل اطلاع ملتی ہے :

''در آغاز جلوس یکی از اولاد مظفر گجراتی که خود را حاکم زادۂ آن ولایت میگرفت سر شورش برآورده اطراف و جوانب شهر احمد آباد را تاخت و تاراج نموده چندی از سرداران مثل ہم بہادر اوزبک و رای علی بھٹی که از جوانان مردانه و قرار داده آنجا بودند در آن فتنه به شہادت رسیدند۔ آخرالامر راجه بکرماجیت و بسیاری از منصب داران را با شش هفت

هزار سوار آراستہ بہ کمک لشکر گجرات تعین ساختم و مقرر شد کہ ،
چون خاطر از رفع و دفع مفسدان جمع سازد ، راجہ مذکور صاحب صوبۂ
گجرات باشد قبل ازین کہ قلیج خان بدان خدمت تعین یافتہ بود متوجہ
ملازمت گردد ۔'' (توزک ، صفحہ ۲۳)

یہ تاخت بقول جہانگیر ۱۰۱۴ھ میں کی جاتی ہے ۔ مگر جہانگیر اس کو اطراف و جوانبِ احمد آباد تک محدود بتاتا ہے ۔ کھمبایت کی تاخت بھی گمان غالب ہے کہ عہدِ جہانگیری میں وقوع میں آئی ہے کیونکہ اس سلسلے میں صلائی نے جن جن اشخاص کو خطاب کیا ہے وہ سب کے سب جہانگیر کے دور سے تعلق رکھتے میں ۔ مثلاً خود جہانگیر پادشاہ اور اس کے امرا ، مقرب خان ، جہانگیر قلی خان اور مسعود وغیرہ ۔ اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ یہ تاخت بھی اسی سال رونما ہوتی ہے جس سال احمد آباد کی تاخت واقع ہوتی ہے اور مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر دونوں ایک ہی وقت میں عمل میں آئی ہوں ، اگرچہ کھمبایت کی تاخت و تاراج کا ذکر تاریخوں میں نہیں آیا ۔

بہادر واقعہ طلبی اور جیوٹ میں اپنے باپ مظفر سے کم نہیں تھا ۔ اس کی تمام عمر مغلوں کی مخالفت میں گزری ۔ جب نویں سال جلوس میں جہانگیر اس کی وفات کی اطلاع سنتا ہے ، خوش ہوتا ہے اور اس خبر کو اپنے واسطے ایک مبارک نوید تصور کرتا ہے ۔ لکھتا ہے :

''دوم خبر فوت بہادر کہ از حاکم زادہای ولایت گجرات و خمیر مایۂ
فتنہ و فساد بود رسید کہ اللہ تعالیٰ بکرم خود او را نیست و نابود ساخت
باجل طبعی درگذشت ۔'' (توزک ، صفحہ ۱۳۴)

اس سے ظاہر ہے کہ وہ جہانگیر کو خاصہ دق کر رہا ہے اور اس کی موت سے ایک بڑا بوجھ اس کے دل سے اترتا ہے ۔

گوبند پٹیل کی ہجو :

صلائی اور اس کے معاملات میں جس شخص نے سب سے زیادہ دلچسپی لی ہے وہ میرزا ابوالقاسم (محی الدین) صدر گجرات ہے ، جس کی مدح میں شاعر نے کم از کم دس قصیدے یادگار چھوڑے ہیں ۔ بدقسمتی سے میں میرزا کے حالات معلوم

نہ کر سکا۔ میرزا کی وساطت سے صلائی کا معروضہ جہانگیر کی خدمت میں پہنچتا ہے ، جس میں شاعر درخواست گزار ہے :

انعام وظیفہ ام ز لطفش
بی منت عاملان ، مقرر
چندانکہ ز نفع حاصل آن
گردم ز توانگران توانگر
خواہم دہی کہ سازم آن را
معمور و خورم ز حاصلش بر

بادشاہ اس کو سو بیگھہ زمین کھمبایت میں عنایت کر دیتے ہیں ۔ شاہی حکم لے کر صلائی کھمبایت آیا ۔ حاکم بندر نے اسی وقت زمین ناپنے اور چک بندی کا حکم دیا لیکن گوبند نے ، جو شہر کا پٹیل تھا اور جس کا فرض زمین ناپنا تھا ، شاعر کو تازہ ولایت سمجھ کر ، کچھ افتادہ اور کچھ اونچی نیچی زمین بتا کر ٹالنا چاہا ۔ مگر صلائی ٹلنے والی اسامی نہیں تھا ۔ اس کا اصرار تھا کہ مزروع زمین دی جائے جیسا کہ شاہی حکم میں درج ہے ۔ گوبند نے 'میرجیو' کو ، جیسا کہ وہ ہمارے شاعر کو کہا کرتا تھا ، سمجھانے کی کوشش کی کہ میرجیو ! اس سال تو خیر ، پارسال آپ دیکھیں گے کہ اس زمین میں بے حساب پیداوار ہوگی ۔ مگر میرجیو بھلا ان فقروں میں کب آنے والے تھے ۔ وہ یہی سمجھے کہ یہ ہندو مجھے اُلّو بنا رہا ہے ۔ چنانچہ طیش میں آ کر میرجیو نے پٹیل موصوف کے مزاج درست کرنے کی غرض سے قصیدہ ذیل نظم کیا :

عرضی است بندہ را شنوای معدلت دثار
از قبح فعل را بتر برگشتہ روزگار

سرکش ز حکم شاہ جہانگیر مبرہی
کو را بجز تقلب و تکذیب نیست کار

نواب مستطاب فریدون فر از عطا
دادم وظیفۂ صلۂ مدح شہریار

صد بیگۂ بہ بندر کمبایتم زمین
مزروع او فتادہ برابر کہ شمار

آن حکم را چو حاکم بندر گرفت و خواند
کرد انقیاد و رسم مراعات اختیار

فرمود زود رفته و پیموده بسته چک
آن تن دهند بی خلل و نقص و انکسار

ناپاک طینتی ز اوامین سفله طبع
کو را بجز درک نبود مامن و قرار

بدبخت ، کامهج منشی ، بی دیانتی
کو راست پیشه قلبی و ناراستی شعار

از مال واجبی شه آن دزد می برد
هر سال روپیه به عدد پنج و شش هزار

هژده هزار روپیه را بی زیاد و کم
تنخواه از رعیت بندر گرفته پار

جمع خزانه یازده و چار صد نمود
باقی به قبض اوست درین هیچ شک میار

گر شاهدی ز من طلبند اندرین سخن
پرسید ازان گروه که هستندش از تبار

زان پس ایمهٔ که ون(کذا)بق همی خورند
بر قتل اوستاده به یک پای بر قطار

گویند نام دارد و باشد پٹیل شهر
این دزد بی ملاحظه وین قلب نابکار

زین طرفه تر بگویمش از حال شمهٔ
گوش شنو به سوی من مستمند دار

زرعی که آن ایمه وظائف گرفته اند
از لطف شاه و جود خوانین نامدار

جز من به جمله داده زمین‌های عین را
اما نمی هلد که کنندی بران گذار

یک روپیه اجارهٔ هر بیگهٔ دهد
وز زارعان کشت ستاند سه و چهار

اول زمین حضرت قاضی شهر را
بینند چون گرفته و داده به کشتکار
با حاکم آن کند که ازین پیش گفته شد
با قاضی این که عرض نمودم باختصار
چون من بفکر زرع خودم می‌نمیدهد
جائی بمن که گل دمد آنجا ورای خار
هر جا که شوره بوم بود یا طلی ز ریگ
گوید صلائیا برو آنجا تو نیل کار
امسال اگر ثمر ندهد سال دیگر این
چندان بر آورد که ندانی حساب پار
در ضمن ریشخند چنین گویدم که میر
همکان سار کرته دایم بلی چهار (کذا)
میرجیوخدا کسوں کہ آو دیوان کہ کہتہ‌جا
اس برس دن تہی موہ کو بندکوں اوار
این قلتبان، زن به کرا، می کند خیال
کز وی خورم فریب به این گفت‌واین گذار
ای اهل درک جرم نیست ار بیان کنم
قبح فعال این همج دزد نابکار
تا خانه اش خراب کند عدل بیدرنگ
ز انسان که کس نه بیند اثر زان بروزگار
اظهار میکنم سخنی گرچه می‌کشند
نقصان ایمه هم چو بر افروزم این شرار
این قلتبان مرتد بدبخت روسیاه
کآزار دم عبث کشم ازوی کنون دمار
آمد زمان آنکه به قتلش بر آورم
بی دهشتانه من ز میان تیغ آبدار
قتلش سزاست زانکه به اهل سخن کند
این قسم بی ملاحظه تمهید گیر و دار

حقا کہ گر ضرور نبودی نکردمی
آزار طبع و رنجہ نمی کرد می فگار

لعنت بر آن خسیس کہ از سل دیگری
خواهد کند مضائقہ چون لہوہ هرزہ کار

یاران ز روی لطف بہ این ابتر سفیہ
گویند نکتہ کہ ازین شیوہ شرم دار

ورنہ فغان بہ درگہ شاهجہان برم
فرخندہ ارجمند جہانگیر شہریار

پس آنچہ کردہ است درین سلک بی حساب
تقریر آن کند قلمم رهن انتشار

اول زمین فوتی آن مقربی کہ او
کردہ باسم سامی او محضر استوار

محصول آن زمین بہ شراکت کنند صرف
با وارثان آن حیل اندوز مردہ پار

ز افعال دیگرش چو کنم شمہ بیان
واجب بہ قتل باشد و لایق بہ تفت و تار

این دزد بی ملاحظہ را هیچ شرم نیست
از قبح فعل خویش بر اهل اعتبار

خواهم کہ عدل حضرت نواب سازدش
سر از بدن جدا و تن آویزدش ز دار

تا خائنان دهر بگیرند عبرتی
زو در فضای عرصہ این نیلگون حصار

خواهم کہ عنقریب برآرند ازو بکین
مستحفظان ملک جہانگیر شہ دمار

وانگہ ز بہر تجزیہ دیگران برند
مالش بہ لوت زادہ و پسرش سوی تتار

گوبند نے جب یہ تجاویز اپنے لیے شاہ سخن کی عدالت سے سنی ہوں گی تو خدا

جانے اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی ۔ لیکن ہم جو حضرت آغا کے ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف ہیں ، جانتے ہیں کہ اس تمام آتش باری ، قتل و کشت اور داروگیر سے حضرت میر جیو کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ پٹیل موصوف ذرا رعب میں آ کر ان کی حسب منشا کام کر دے ۔ جہانگیر کے پاس جانا اور گوبند کی قلعی کھولنا تو محض گیدڑ بھبکی ہے ، مراد صرف اتنی ہے کہ لوگ اسے سمجھا دیں ، جو اس شعر سے صاف مترشح ہے :

یاران ز روی لطف باین ابتر سفیہ
گویند نکتۂ کہ ازین شیوہ شرم دار

اور ہمیں قطعی یقین ہے کہ حضرت آغا کا جادو ضرور کارگر ثابت ہوا ہوگا اور گوبند مذکور کو آغا سے مصالحت کرتے ہی بنی ہوگی ۔

اقتباس ذیل میں جہانگیر پادشاہ سے عرض ہے :

سی سال شد کہ این ملک کردم وطن کم و بیش
اما نبود طبعم ہرگز بہ اخذ مائل

بر درگہ شہنشاہ اکبر کہ باد بخشش
فیروز بر اعادی ، مفتاح بر مشاکل

بودم ز اہل خدمت عمری کہ برد قسمت
سوی طواف کعبہ بختم ازین مراحل

از دولت عطایش وجہی معیشتی بود
از دست رنج سعیم در کیسۂ مداخل

بعد از مراجعت ہم دست تصرفم داشت
فی‌الجملہ خود قلیلی کان شد بہ بحر واصل

چون گشت واقف حال صدر حمیدہ اطوار
معروض خدمتت داشت عالم بہ صد دلایل

احسان کام بخشت بعد از شنیدن آن
صد بیگۂ زمین کرد رزق مرا مکفّل

ہندوی بخشی الملکی (کذا) آنرا تغیر دادہ
بعد از قریب نہ ماہ کش بندہ مردہ حاصل

این شیوه را چه نامند یا رب میان اعیان
در پیشگاه دولت مستوفیان کامل

قولم خلاف نبود زیرا که شاهد حال
صدر رفیع قدریست کت هست در مقابل

صد روپیه گرفته دیوان بخشی الملک
زان کس که کرده امرش فرمان تو مسجّل

این بنده چون نداده رشوت کنون نشسته
حسرت قرین امید مایوس از عوامل

قید عیال مندی گر باعثم نمی بود
هرگز رقم نمی کرد کلکم خود این رسایل

خود از حسب نگویم امانسب ز چغتای
دارم مرا ندانی از جنس هر ارازل

ای قدوهٔ مروت داری روا که گردم
نومید از عطایت با صد جهان غم دل

حاشا که باز گردد رزق عطا نموده
از مستحق چون من احسان چون تو باذل

این بر بدیع باشد از صاحب کرامت
پس خواستن چو اطفال انعام را رسایل

اسی زمین کے سلسلے میں ایک اور قصیدے سے جو میرزا ابوالقاسم کی تعریف میں ہے ، اشعار ذیل ملتے ہیں :

ارض انعامی که جودش زان سر افرازم نمود
بهر قبضش چند خود را خستهٔ خست کنم
من که دایم باج گیرم از کهان و از مهان
کی دهم رشوت که تا چک نامهٔ حجت کنم

اقتباس از مثنوی مشتمل بر حالات مصنّف :

ز نه صد فزون بود پنجاه و پنج
ز هجرت که شد مامنم این سپنج

چو پرداختم جای از تخت مهد
شدم همچو اجداد والی عهد

پدر را که از من روان شاد باد
در تربیت بر رخم بر کشاد

بمکتب چو کردم الف یا تمام
گل نظم کلکم بر آورد نام

وطن بود در اسفراین مرا
قضا ساخت دور از اقارن مرا

چو زد عمر از بیست بالا قدم
به سیّاحی افراخت سعیم علم

به نیروی تقدیر و قسم نصیب
ز ایران بهند اوفتادم غریب

در آن کشور بی مروت نهاد
همه حاصل سعی دادم بباد

چو از عمر چل سال شد بیش و کم
شد از هند سعیم بطوف حرم

ز نه صد نود بود و نه در حساب
که گشتم ز طوف حرم کامیاب

در آن کشور خلد پیکر دو سال
کم و بیش بودم بری از ملال

دگر باره آبشخورم شد دلیل
چو آدم بهند اوفتادم ذلیل

دل پر ز حسرت لب پر ز آه
مقر کرد سعی آن زمین سیاه

سراپای آن ملک را سربسر
بگشتم بکردم مکرّر سفر
چو از رخت آمد بہ پرداختم
بہ گجرات آخر وطن ساختم

قطعہ ذیل میں بھی تقریباً یہی حالات دہرائے گئے ہیں :

بہ سال نہ صد و پنجاه و پنج از هجرت
ز شهر بند عدم آمدم بہ ملک وجود
بود مقام تولد بہ ساحل مرغاب
ولیک نشو و نمایم بہ اسفراین بود
چرا کہ آن وطن اصلی پدر بودم
قضا بہ آن سبیم سیر آن وطن فرمود
چو سال نہ صد و هشتاد و یک شد از تاریخ
هوای هند عنان دلم ز کف بر بود
ولی بهند نشد حاصل آنچہ دل میخواست
مکرر ارچہ نشیب و فراز او پیمود
کشید رخت تمنا بزورق تعجیل
دل شکستہ بپابوس قبلۂ مقصود
بہ نہ صد و نود و نہ بروز عید ضحیٰ
بروی کعبۂ امید بخت دیده شود
سواد اسودش آنسان بیامدم بہ نظم
کہ نور مهر و مہ اندر برابرش ننمود
هزار شکر کہ این دولتم میسر شد
کہ سعی بخت جبینم بخاک آن در سود
بیادگار ز من گر نماند فرزندی
کہ جانشین بودم چون جهان کنم پدرود
ولی باین دل خود شاد میکنم کہ بدهر
نمرده آن کہ سرایند گفتہ اش بسرود

☆ ☆ ☆

مولانا ابوالبرکات منیر لاہوری

(از اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۶ع)

'سرو آزاد' میں آزاد بلگرامی نے ان کے حالات حسب ذیل دیے ہیں :

''منیر ، ابوالبرکات لاهوری بن عبدالمجید[1] ملتانی ، صاحبِ طبعِ منیر و نظم و نثر دلپذیر است ۔ در منشآت خود گوید 'من بی خانمان کہ در قلم رو سخن وطن گزیدہ ام صد هزار بیت بلند بنیاد نہادہ ام' ۔ منثورات او و شرحی کہ بر قصاید عرفی شیرازی نوشتہ ، متداول است ۔ مولد و منشای منیر دارالسلطنت لاهور است ۔ در عهد شاهجهانی اول با میرزا صفی ، مخاطب بہ سیف خان ، ناظمِ الہ آباد بسر می‌برد ۔ این سیف خان داماد میرزا ابوالحسن مخاطب بہ آصف خان بن میرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ طهرانی جهانگیری است و بعد ازان منیر با اعتقاد خان ، حاکم جونپور ، پسر خورد اعتمادالدولہ مذکور ، مربوط گشت و از خوان احسان او زلہ برداشت ۔ و هفتم رجب سنہ اربع و خمسین و الف (۱۰۵۴ھ) در مستقرالخلافت اکبر آباد رخت حیات بر بست ۔ نعش او را بہ لاهور نقل کردہ زیر خاک سپردند ۔''[2]

یہ وہ مختصر حالات ہیں جو عام طور پر منیر کے سوانح حیات کے متعلق ملتے ہیں ۔ سطورِ ذیل میں ایسی اطلاع جو زیادہ تر 'بہارِ سخن' محمد صالح اور 'انشاے منیر'

۱۔ آزاد اور شیر خان لودھی دونوں ان کا نام عبدالمجید ملتانی بیان کرتے ہیں ۔ لیکن محمد صالح ، جو منیر کا قریبی رشتہ دار ہے ، عبدالجلیل ابن حافظ ابواسحٰق لاہوری بیان کرتا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

۲۔ مآثرالکرام (سرو آزاد) ، صفحہ ۶۰ ، حیدر آباد ، سنہ ۱۹۱۳ع ۔ (مرتب)

سے حاصل کی گئی ہے ، اور عام طور پر معلوم بھی نہیں ہے ، ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے ۔ یہ واضح رہے کہ محمد صالح رشتے میں منیر کا برادر ہونے کے علاوہ اس کا معتقد اور دوست بھی ہے اس لیے اس کی معلومات منیر کے سوانح حیات کے متعلق بے حد قابلِ وثوق اور معتبر مانی جا سکتی ہے ۔

محمد صالح کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا منیر کے والد کا نام عبدالجلیل ابن حافظ ابو اسحٰق ہے جو لاہور کے رہنے والے تھے اور فنِ خوش نویسی میں تمام ہندوستان میں مشہور تھے ۔ جلال الدین اکبر بادشاہ کے درباری خوش نویسوں کے زمرے میں ملازم تھے ۔ ''اکبر نامہ' کے مسودات انھی بزرگ نے ابوالفضل کے سامنے بیٹھ کر سب سے پیشتر تسوید کیے ہیں ۔ آخری عمر میں لاہور — اپنے وطن — آ کر خانہ نشین بن گئے ۔ ان کو استادوں کے مشکل اشعار کے حل کرنے اور ان کے معنی بیان کرنے کا بہت شوق تھا ۔ ابوالبرکات کے سوا ان کے دو اور فرزند تھے ؛ ایک ابوالفیض جن کا تخلص فیض تھا اور دوستوں میں حسب رسم عصری 'فیضا' کے نام سے مشہور تھے ۔ ایک دیوان یادگار چھوڑا ۔ خط نستعلیق نہایت پاکیزہ لکھتے تھے اور اعلیٰ پایے کے شعر فہم تھے ۔ تمام عمر لاہور میں رہے ، اربابِ دول سے مطلق سروکار نہ رکھا ، نہ کسی کی ملازمت کی ۔ درویشانہ وضع اور گوشۂ قناعت میں زندگی گزار دی ۔ سنہ ۱۰۷۰ھ میں اس دار فانی سے رحلت کی ۔ دوسرے ابوالفتح ، ان کا تخلص ضمیر تھا ۔ مشکل قافیوں اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آمائی کرتے تھے ۔ آغازِ شباب میں بنگالے گئے اور اپنے بڑے بھائی منیر کے ساتھ رہے ۔ بعد میں بھائی سے ناراض ہو کر غالباً شہزادہ شجاع کے ملازمین میں داخل ہو گئے ۔ چنانچہ منیر ایک رقعے میں لکھتے ہیں ''بالجملہ بی وجہ از من رو گردانیدہ بہ ہیچ صورت ما فی الضمیر خود را اظہار نہ کرد و اکنون در حلقۂ بگوشان شہزادۂ کامگار درآمدہ است ۔''

ضمیر بنگالے میں وفات پاتے ہیں ۔

مولانا منیر چہار شنبے کے دن ۱۲ - رمضان المبارک سنہ ۱۰۱۹ ہجری کو شہر لاہور میں پیدا ہوئے ۔ ابوالبرکات نام رکھا گیا ۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بٹھائے گئے ۔ طبیعت بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف راغب تھی اس لیے استادوں کے اکثر اشعار حفظ کر لیا کرتے تھے ۔ لوگ ان کی یادداشت اور قوتِ حافظہ پر عش عش کرتے تھے ۔ چودہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے ۔ فلکی ، سنائی اور

انوری کی تقلید کرتے ۔ منیر تخلص رکھ لیا ۔ اس عمر کے کلام میں چونکہ خامیاں موجود تھیں اور معترض اعتراض کرتے تھے اس لیے اس کا بیشتر حصہ ، جو پندرہ ہزار اشعار پر شامل تھا ، بعد میں بالکل منسوخ کر دیا اور دیوان سے نکال ڈالا ۔ اگرچہ ان کے دوستوں کی بیاضوں میں اس کا کچھ حصّہ محفوظ رہ گیا ۔ موجودہ کلیات میں کم و بیش پچاس ہزار اشعار ہیں جو ابتدائی عمر کے کلام سے علاوہ ہیں ۔ اس کے سوا کسی قدر حصّہ کلام ایسا بھی تھا جو متاخرین کی طرز سے مختلف تھا ، اور مولانا منیر بہ وجہ شہرت اس کو برباد نہیں کر سکتے اس لیے ضروری حک و اصلاح کے بعد اس کو درست کر دیا ۔

۱۰۴۵ھ میں مولانا ابوالبرکات اکبر آباد گئے اور سیف خان کے ملازم بن گئے ۔ رقعات کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیف خان کے ہاں ان کی تنخواہ دو سو بیس روپیہ ماہوار تھی ۔ یہ میرزا صفی خلف امانت خان ہیں ۔ ان کی زوجہ ، ملکہ بانو ، آصف خان یمین الدولہ کی بڑی صاحبزادی اور ممتاز محل کی بڑی بہن ہیں ۔ میرزا صفی عہد جہانگیری میں صوبۂ گجرات کی دیوانی پر ممتاز تھے اور گجرات شہزادہ خرم (شاہجہان) کی جاگیر میں تھا ۔ جب شاہجہان نے بغاوت کی اور حوالیِ دہلی میں جنگ ہوئی ، میرزا صفی نے بادشاہ کی نمک حلالی کے خیال سے موقع پا کر قلعہ احمد آباد پر قبضہ کر لیا ۔ شاہجہان ان ایام میں مانڈو میں مقیم تھا ۔ اس نے قلعے کی استرداد کے لیے عبداللہ خان کو بھیجا لیکن اس کو شکست ملی ۔ اس حسن خدمت پر جہانگیر نے میرزا صفی کو سہ ہزاری و دو ہزاری منصب اور خطاب 'سیف خاں' عطا کیا اور صوبہ دار گجرات مقرر کر دیا ۔ سیف خاں نے جس میدان میں فتح پائی تھی وہاں ایک باغ تعمیر کیا جس کا نام 'جنت باڑی' رکھا ۔ جہانگیر کی وفات پر سیف خاں شاہجہاں کے حکم سے نظر بند کر لیے گئے مگر ممتاز محل کی سفارش پر ان کا قصور معاف ہوگیا اور بہار کے صوبہ‌دار بنا دیے گئے ۔ سال پنجم جلوس شاہجہانی میں الہ آباد کے صوبہ دار بنے اور سال ہشتم میں گجرات بھیج دیے گئے ۔ وہاں سے اکبر آباد تبدیل ہو گئے ۔ بارھویں سال جلوس شاہجہانی میں ، جب صوبہ داریٔ بنگالہ شاہ شجاع کو عنایت ہوئی ، چونکہ شہزادہ مذکور کابل میں تھا اس لیے سیف خان کو حکم ہوا کہ شہزادے کی آمد تک اس ملک کا انتظام کریں اور شہزادے کے پہنچنے پر اس ملک

کے نگران رہیں کیونکہ شہزادہ نوجوان ہے ۔ سیف خان سال سیزدہم جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۴۹ھ میں ملک بنگالہ میں انتقال کرتے ہیں ۔

جن ایام میں مولانا منیر اکبر آباد پہنچے ہیں ، سیف خاں ان دنوں اکبر آباد کے صوبہ دار تھے ۔ ان کی مجلس اہل ِ کمال کا مجمع تھی ۔ ان میں سے بعض کا ذکر خود مولانا منیر نے اپنے رقعات میں کیا ہے : مثلاً (۱) مولانا نسیمی ، جو ایک مشتاق اور ماہر شاعر تھے ۔ ان کا کلام تخیل کی بلند آہنگی اور شیرینی الفاظ میں ممتاز تھا ۔ (۲) مولانا جلال ، جنھوں نے تازہ گوئی کا از سر ِ نو احیا کیا ۔ (۳) مولانا کلامی ، جو ایک نکتہ شناس اور لطیفہ سنج شاعر تھے ۔ ان کے لطائف و ظرائف مشہور تھے ۔ (۴) مولانا بدیہی ، جو بد یہہ گوئی اور ظرافت میں بے نظیر تھے ۔

ان باکمالوں نے منیر کو ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ سیف خان نے قدردانی کی اور ان کا زمانہ خان کی صحبت میں نہایت شادمانی اور فارغ البالی سے گزرنے لگا ۔ جب خان موصوف بنگالے گئے ، منیر بھی سیف خان کے ساتھ بنگالے پہنچ گئے ۔ یہاں منیر نے اپنی مثنوی ''مظہر ِ گل'' بنگالے کے میووں کی تعریف میں اور ''کارستان سلاطین'' مشرق کے حالات میں تالیف کیں ۔ ابھی بنگالے پہنچے مشکل سے ایک سال گزرا ہوگا کہ ۱۰۴۹ھ میں سیف خان کی وفات کا واقعہ پیش آیا ۔ اس واقعۂ ہوش ربا نے ان کے درباریوں کا شیرازۂ جمعیت منتشر کر دیا ۔ بعض شہزادہ شاہ شجاع کے درباریوں میں شامل ہو گئے ۔ مولانا جلال اور مولانا نسیمی بہار کی طرف روانہ ہو گئے ۔ مولانا منیر ان ایام میں راج محل میں مقیم تھے ۔ شہزادہ شاہ شجاع نے طلب کیا لیکن نہ گئے ۔ راج محل سے اٹھ کر سیدھے پٹنے آ کر دم لیا ۔ یہاں شائستہ خان نے آؤ بھگت کی اور اپنے پاس رکھنا چاہا لیکن انھوں نے ملازمت سے انکار کر دیا ۔ جونپور میں اپنے دوست مولانا ابوالبقا کی کشش انھیں الہ آباد کھینچ لائی ۔ یہاں آ کر ابوالبقا کو خط لکھا کہ چونکہ مجھ کو تم سے ملنے اور تمھاری صحبت میں وقت گزارنے کی آرزو ہے اس لیے اگر کوئی ایسی صورت ہو جائے کہ اعتقاد خاں پروانہ بھیج کر مجھ کو بلوا لیں تو بہت مناسب ہوگا ۔ چنانچہ مولانا کے اصل الفاظ حسب ِ ذیل ہیں :

''دانش پژوہا در محلی کہ در راج محل بودم ناصیہ سای آن والا مجلس ، رتبہ سنج روزگار ، شاہزادۂ کامگار خواستند کہ من بندہ را بپایۂ بندگی

خویش رسانیده سرفراز سازم ۔ ازان جا کہ خیال دیگر در سر داشتم ، بحکم سرنوشت سر از حظ پذیرائی پیچیدم و طومار جادہ را یک قلم در نوشتہ بہ سواد خطۂ پٹنہ رسیدم ۔ چند روز دران شہر مقام کردم و در گوشہ جاگرفتم ۔ ہرچند دمسازان خان بلند آوازہ ، شائستہ خان زمزمۂ مدعا بگوشم رسانیدند ۔ چون من بی نوا را آہنگ دیگر بود ، ناشنیدہ انگاشتم و ازان دیار مانند نغمہ از تار بیرون آمدم ۔ اکنون بخطہ فیض (لباس اللہ باس) رسیدم ۔ اگرچہ فرخی اخترم مقتضی آنست کہ مہر نواب سپہر کوکبہ شجاعت خان کار این ذرہ را فروغی بخشد اما من بی آب می خواہم کہ اگر آبخورد باشد از فیض صحبت آن بحر پیمای سخن آب رفتہ بجوی آرزو باز آرم ۔ ازین رہگزر دلم از صحبت آشنایان دیگر آب نمی خورد و بی اختیار طبعم بہ شہر جونپور گرایش میکند ۔ اگر بیمن دل گرمی آن گرم آشنای سخن ، پروانۂ شمع دودۂ اقبال چمن ، چراغ انجمن اجلال ، نواب خرد مآب ، نور جبین معانی تاب ، چراغ فیض جاودانی ، مجلس افروز اہلِ خرد ، اعتقاد خان بطلب من بندہ رسد ، و پرتو التفات ازان پروانہ روشن گردد ، پروانہ وار پرواز کنان راہ را در نوردم و باہزاران شوق سرگرم رہ نوردی گشتہ ، از گرمی ہای صحبت احباب ، افسردہ دماغی خویش را چارہ سازم و در حلقۂ اعتقاد پرستان در آمدہ حلقۂ بندگی در گوش جان اندزام ۔''

اعتقاد خان نے پروانۂ طلبی ان کے نام جاری کر دیا اور مولانا بہ خیریت جونپور پہنچ گئے ۔ چار روپیہ روزانہ مشاہرہ مقرر ہوا ۔ چنانچہ مولانا اپنے رقعات میں فرماتے ہیں :

''چون صاحب جوہر شناس سیف‌اللہ خان تغمدہ‌اللہ بغفرانہ ، قطع علایق جسمانی کرد و با روحانیان دمسازی گرفت پروانۂ نواب خرد مآب اعتقاد خان کہ شمع انجمن اقبال است و چراغ دودمان اجلال ، مانند ہمای سعادت بر فرق من بندہ سایہ انداخت ۔ بہ رہنمونی توفیق بخطۂ جونپور رسیدم و بیاوری بخت در انجمن آن خورشید ضمیر راہ یافتم ۔ آن والا درجہ از مہر ، نسبت باین ذرہ ، دقیقہ فروگذاشت نکرد و نخستین فرزند آبای علوی را بعدد اخشیجان وجہ یومیہ بندہ مقرر فرمودہ ۔''

باوجودیکہ مولانا اپنی خواہش سے جونپور آئے تھے لیکن خلافِ امید یہاں ان کا دل نہ لگا۔ نہ اعتقاد خاں کا سلوک ان کے ساتھ قابلِ ستائش تھا۔ ان کی تنخواہ ایک سو بیس ماہوار سے ایک سو پانچ ماہوار کر دی گئی۔ مولانا نے ایک رقعے میں اس کی شکایت کی :

''ہمانا کہ فلک تنگ چشم ، کہ جان‌گزای خرد وران دانش سگال است ، نتوانست دید کہ مواجب رهی با عمر طبعی انسان در عدد مساوی باشد ناچار از صد و بیست بصد و پنج انجامید و درین معنی این قطعہ از زبان قلم بیرون تراوید۔

قطعہ

ای کہ هست از جود و بخشش ماہ و سال
گوهر انشانی و زر ریزی فنت
وجہ ماہِ بندہ حیرانم چرا
گشت کم چون سال عمر دشمنت''

ادھر تنخواہ کی وصولی میں دقتیں پیش آتی تھیں۔ خان کے دفتر کے آدمی اکثر اوقات تساہل اور تجاہل سے کام لیتے اور مولانا کو بار بار دفتر میں آ کر تقاضا کرنا پڑتا اور وہ متوجہ نہ ہوتے۔ الغرض ان باتوں سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور جونپور کو خیر باد کہہ کر آگرہ آ گئے۔ تقدیر نے اس مرتبہ یاوری کی اور مولانا اس منصب پر فائز ہو گئے جس کے ہر طرح سے وہ مستحق تھے ، یعنی دربار شاہی کے شعراء کے زمرے میں داخل ہوگئے۔

۱۰۵۰ھ میں انھوں نے اپنے رقعات کا مجموعہ شائع کیا جس میں بعض خطوط ، جو ابتدا میں ملتے ہیں ، سیف خان کے لیے لکھے گئے ہیں۔ باقی اکثر خطوط ان کے اپنے ہیں جو انھوں نے اپنے دوستوں اور خوانین کے نام لکھے ہیں۔ مولانا کے واقعات زندگی پر یہ رقعات کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۰۵۲ھ میں شعرائے ہند کے حالات میں ایک تذکرہ لکھا۔ یہ رمضان کا مبارک مہینہ تھا اور خاص فیضان کا زمانہ۔ مولانا تمام شب بیدار رہتے اور اس تذکرے پر کام کرتے۔ اکثر حصہ اسی ماہ میں ختم ہوگیا۔ رمضان کے بعد

جب اس پر نظرثانی کی تو اس میں بعض خامیاں اور بے ربطیاں نظر آئیں لیکن چونکہ درِ فیضانِ باطن اب بند ہو چکا تھا اس لیے اس کی اصلاح کسی اور وقت پر موقوف رکھی ۔ رمضان ۱۰۵۰ھ میں پھر تذکرے کو ہاتھ لگایا ، ضروری اصلاح کی اور تذکرے کو ختم کر دیا ۔ صرف دیباچہ لکھنا باقی رہ گیا تھا ۔ اس کمی کو محمد صالح نے ۱۰۷۰ھ میں پورا کر دیا ، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تذکرہ آج بالکل مفقود ہے ۔ انھوں نے اسی زمانے میں قصائد عرفی کی ایک مفید شرح بھی لکھی ہے جو غالباً ناتمام ہے ۔ 'بہار سخن' میں محمد صالح نے اس پر ایک دیباچہ لکھا ہے ۔ یہ شرح مولانا کے ایک معتقد نے ۱۰۷۵ھ میں محمد صالح کو لا کر دی تھی ۔

مولانا منیر ، عرفی کی طرح عین عالم جوانی میں ، جب کہ چھتیسویں سال کا دسواں مہینہ طے کر رہے تھے ، رجب ۱۰۵۵ھ میں انتقال کرتے ہیں ۔ ان کے کلام اور تصنیفات کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا ہے ۔ مولانا کے پسماندگان میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان کے کلام کو جمع کرتا ۔ ان کے بھائیوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی ۔ ان کی نظم و نثر پر تبصرہ آئندہ کسی قسط میں ناظرین کے پیش کر دیا جائے گا ۔

☆ ☆ ☆

ضمائم

ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب

(شمس العلما عبدالغنی کا تازہ علمی کارنامہ)

از پروفیسر محمد ابراہیم ڈار ایم - اے ، یوسف اسماعیل کالج اندھیری

(مطبوعہ ''اورینٹل کالج میگزین ، بابت ماہ اگست و نومبر سنہ ۱۹۳۸ء و فروری ، مئی ، اگست و نومبر سنہ ۱۹۳۹ع)

علامہ شیرانی مرحوم نے اپنی عالمانہ تحقیقات سے اردو اور فارسی ادب اور تاریخ میں گراں قدر اضافے کیے ہیں - اس میں شبہہ نہیں کہ اپنے قیام انگلستان کے دوران میں بھی وہ علمی مشاغل میں منہمک رہے - چنانچہ جس قابلیت سے انہوں نے ڈاکٹر سٹبز (Stubbs) کی کتاب Rise and Progress of Mahometanism لنڈن سے سنہ ۱۹۱۱ع میں شائع کی اور اس کے ساتھ ایک محققانہ ضمیمہ شامل کیا - اس سے ان کے شاندار علمی مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے - یہ بھی سچ ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنے محترم دوست شیخ عبدالقادر کے رسالہ 'مخزن' کے لیے نظم اور نثر میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ، تاہم امر واقع یہ ہے کہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں وہ صرف اس وقت روشناس ہوئے ، جب رسالہ 'اردو' میں فردوسی پر ان کے عالمانہ مقالے شائع ہوئے - ایک زمانے سے یہ بات مشہور چلی آ رہی تھی کہ فردوسی نے سلطان محمود کی وعدہ خلافی سے بد دل ہو کر اپنے غیظ و غضب کا اظہار اُن اشعار میں کیا جو محمود کی ہجو کے نام سے مشہور ہیں - جس طریقے سے ان اشعار کی تعداد میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے ، وہ حیرت انگیز ہے - نظامی عروضی ان اشعار کی تعداد صرف چھ بتاتا ہے - اس کی رائے میں باقی اشعار ضائع کر دیے گئے تھے لیکن موجودہ ہجو تقریباً سو ابیات پر مشتمل ہے - شیرانی صاحب نے روایت اور درایت کے اصولوں کی کسوٹی پر ان اشعار کو پرکھ کر یہ حقیقت واضح کی کہ ان میں سے بعض اشعار

خود 'شاہنامہ' یا دوسری کتابوں سے لیے گئے ہیں اور متعدد اشعار سرے سے موضوع اور جعلی ہیں - جس طرح ہجو کے اشعار فردوسی کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اسی طرح مثنوی ''یوسف و زلیخا'' کا بھی اسے مالک ٹھہرایا گیا ہے - شیرانی صاحب نے داخلی اور خارجی شواہد کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ مثنوی فردوسی کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اس کے بعد کے زمانے کی تصنیف ہے - بدیع الزمان اپنی تالیف 'سخن و سخنوران' (جلد اول ، صفحہ ۴۰) میں فردوسی کی مثنوی 'یوسف و زلیخا' کا ذکر کر کے اس کے سست اور دل ناپزیر ہونے کے شکوہ سنج ہیں اور نہایت حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ کاش یہ مثنوی فردوسی کی تصنیف نہ ہو - کاش انھیں اس بات کا علم ہوتا کہ ایک ہندوستانی محقق اصل حقیقت کا سراغ لگا چکا ہے اور بہ‌دلائل واضح کر چکا ہے کہ اس مثنوی کو فردوسی کی طرف منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں - ڈاکٹر رضا زادہ شفق بھی اس بارے میں بعض فضلا کے تشکک کا ذکر کرتے ہوئے ''تاریخ ادبیات ایران'' (طہران ، ۱۳۲۱ ، صفحہ ۹۷) میں رقم‌طراز ہیں کہ حال ہی میں ایک عالم کو مثنوی 'یوسف و زلیخا' کا ایک ایسا نسخہ ہاتھ لگا ہے ، جس کے مقدمے کے اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مثنوی کا مصنف فردوسی نہیں بلکہ کوئی اور شاعر ہے اور یہ مثنوی سلطان ملک شاہ سلجوق (۴۶۵ تا ۴۸۵ ہجری) کے زمانے میں اس کے بھائی طغان شاہ بن الپ ارسلان کے نام پر لکھی گئی ہے -

جب فردوسی پر شیرانی صاحب کے عالمانہ مقالے شائع ہوئے اور لوگوں کو ان کے محقق اور ناقد ہونے کا علم ہوا تو قدرتی طور پر بعض علمی حلقوں نے ان کی خداداد قابلیت اور علمی تبحّر سے استفادہ کرنے کی کوشش کی - اسی قسم کی ایک کوشش وہ تھی جس کا نتیجہ آج ہم 'تنقید شعرالعجم' کی صورت میں دیکھتے ہیں - جیسا کہ شیرانی صاحب نے اس مجموعے کے دیباچے میں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے ، ان کا اس تنقید لکھنے میں بڑا مقصد تعمیری تھا نہ کہ تخریبی - چنانچہ انوری ، نظامی اور عطار کے متعلق انھوں نے بڑے قیمتی اور مفید اضافے کیے ہیں - برادر عزیز ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (اورینٹل کالج لاہور) نے شیرانی صاحب سے غزلیاتِ نظیری سبقاً سبقاً پڑھنے کا ذکر کرتے ہوئے استاد مرحوم کی اس محنت اور جانفشانی کی طرف اشارہ کیا ہے ، جس کے ساتھ وہ کتابوں کے متن کی تصحیح

کیا کرتے تھے ۔ مجھے بھی شیرانی صاحب سے قصائدِ انوری کے بعض مشکل اشعار کی شرح سننے کا فخر حاصل ہے ۔ سنہ ۱۹۴۰ع میں اپنے لاہور والے مکان واقع فلیمنگ روڈ پر مئی اور جون کی سخت تپش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ گھنٹوں انوری کے اشعار کی شرح دلکش انداز میں کیا کرتے ۔ جب میری چھٹیوں کا زمانہ ختم ہونے کو آیا تو انوری کے چند ایسے اشعار رہ گئے تھے جن پر شیرانی صاحب مزید غور و فکر کرنا ضروری سمجھتے تھے ۔ چنانچہ ان کے حسبِ ارشاد میں نے وہ اشعار ایک الگ کاغذ پر لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کر دیے اور خود بمبئی چل دیا ۔ کچھ مدت کے بعد شیرانی صاحب نے از راہِ کرم ان اشعار کی شرح لکھ کر میرے بمبئی کے پتے پر روانہ کی ۔ میرا ارادہ ہے کہ یہ شرح استفادۂ عام کی غرض سے شائع کرا دوں ۔ انوری کے سوانح اور شاعرانہ کمال پر جس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ شیرانی صاحب نے اظہار خیال کیا ہے ، وہ اپنی نظیر آپ ہے ۔ اگرچہ نظامی کے سلسلے میں بھی انھوں نے ہماری معلومات میں معتدبہ اضافہ کیا ہے لیکن ان کا ایک بڑا کارنامہ عطار کی مفروضہ اور جعلی تصنیفات پر بصیرت افروز تبصرہ ہے ۔ میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی ، جو زمانۂ حال میں ایران کے سب سے بڑے محقق شمار ہوتے ہیں ، اس مقدمے میں ، جو انھوں نے عطار کی 'تذکرۃ الاولیا' پر لکھا ہے ، 'لسان الغیب' کی سند پر ، جو عطار کی طرف منسوب کی جاتی ہے ، عطار کی سنی عقیدے سے بیزاری کا ذکر کرتے ہیں ۔ مولانا شبلی بھی میرزا قزوینی کی تقلید میں 'لسان الغیب' کو عطار کی اصلی تصنیف مان کر اس کے بعض اشعار 'شعرالعجم' میں نقل کرتے ہیں ۔ لیکن شیرانی صاحب قزوینی سے متاثر ہوئے بغیر عطار کی ان جعلی تصنیفات کا گہرا مطالعہ کر کے اپنی تحقیقات کا خلاصہ رسالۂ 'اردو' میں شائع کرتے ہیں ، جس کے ذریعے سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ ان تصنیفات میں سے اکثر کا مصنّف کوئی جعلی عطار ہے اور بعض ، اصلی مصنفوں کی بجائے ، شیخ عطار کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں ۔ سنہ ۱۹۴۴ع میں جب پروفیسر سعید نفیسی کی کتاب عطار کے حالات اور تصانیف پر اسمٰعیل کالج اندھیری (بمبئی) کی لائبریری میں مجھے پڑھنے کا موقع ملا تو یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ سعید نفیسی عطار کی طرف غلط طور پر منسوب کی ہوئی

کتابوں کے بارے میں اسی نتیجے پر پہنچے ہیں جہاں شیرانی صاحب برسوں پہلے پہنچ چکے ہیں ۔ جب شیرانی صاحب کے ارشاد کے مطابق میں نے اس کتاب کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں بھجوایا تو انھوں نے نفیسی کی تحقیقات کی بعض خامیوں کی طرف میری توجہ مبذول کرائی ۔ یہ موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے اچھا خاصا دلچسپ ہے اور اس پر ایک مستقل مقالہ درکار ہے ۔

'تنقید شعرالعجم' کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اُردو زبان کی تاریخ شیرانی صاحب کی توجہ کا مرکز بن گئی ۔ چنانچہ انھوں نے 'پنجاب میں اُردو' شائع کر کے اس زبان کے ساتھ دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تحقیق اور جستجو کی نئی راہ کھول دی ۔ شیرانی صاحب کا نظریہ اگرچہ بعض علما کے نزدیک قابلِ قبول نہ تھا ، تاہم ان کو شیرانی صاحب کی نکتہ رسی اور بلند نظری کا قائل ہونا پڑا ۔ بعد میں جب شیرانی صاحب کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں بطور لیکچرر عمل میں آیا تو وہ خود بھی اس مسئلے کے بعض پہلوؤں سے مطمئن نہ تھے ، اور چاہتے تھے کہ 'پنجاب میں اُردو' پر نظر ثانی کر کے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کریں لیکن ان کے دوسرے مشاغل کی وجہ سے یہ کام سرانجام نہ پا سکا ۔ سنہ ۱۹۲۸ع کے بعد ان کی توجہ زیادہ تر اردو زبان پر مرکوز ہوگئی ۔ چنانچہ ان کے متعدد مقالے اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوئے ۔ ضرورت ہے کہ اُردو زبان سے متعلق ان کے تمام مقالے کتابی صورت میں شائع کیے جائیں ۔ امید ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب اس کام کی طرف توجہ مبذول فرمائیں گے ۔ انجمن ترقی اُردو اس سے پہلے 'اصلی خالق باری' اور 'پرتھی راج راسا' شائع کر چکی ہے ۔ پہلی مرتبہ 'پنجاب میں اُردو' میں شیرانی صاحب نے امیر خسرو کی طرف 'خالق باری' کے انتساب پر چند وزنی اعتراضات کیے تھے ۔ پھر اپنے مضمون 'تنقید بر آبِ حیات' میں دوبارہ اس انتساب کے غلط ہونے پر دلائل پیش کیے ۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسا نسخہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوگئے جس سے یہ حقیقت کامل طور پر ثابت ہوگئی کہ 'خالق باری' امیر خسرو کی نہیں ، بلکہ کسی دوسرے خسرو کی تصنیف ہے ۔ گذشتہ صدی میں 'پرتھی راج راسا' اپنے مطالب کی دلکشی کی بنا پر ماہرین السنہ اور مؤرخین کے لیے دلچسپی اور کشش کا باعث بنی رہی ۔ چنانچہ ٹاڈ نے اپنی 'داستان راجستھان' کی بلند عمارت اسی بنیاد پر کھڑی کی ۔ عین اس وقت جب کہ راسا بعض مغربی علما کا دل موہ رہی تھی ،

بعض علمی حلقوں میں راسا کی داستانوں کو شبہہ کی نظر سے دیکھا گیا اور اس طرح اس کے موافق اور مخالف بہت سا مواد جمع ہو گیا ۔ اُردو زبان کی تاریخ کے سلسلے میں مولوی محمد حسین آزاد نے 'آبحیات' میں راسا کے بعض اشعار استشہاد کے طور پر نقل کر کے اس کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کر لیا ۔ شیرانی صاحب پہلے محقق تھے جنھوں نے اردو زبان میں راسا کے مضامین پر علمی اور لسانی اعتبار سے پورے استقصا اور جامعیت کے ساتھ تبصرہ کیا اور اس کی تاریخی قدر و قیمت کو ایک مبالغہ آمیز افسانہ بتایا ۔ اس تبصرے کے شائع کرنے سے چند سال پہلے شیرانی صاحب حکیم قدرت اللہ قاسم کا 'تذکرۂ مجموعۂ نغز' مرتب کر کے محمد حسین آزاد کے خلاف اس الزام کو غلط ثابت کر چکے تھے کہ آزاد نے 'آبِ حیات' میں بے بنیاد باتیں درج کی ہیں اور قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اڑائے ہیں ۔

اگرچہ سنہ ۱۹۲۸ع کے بعد ، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے ، شیرانی صاحب کی دل بستگی زیادہ تر اُردو کے ساتھ رہی تاہم کبھی کبھی وہ فارسی کی طرف بھی توجہ منعطف کیا کرتے تھے ۔ 'اوریئنٹل کالج میگزین' کے شمارہ فروری سنہ ۱۹۳۰ع میں ان کا ایک مقالہ 'شاہنامہ سے فردوسی کے حالات' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں اُنھوں نے 'شاہنامہ' سے متعلق بعض امور کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا کہ داستان منیژہ و بیژن سب سے پہلی داستان ہے جسے فردوسی نے منظوم کیا ۔ اسی طرح ایک ایرانی شاعر صلائی کے حالات اور کلام پر دلچسپ مضمون لکھا ، جو مختلف ملکوں میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد اکبر کے عہد میں کھنبایت کی بندرگاہ میں سکونت اختیار کر لیتا ہے لیکن یہاں بھی اس کا طالع اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ۔

بہادر ابن مظفر ، جسے شاعر ابن نتّوں کے نام سے یاد کرتا ہے ، کھنبایت پر حملہ کر دیتا ہے اور بے چارے شاعر کا تیس سال کا اندوختہ غارت ہو جاتا ہے ۔ ہندوستان کے اسلامی دور کی تاریخ کے ساتھ شیرانی صاحب کی دلچسپی حد سے بڑھی ہوئی تھی ۔ اسی وجہ سے جب علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب نے سلطان محمود غزنوی پر ایک کتاب شائع کی اور اس میں محمود کو ایک ڈاکو اور غارت گر ثابت کرنے کی کوشش کی تو شیرانی صاحب کو بہت رنج پہنچا ۔ چنانچہ

اس کا اظہار اُنھوں نے پروفیسر حبیب کی کتاب کے اُردو ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا ہے ۔ اُنھیں ہندوستانی اکیڈمی والوں سے شکایت ہے کہ وہ ہیرے اور کنکر اور موتی اور بوتھ میں امتیاز نہیں کر سکے اور محمود غزنوی پر ڈاکٹر محمد ناظم کی محققانہ کتاب کی موجودگی میں وہ حبیب صاحب کی کتاب کو ترجمے کے لیے پسند کرتے ہیں ۔

'خزائن الفتوح' میں امیر خسرو نے علاء الدین خلجی کی دکنی فتوحات کو نہایت ہی مشکل ، پُر تکلف اور رنگین پیرائے میں بیان کیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کا ایڈٹ کرنا کس درجے مشکل ہے ، اور اس کا ترجمہ اور بھی مشکل ہے ۔ لیکن پروفیسر حبیب ، جو اسی کتاب سے متعلق انگلستان میں بھی کام کر چکے تھے ، آگے بڑھے اور علی گڑھ یونیورسٹی کی ہسٹاریکل سوسائٹی کی جانب سے اس کا متن اور انگریزی ترجمہ شائع کر دیا ۔ شیرانی صاحب جو اس میدان کے مرد تھے ، اچھی طرح جانتے تھے کہ حبیب صاحب سے یہ کہاں زہ نہ ہو سکے گی ۔ چنانچہ جب اُنھوں نے انگریزی ترجمے کا مقابلہ اصل متن سے کیا تو ان کا اندیشہ درست نکلا اور اُنھوں نے ترجمے میں زبان ، تاریخ اور جغرافیے کی فاحش غلطیاں بتائیں ۔ ایک سطحی نظر سے دیکھنے والے کو یہ بات کھٹکے گی کہ آخر شیرانی صاحب نے اتنی ساری محنت کیوں گوارا کی لیکن وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں کتابوں کے معیار کو بلند کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اس قسم کی غلط کوششوں کا احتساب کیا جائے ورنہ ہر کہ و مہ کتابوں کا مرتّب بننے کے شوق میں علم کا خون روا رکھے گا اور ہمارا علمی معیار ، جو پہلے ہی بہت بلند نہیں ہے ، اور بھی پست ہو جائے گا ۔

سنہ ۱۹۳۸ع میں ڈاکٹر اقبال حسین ، لیکچرار پٹنہ کالج کی قابلِ قدر کتاب 'ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء' (از سنہ ۴۲۱ھ تا ۶۷۹ھ) کا شیرانی صاحب 'پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ''قدیم شعرائے ہند پر قلم اُٹھانا کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مترادف ہے اور ڈاکٹر اقبال حسین اس سنگلاخ اور بنجر زمین میں اپنی تیشہ زنی اور جگر کاوی پر مستحقِ مبارکباد ہیں ۔''

اس موضوع کے ساتھ جو دلچسپی شیرانی صاحب کو تھی اس کا لازمی تقاضا تھا کہ وہ کتاب کے بعض اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالیں جو مبہم یا غیر واضح رہ گئے

تھے - ایک مبسوط تبصرے کے آخر میں وہ مصنّف سے درخواست کرتے ہیں کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کرتے وقت وہ شیرانی صاحب کی گذارشات پر بھی غور کر لیں - شیرانی صاحب نے اپنے احباب اور شاگردوں سے اس موضوع پر کئی مضامین لکھوائے اور اورینٹل کالج میگزین لاہور میں پروفیسر آغا عبدالستار نے سلطان شمس الدین التتمش اور سلطان قباچہ کی علمی سرپرستی اور ان کے عہد کے شاعروں پر ایک سلسلۂ مضامین لکھا اور پروفیسر یٰسین خان نیازی نے اسی میگزین میں امیر خسرو کی 'مثنوی مفتاح' الفتوح شائع کی اور جمالی اور اس کے بیٹے گدائی پر مضمون لکھے -

امیر خسرو کے سوانح و تصنیفات پر ڈاکٹر وحید مرزا کے عالمانہ مقالے کے بھی شیرانی صاحب بہت معترف تھے - اس قسم کی مساعی کو شیرانی صاحب کے بہ نظر استحسان دیکھنے سے قدرتی طور پر ان سے یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ شمس العلماء محمد عبدالغنی کی کتاب 'مغلوں سے قبل ہندوستان میں فارسی ادب' کی دیدہ زیب طباعت ، اس کی ضخامت ، اس پر بعض اکابر ملک و قوم کی سند تصدیق اور پھر موضوع کی دل کشی سے متاثر ہو کر شمس العلماء کی محنت و جانفشانی پر تحسین کے پھول برسائیں گے - لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس تحسین کے بجائے وہ ایک ناقدانہ تبصرے میں کتاب کی خامیاں اس طرح چُن چُن کر پیش کرتے ہیں کہ شمس العلماء کی تحقیقات پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے . اور ان کی کتاب فاحش غلطیوں کی ایک کھتونی سے زیادہ درجے کی مستحق نہیں رہتی - اس سوال کا جواب کہ آخر شیرانی صاحب نے اتنا سخت محاسبہ کیوں روا رکھا ، ذیل کی سطور میں دیا جائے گا -

غالباً جولائی سنہ ۱۹۴۳ع میں برادر محترم پروفیسر نجیب اشرف ندوی (اسمٰعیل کالج بمبئی) کی عنایت سے مجھے شیرانی صاحب کا تبصرہ پڑھنے کا موقع ملا - اس کے پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر شمس العلماء عبدالغنی سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے میں نے شیرانی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کی تنقید سے جو کچھ شمس العلماء کے دل پر گذری ہوگی ، اس کو شمس العلماء ہی جان سکتے ہیں - اس کے جواب میں شیرانی صاحب نے لکھا کہ ''مجھ پر طعن کرنے سے پہلے کتاب کا مطالعہ کر لو - اگر میں کسی لائبریری کے نزدیک ہوتا تو یہ تنقید مضاعف ہوتی -''

اسی اثنا میں مخدومی ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن (پرنسپل اسمٰعیل کالج بمبئی) شمس العلما کی کتاب کا ایک نسخہ کالج کی لائبریری کے لیے منگوا چکے تھے۔ بڑے شوق سے میں نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا لیکن جوں جوں شمس العلما کے بیانات پر نظر پڑی، بادلِ ناخواستہ شیرانی صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا، چنانچہ ان کے تبصرے کے تتمّے کے طور پر اس کتاب سے متعلق میرا مضمون 'رسالہ اُردو' کے شمارہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ع میں شائع ہوا، جس کے آخر میں یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ آئندہ ایڈیشن میں دیدہ زیب طباعت کے ساتھ ساتھ یہ کتاب گہرے مطالعے اور تحقیقات کی آئینہ دار بھی ہوگی۔

تبصرہ شائع ہونے کے بعد ہی یہ آواز ہمارے کانوں میں پہنچی کہ شمس العلماء بہت سرگرمی اور مستعدی سے اس کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے بعض فاضل دوست اس خبر پر ایمان لانے کے لیے تیار نہ تھے، تاہم شمس العلماء کے لیے گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کا سوال درپیش تھا۔ اگر وہ خاموشی اختیار کرتے تو ان کی کتاب ناقص و ساقط الاعتبار ٹھہرتی اور اگر جواب دینے کی کوشش کرتے بھی تو ان صریح اور فاحش غلطیوں کی تاویل کہونکر پیش کرتے جو ان کی کتاب کا بدنما داغ ہیں۔ غرض شمس العلماء اسی تذبذب کے عالم میں تھے کہ سید حسن امام سابق مدیر رسالۂ "ندیم" (گیا) کے اصرارِ تمام نے انھیں اس فرض کی انجام دہی پر آمادہ کر لیا اور ان ہی کی ہمت افزائی سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ادارۂ 'معارف' سے خط و کتابت کے بعد یہ طے پایا کہ شمس العلماء کا جواب کتابی صورت میں معارف کے ضمیمے کے طور پر شائع کیا جائے۔ اس جواب کے نسخے غالباً ان تمام حضرات کی خدمت میں بھیجے گئے جنھیں اصل کتاب بطورِ ہدیہ دی گئی تھی۔ ان حضرات میں ہمارے مخدوم ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن بھی تھے۔ جب دسمبر سنہ ۱۹۴۵ع کے آخری ہفتے میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو ان کے پاس شمس العلماء کا جواب دیکھ کر میں نے اس کاپی کے لیے درخواست کی جسے ڈاکٹر صاحب نے از راہِ کرم شرف قبولیت بخشا۔ احمد آباد واپس پہنچ کر میں نے فوراً شیرانی صاحب سے دریافت کیا کہ کیا شمس العلماء کا جواب ان کے ملاحظے سے گزر چکا ہے یا نہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی ناسازیٔ طبیعت کے پیشِ نظر اپنی طرف سے شمس العلماء کے جواب کا جائزہ لینے کے لیے آمادگی ظاہر

کی ۔ شیرانی صاحب ٹونک سے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۷ ۔ جنوری سنہ ۱۹۴٦ع
میں فرماتے ہیں :

''شمس العلماء کا تبصرہ میں نے نہیں دیکھا ۔ اگر آپ بھیج دیں گے تو
میں دیکھ لوں گا ، لیکن میری یہ حالت نہیں کہ جواب دے سکوں
. . . بیماری نے بالکل گھلا دیا ہے ، بے حد ضعیف ہو چکا ہوں ، مجھ
میں اور قبر میں بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے ۔ اگر آپ جواب کی ضرورت
سمجھتے ہیں تو جواب دے دیجیے لیکن چھپوائیے گا کہاں ؟ میرے خیال
میں 'اُردو' ہی مناسب رہے گا ۔ اشاعت سے پیش‌تر اگر ایک نظر وہ جواب
مجھے بھی دکھا دیں تو ممنون ہوں گا ۔ ممکن ہے کہ میں کوئی مشورہ بھی
دے سکوں ۔

یاد رہے کہ شمس العلماء کے 'النکتی' مہمل کو بامعنی بنانے کے لیے میں
نے اس کا استخراج 'نکتہ' سے کیا تھا ۔ ڈاکٹر صدیقی نے ان ہی دنوں
مجھے لکھا نکت یا النکت یاقوت کے ہاں سمرقند کے قریب کسی قصبے
کا نام ہے ۔ بہرحال آپ یاقوت سے اس کی تصدیق کر لیں اور میری
یادداشت پر نہ جائیں ۔ یہ بھی یاد رہے کہ زبان اور لہجہ نرم اور مناسب
ہونے چاہییں ۔''

شیرانی صاحب کے حسب الارشاد شمس العلماء کا جواب ان کی خدمت میں
ارسال کر دیا گیا ۔ اب ہر روز میں شیرانی صاحب کی ہدایت کا انتظار کر رہا تھا
کہ ناگہاں ۲۰ ۔ فروری سنہ ۱۹۴٦ع کو ٹونک سے ان کے انتقال پُر ملال کی
اطلاع ملی ۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ شیرانی صاحب بستر مرگ
پر لیٹے لیٹے شمس العلماء کے جواب کا مطالعہ کر سکے یا نہیں ۔ خدا کرے کہ یہ
ان کے ملاحظے سے نہ گزرا ہو ۔ اس کا لہجہ بعض مقامات پر سخت دل آزار واقع
ہوا ہے ۔ اگر شمس العلماء کی تحریر استادِ مرحوم کی نظر سے گزر چکی ہے تو میں
ان کی روح سے سخت نادم ہوں کہ ان کی زندگی کے آخری لمحات میں نادانستہ طور
پر میں ان کی ذہنی کوفت کا باعث ہوا ۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ، شمس العلماء کی توجہ جوابِ تبصرہ کی
طرف سب سے پہلے سید حسن امام نے مبذول کرائی اور ان کو باصرار تمام اس
فرض کی انجام دہی پر آمادہ کیا ۔ جوابِ تبصرہ کے پہلے تیرہ صفحے ہی دیکھ کر

سید موصوف شمس العلماء کو لکھتے ہیں :

''ماشاء اللہ قیاس سے بڑھ کر کامیاب جوابات ہیں ، خدا کرے آیندہ بھی یہی حال ہو ۔''

چونکہ یہ جواب سید حسن امام کی تحریک سے شروع کیا گیا تھا ، شمس العلماء کے بھائی حکیم محمد عبدالباقی ندوی ، جو اس جواب کے ناشر ہیں ، سید صاحب کے شکر گزار ہیں کہ ان کے ذریعے سے یہ ضروری ادبی خدمت عمل میں آئی ۔ حکیم صاحب کی رائے میں :

''یہ جواب نہایت دلچسپ اور امید سے بڑھ کر کامیاب رہا اور علمی میدان کے مسافروں کے لیے ایک ہموار شاہراہ بن گئی جو سلامت روی کی ضامن ہے ۔''

بے چارے سید حسن امام اور حکیم عبدالباقی کو اس بات کا علم نہیں کہ شمس العلماء کے جوابات نے ان کے علم و فضل کی حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے ۔ خیر ان حضرات کو تو شاید اس بنا پر معذور قرار دیا جائے کہ فارسی زبان اور ادب کی تاریخ سے وہ کماحقّہٗ واقف نہیں ہیں لیکن سید ریاست علی ندوی جیسے عالم کے لیے ، جنھوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے خط و کتابت کے فرائض انجام دیے ، یہ عذر کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے ۔ ان کی رائے بھی جوابِ تبصرہ کے بارے میں سننے کے لائق ہے ۔ اپنے خط مورخہ ۷- ستمبر سنہ ۱۹۴۴ع میں لکھتے ہیں :

''آپ کا پُر لطف جواب نقد قسط وار پہنچتا رہا ۔ آپ نے سطر بہ سطر جواب دینے میں غیر معمولی زحمت اٹھائی اور خشک مضمون کو اپنے پیرایۂ بیان سے اس قدر دلچسپ اور دلآویز بنا دیا کہ ایسے خشک اعتراض و جواب پر ایسی دلچسپ تحریر کم نظر سے گزری ہے ۔''

یہاں جواب کے محض پُر لطف ہونے کا ذکر ہے اور لیجیے ، اپنے دوسرے خط مورخہ ۱۷- ستمبر سنہ ۱۹۴۶ع میں شمس العلماء کی تحریر کی معقولیت پر یہ کہہ کر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں کہ ''آپ کی یہ تحریر نہایت معقول ہے ۔''

آئیے دیکھیں اس بیان میں صداقت کس قدر ہے ۔

پیشتر اس کے کہ شمس العلماء کے ارشادات کی معقولیت سے بحث کی جائے ، یہ

نہایت ضروری ہے کہ ان کی تحریر کے بعض اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے جائیں تا کہ انھیں بھی شمس العلماء کے لہجے اور زبان کی نرمی کا اندازہ ہو جائے ۔ اپنے جواب میں شمس العلماء نے کئی جگہ مرحوم شیرانی صاحب پر چھینٹے اڑائے ہیں ۔ بار بار ان کے انگریزی عبارت کے ترجمے میں سقم دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے اور کہیں انھیں بصیرت سے محروم قرار دیا ہے ۔ چند اقتباسات درج ذیل ہیں :۔

جوابِ تبصرہ صفحہ ۴۶ :

''مبصّر نے اصل انگریزی کا مفہوم نہیں سمجھا جیسا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی جگہ لغزش کھا چکے ہیں ۔''

صفحہ ۴۹ : ''لیکن مبصّر نے انگریزی کے اقوال قلم بند کرنے میں بہت بے احتیاطی سے کام لیا ہے اور مصنّف کی انگریزی عبارت کے مفہوم کو دیانت کے ساتھ پیش نہیں کیا ۔ یا تو مبصّر پہلے کی طرح انگریزی کا صحیح ترجمہ نہیں کر سکے یا یہ کہ انھوں نے ترجمے کو اپنے نظریے کے مطابق کر کے ایسے الفاظ میں پیش کیا ہے جس سے مصنّف کا مفہومِ عبارت بدل گیا ۔''

صفحہ ۴۶ : ''لیکن وہ سیاہی جو مبصّر کے ذہن میں سمائی ہے اور جس کے اظہار کی وہ مصنّف کو تاکید فرما رہے ہیں وہ حنا سے نہیں تارکول سے ہوتی ہے ۔''

صفحہ ۶۸ : ''مصنّف کی عبارت میں لفظ آج (Today) موجود نہیں جو مبصر کا جعلی مستزاد ہے ۔''

صفحہ ۸۶ : ''تخریب کار دونان و تعمیر کار ہوشمندان است ۔''

صفحہ ۱۱۲ : ''حق و باطل کی جنگ میں حق غالب ہو کر رہے گا ۔''

ان چند اقتباسات سے ناظرین شمس العلماء کے لب و لہجے کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔ غالباً شمس العلماء جیسا ہی کوئی حاجی ہوگا جس کی خوش خلقی سے تنگ آ کر شیخ شیراز کو کہنا پڑا تھا ۔ ع :

که رحمت بر اخلاق حجّاج باد

جن حضرات نے شیرانی صاحب کا ناقدانہ تبصرہ پڑھا ہے وہ یقیناً شمس العلماء کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے ان کے اس شدید غیظ و غضب کے لیے

انہیں معذور سمجھیں گے ۔ اس لیے کہ اس تبصرے کے بعد اہلِ ذوق کے نزدیک اصل کتاب کی قدر و قیمت بہت کم رہ جاتی ہے ۔ اس بات کا پتا لگانا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شیرانی صاحب کے تبصرے سے خود مصنف کے ذہن پر کیا کیفیت طاری ہوئی ۔ شمس العلماء ایک عجیب ذہنی کیفیت میں مبتلا ہیں ۔ ایک طرف ایسی شدید اور صریح غلطیاں موجود ہیں کہ انہیں تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ۔ دوسری طرف کتاب کی علمی قدر و قیمت محل نظر ہے ۔ ایسے صبر آزما حالات کا مقابلہ کیا جائے تو کیوں کر ؟ شمس العلماء بڑی کشمکش کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اپنی غلطیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ شیرانی صاحب کے بیانات کی تردید اس زور سے کی جائے کہ سادہ دل پڑھنے والے اس سے متاثر ہو جائیں ۔ شمس العلماء یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مبصر کے اعتراضات سے قطعاً مرعوب نہیں ہیں اور چونکہ انہیں شیرانی صاحب کے تبصرے سے پبلک میں غلط فہمی پھیلنے اور صحیح علمی ذوق کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لیے وہ جوابِ تبصرہ لکھنے کے لیے تیار ہوگئے ہیں :

''تا کہ ارباب حل و عقد (کذا) مبصّر کے اعتراضات اور ان کے بالمقابل مصنّف کے جوابات کو پڑھ کر صحیح فیصلہ کر سکیں ۔''

لیکن جواب تبصرہ کے لکھے جانے کا اصلی سبب وہ ہے جسے شمس العلماء کے بھائی حکیم محمد عبد الباقی نے 'عرض ناشر' میں بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ ''صاحب تبصرہ نے درحقیقت اپنی تمام امکانی کوشش سے اعتراضات کا کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا جو ان کے نزدیک مصنّف کی کتاب کو قاری کی نظر میں ناقص و ناکارہ ثابت کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کرتا ۔'' درحقیقت یہ کتاب کے 'ناقص و ناکارہ' ٹھہرنے کا اندیشہ ہے جس نے شمس العلماء کو جواب لکھنے پر مجبور کر دیا ہے ۔ شمس العلماء کبھی تو مبصّر کی عظیم الشان کاوش اور جد و جہد کو ''کوہ کندن و کاہ بر آوردن'' کے برابر سمجھتے ہیں اور کبھی اس بات کا اعتراف بھی کر لیتے ہیں کہ ان کی کتاب کے لیے ''مبصّر کا تبصرہ ایک حد تک نفع بخش ثابت ہوا'' اور ''مبصّر نے اپنے تتمۂ تبصرہ کے ذیل میں جو کچھ ضروری مواد اور مزید قابل ذکر مصنفین و شعراء کے نام پیش کیے ہیں ، وہ سب مصنف کو قبول و منظور ہیں'' اور ان کے نزدیک مبصّر کا یہ قول کہ ''جس قدر کام پروفیسر نے کیا ہے اس سے کہیں زیادہ چھوڑ گئے ہیں'' حقیقت

پر مبنی ہے ، لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں افسوس اس امر کا ہے کہ ''تبصرے کے ۱۰۳ صفحات میں سے تقریباً ایک سو صفحات محض خیال آرائیوں اور صحیح کو غلط ٹھہرانے اور ذاتی نقطۂ نظر کی غیر ضروری تبلیغ اور اس کو معیار جائزہ قرار دے کر اسی کے مطابق مصنّف کو اصلاحات کرنے کا مشورہ دینے سے رنگے ہوئے ہیں ۔'' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خود شمس العلماء کی کتاب کے صفحات ان تمام خیال آرائیوں سے پُر ہیں اور انھوں نے بعض فرضی اور بے بنیاد چیزوں کی تبلیغ اپنے لیے فرض قرار دی ہے ۔

اگرچہ شمس العلماء کی اصل کتاب میں قارئین کی ضیافت طبع کے لیے کافی سامان موجود ہے ، تاہم ان فروگذاشتوں کے سلسلے میں نادانستگی کا عذر پیش کیا جا سکتا ہے اور ایک غیر جانبدار اور انصاف پسند شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ غلطیاں نا واقفیت کی بنا پر ہیں اور ان میں نیت اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ، لیکن جوابِ تبصرہ محض غلط اور لاطائل چیزوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس میں لا علمی اور ناواقفیت سے کہیں زیادہ قابلِ اعتراض لفظی اور معنوی تحریف ہے ، جس سے جا بجا کام لیا گیا ہے ۔ محض جواب کی خاطر بعض چیزیں گھڑ لی گئی ہیں یا بعض حقائق سے انکار کر دیا گیا ہے ۔ مثلاً شیرانی صاحب نے عنصری کی مثنوی 'وامق و عذرا' کے چند شعر اس عکس سے ، جو حضرۃ الاستاذ پرنسپل محمد شفیع صاحب مدظلہ نے اگست سنہ ۱۹۳۷ع کے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا ہے ، اپنے تبصرے میں نقل کیے ۔ پہلا شعر یوں درج ہے :

جوانی خردمند مادرش مرده بود
پدر نیز دیگر زنی کرده بود

وزن اور بحر کے لحاظ سے یہاں 'مند' زائد معلوم ہوتا ہے لیکن عکس میں وہ صاف موجود ہے ۔ شیرانی صاحب امر کے سامنے علامتِ استفہام ڈالنا بھول گئے ۔ اگر شمس العلماء اس بھول کی طرف اشارہ کر دیتے تو بات ہر ایک کی سمجھ میں آ سکتی تھی ، لیکن انھوں نے یہ غضب کیا کہ لکھنؤ کے کسی کتاب خانے سے اس مثنوی کا ایک فرضی نسخہ ، جس میں پہلا مصرع بغیر سکتہ واقع ہوئے وزن صحیح کے ساتھ اس طرح تحریر ہے :

''جوانی نژند مادرش مرده بود''

کیا کوئی شخص، جسے عروض سے ذرا بھی مس ہے، شمس العلماء کے نقل کردہ مصرع کے وزن کو صحیح کہہ سکتا ہے؟ دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں شمس العلماء نے جو اصلاح کی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ فرماتے ہیں کہ لکھنؤی نسخے میں یوں درج ہے:

زنی۔ بدگہر معشقولیاش نام

ان کے نزدیک یہ تبصرے کے نقل شدہ مصرع:

زنی بدکنش معشقولیہ نام

سے بہتر ہے۔ ہمیں شمس العلماء کی نیک نیتی پر شبہہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، تاہم اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر ہم ان سے یہ درخواست کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں اس خوش قسمت کتاب خانے کے نام سے مطلع کریں جہاں سے انہیں عنصری کی مثنوی 'وامق و عذرا' کا نسخہ ملا ہے اور اس کے چند ابتدائی اشعار نقل کر کے اہلِ علم کو ممنون فرمائیں۔ جس طرح یہاں ایک موہوم چیز کو موجود بنا کر پیش کیا گیا ہے اسی طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے متعلق 'فرشتہ' کے اس قول کے بارے میں کہ ''تولد او در بلدۂ سجستان بودہ'' ایک موجود چیز سے اس بنا پر انکار کر دیا گیا ہے کہ ''فرشتہ کا جو نسخہ مصنّف کے پاس ہے اس میں مبصر کی منقول عبارت موجود نہیں۔'' خدا جانے شمس العلماء کے پاس فرشتہ کا کون سا نسخہ ہے جس میں یہ عبارت غائب ہے۔ اگر شمس العلماء خفا نہ ہوں تو ہم ان کے مملوکہ نسخے کا سراغ لگانے کی کوشش کریں؟ اپنے جواب میں تین چار جگہ انہوں نے فرشتہ کا حوالہ دیا ہے۔ صفحہ ۱۷ پر جلد اول، صفحہ ۱۸ کا، صفحہ ۵۰ پر جلد اول، صفحہ ۲۸ کا، صفحہ ۶۰ پر جلد اول، صفحہ ۲۳ کا، صفحہ ۱۰۱ پر جلد اول، صفحہ ۸۲ کا اور صفحہ ۱۱۱ پر جلد اول صفحہ ۵۷ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اگر ہم ان مندرجات کا مقابلہ فرشتہ کے نولکشوری ایڈیشن سے کریں تو یہ تمام بیانات ان ہی صفحات پر پائے جاتے ہیں جن کا حوالہ شمس العلماء کے جواب میں دیا گیا ہے۔ اس تطابق کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شمس العلماء کے پاس نولکشوری ایڈیشن ہونا چاہیے اور اگر انہیں اب بھی انکار ہو تو ایڈیشن کا سال بتلا دیں تاکہ ہم نیازمند فرشتہ کے یہ الفاظ اس میں سے بھی ڈھونڈ کر ان کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

شمس العلماء نے اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی عجیب و غریب ترکیبیں وضع کی ہیں - عام طور پر وہ سہوِ نظر یا لغزشِ قلم کہہ کر ان کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں - ان کے نزدیک ''صرف معدودے چند اغلاط مندرج تبصرہ'' ہیں جن کی اصلاح غلط نامہ' جدید میں کر دی گئی ہے - حالانکہ چالیس کے قریب تو ایسی غلطیاں ہیں جن کو انھوں نے اپنے جواب میں تسلیم کیا ہے ، تیس کے قریب ایسی غلطیاں ہیں جن کی طرف انھوں نے اشارہ تک نہیں کیا ، اور پھر کئی ایسی غلطیاں بھی ہیں جن کو انھوں نے مختلف تاویلوں سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - تعجب ہے کہ سید ریاست علی جیسے فاضل کو شمس العلماء کی تحریر معقول نظر آئی ، حالانکہ یہ تحریر بقول ان کے کتنی ہی ''پر لطف اور دلچسپ'' کیوں نہ ہو ، کم از کم معقولیت سے معرّا ہے - اسے تو ادبیل تنزل مناظرہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ مکابرہ و مجادلہ کی نہایت بری مثال ہے - کسی چیز سے ناواقف ہونا کوئی عیب کی بات نہیں لیکن اپنی ناواقفیت پر بے جا اصرار ایک عالم کے شایان شان کیونکر ہو سکتا ہے - شمس العلماء نے اپنے جواب کے دوران میں بارہا اسی بے جا ضد کا مظاہرہ کیا ہے - شیرانی صاحب کی طرف غلط بیانات منسوب کیے گئے ہیں ، ان کے صاف اور صریح بیانات میں افسوس ناک تحریف کی گئی ہے - کہیں اصل سوال کے جواب سے پہلو تہی کی گئی ہے اور کئی بار اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے شمس العلماء اپنی حیثیت ایک ناقل کی سی قرار دیتے ہیں جسے نقد و درایت سے کوئی واسطہ نہیں اور جس کا کام بغیر تحقیق و تفتیش کے فقط نقل کرنا ہے - شمس العلماء کی کتاب کا ایک تاریک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات ان ہم عصر محققین کا ذکر نہیں کرتے جن کی تحقیقات سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں - حالانکہ ایک مصنف کے لیے اس قسم کا اعتراف بہت ضروری ہے -

اس مختصر تمہید کے بعد ہم مختلف عنوانات کے تحت شمس العلماء کے بیانات کا جائزہ لیں گے -

غلطی اور اس پر بے جا اصرار

جوابِ تبصرہ صفحہ ۱۰ : ''مصنّف نے افراسیاب کو ایران کا بادشاہ کب اور کس جگہ کہا ہے ؟ ایسا سمجھنا مبصّر کے فہم کا قصور ہے - مصنّف نے افراسیاب

کو صفحہ ۸ پر Persian King یعنی ایرانی یا عجمی الاصل بادشاہ کہا ہے ۔ مبصّر کو اگر اعتراض ہی کرنا تھا تو وہ افراسیاب کے سلسلۂ نسب کی کھوج لگا کر یہ کہتے کہ وہ ترکی الاصل ہے جو واقعی صحیح ہوتا مگر چوک گئے : ع

رسیدہ بود بلایی ولی بخیر گذشت ۔''

جب خود شمس العلماء کو تسلیم ہے کہ افراسیاب ترکی الاصل تھا ، پھر اسے ایرانی الاصل کہنا کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے ۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ توران کا بادشاہ تھا ، نہ کہ ایران کا ۔ غلطی سے افراسیاب کو ایرانی بادشاہ کہنا اور اس پر اصرار کرنا شمس العلماء کی صریح زبردستی ہے ۔

صفحہ ۱۰ : بَرزُوَیہ کو شمس العلماء نے اپنی کتاب میں بَرزَوَیہ لکھا تھا ۔ شیرانی صاحب نے اپنی تائید میں فردوسی کا یہ قول نقل کیا ہے :

پزشک سرانیدہ بَرزُوی بود
بہ پیری رسیدہ سخن گوی بود

بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے شمس العلماء کہتے ہیں کہ در حقیقت اس کے تلفظ میں اختلاف ہے اور فردوسی کی شہادت ان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ۔ کاش شمس العلماء اپنے بیان کی تائید میں کوئی حوالہ پیش کر کے یہ دعویٰ کرتے تو شاید مناسب ہوتا ۔ فردوسی کا قول تسلیم کرنے میں شمس العلماء کو اس بنا پر تامل ہے کہ نظم میں ضرورت شعری کے باعث تصرف کے لیے بہت گنجائش رہتی ہے ۔ خیر یوں ہی سہی ۔ ہم ''مجمل التواریخ والقصص[۱]'' کا ایک حوالہ درج کرتے ہیں جسے ملک الشعرا بہار نے اپنی 'سبک شناسی' کی جلد دوم (صفحہ ۱۲۷) میں نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ لفظ برزوی کا صحیح تلفظ متعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے :

''ازین پس فرستادن بُرزوی طبیب بود بہ ہندوستان تا آنجا بماند بمدتہا و پیرگشت و بحیلت کلیلہ و دمنہ بایران آورد پیش شاہ و در بُرزوی برزجمہر در آن افزود بفرمان شاہ تا رنج او ضائع نگردد . . . .''

۱۔ ملک الشعرا بہار کا بیان ہے کہ یہ کتاب ۵۲۰ھ میں تالیف ہوئی اور اس کا مؤلف جو اسد آباد ہمدان کا رہنے والا ، ہے امرای سلجوقی کی ملازمت میں کتابت اور ندیمی کے فرائض انجام دیتا تھا ۔

اس کے علاوہ کلیمان ہوار کی 'عربک[1] لٹریچر' میں Burzuya اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں 'کلیلہ و دمنہ' کے مضمون کے تحت Burzoe درج ہے ۔

صفحہ ۱۶ : برکست مفرد لفظ ہے یا مرکب ؟

شیخ سرجویہ کے فارسی جملے ''برگست من نہ گفتم آن پسر مناذر گفت'' میں جسے شمس العلماء نے کتاب الاغانی سے نقل کیا ہے ، وہ 'برکست' کو بہ تحریکِ مین مانتے ہیں اور اس کے معنی ''کسی کے متعلق'' لیتے ہیں ، حالانکہ 'برکست' خواہ کاف عربی ہو یا کاف عجمی ، ایک مفرد لفظ ہے جس کے معنی حاشا و معاذ اللہ ہیں ۔ بظاہر یہ اتنی آسان بات ہے کہ ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن شمس العلماء اس کو ماننے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں ۔ یہی نہیں کہ انھیں اپنی غلطی پر اصرار ہے بلکہ انھوں نے اپنی حمایت میں ایک زرین اصول بیان کیا ہے جو انھی کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے :

> ''جس نسخے سے عبارتِ بالا نقل کی گئی ہے اس میں برکست با کاف عربی ہے لہٰذا خواہ مخواہ اصلاح دے کر اس کو با کاف عجمی پڑھنا اور پھر اسی قرأت کے مطابق معنی پیدا کرنا مصنّف کے نزدیک دیانت سے بعید امر تھا ۔ مصنّف کے نزدیک ایسی تحریف قطعاً ناجائز ہے ۔ تا وقتیکہ کتابت کی کوئی ایسی فاحش غلطی یا نقص معنی نظر نہ آئے جو عبارت کو مہمل بنا دے ۔ یہی طریقہ محققینِ یورپ کا ہے ۔''

شمس العلماء کا اپنا بیان کیا کم زوردار تھا کہ وہ محققینِ یورپ کو بھی اس خارزار میں گھسیٹ لائے ۔ سب سے پہلی چیز جو ہماری توجہ کی مستحق ہے ، وہ ماخذ کا بزبان عربی ہونا ہے ۔ یہ فارسی جملہ 'کتاب الاغانی' سے نقل کیا گیا ہے ۔ عربی زبان کا ہر مبتدی بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ عربی میں کاف عجمی نہیں ہوتا لہٰذا شمس العلماء کا یہ کہنا کہ جس نسخے سے عبارتِ بالا نقل کی گئی ہے اس میں 'برکست' با کاف عربی ہے ، صرف غیر متعلق ہی نہیں نادرست بھی ہے ۔ پھر یہاں سوال کاف عجمی یا کاف عربی کا نہیں ۔ اسے 'برکست' پڑھیے یا 'برگست' بہرحال یہ ایک مفرد لفظ رہتا ہے جس کے معنی حاشا و معاذ اللہ ہیں ۔ چونکہ

۱۔ عربک لٹریچر ، صفحہ ۲۱۲ ۔

'الاغانی' میں برکست درج ہے ۔ شمس العلماء نے اس کے معنی ''کسی کے متعلق'' بتائے اور جب انھیں اس بات پر متنبہ کیا گیا تو انھوں نے کاف عربی کا سہارا ڈھونڈا جو کسی طرح بھی ان کے مفید مطلب نہیں ۔ شمس العلماء کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ کہیں ان کے بتائے ہوئے معنی مضحکہ خیز تو نہ بن جائیں گے کیونکہ یہ مرکب لفظ شمس العلماء کے ہاں ملے تو ملے، اور کسی جگہ نہ ملے گا ۔

'کتاب الاغانی' کا یہی جملہ جلال ھمائی نے اپنی تاریخ ادبیات[1] ایران میں نقل کیا ہے : ''برکست من نہ گفتم آن پسر مناذر گفت داءالمر من تحت'' اور حاشیہ فرہنگ برہان جامع کے حوالے سے اس کے معنی 'خدا نکند و معاذ اللہ' دیتے ہیں ۔

صفحہ ۱۹ : ابوالعباس اسفرائنی ، نصر بن احمد سامانی کے دربار کا میر منشی تھا ؟

سلطان محمود غزنوی کے وزیر فضل بن احمد اسفرائنی (متوفی ۴۰۴ھ) کے سلسلے میں شمس العلماء لکھتے ہیں کہ پہلے وہ نصر بن احمد سامانی کے دربار کا میر منشی تھا اور بعد میں سبکتگین کا وزیر بنا ۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں ، اس لیے کہ اسفرائنی نہ نصر بن احمد سامانی متوفی ۳۳۱ھ کا میر منشی تھا اور نہ ہی کبھی سبکتگین کا وزیر بنا ۔

تذکرۂ سلاطین آل غزنین میں بھی ، جو ایک گمنام کتاب ہے اور جس سے شمس العلماء اکثر استشہاد کرتے ہیں ، کہیں نصر بن احمد سامانی کا مذکور نہیں ملتا ۔ وہ صرف امیر نصر کا ذکر کرتا ہے ۔ لیکن ہمارے شمس العلماء کا ذہن فوراً نصر بن احمد سامانی کی طرف منتقل ہوتا ہے اور وہ اس طویل زمانے کے فاصلے کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جو امیر نصر بن احمد اور ابوالعباس اسفرائنی کے درمیان حائل ہے ۔ جب شیرانی صاحب کے ٹوکنے پر شمس العلماء کو اپنی غلطی کا احساس ہوا بھی تو ذمہ داری سے یہ کہہ کر گریز کرتے ہیں کہ العهدة علی الراوی ۔ لیکن چونکہ اس تاویل سے ان کا اپنا دل بھی مطمئن نہیں اس لیے فرماتے ہیں کہ ممکن ہے امیر نصر سے مراد امیر ناصر الدین سبکتگین ہو یا اس کا فرزند ہو جو امیر نصر کے مخصوص لقب سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اب اگر

۱۔ تاریخ ادبیات ایران ، جلد دوم ، صفحہ ۲۸۹ ۔

شمس العلماء نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہوتی تو وہ ان دور از کار تاویلات کی زحمت سے بچ جاتے - آج پہلی مرتبہ ہم ان سے یہ سن رہے ہیں کہ امیر نصر سے مراد امیر ناصرالدین سبکتگین بھی ہو سکتا ہے - نصر سبکتگین کے بیٹے کا نام ہے ، نہ کہ اس کا مخصوص لقب - 'زین الاخبار' کے صفحات ۶۰ ، ۶۳ اور ۷۹ پر امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین کا ذکر موجود ہے - اسی طرح عتبی کی تاریخ میں جو 'الیمینی' کے نام سے مشہور ہے ، صفحات ۱۶۸ و ۱۶۹ پر صاحب الجیش ابوالمظفر نصر بن ناصرالدین سبکتگین درج ہے - ابوالعباس اسفرائنی کے حالات کے لیے شمس العلماء کو عتبی کی تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا اور اگر یہ ممکن نہ تھا تو کم از کم ڈاکٹر محمد ناظم کی کتاب سلطان محمود کے متعلق ہی دیکھ لیتے - اسفرائنی کے بارے میں ان کو صحیح اطلاع مل جاتی -

صفحہ ۱۹ : کیا شاہنامہ کی تکمیل اسدی طوسی نے کی ؟

شمس العلماء کا یہ قول کہ 'ابوالعباس' نے 'شاہ نامے کی تصنیف کے واسطے فردوسی کی سفارش کی ، صحیح بنیاد پر قائم نہیں کیونکہ فردوسی محمود کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے سے اس کتاب پر مصروف تھا - چنانچہ :

سخن را نگہ داشتم سال بیست
بدان تا سزاوار این گنج کیست

ایک اور موقع پر کہا ہے :

همی گفتم این نامہ را چند گاہ
نہان بود از چشم خورشید و ماہ

البتہ شاہی دربار میں فردوسی کا تعارف ابوالعباس کے توسط سے ہوتا ہے - شیرانی صاحب کا یہ بیان بالکل واضح ہے - دربار شاہی میں آنے سے ایک عرصہ پیشتر سے فردوسی شاہنامہ کی تصنیف میں مصروف رہ چکا ہے - اس لیے یہ کہنا کہ ابوالعباس اسفرائنی نے اس کی تصنیف کے لیے سفارش کی ، کسی طرح صحیح نہیں - یہ ایک معمولی سی فروگذاشت تھی جسے شمس العلماء اگر نظر انداز کر دیتے تو بہت بہتر ہوتا - لیکن شمس العلماء چھوٹی غلطی سے بچنے کی بجائے بڑی غلطی کا مرتکب ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں اور 'شاہ نامے' کی تصنیف کے آغاز اور اختتام کے متعلق بحث چھیڑ دیتے ہیں جو ان کے بس کی بات نہیں ، اور اس سلسلے میں

دولت شاہ کی ضعیف روایت پر بھروسا کر کے اسدی طوسی سے فردوسی کی تکمیلِ شاہ نامہ کے لیے درخواست کو صحیح مانتے ہیں ، جسے اسدی منظور کر لیتا ہے اور ایک رات اور ایک دن میں تا نمازِ دیگر چار ہزار اشعار لکھ کر فردوسی کو سناتا ہے جو استاد کے کمال کی تعریف کرتا ہے ۔ اس روایت کی سخافت اور کمزوری اس درجہ عیاں ہے کہ شمس العلماء کا دل بھی اس پر مہر تصدیق لگانے کے لیے تیار نہیں ۔ چنانچہ وہ اس روایت اور قصے کو ضعیف اور مجہول ماننے پر رضامند ہوتے ہوئے بھی تذبذب کے عالم میں ہیں ۔ اس لیے کہ ''خاتمہ' شاہ نامہ ، جس کو اکابر مؤرخین نے اسدی طوسی کا کلام تسلیم کیا ہے ، آج بھی موجود ہے جس کی تکذیب نہیں کی جا سکتی ۔''

خدا جانے یہ کون سے اکابر مؤرخین ہیں جن کا نام تک شمس العلماء ہمیں نہیں بتاتے ۔ ہمارے خیال میں ان کا ماخذ تذکرۂ دولت شاہ ہے یا پھر وہی مجہول اور کم نام 'تذکرۂ سلاطینِ آلِ غزنین' جو خوش قسمتی سے ان کے کتاب خانے کی زینت ہے ۔ فرشتہ نے اس واقعے کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن اس کا بیان دولت شاہ کے بیان کی تقریباً لفظ بلفظ نقل ہے ۔ دولت شاہ[1] کے الفاظ یہ ہیں :

''و آن نظم از اول استیلائی عرب است بر عجم در آخر شاہ نامہ و آمدن مغیرہ بن شعبہ برسالت نزد یزدجرد شہریار و حرب سعد بن وقاص بملوک عجم و ختم شاہ نامہ و فضلا بر آنند کہ آنجا نظم فردوسی آخر شدہ و بنظم اسدی رسیدہ و ظاھرا بفراست معلوم می توان کرد ۔''

اگر شمس العلماء کی فراست اس بے سروپا قصے کی صحت کی قائل ہے تو ہو ورنہ موجودہ زمانے کے محقق اسے پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے ۔ پروفیسر سعید نفیسی ''احوال و اشعار رودکی'' کی جلد سوم (صفحہ ۱۳۰۷) میں لکھتے ہیں :

''پارہ ای از مولفان اسدی را استاد فردوسی دانستہ اند و بہمین جہت خاور شناسان اروپائی کوشیدہ اند ثابت کنند کہ دو اسدی بودہ اند یکی پدر کہ گویندہ مناظرات و استاد فردوسی باشد و دیگر پسر او کہ اسدی دوم و مولف گرشاسپ نامہ باشد ولی این نکتہ کاملاً باطل است و این

۱- تذکرۂ دولت شاہ ، طبع لاہور ، صفحہ ۱۶ ۔

که اسدی نامی استاد فردوسی بوده باشد به هیچ وجه اساس ندارد و یک اسدی طوسی بیشتر نبوده است که همه این آثار ازوست ۔''

ڈاکٹر رضا زادہ شفق[1] اسدی اول کا ذکر تک نہیں کرتے اور اسدی دوم کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے مناظرات چہارگانہ کا مصنف ٹھہراتے ہیں ۔

اس ضمن میں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ برون[2] جو اسدی کلاں اور اسدی صغیر کے علیحدہ وجود کے قائل ہیں ، اسدی کلاں کے خاتمہ شاہنامہ کے مصنف ہونے کے متعلق دولت شاہ کی روایت کو غلط اور بے معنی قرار دیتے ہیں ۔

مولانا شبلی جن کے پاکیزہ ذوق کا اعتراف ہر موافق اور مخالف کو ہے ، شعرالعجم کے حصہ اول[3] میں لکھتے ہیں :

''لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت محض فرضی اور غلط ہے ۔ نہ 'شاہ نامہ' ناتمام رہا تھا ، نہ اسدی فردوسی کا استاد تھا ۔ نہ اسدی فردوسی سے ایسی فرمائش کر سکتا تھا ۔ نہ ایک رات دن میں اسدی سے چار ہزار شعر لکھے جا سکتے تھے ۔''

بدیع الزمان 'سخن و سخنوران' کی جلد دوم کے صفحہ ۹۴ پر لکھتے ہیں :

''و استادی اسدی نسبت بفردوسی نغمہ' ناراستی است کہ از ساز دولت شاہ برآمدہ است ۔''

اسی طرح 'مجمع الفصحا' میں رضا قلی ہدایت اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں :

''بجہات چند خطاست ۔''

وہ کون سے اکابر مؤرخین ہیں جو خاتمہ' شاہ نامہ کو اسدی طوسی کا کلام تسلیم کرتے ہیں ؟

صفحہ ۲۲ : قصر شیرین کی شکستہ محراب پر فارسی شعر لکھا ہوا پایا گیا :

اپنی کتاب کے صفحہ ۸۱ پر شمس العلماء ، دولت شاہ کے حوالے سے

۱۔ تاریخ ادبیات ایران ، صفحہ ۱۳۱ ۔

۲۔ ایران کی ادبی تاریخ ، جلد دوم ، صفحہ ۱۴۸ و ۱۴۹ ۔

۳۔ شعر العجم (سنہ ۱۹۴۰ع) صفحہ ۱۸۲ ۔

فرماتے ہیں :

''فارسی شعر کی ایک اور اچھی مثال اس کتبے میں ملتی ہے جو قصر شیریں
کی شکستہ محراب پر لکھا ہوا تھا اور جس کا انکشاف عضدالدولہ دیلمی
کے زمانے میں ہوا ۔ یہ شعر بہرام گور کے زمانے سے بھی اقدم سمجھا
جاتا ہے :

هژبرا بگیهان انوشه بذی
جهان را بدیدار توشه بذی''

پیشتر اس کے کہ ہم اس بیان کی صحت اور عدم صحت کے متعلق کچھ عرض کریں ، یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ یہ بیان دولت شاہ کے بیان سے مختلف ہے ۔ دولت شاہ تو ابو طاہر خاتونی (مصنفِ مناقب الشعرا) کے حوالے سے یہ کہہ رہا ہے کہ ''عضدالدولہ دیلمی کے عہد میں جب کہ قصر شیریں جو خانقین کی نواحی میں ہے ، بالکل ویران نہ ہو چکا تھا ، اس کے کتابہ (کتبہ) میں یہ شعر لکھا ہوا پایا گیا جو فارسی قدیم کے دستور کے موافق ہے :

هژبرا بگیهان انوشه بذی
جهان را بدیدار توشه بذی

بنابرین تقدیر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے قبل بھی شعر کہتے تھے ۔''

شمس العلماء کا یہ ارشاد کہ یہ شعر بہرام گور کے زمانے سے بھی اقدم سمجھا جاتا ہے ، ان کا اپنا اضافہ ہے جس کے لیے ان کے پاس کوئی سند نہیں ۔ جب شیرانی صاحب نے یہی شعر معمولی لفظی تبدیلی کے ساتھ 'شاہ نامہ' میں لکھا ہوا بتایا :

بدو گفت شاپور انوشه بذی
جهان را بدیدار توشه بذی

تو شمس العلماء اپنی حیثیت محض ایک ناقل کی سی تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"مصنف نے اپنی اس اطلاع کا ماخذ نقل کر دیا ہے اورِ شعر کے متعلق
اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں کیا بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ صرف دوسروں
کا قول ہے جس کے اصل جواب دہ وہی رواۃ ہیں ۔''

قارئین خود انصاف فرمائیں کہ شمس العلماء کا یہ بیان کہاں تک درست ہے ۔

وہ قصر شیریں والے شعر کو عربوں کی فتح ایران سے قبل فارسی شعر کے ان چند نمونوں میں سے بتاتے ہیں جو زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں ۔ وہ کہیں ایک جگہ بھی تذبذب کا اظہار نہیں کرتے ۔ لیکن جب ان کی توجہ اس غلطی کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے تو نہایت دیدہ دلیری سے یہ کہہ کر اپنی براءت پیش کرتے ہیں کہ وہ اس کے جواب دہ نہیں بلکہ دولت شاہ وغیرہ ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود تھوڑی دور آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''فردوسی کا اس شعر کو تبرکاً نقل کرنا ہی اس کی قدامت کا ثبوت ہے ۔ شعر کی ترکیب اور زبان سے بھی اس کی قدامت صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے ۔''

یہ عجیب طرز استدلال ہے کہ ایک طرف تو اس بیان کی صحت کی ذمہ داری سے گریز کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف اسی کی سند پر یہ بے بنیاد دعویٰ بھی پیش کرتے ہیں کہ فردوسی نے اس شعر کو تبرکاً اپنے شاہ نامے میں نقل کیا ہے ۔

شیرانی صاحب کے تبصرے میں بہرام گور اور خسرو پرویز کا زمانہ بجائے عیسوی سنہ کے ہجری چھپ گیا تھا ۔ چنانچہ اس غلطی کی تصحیح جولائی سنہ ۱۹۴۳ع کے 'اردو' میں کر دی گئی تھی ۔ لیکن بھلا شمس العلماء اسے کیوں ملاحظہ فرمانے لگے ۔ انتہائی فخر و مسرت کے عالم میں لکھتے ہیں :

> ''مصنف تو آج تک ساسانی عہد کو نشر اسلام سے قبل کا زمانہ سمجھتا کرتا تھا مگر وہ اسلامی عہد میں نکلا اور بہرام گور و خسرو پرویز دونوں یکے بعد دیگرے غزنوی اور غوری عہد میں نکلے ۔ یک نشد دو شد ۔''

اگر شمس العلماء نے ذرا تحقیق کرنے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو ان کا یہ شادیانہ فتح بجانا قبل از وقت ٹھہرتا لیکن شمس العلماء سے اس قسم کی تحقیق کی توقع کرنا بے سود ہے ۔

صفحہ ۴۲ ۔ یاتکار زریران : شمس العلماء یاتکر زریران کو ایک پہلوی رجزیہ نظم بتاتے ہیں جس کے دوسرے نام پہلوی شاہ نامہ اور شاہ نامہ گشتاسپ ہیں ۔ اس کی تصنیف کی عزت زردشت کی طرف منسوب کی ہے ۔ فرماتے ہیں :

> ''قیاس میں آتا ہے کہ اس نظم نے پندرہ سو برس بعد شاہ نامہ نظم کرنے میں فردوسی کو محرک اور مثالیہ کا کام دیا ۔''

جب شیرانی صاحب نے کہا کہ یاتکار زریران نثر کی کتاب ہے ، نہ کہ نظم کی اور اس کا مصنف زردشت نہیں ، تو شمس العلماء بر افروختہ ہوگئے - پہلی شق یعنی 'یاتکار' کے رجزیہ نظم ہونے پر شمس العلماء کو اصرار ہے - بقول پروفیسر جیکسن یہ پہلوی تصنیف نظم کا قدیم ترین نمونہ ہے - ''یہ شاہ نامہ نثر میں نہیں تھا - مبصّر اگر اس کو اب تک نثر کی کتاب سمجھا کرتے تھے تو یہ محض ان کی ناسمجھی تھی -''

پروفیسر نولڈکہ کے مشہور مقالے Das Tranische Nationalepos کا انگریزی ترجمہ جو کاما اورینٹل انسٹیٹیوٹ بمبئی کی طرف سے شائع ہوا ہے ، ہمیں ایک فاضل پارسی دوست کی عنایت سے مل گیا ہے - یاتکار زریران کے متعلق نولڈکہ لکھتا ہے :

''پوری کتاب میں رزمیہ اسلوب نبھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں آنے والی رزمیہ کتابوں کے تمام حد سے بڑھے ہوئے مبالغے موجود ہیں - اگرچہ بظاہر یہ کتاب نظم میں نہیں لکھی گئی -''

اس پہلوی کتاب کا ترجمہ جرمن زبان میں گیگر (Geiger) نے ، گجراتی اور انگریزی میں شمس العلماء جیون جی مودی نے اور فارسی میں ملک الشعرا بہار نے کیا ہے - اس کا متن دوسرے رسالوں کے ساتھ ایک پارسی عالم جاماسپ جی دستور منوچہر جی جاماسپ اسانا نے بمبئی میں سنہ ۱۸۹۷ع میں شائع کیا ہے - سنہ ۱۸۹۹ع میں شمس العلماء مودی نے اس کا دوسرے دو پہلوی رسالوں کے ساتھ انگریزی اور گجراتی میں ترجمہ کیا - مودی ان تینوں کتابوں کو رسالے (Treatises) کہتے ہیں اور کہیں بھی ان کے نظم کا قدیم نمونہ ہونے کا ذکر نہیں کرتے - دیباچے میں 'یادگار زریران' کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس رسالے کا ترجمہ پروفیسر گیگر جرمن زبان میں مفید حواشی کے ساتھ کر چکا ہے - جلال ہمائی اپنی تاریخ ادبیات ایران[1] میں لکھتے ہیں :

''و دیگر از آثار نثر منسوب باین دورہ کتاب (کارنامہ اردشیر) و کتاب (یادگار زریران) است کہ اصل پہلوی آنہا بہمت بعض مستشرقین در قرن نوزدہم میلادی بطبع رسیدہ است -''

۱- جلد اول ، صفحہ ۲۵۰ -

شمس العلماء نے پروفیسر جیکسن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ 'یاتکار زریران' نظم کا قدیم ترین نمونہ ہے لیکن جیکسن کی کسی کتاب یا مقالے کا حوالہ نہیں دیا کہ ہم بھی اس کی تصدیق کر سکتے - جیکسن کی ایک کتاب Early Persian Poetry کے نام سے مشہور ہے - وہ انڈیکس (صفحہ ۱۲۵) میں 'یاتکار زریران' کو صاف طور پر (Pahlavi Prose Epic) 'پہلوی نثر کی رزمیہ کتاب' لکھتے ہیں - اس سے بھی زیادہ واضح ان کا وہ بیان ہے جو انھوں نے صفحہ ۸ کے نوٹ نمبر ۴ میں دیا ہے - وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ پہلوی کی موجودہ کتابوں میں ، جن میں یاتکار زریران اور کارنامک ارتخشیر پاپکان بھی شامل ہیں ، نظم تلاش کرنے کی کوششیں ابھی تک ناکام ثابت ہوئی ہیں[1] -

> "Attempts to find verse in the extant Pahlavi works, including the Yatkar-i-Zariran and the Karnamak-i-Artakhshir-i-Papakan have thus far proved unsuccessful. . ."

جیکسن کے اس صریح اور غیر مبہم بیان کے بعد شبہے کی گنجائش بہت کم رہتی ہے -

دوسری شق کے بارے میں شمس العلماء کی روش ناقابل فہم ہے - ایک طرف تو 'یادگار زریران' کو حضرت زردشت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور دوسری طرف اسے دوسروں کا قول بتاتے ہیں - اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ان کا فرض تھا کہ وہ کم از کم ایک دو محققوں کا نام تو لیتے جو یادگار کو حضرت زردشت کی تصنیف مانتے ہیں - اگر وہ اپنے قارئین کے لیے یہ معمولی اطلاع بھی فراہم نہیں کر سکتے تو صرف یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شمس العلماء کا اپنا قول ہے جس کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے وہ دوسروں کی پناہ لیتے ہیں ، لیکن ان کے نام بتانے سے یکسر قاصر ہیں - اب ایک دوسری حیثیت سے ہم شمس العلماء کے اس قول پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں - حضرت زردشت کی زبان اوستا کی زبان تھی - اور ان کے بہت بعد 'یادگار زریران' ساسانیوں کے عہد میں پہلوی زبان میں لکھی جاتی ہے - ایسے حالات میں شمس العلماء کے سوا کوئی دوسرا صاحب علم کیوں کر

۱- ایران کی قدیم شاعری ، صفحہ ۸ -

'یادگار زریران' کو حضرت زردشت کی طرف منسوب کرنے کی غلطی کر سکتا ہے ۔

تیسری شق سب سے زیادہ دلچسپ ہے ۔ شمس العلماء کا یہ دعوی کہ یہ یادگار زریران شاہ نامہ کی تصنیف کے لیے محرک ہوئی اور پندرہ سو برس کے بعد اسی کے نقش پر فردوسی نے اپنی تصنیف کی بنیاد ڈالی ، شاہ نامے کی تاریخ کے سلسلے میں ایک معرکہ آرا انکشاف ہے ۔ شمس اللعماء فرماتے ہیں :

''یاتکار زریران ایک ایسی نظم ہے جس میں ایرانی بہادروں کی شجاعت اور ان کے معبودوں کے محیرالعقول کارنامے درج ہیں (کاش شمس العلماء کی نظر سے یہ کتاب گزری ہوتی) ۔ فردوسی کے شاہ نامے کا بھی یہی موضوع ہے ، اس لیے یہ امر بعید از فہم نہیں ہے کہ اس نے شاہ نامے کی تیاری بالخصوص اس کے تاریخی مواد کی فراہمی میں جن قدیم کتب کا مطالعہ کیا ہوگا اس میں 'یاتکار زریران' کو بھی بڑا دخل ہوگا ۔ اس کا ایک محکم داخلی ثبوت یہ ہے کہ خود شاہنامے میں 'یاتکار زریران' کے واقعات بہ تفصیل منقول ہیں ۔ اگر فردوسی نے 'یاتکار زریران' کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو ایسا توارد نا ممکن تھا ۔''

'یادگار زریران' میں گشتاسپ کے بھائی زریر اور اس کے بیٹے بستور کی شجاعت بیان کی گئی ہے ۔ زریر لڑائی میں مارا جاتا ہے اور اس کا بیٹا بستور اپنے باپ کا انتقام لیتا ہے ۔ یہی داستان شاہ نامے میں بھی درج ہے اور دونوں روایتوں میں بہت حد تک مطابقت پائی جاتی ہے ۔ شاہ نامے کا یہ حصہ ، جیسا کہ شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں بتایا ہے ، دقیقی کا تصنیف کردہ ہے ۔ اگر 'یادگار زریران' کا کچھ اثر تسلیم بھی کیا جائے تو صرف اس حصے پر کیا جا سکتا ہے ۔ فردوسی اس سے کیونکر متاثر ہوتا ۔ اس کے لیے دقیقی کا شاہنامہ بہ طور نمونہ موجود تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دقیقی کو اپنا رہبر تسلیم کرتا ہے :

ہم او بود گوینده را راه بر

وارنر جس نے کئی جلدوں میں شاہ نامے کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے ، پانچویں جلد کے صفحہ ۲۴ - ۲۶ پر ان چیزوں کا ذکر کرتا ہے جو دقیقی کے نظم کردہ حصے اور 'یاتکار زریران' کے مندرجات میں مشترک ہیں، یا جن کے بارے میں دونوں کے بیان ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ اس کی رائے میں 'یاتکار زریران'

دقیقی کا اصلی ماخذ نہیں ہے ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

"It should be understood clearly that Yatkar-i-Zariran was not the actual authority followed by him but stands collaterally related to the version of the original affluent which, mingled with the Bastan Nama, passed after further vicissitudes and centuries later into his hands."

ان واضح تصریحات کی موجودگی میں شمس العلماء کا یہ دعوی کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ 'یاتکار زریران' نے پندرہ سو برس بعد شاہ نامہ نظم کرنے میں فردوسی کو محرّک اور مثالیہ کا کام دیا ۔

صفحہ ۶ : خدائی نامہ کا فارسی ترجمہ :

"اسے منصور اول کے لیے اس کے دربار کے منشی قضی ابو منصور بن عبدالرزاق معمری نے سنہ ۳۵۲ھ میں تیار کیا ۔"

شمس العلماء کے اس مختصر بیان میں چار غلطیاں پائی جاتی ہیں :

(۱) شاہ نامہ ابو منصوری ، خدائی نامہ کا فارسی ترجمہ نہیں بلکہ مستقل تصنیف ہے جس کے متعدد مآخذ تھے ۔

(۲) یہ شاہنامہ منصور اول کے لیے نہیں بلکہ ابو منصور بن عبدالرزاق حاکم طوس کے حکم سے تیار کیا گیا ۔

(۳) معمری کا نام ابو منصور المعمری ہے ، نہ کہ ابو منصور بن عبدالرزاق جیسا کہ شمس العلماء بغیر کسی سند کے لکھ رہے ہیں ۔

(۴) اس شاہ نامہ کی تالیف کی تاریخ سنہ ۳۴۶ھ ہے ، نہ کہ ۳۵۲ھ ۔

ان اغلاط میں سے نمبر ۳ اور ۴ شمس العلماء کو منظور ہیں ۔ نمبر ۲ کے متعلق ان کا یہ اعتراض ہے کہ یہ شاہ نامہ ابو منصور المعمری کے حکم سے برائے ابو منصور بن عبدالرزاق عمل میں آیا اور نمبر ۱ کے متعلق ان کا اصرار ہے کہ یہ خدائی نامہ کا ترجمہ ہے اور اپنے دعوے کی تائید میں براؤن کا یہ قول نقل کرتے ہیں :

"یہ عربی ترجمہ بڑی بدقسمتی ہے کہ دنیا سے ناپید ہو گیا ہے ، جیسا کہ فارسی نثر والا ترجمہ بھی ، جو بحکم ابو منصور المعمری برائے ابو منصور

بن عبدالرزاق عمل میں آیا تھا ۔"

اور اس دعوے کو اور زوردار بنانے کے لیے اسی مجہول تذکرۂ سلاطین آل غزنین سے یہ عبارت پیش کی جاتی ہے :

"و دانای کار ابو منصور المعمری از نیکو خواهی و درست کامی خواست که امیر منصور عبدالرزاق عامل طوس را یادگاری بماند پس مقرر کرد و فرمود . . . نامہ گرد آوردند و شاہ نامه نام کردند ۔"

اس کے مقابلے میں شیرانی صاحب نے خود دیباچۂ قدیم کی شہادت پیش کر کے بتایا کہ شاہنامۂ ابو منصوری ، خدائی نامہ کا فارسی ترجمہ نہیں بلکہ مستقل تصنیف ہے ۔ اور یہ شاہنامہ ابو منصور بن عبدالرزاق حاکم طوس کے حکم سے تیار کیا گیا ۔ شمس العلماء کے نزدیک یہ شہادت اگرچہ وقیع ہے ، تاہم قول فیصل نہیں ۔ اس لیے انھوں نے "ایک ایرانی اور ایک انگریز محقق کے اقوال پر زیادہ اعتماد کر کے دیباچہ کی سند کو نظر انداز کیا ہے جس کو مبصر نے صحیح طور پریشان حجت قرار دی (دیا) ہے ۔"

ناقص اور پریشان خیالی کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کہیں مل سکے ۔ دیباچۂ قدیم کی سند بقول شمس العلماء بھی وقیع ہے اور اسے شیرانی صاحب نے صحیح طور پر اپنی حجت بھی قرار دیا ہے ، تاہم وہ نظر انداز کیے جانے کی مستحق ہے ، محض اس بنا پر کہ مشہور مستشرق براؤن اس کے خلاف کچھ اور کہتے ہیں ۔ شمس العلماء کا یہ انوکھا طرز استدلال فقط حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ افسوس ناک بھی ہے ۔ آخر براؤن کے پاس وہ کون سے مآخذ ہیں جن کی بنا پر ان کے اقوال کو دیباچۂ قدیم کی سند پر ترجیح دی جائے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سند کی رو سے پروفیسر براؤن کا قول غلط ٹھہرتا ہے ۔ ہم یہاں دیباچۂ قدیم مرتبہ میرزا قزوینی سے ضروری اقتباس[1] نقل کرتے ہیں تا کہ شمس العلماء کے استدلال کی کمزوری پورے طور پر عیاں ہو جائے :

"پس ابو منصور عبدالرزاق مردی بود بافر . . . آرزو کرد تا او را نیز یادگاری بود اندرین جهان پس دستور خویش ابو منصور المعمری را

۱۔ بیست مقالہ ، جزء ثانی ، صفحہ ۲۳ ، ۲۴ ، ۲۵ ۔

بفرمود تا خداوند کتب را از دهقانان و فرزانگان و جهاندیدگان را از شهرها بیاوردند و چاکر او ابو منصور المعمری بفرمان او نامہ کرد و کس فرستاد بشهر های خراسان و هشیاران از آنجا بیاورد . . . و بنشاند بفراز آوردن این نامہ های شاهان و کارنامهاشان و زندگانی هر یکی از داد و بیداد و آشوب و جنگ و آیین از کی نخستین . . . تا یزدگرد شهریار کہ آخر ملوک عجم بود اندر محرم و سال بر سیصد و چهل و شش از هجرت . . . و این را نام شاهنامہ نهادند ۔''

دیباچہ قدیم کا یہ بیان اس درجے واضح ہے کہ کسی قسم کے شک اور ابہام کے لیے گنجایش نہیں رہتی ۔ اس سے یہ دو باتیں ثابت ہوتی ہیں : (اول) یہ شاہنامہ ابو منصور بن عبدالرزاق والیٔ طوس کے حکم سے تالیف پایا ۔ (دوم) یہ شاہنامہ خدائی نامہ کا ترجمہ نہیں بلکہ مستقل تصنیف ہے ۔ اپنی ادبی تاریخ کی دوسری جلد میں خود براؤن بھی اسے خدائی نامہ کا ترجمہ نہیں کہتے ۔ ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں :

"... the prose 'Book of Kings' compiled in Persian from older sources by Abu Mansur al-Mamari for Abu Mansur b. Abdur Razzaq the Governor of Tus in A. D. 957-58 ..."

صفحہ ۲۸ ۔ لغت فرس کا مصنف :

''اسدی مصنف 'لغت فرس' کو سلطان محمود کے دربار کا شاعر مانا ہے حالانکہ یہ اسدی خورد ہے جو 'گرشاسپ نامہ' تالیف سنہ ۴۵۸ھ کا ناظم ہے ۔ پال ہورن مرتّب 'لغت فرس' کا بیان ہے کہ اسدی نے یہ فرہنگ اپنے آخر حصۂ عمر میں تصنیف کی ہے ۔''

شیرانی صاحب کے اس درست بیان سے شمس العلماء فقط انکار ہی نہیں کرتے بلکہ غلط کو صحیح ٹھہرانے کے لیے چند در چند الجھنوں میں پھنس جانا گوارا کر لیتے ہیں ۔ وہ اپنے اس دعوے کا اعادہ کرتے ہیں کہ محمود کے دربار کا

۱۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا ، جلد دوم ، صفحہ ۱۴۱ ۔

مشہور شاعر اسدی ہی 'لغت فرس' کا مصنف ہے اور ان کے اس دعوے کے مؤید ایرانی مصنف اور محققین یورپ ہیں ۔ قارئین کرام کو ایرانی مصنفین کے ذکر سے مرعوب نہ ہونا چاہیے ۔ شمس العلماء ، 'مجمع الفصحا' کی ایک عبارت نقل کر کے دنیا پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ایرانی مصنفین ان کے ہم‌نوا ہیں ۔ لیجیے ڈاکٹر رضا زادہ شفق[1] نہایت واضح طور پر ایک ہی اسدی کو گرشاسپ نامہ اور لغت فرس کا مصنف بتاتے ہیں :

''تاریخ فرهنگ مزبور (یعنی لغت فرس) بعد از گرشاسپ نامه یعنی بعد از سال چهار صد و پنجاه و هشت است زیرا ذکر گرشاسپ نامه درآن آمده چنانچه در بیان لغت از فنداق گوید : از فنداق قوس و قزح (کذا) بود ۔ اسدی مصنف گوید در گرشاسپ نامه :

کمان آر فنداق شد ژاله تیر
گل غنچه ترگ و زره آب گیر''

پروفیسر سعید نفیسی نے لغت فرس کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہے ، ان کی رائے بھی ملاحظہ ہو ۔ اسدی کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے[2] ہیں :

''دوم مثنوی گرشاسپ نامه . . . و در سال ۴۵۸ھ بپایان رسانده است ، سوم لغت فرس معروف بفرهنگ اسدیست . . . و ظاهراً آن را پس از نظم گرشاسپ نامه و پس از سال ۴۵۸ھ تمام کرده زیراکه در باره ای از نسخ آن اشعار گرشاسپ نامه هست ۔''

دو ایرانی محققوں کے بیان آپ کے سامنے ہیں جن سے یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ لغت فرس کا مصنف ہی گرشاسپ نامہ کا مصنف بھی ہے اور لغت فرس ، گرشاسپ نامہ کے بعد تالیف ہوتی ہے ۔ جہاں تک محققین یورپ کا معاملہ ہے ، شمس العلماء ایک ایسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں جس میں اگر نیت کو دخل نہ بھی ہو جب بھی ایک شدید فروگذاشت ہے ۔ شمس العلماء پروفیسر براؤن کی جلد اول سے ایک اقتباس نقل کر کے اسدی اول کو لغت فرس کا مصنف بتاتے

۱- تاریخ ادبیات ایران ، صفحہ ۱۳۱ ۔
۲- رودکی ، جلد دوم ، صفحہ ۱۳۰۶ ۔

کی ناکام کوشش کر رہے ہیں ، چنانچہ فرماتے ہیں : ''واضح ہو کہ براؤن نے اپنی تاریخ کے اس صفحے پر یہ اطلاع اسدی شاعر کے ماتحت دی ہے ، نہ اس کے بیٹے اسدی خورد کے ، جو گرشاسپ نامہ کا مصنف ہے ۔''

جہاں سے شمس العلماء نے یہ اقتباس نقل کیا ہے وہاں اسدی کلاں یا اسدی خرد سے مطلق بحث نہیں کی گئی بلکہ لغت فرس کا ذکر ایک علمی ماخذ کے طور پر کیا گیا ہے ، جس کے مطالعے سے ان فارسی شعرا کا پتا چلتا ہے جو گیارھویں صدی عیسوی کے وسط سے پہلے موجود تھے ۔ براؤن نے اسدی خرد کا باقاعدہ تذکرہ جلد دوم کے صفحہ ۲۷۲ پر دیا ہے ، جہاں اس کی دونوں کتابوں یعنی گرشاسپ نامہ اور لغت فرس کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ مزید بر آن جلد دوم کے صفحہ ۱۴۶ پر اسدی کلاں کا ذکر براؤن اس طرح شروع کرتے ہیں :

''دوسرا شاعر ، جو ہماری توجہ کا مستحق ہے ، وہ اسدی کلاں ابو نصر بن منصور طوسی ہے جسے اس کے بیٹے علی بن احمد اسدی سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے جو کہ گرشاسپ نامہ اور قدیم ترین فارسی کتب کا مصنف ہے اور جس کے ہاتھ کا لکھا ہوا فارسی کا قدیم ترین مخطوطہ ہے جس کی کتابت ۱۰۵۵ - ۱۰۵۶ عیسوی میں ہوئی ۔ یہ وائنا میں محفوظ ہے اور سیلیگمین نے اسے شائع کیا ہے ۔''

قارئین خود انصاف فرمائیں کہ شمس العلماء کا اس طرح غلط حوالے دینا کہاں تک ایک عالم کے شایانِ شان ہے ۔

صفحہ ۳۰ ۔ ابوحفص سغدی :

''مؤرخین نے ابوحفص کا زمانہ پہلی صدی ہجری میں بتایا ہے جس میں مصنف کے قیاس کا دخل نہیں ہے ۔ رضا قلی خان کا بیان ملاحظہ ہو : ابوحفص حکیم سغدی سمرقندی . . . در مائۂ اولی بودہ ۔''

شمس العلماء صاحب کو بیجا طور پر اصرار ہے کہ حکیم ابوحفص پہلی صدی ہجری کا فارسی گو شاعر ہے ۔ اس سلسلے میں محض رضا قلی خان کا حوالہ مفید نہیں ، جب کہ اس سے اقدم مصنف ابوحفص کو تیسری صدی ہجری کا بتاتے ہیں ۔ ہیں ۔ آقای جلال ہمائی رضا قلی خاں کی مندرجہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں : ''معلوم نیست این عقیدہ از چہ ماخذی گرفتہ و مخصوصاً زمان او را

از روی چه دلیلی معین نموده است ۔[1]"

قدیم ترین شعر[2] فارسی والے مقالے میں میرزا محمد قزوینی اس روایت کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ بعض کے نزدیک فارسی کا قدیم ترین شعر حکیم ابوحفص سغدی سمرقندی کا یہ شعر ہے :

آهوی کوهی در دشت چگونه دودا
یار ندارد بی یار چگونه رودا

حالانکہ شمس الدین محمد بن قیس رازی اپنی کتاب 'المعجم فی معاییر اشعار العجم' (صفحہ ۱۷۱) میں فارابی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ وہ سنہ ۳۰۰ھ کے قریب زندہ تھا ۔ مشہور ہندوستانی عالم ڈاکٹر عمر بن محمد[3] داؤد پوتہ بھی العجم اور مفاتیح العلوم خوارزمی کی سند کی بنا پر حکیم ابوحفص سغدی کو تیسری صدی ہجری کا شاعر مانتے ہیں ۔ پروفیسر سعید نفیسی[4] نے اس شاعر کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھا ہے ۔ وہ اس کا ذکر اس طریقے سے شروع کرتے ہیں :

"ابوحفص سغدی همان کسیست که بخطا وی را نخستین شاعر زبان فارسی در قرن اول هجری دانسته و این شعر او را نخستین شعر فارسی شمرده اند :
آهوی کوهی . . . ۔"

اس کے بعد کئی حوالے درج کیے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :

ادیب فضل اللہ قزوینی کی تاریخ معجم میں لکھا ہے : "و او در ثلاث مائه هجریه نبویه بوده است ۔"

خوارزمی اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں لکھتا ہے :

"الشهرود آلة محدثة ابدعها حکیم بن احوص سغدی ببغداد فی سنة ثلث مائة للهجرة ۔"

شمس قیس رازی کی کتاب 'المعجم فی معاییر اشعار العجم' کا یہ اقتباس بھی

۱۔ تاریخ ادبیات ایران ، جلد دوم ، صفحہ ۳۶۰ ۔
۲۔ بیست مقالہ ، جلد اول ، صفحہ ۲۹ ۔
۳۔ فارسی شاعری پر عربی شاعری کا اثر ، صفحہ ۶ ، حاشیہ ۔
۴۔ رودکی ، جلد سوم ، صفحہ ۱۱۵۰ - ۱۱۵۲ ۔

مستحق توجہ ہے :

''ابونصر فارابی در کتاب خویش ذکر او آورده است و صورت آلتی موسیقاری نام آن شهرود که بعد از ابوحفص هیچ کس آن را در عمل نتوانست آورد برکشیده و میگوید او در سنه ثلث مائه هجری بوده است -''

ان شواہد کی موجودگی میں شمس العلماء کا یہ اصرار کہ حکیم ابوحفص سغدی پہلی صدی ہجری کا فارسی گو شاعر ہے ، کہاں تک مناسب ہے ۔

اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۳ پر شمس العلماء نے یہ دعویٰ کیا ہے :

" . . . The Persian poet, Hakim Abu Hafs, who lived and composed the historic Persian verses in the 1st century A.H. . . ."

یہ بیان پڑھ کر شیرانی صاحب کو قدرتی طور پر اچنبھا ہوا اور انھوں نے لکھا کہ ''معلوم نہیں یہ تاریخ قائم کرنے والے کون سے اشعار ہیں ۔'' اس سادہ سوال کا جواب دینے کی بجائے شمس العلماء راہ گریز اختیار کرتے ہوئے شیرانی صاحب کے ترجمے پر اعتراض کرتے ہیں (حالانکہ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ شیرانی صاحب ان کی کتاب کا ترجمہ کرنے نہیں بیٹھے بلکہ وہ اس کے مطالب کا مفہوم بیان کر رہے ہیں ۔ ان کے نزدیک ''Historic verses'' کا مطلب ''تاریخ قائم کرنے والے اشعار'' نہیں، بلکہ ''تاریخی ابیات ہیں یعنی وہ ابیات جو تاریخ میں یادگار ہیں'' (قارئین کرام غور فرمائیں کہ ''تاریخ قائم کرنے والے'' اور ''وہ جو تاریخ میں یادگار ہیں'' کے درمیان کیا فرق ہے) شمس العلماء پوری کتاب میں ایک شعر سے زیادہ پیش نہیں کر سکے ، اور کرتے بھی کیسے ؟ جب کہ ابوحفص کے اشعار کہیں نہیں ملتے ۔ سعید نفیسی آهوی کوهی والے شعر کے علاوہ صرف ایک شعر کا سراغ لگا سکے ہیں ۔

شمس العلماء قبلہ آپ کا ترجمہ ہی درست سہی ۔ آئیے اب وہ تاریخی ابیات پیش کیجئے جو آپ کے ارشاد کے مطابق حکیم ابوحفص نے کہے ہیں ۔ ایک عالم کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اپنی غلطی چھپانے کے لیے یوں پہلوتہی کرے اور پھر ایک مناظر کی طرح یہ غلغلہ بلند کرے : ''اس مفہوم کے تحت مبصر کا یہ استفسار کہ وہ کون سے تاریخ قائم کرنے والے اشعار ہیں ، پادربدہ ہو کر خود ہی قائم نہیں رہتا ۔''

صفحہ ۳۱ - دو بیت اور دوبیتی میں فرق :

شمس العلماء نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۱۰ پر حنظلہ بادغیسی کے مندرجہ ذیل چار شعر دو رباعیوں کے طور پر نقل کیے ہیں :

مہتری گر بکام شیر دراست
تو خطر کن ز کام شیر بجوی
یا بزرگی و عز و نعمت و جاہ
یا چو مردانت مرگ رویا روی

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند
از بہر چشم تا نرسد مرورا گزند
او را سپند و آتش ناید ہمی بکار
با روی ہمچو آتش و با خال چون سپند

شیرانی صاحب نے ان قطعوں کے رباعی لکھے جانے پر اعتراض کرتے ہوئے بتایا کہ یہ دونوں قطعے رباعی کے وزن سے خارج ہیں ، اس لیے ان کو رباعی کہنا لفظ کا غلط استعمال کرنا ہے - پہلا قطعہ چہار مقالہ سے نقل کیا گیا ہے جہاں نظامی عروضی اس کو رباعی کہہ کر نہیں پکارتا اور دوسرا قطعہ عوفی کے 'لباب الالباب' سے لیا گیا ہے لیکن عوفی اسے دو بیت لکھتا ہے ، نہ کہ دوبیتی -

چاہیے تو یہ تھا کہ شمس العلماء اعتراض کی صحت کو تسلیم کرتے اور آیندہ ایڈیشن میں اس غلطی کی تصحیح کر لیتے - لیکن اپنے دعوے کی بے جا حمایت میں وہ رباعی کے متعلق اپنی نادر اور نکتہ سنجانہ تحقیقات سے دوسروں کو یوں مستفید کرتے ہیں :

''واضح ہو کہ رباعی یعنی چار مصرع کا اصل نام ، جو ایران میں بعہد یعقوب بن لیث صفار رکھا گیا تھا ، دو بیتی تھا - کچھ مدت گزرنے کے بعد لوگ اسے چہار مصرع بھی کہنے لگے تھے - آخر میں اس کا عربی نام رباعی ہوا - چونکہ یہ اس عہد کی اصطلاح ہے اس لیے دو بیتوں کو رباعی کہنا غلط نہیں ہے -''

شمس العلماء کا یہ ناتمام بیان دولت شاہ سے ماخوذ ہے لیکن وہ اس حصے کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس میں وزن کا ذکر ہے :

''این مصرع را نوعی از هزج یافتند ۔''

جب اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ رباعی بحر ہزج کے مخصوص اوزان میں لکھی جاتی تھی ، پھر ان اشعار کو کیوں کر رباعی کہا جا سکتا ہے جو اس کے اوزان سے خارج ہیں ۔ دوم دولت شاہ کے نزدیک رباعی کا نام 'چہار مصرع' ہرگز نہیں ۔ شمس العلماء اس کا مفہوم نہیں سمجھے ۔ وہ تو یہ کہہ رہا ہے :

''چند گاهی دو (بیتی) می گفتند تا آنکہ لفظ دو بیتی نیکو ندیدند گفتند کہ این چهار مصراعی است رباعی می شاید گفتن ۔''[1]

یعنی شروع شروع میں اسے دو بیتی کہتے تھے ، یہاں تک کہ یہ اصطلاح انھیں پسند نہ آئی ۔ کہنے لگے کہ اس میں چار مصراع ہوتے ہیں اس لیے اسے رباعی کہنا چاہیے ۔ ہر ایک شخص جو قواعد عروض سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے ، اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ رباعی ایک خاص صنف نظم کا نام ہے اور اس کے مخصوص اوزان ہیں ۔ لیکن شمس العلماء تمام قاعدوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہر دو بیت کو رباعی کہنا غلط نہیں ۔ گویا دو بیت اور دو بیتی میں امتیاز کرنا ان کے نزدیک کوئی ضروری امر نہیں ۔ عروض کی کسی ابتدائی کتاب کے مطالعے سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے ، پھر تعجب ہے شمس العلماء جیسا عالم ضد کی حالت میں سر رشتۂ انصاف کو اس طرح ہاتھ سے چھوڑ دے ، گویا عروض کے قواعد ان کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور جہاں کہیں دو شعر ایک ساتھ لکھے ہوئے مل جائیں بے دھڑک انھیں رباعی کا نمونہ سمجھ کر نقل کر دیں ۔ چنانچہ ان کی کتاب میں کئی جگہ لفظ رباعی کے غلط استعمال کی مثالیں ملتی ہیں ۔

شیرانی صاحب نے رباعی کے آغاز تاریخ اور اوزان سے اپنے ان دو مقالوں میں سیر حاصل بحث کی ہے جو اورینٹل کالج میگزین لاہور کے شمارہ فروری اور مئی سنہ ۱۹۳۰ع میں شائع ہوئے ۔ ان میں سے پہلا مقالہ 'تنقید شعرالعجم' میں ضمیمے کے طور پر چھاپ دیا گیا ہے ۔

۱۔ تذکرۂ دولت شاہ ، طبع لاہور ، صفحہ ۲۱ ۔

صفحہ ۳۲ ۔ رودکی اور کلیلہ و دمنہ :

کہتے ہیں کہ امیر نصر نے شاعر کو ایک خلعت اور چالیس ہزار درم کلیلہ و دمنہ کے صلے میں مرحمت فرمائے ۔ ثبوت میں عنصری کا شعر ذیل نقل کیا ہے :

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش
عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

''شمس العلماء نے اگرچہ اس شعر کے لیے اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ شعر العجم نے ماخوذ ہے . . . عنصری کے دیوان میں کلیلہ کا مطلق ذکر نہیں ۔ شاعر نے دوسرا مصرع یوں لکھا تھا :

بیافتہ است بتوزیع ازین درو آن در

یہ انعام کلیلہ کے صلے میں نہیں ملا بلکہ مختلف موقعوں پر . . . ۔''

(شیرانی صاحب)

اگرچہ شمس العلماء نے 'شعر العجم' سے کئی جگہ فائدہ اُٹھایا ہے لیکن وہ اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ چنانچہ یہاں بھی وہ دیوان عنصری کے ایک قدیم نسخے کا ذکر کرتے ہیں جس میں یہ شعر ان کی نقل کردہ صورت میں ملتا ہے ۔ پھر تذکرہ نویسوں میں سے دولت شاہ اور تذکرۂ سلاطین آل غزنین کا حوالہ دیتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ دولت شاہ ہرگز ان کی تائید نہیں کرتا ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

''و کتاب کلیہ و دمنہ را بقید نظم آوردہ و امیر نصر را در حق صلات گران مایہ بود چنانچہ اُستاد عنصری شرح انعام در قصائد خود میگوید ۔''

(تذکرۂ دولت شاہ ، صفحہ ۳۱)

اس عبارت سے یہ کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ کلیلہ کے صلے میں اسے بہت بڑا انعام ملا ۔ بلکہ دولت شاہ یہاں صرف اس قدر کہتا ہے کہ امیر نصر نے رودکی کو بہت بڑے انعام دیے جن کی شرح اُستاد عنصری اپنے قصائد میں کرتا ہے ۔ البتہ ایک اور جگہ دولت شاہ[1] لکھتا ہے کہ رودکی کو کلیلہ و دمنہ نظم کرنے پر ۸۰ ہزار درم بطور انعام ملے تھے ۔

شیرانی صاحب کی قرأت کی تائید میں پروفیسر سعید نفیسی کا حوالہ کافی سمجھا

۱۔ تذکرۂ دولت شاہ ، مرتبہ براؤن ، صفحہ ۱۰ ۔

جانا چاہیے ، جنھوں نے رودکی کے احوال و اشعار پر تین مبسوط جلدیں شائع کی ہیں ۔ تیسری جلد کے صفحہ ۹۴۷ پر وہ عنصری کے مندرجہ ذیل شعر نقل کرتے ہیں :

چهل هزار درم رودکی ز مهتر خویش
بیافتست بتوضیع (بتوزیع) ازین در و آن در
شگفتش آمد و شادی فزود و کبر گرفت
ز روی فخر بگفت این بشعر خویش اندر

اور پھر صفحہ ۹۹۷ پر ازرق کا یہ شعر نقل کیا ہے :

حدیث میر خراسان و قصهٔ توضیع (توزیع ؟)
بگفت رودکی از روی فخر در اشعار

اور سب سے بڑھ کر رودکی کی اپنی شہادت ہے :

بداد میر خراسانش چل هزار درم
درو فزونی یک پنج میر ماکان بود

میر خراسان کی اسی داد و دہش کی طرف عنصری اور ازرق اشارہ کر رہے ہیں لیکن یہاں کلیلہ و دمنہ کا کوئی ذکر نہیں ۔

صفحہ ۳۳۔ رودکی کے اشعار کی تعداد :

شمس العلماء کا بیان ہے کہ رشیدی سمرقندی نے رودکی کے اشعار کو تیرہ مرتبہ گنا ، ایک لاکھ سے اوپر نکلے ۔ رشیدی کا شعر جس سے یہ معنی اخذ کیے گئے ہیں ، ذیل میں درج ہے :

شعر او را بر شمردم سیزده ره صد هزار
هم فزون تر آید ار چونانکه باید بشمری

شیرانی صاحب کی رائے میں رشیدی کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کے اشعار کا شمار کیا ، تیرہ لاکھ نکلے ۔ لیکن اگر احتیاط سے انھیں گنا جائے تو اور بھی زیادہ نکلیں گے ۔

شمس العلماء یہاں پھر مولانا شبلی کی تقلید کر رہے ہیں ، خواہ وہ اس کا لاکھ انکار کریں ۔ اپنے جوابِ تبصرہ میں وہ خواہ مخواہ اس غیر متعلق بحث میں پھنس گئے ہیں کہ کوئی شاعر اتنے اشعار نہیں لکھ سکتا ، جب تک کہ اسے عمر نوح[۴] نصیب نہ ہو ۔ حالانکہ یہاں مابہ النزاع رشیدی کے شعر کا مفہوم ہے ، نہ کہ رودکی

کے اشعار کی غیر معمولی تعداد ـ رشیدی کے بیان کی صحت سے کوئی بحث نہیں ، یہاں تو اس کے شعر کا مطلب معرضِ بحث میں ہے ـ پیشتر اس کے کہ ہم ان علماء کا ذکر کریں جو اس شعر کا وہی مطلب سمجھتے ہیں جو شیرانی صاحب نے سمجھا ہے ، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شمس العلماء کی اس قلبی کیفیت سے قارئین کو آگاہ کیا جائے جو شیرانی صاحب کی اس مزعومہ غلطی دریافت کرنے سے شمس العلماء پر طاری ہوئی ـ مخدوم فرماتے ہیں :

''اس پر مغز اعتراض اور بے نظیر اصلاح کی جس قدر داد دی جائے ، کم ہے ـ مصنف نے تو بے شک اپنی کم عقلی سے ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کا مطلب نکالا لیکن فاضل مبصّر نے محیّرالعقول اصلاح دے کر تیرہ لاکھ سے زائد اشعار رودکی کی طرف منسوب کر دیے جس کی نظیر ایران میں تو کیا بلکہ تمام براعظم ایشیا اور ساری دنیا میں ملنا محال ہے . . . رودکی در حقیقت بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کو بعد وفات مبصّر جیسا پُر جوش عقیدت مند مل گیا جس نے تیرہ لاکھ سے زائد اشعار منسوب کرکے نہ صرف اس کو محسودِ اقران اور دنیا کی شاعری میں فرد و بے مثال بنا دیا بلکہ ایک ناممکن بات کو ممکن کر دکھایا ـ کاش وہ زندہ ہو جائے تو مبصّر کی اس معجز نما شرح و اصلاح پر انگشت بدندان ہو کر محو حیرت ہو جائے ـ''

مندرجہ بالا عبارت میں شمس العلماء حسبِ معمول تحریف اور غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں ـ شیرانی صاحب نے کہیں رودکی کی طرف تیرہ لاکھ اشعار منسوب نہیں کیے ، وہ تو صرف رشیدی کے شعر کا مفہوم بتا رہے ہیں جس میں رودکی کی طرف تیرہ لاکھ اشعار منسوب کیے گئے ہیں ـ اگر یہ مبالغہ آمیز بیان ہے تو اس کا ذمہ وار رشیدی ہے ، نہ کہ کوئی اور ـ

اب ہم شعر کے مطالب کی طرف آتے ہیں اور ان مستشرقین کا حوالہ دیتے ہیں جن کے نزدیک رشیدی کے شعر سے تیرہ لاکھ اشعار کا مفہوم نکلتا ہے ، نہ کہ ایک لاکھ اشعار کا ـ پروفیسر سعید نفیسی نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں مستشرقین کے مضامین در بارۂ رودکی کا ترجمہ درج کیا ہے ـ ہم یہ حوالے انھی کی کتاب سے نقل کر رہے ہیں :

صفحہ ۹۳۸ : مشہور مستشرق جیمس ڈار مستتر لکھتا ہے : ''اشعار رودکی

بغایت فراوان بود ، می گویند کہ یک ملیون و سیصد هزار شعر گفته است ۔''

صفحہ ۸۳۶ : ڈاکٹر ہرمان ایتھے کا قول : ''گویند کہ سخنان وی در صد مجلّد بوده است و بیش از ۱۳۰۰۰۰ شعر داشتہ ۔''

صفحہ ۹۱۰ : ولیم جیکسن کا قول : ''آثار شعری رودکی فوق‌العاده فراوان بوده و میگویند کہ یک ملیون و سیصد هزار شعر گفتہ ۔''

پروفیسر برون اپنی لٹریری ہسٹری کی جلد اول کے صفحہ ۴۵۷ پر حاشیہ ذیل میں رشیدی کے شعر سے تیرہ لاکھ اشعار کا مطلب نکالتے ہیں :

'عتبی کی کتاب الیمینی کی شرح منیٹی میں رشیدی کے شعر کی بنا پر رودکی کے اشعار کی تعداد الف الف و ثلٰث مائۃ (دس لاکھ اور تین سو ابیات) بتائی گئی ہے[1] ۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہاں 'ثلٰث مائۃ' کے بعد 'الف' کا لفظ کتابت میں رہ گیا ہے ، اس صورت میں اشعار کی تعداد تیرہ لاکھ نکلتی ہے ۔ اگر ہمارا قیاس درست نہ ہو ، جب بھی رودکی کے اشعار کی تعداد دس لاکھ اور تین سو ابیات شمس العلماء کو حیرت زدہ کرنے کے لیے کافی ہے ۔ بہارستان میں مولانا جامی نے بھی شرح یمینی کی سند پر دس لاکھ اور تین سو ابیات تعداد بتائی ہے اگرچہ پروفیسر براؤن اسے تیرہ لاکھ مانتے[2] ہیں ۔

شمس العلماء کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو مستشرقین کی رائے ہے ، خود اہلِ زبان اس بارے میں کیا کہتے ہیں ۔ ہمیں یہاں پھر نہایت رنج اور افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ شمس العلماء واقعات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ رودکی کی تیسری جلد ان کے ملاحظے سے نہ گزری ہو لیکن پہلی دو جلدیں ان کے زیرِ مطالعہ رہ چکی ہیں ۔[3] دوسری جلد میں یہی نہیں کہ سعید نفیسی 'سیزده ره صد ہزار' کا مطلب تیرہ لاکھ اشعار سمجھتے ہیں بلکہ وہ انی

۱۔ رودکی ، جلد دوم ، صفحہ ۵۷۵ ۔

۲۔ ایران کی ادبی تاریخ ، جلد اول ، صفحہ ۴۵۷ ۔

۳۔ شمس العلماء کی کتاب ، صفحہ ۱۲۶ ، حاشیہ ۔

غیر معمولی تعداد کے ممکن ہونے کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔[۱] ظاہر ہے کہ شمس العلماء سعید نفیسی کے اس بیان سے واقف ہوں گے ۔ پھر وہ خود ہی فرمائیں کہ شیرانی صاحب پر ان کی یہ تعریض کہاں تک درست ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ شمس العلما کا حقیقی مقصود علمی تحقیق نہیں بلکہ ادنٰی درجے کی مناظرہ بازی ہے ۔ سعید نفیسی کے اصل الفاظ یہ ہیں :

''و سیزده ره صد هزار می شود هزار هزار (یک ملیون) و سیصد هزار بیت ۔'' [صفحہ ۵۷۴]

صفحہ ۳۴ ۔ رودکی اور قطران تبریزی :

فارسی شاعری کے باوا آدم رودکی کی طرف قطران تبریزی کے بعض اشعار منسوب کیے گئے ہیں ۔ چنانچہ 'شعرالعجم' کی پہلی جلد میں مولانا شبلی نے بھی قطران کے اشعار رودکی کے حوالے کر دیے ہیں ۔ ہمارے شمس العلماء اس غلط فہمی سے بچنے کے لیے دیوان رودکی کے طہران والے ایڈیشن کو ناقابلِ اعتماد ٹھہراتے ہوئے رودکی کے صرف وہی اشعار نقل کرتے ہیں جن کے متعلق انہیں پورا اطمینان ہے کہ وہ قطران کے دیوان میں موجود نہیں ہیں اور پھر خوش قسمتی سے ان کو دیوان قطران کا وہ مخطوطہ بھی مقابلے کے لیے میسر آ جاتا ہے جو ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی ملکیت ہے ، لیکن اس تمام احتیاط کے باوجود وہ قطران کے مندرجہ ذیل چار شعر رودکی کے نام سے درج کرتے ہیں :

بود هرجا بهر نزهت گاه یارو نقل و هل
گلستان در گلستان و میوه اندر میوه زار

آن مکافات نماز است ، این مکافات مدیح
آن عطای کردگار است ، این عطای شهریار

شیرانی صاحب نے اس پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اشعار رودکی کے نہیں ہیں بلکہ قطران کی ملک ہیں اور کنجلک دور کرنے کے لیے انھوں نے

۱۔ رودکی ، جلد دوم ، صفحہ ۳۶۹ ۔ ۳۷۰ ؛ ۵۷۵ ۔

اس قصیدے کا وہ شعر بھی نقل کر دیا جس میں ممدوح کا نام درج ہے :

افتخار دھر ابو منصور وھسودان کہ ھست

بندگانش را بمیران صد ھزاران افتخار

شمس العلماء بھلا ایسی صاف اور سیدھی بات کو کب ماننے والے تھے ۔ نہایت ہی غیر عالمانہ روش اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مبصّر کے بیان کے بالعکس مصنف کہتا ہے کہ یہ اشعار حکیم قطران کے نہیں بلکہ خالص رودکی کی ملک ہیں ، اس کی مطابقت لکھنؤ کے ایک مخطوطے سے بھی کی جا چکی ہے ، جس کا حوالہ حاشیے میں درج ہے ۔ علاوہ بریں حکیم قطران کے ممدوح کا نام ابو منصور وھسودان ہے لیکن مصنف کے ماخذ میں ابو منصور سامانی درج ہے جو رودکی کا ممدوح تھا۔''

شمس العلماء نے یہ بیان بڑی جسارت اور دلیری سے دیا ہے ۔ کاش اس بیان سے پہلے وہ دیوان قطران کے اس مخطوطے سے مقابلہ کر لیتے جو ڈاکٹر ہادی حسن کی ملک ہے اور جس تک خوش قسمتی سے انہیں رسائی حاصل ہے ۔ محض مناظرانہ انداز میں وہ کہنے کو تو یہ کہہ گئے کہ یہ قصیدہ رودکی کا ہے اور اس کے ممدوح ابومنصور سامانی کی مدح میں ہے لیکن اگر حضرت سے کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ رودکی کے سرپرستوں میں ابو منصور سامانی کا نام بھی کہیں ملتا ہے ؟ تو وہ اس سوال کا کیا جواب دیں گے ۔ اس کا ممدوح نصر بن احمد سامانی ہے جو سنہ ۳۰۱ سے ۳۳۱ ہجری تک حکومت کرتا ہے اور رودکی کا سالِ وفات بقول سمعانی سنہ ۳۲۹ ہجری ہے ۔

اس کے علاوہ سب سے زبردست شہادت پروفیسر سعید نفیسی کی ہے جن کی رودکی پر ضخیم مجلدات مشہور ہیں ۔ خود شمس العلماء اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ رودکی اور قطران کے کلام کے مخلوط ہونے کے متعلق مزید اطلاع سعید نفیسی کی کتاب سے حاصل کرنی چاہیے ۔ سعید نفیسی نے تیسری جلد میں متفرق ذرائع سے رودکی کے پراگندہ کلام کو یکجا کر دیا ہے ۔ اس میں بھی یہ قصیدہ ، جسے شمس العلماء رودکی کی ملک کہہ رہے ہیں ، درج نہیں کیا گیا ، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نفیسی اسے رودکی کی طرف منسوب نہیں کرتے ۔ شمس العلماء قبلہ کے لیے مناسب یہی ہے کہ دعویٰ کرنے سے پہلے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر اچھی

طرح غور کر لیا کریں - ہمارے مخدوم دوسروں کو تو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ رودکی اور قطران کے کلام میں امتیاز کرنے کے لیے سعید نفیسی کی کتاب کی طرف رجوع کریں لیکن خود اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں ۔ اگر وہ اس کتاب کی دوسری[1] جلد کی ورق گردانی کریں تو انھیں وہ اشعار قطران کے نام پر ملیں گے جن کو وہ زبردستی رودکی کے بتا رہے ہیں ۔ اسی طرح یہ اشعار بھی ، جنھیں وہ رودکی کی طرف منسوب کر رہے ہیں ، دوسری جلد کے صفحہ ۶۶۵ پر قطران کی ملک بتائے گئے ہیں :

چو بکشاید نگار من دو بادام و دو مرجان را
بدین نازان کند دل را و بدان رنجان کند جان را

ازان گاهی که پنهان کرد از من روی پیدا را
سرشک (و) روی زردم کرد پیدا راز پنهان را

اس قصیدے کے آخر میں قطران کا نام تک ملتا ہے :

خداوندا تو قطران را ز هرکس دوست تر داری
و لیکن کمترک بخشی ز هرکس چیز قطران را

ایسی صریح زیادتی کی وجہیں صرف دو ہو سکتی ہیں ؛ یا تو اسے شمس العلماء کی قوتِ حافظہ کی کمزوری سمجھیں یا پھر یہ کہ شمس العلماء دیدہ و دانستہ اس قسم کی زیادتیوں کو روا رکھتے ہیں ۔

صفحہ ۳۵ ۔ دو بیت اور دو بیتی میں فرق :

رودکی نے جو مرثیہ مرادی کی وفات پر لکھا ہے ، اس میں سے شمس العلماء دو شعر نقل کرکے انھیں رباعی کے نام سے یاد کرتے ہیں ، اور جب شیرانی صاحب نے ان کی توجہ اشعار کے وزن کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ یہ اشعار رباعی کے وزن سے خارج ہیں تو شمس العلماء جواب میں فرماتے ہیں :

"دو بیتی کو رباعی کہنا بالکل صحیح ہے ۔"

بڑی مصیبت یہ ہے کہ شمس العلماء غور و فکر کرنے کے عادی نہیں ورنہ وہ دو بیت اور دو بیتی میں ضرور امتیاز کرتے ۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ جہاں دو

۱- رودکی ، جلد دوم ، صفحہ ۶۸۳ ۔

شعر ان کی نظر سے گزرے ، فوراً انہیں دوبیتی یا رباعی سمجھ لیا ۔ پروفیسر سعید نفیسی[1] اس مرثیے کو قطعے کے نام سے یاد کرتے ہیں ، نہ کہ رباعی کے نام سے ۔ ایک اور جگہ نفیسی لکھتے ہیں :

''رودکی را قطعہ ایست در مرثیت مرادی ۔'' [صفحہ ۵۱۲]

صفحہ ۳۹ ۔ ''در شمار خرد'' یا ''از شمار خرد'' :

رودکی نے جو دو شعر اپنے دوست شہید بلخی کی وفات پر کہے تھے اور جنھیں شمس العلماء غلطی سے رباعی کہہ کر پکارتے ہیں ، شمس العلماء کی کتاب میں یوں نقل کیے گئے ہیں :

کاروان شہید رفت از پیش
و آن ما رفتہ گیر و می اندیش

از شمار دو چشم یک تن کم
در شمار خرد ہزاران بیش

شیرانی صاحب نے فرمایا کہ چوتھے مصرع میں ''در شمار خرد'' کے بجائے ''وز شمار خرد'' بہتر اور موزوں قرأت ہے ۔ اس پر شمس العلماء کی برافروختگی ملاحظہ ہو :

''مبصّر کی مجوّزہ قرأت اور اصلاح دخل در معقول و نامقبول ہے ۔ کیونکہ جس نسخے کے حوالے سے رودکی کا وہ شعر نقل کیا گیا ہے ، اس میں ''وز'' نہیں بلکہ ''در'' ہے اور یہی قرأت صحیح اور قرین دیانت ہے ۔ اگر بالفرض اس قسم کی اصلاحیں مبصّر کے نظریے کے مطابق روا رکھی جائیں تو رودکی کا پورا کلام مسخ ہو جائے گا ، جس کا غیر مستند ہونا ظاہر ہے ۔''

اگر شمس العلماء شعر کے مفہوم پر ذرا غور فرماتے تو ہر صاحب فہم و ذکا کی طرح شیرانی صاحب سے اتفاق کرتے لیکن ان کا دماغ ایک عجیب الجھن میں گرفتار ہے ۔ ان کے نزدیک نقل کے سامنے عقل کو ہتھیار ڈال دینے چاہییں اور جیسا کچھ لکھا ہوا مل جائے اسے وحی خداوندی کے طور پر قبول کر لینا چاہیے ۔ اگر دوسرے علما بھی شمس العلماء کی طرح عقل کو اپنی محفل سے نکال باہر پھینکیں

۱۔ رودکی ، جلد سوم ، صفحہ ۹۸۴ ۔

تو تمام علمی تحقیق اور تلاش کا خاتمہ ہو جائے اور ایک مصنف کی حیثیت محض ایک حاطب اللیل کی سی رہ جائے جو ہر قسم کا رطب و یابس بغیر کسی تنقیح و تنقید کے قبول کر لیتا ہے - یہی ''در شہار خرد'' اور ''وز شہار خرد'' والا معاملہ لیجیے - جو شخص ذرا بھی غور سے کام لے گا ''در شہار خرد'' پر ''و ز شہار خرد'' کو ترجیح دے گا - لیکن شمس العلماء محض اس بنا پر قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ اتفاق سے ان کے نسخے میں ''در شہار خرد'' لکھا ہوا ہے - شمس العلماء کی غلط فہمی کے ازالے کے لیے ہم پھر سعید نفیسی کی قابل قدر کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں - تیسری جلد کے صفحہ ۱۰۰۴ پر یہ شعر یوں ملتا ہے :

از شہار دو چشم یک تن کم
وز شہار خرد ہزاران بیش

اسی صفحے کے حاشیے میں نفیسی دوسری قرأت ''در شہار خرد'' بھی درج کرتے ہیں لیکن متن میں شیرانی صاحب کی طرح ترجیح ''وز شہار خرد'' کو ہی دیتے ہیں - اب قارئین انصاف فرمائیں کہ اگر شیرانی صاحب نے اسے بہتر اور موزوں قرأت قرار دیا تو اس پر شمس العلماء کو چیں بجبیں ہونے کی کیا ضرورت ہے - ایک اور ایرانی فاضل ڈاکٹر رضا زادہ شفق کی کتاب[1] میں بھی یہ شعر اسی صورت میں نقل ہوا ہے :

از شہار دو چشم یک تن کم
وز شہار خرد ہزاران بیش

'شعر العجم' کے حصہ اول[2] میں مولانا شبلی نے بھی ''وز شہار خرد ہزاران بیش'' نقل کیا ہے -

صفحہ ۴۷ - ابوالمؤید بلخی کی مثنوی یوسف و زلیخا :

ابوالمؤید کی مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے شمس العلماء نے یہ دعویٰ کر دیا کہ خسرو اور جامی نے اس کی طرز کی تقلید کی - (اصل کتاب ، صفحہ ۱۳۷)
بلخی کی مثنوی یوسف و زلیخا کا ذکر جیسا کہ شیرانی صاحب فرماتے ہیں ،

۱- تاریخ ادبیات ایران ، صفحہ ۴۲ -
۲- شعر العجم ، حصہ اول ، صفحہ ۲۶ -

یوسف و زلیخا منسوب بہ فردوسی کے دیباچے میں آتا ہے :

یکی بوالموید کہ از بلخ بود
بدانش ہمی خویشتن را ستود

''یہ تنہا ماخذ ہے ہمارے اس علم کا کہ بوالموید نے کوئی یوسف و زلیخا نظم کی تھی ۔ اس سے زیادہ کسی کو کوئی اطلاع نہیں ۔''

اب قارئین انصاف فرمائیں کہ جب ابوالموید کی مثنوی عنقا رہی ہے تو پھر امیر خسرو اور جامی اس کی طرز کی تقلید کیوں کر کرتے ۔

حسب معمول اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے شمس العلماء ایک غیر متعلق بحث بطور تمہید شروع کر دیتے ہیں اور چونکہ اصلی زور اسی پر ختم ہو جاتا ہے اس لیے ابوالموید کی مثنوی کے متعلق وہی شیرانی صاحب کی فراہم کردہ اطلاع دہراتے ہیں لیکن ایک گراں قدر اضافے کے ساتھ :

''یہی حال کم و بیش ابو الموید کی مثنوی کا بھی ہے جو ایک نئی اور لطیف چیز تھی ۔ نظامی وغیرہ کے علاوہ خود فردوسی بھی اس کا معترف تھا ، چنانچہ دیباچے میں کہتا ہے :

یکی بوالموید کہ از بلخ بود
بدانش ہمی خویشتن راستود''

چونکہ شمس العلماء ابوالموید کی مثنوی کی مقبولیت کے قائل ہیں ، انھیں چاہیے تھا کہ شیرانی صاحب کے بتائے ہوئے ماخذ کے علاوہ کم از کم ایک اور ماخذ کا تو ذکر کرتے تاکہ ان کے دعوے کو تقویت پہنچتی ۔ لیکن اس کے برعکس وہ یہ حیرت انگیز دعویٰ کرتے ہیں کہ نظامی بھی ابوالموید کی مثنوی کا معترف تھا ۔ ہم شمس العلماء کو دعوت دیتے ہیں کہ نظامی کی کتابوں میں اس مثنوی کی طرف ادنیٰ سے ادنیٰ اشارہ بھی ڈھونڈھ نکالیں ۔ آخر اس قسم کے دعوے کرنے میں شمس العلماء اس درجے غیر محتاط کیوں واقع ہوئے ہیں ۔ انھیں اپنی علمی حیثیت کو ٹھیس لگنے کا احساس کیوں نہیں ہوتا ۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ان کا یہ قول ہے کہ امیر خسرو اور جامی ابوالموید کی طرز کے مقلد تھے ۔ امیر خسرو اور جامی متعدد تصانیف کے مالک ہیں ۔ کیا ان کی کسی تصنیف میں ابوالموید بلخی کی مثنوی یوسف و زلیخا کا ذکر ملتا ہے ؟ اور اگر نہیں

ملتا تو پھر ایسی بے بنیاد اور مضحکہ خیز بات کہنے سے کیا حاصل ؟

صفحہ ۴۳۔ منوچہری محمود غزنوی کے درباری شعرا کے زمرے میں :

''شمس العلماء منوچہری کا نام محمود غزنوی کے درباری شعرا میں شامل کرتے ہیں حالانکہ وہ صریحاً اس کے فرزند شہید مسعود کے عہد کا شاعر ہے اور خاص اسی کے دربار سے تعلق رکھتا ہے۔''

(شیرانی صاحب)

'مجمع الفصحا' اور 'شعر العجم' میں غلطی سے منوچہری کو محمود کے درباری شاعروں میں شامل کیا گیا ہے اور شمس العلماء بھی انھی کے مقلّد ہیں۔ سیدھی اور آسان صورت یہی تھی کہ شمس العلماء اسے سہو قلم یا سہو نظر کہہ کر نظر انداز کر دیتے لیکن اس کے برخلاف وہ اقرار و انکار کا ایک دلچسپ اور دلکش مرقع پیش کرتے ہیں اور جواب میں ایسی باتیں کہتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

''منوچہری اگرچہ سلطان محمود کے دربار سے براہ راست منسلک نہ تھا لیکن اس سے بالواسطہ تعلق رکھتا تھا اور اسی کے عہد کا شاعر ہے۔''

''دیگر این کہ منوچہری محمود کے دربار کے ملک الشعرا عنصری کا شاگرد رشید ہے اور اس حیثیت سے بھی اس کا اپنے استاد کے ساتھ سلطانی دربار میں باریاب ہونا نہ صرف قرینِ قیاس بلکہ اغلب ہے اور مبصر کا اس پر حیرت کرنا ہی موجب حیرت ہے : ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است''

شمس العلماء کے اقوال میں صریح تناقض آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ ایک طرف تو اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ محمود کے دربار سے براہِ راست منسلک نہ تھا اور پھر دوسری طرف عنصری کے ساتھ سلطانی دربار میں اس کا باریاب ہونا قرین قیاس بلکہ اغلب فرماتے ہیں :

بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است

اگر منوچہری کا محمود کے دربار میں باریاب ہونا قرینِ قیاس ہے تو محمود کی مدح میں ایک چھوڑ کئی قصیدے اس کے دیوان میں ملتے ، خاص طور پر جب

بقول شمس العلماء منوچہری محمود کے دربار میں حاضر تھا ۔ (ملاحظہ ہو اصل کتاب ، صفحہ ۱۷۸) حالانکہ دولت شاہ نے اس قول کو کہ منوچہری محمود کے شاعروں میں شمار ہوتا تھا ، دوسروں کی طرف منسوب کیا ہے :

"و او را از شعرای سلطان محمود شمردہ اند ۔"

مولانا شبلی[1] بھی لکھتے ہیں کہ :

"منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں ، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنی میں آیا ہے ۔"

اسی سلسلے میں شمس العلماء نے محمود کے درباری شعرا پر ہندوستان کی سازگار آب و ہوا کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے ان کی نزاکت خیال ، رنگینیٔ انشا اور شگفتگیٔ بیان کو ہندوستانی فضا کا فیض بتایا ہے ۔ جب ایسے جذباتی اور خیالی بیان پر شیرانی صاحب نے اظہار حیرت کیا تو شمس العلماء اصل موضوع سے اعراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ہندوستان کا خوشگوار ماحول بالخصوص امرا کی بے نظیر فیاضیاں اور قدردانیاں ، نووارد شعرا کے حق میں مفید اور ان کے ہندوستان میں قیام کا باعث ہوئیں ، جن کے زیرِ اثر انہوں نے یہاں فارغ البال و مرفہ الحال رہ کر اپنی تمام تر توجہ قصیدے ، غزل اور مثنوی پر صرف کی ، جن سے ان اصنافِ سخن کو حیرت انگیز ترقی نصیب ہوئی ۔"

جس کسی نے ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے ، وہ شمس العلماء کی اس رائے سے بہت حد تک اتفاق کرے گا لیکن اس قول کا اطلاق محمود کے درباری شعرا پر کیسے ہو سکتا ہے ۔ محمود کے عہد میں ہندوستان میں وہ کون سے امرا تھے جن کی بے نظیر فیاضیاں اور قدردانیاں نووارد شعرا کے حق میں ابرِ رحمت ثابت ہوئیں ۔ فرخی کا محمود کے ہمراہ ہندوستان آنا اس کے قصائد سے ثابت ہے لیکن وہ ہندوستانی فضا کا دل دادہ کب تھا ؟ کس جگہ اس نے

۱۔ شعر العجم ، حصّہ اول ، صفحہ ۱۸۷ ۔

ہندوستان میں قیام کرنے کی خواہش کی کہ وہ یہاں کے خوشگوار ماحول سے متنفّر ہوتا ؟ آخر اس قسم کی فرضی اور خیالی باتوں سے کیا فائدہ ہے ۔

اس بحث کے ضمن میں شمس العلماء کی تعلّی قابل ملاحظہ ہے :

''مبصّر حسب معمول ایسی پوچ دلیل کتاب کی تنقیص کی دھن میں لے آئے جس کے عنکبوتی تار و پود کے لیے صرف ایک پھونک کافی ہے ۔''

خدا کی شان ہے کہ شیش محل میں بیٹھ کر شمس العلماء دوسروں پر پتھر پھینکنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

صفحہ ۴۴ ۔ ذکرِ سومنات و قدح آن :

محمود غزنوی کے سفرِ سومنات کے متعلق فرخی کا مشہور قصیدہ ہے جس کی سرخی شمس العلماء نے ''در ذکر سفر سومنات و قدح آن'' دی ہے ۔ شیرانی صاحب نے بتایا ہے کہ یہ 'قدح' تو 'مدح' کی ضد ہے ، اس کی جگہ پر اگر 'فتح' پڑھا جائے تو عبارت کی تمام گنجلک دور ہو جاتی ہے ۔

ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ ایسی صاف اور واضح بات کو شمس العلماء قبول فرمائیں گے لیکن چونکہ ان کے قلمی نسخے میں 'قدح' ہے وہ 'فتح' کو کیوں کر پسند کرنے لگے ۔ چنانچہ ان کے نزدیک 'قدح' زیادہ صحیح اور 'فتح' سے بہتر قرأت ہے ۔

''قدح کے معنی شکست کے ہیں ۔ فرخی اسی قدح یعنی شکستِ سومنات کا ذکر کرتا ہے ۔ اس بت کو محمود نے اپنے ہاتھ سے شکست کیا تھا ، جو تاریخی واقعہ ہے اس لیے عنوان نظم میں 'قدح' کا لفظ ہی بمعنیٰ شکست موزوں اور مناسب ہے ۔''

عربی میں اس قسم کے توڑنے کے لیے 'قدح' استعمال نہیں کیا جاتا ۔ شاید شمس العلماء واحد و منفرد عربی دان ہوں گے جو 'قدح' کا لفظ توڑنے کے لیے استعمال کریں گے ۔ اس کے علاوہ اگر شمس العلماء دیوان[1] فرخی مرتّبہ عبدالرسولی ملاحظہ فرمانے کی تکلیف گوارا کریں تو وہاں بھی انہیں ''در ذکر سفر سومنات و فتح آن'' ملے گا ۔ ایسی حالت میں جب کہ شمس العلماء کوئی معقول دلیل اپنے

۱۔ دیوان فرخی ، صفحہ ۶۷ ۔

دعوے کی حمایت میں نہیں لا سکتے ، شیرانی صاحب کی مجوزہ قرأت ماننے کے سوا ان کے لیے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا ۔ عربی لغت سے قطع نظر اگر اس سرخی پر نظر ڈالیں جو شمس العلماء نے اس قصیدے کے لیے تجویز کی ہے تو لفظ 'قدح' کے استعمال کی غیر معقولیت عیاں ہو جاتی ہے :

''در ذکر سفرِ سومنات و قدح آن و شکستن منات و رجعت سلطان گوید ۔''

غلطی سے بعض مسلمان مصنّف اور شاعر مثلاً گردیزی اور فرخی اس بت کا نام منات بتاتے ہیں ۔ گردیزی[1] کی مندرجہ ذیل عبارت اس قیاس کی مؤید ہے :

''و پیش او حکایت کردند کہ بر ساحل دریای محیط شہریست بزرگ و آن را سومنات گویند و آن شہر مر ہندوان را چنانست کہ مر مسلمانان را مکہ و اندرو بت بسیار است از زر و سیم و منات را کہ بروزگار سید عالم صلی اللہ علیہ وسلّم از کعبہ براہ عدن گریزانیدند بدانجاست ۔''

چنانچہ گردیزی وغیرہ کے نزدیک سومنات اس شہر کا نام ہے اور وہاں کے بڑے بت کا نام منات ہے ۔

اب شمس العلماء کی اپنی تجویز کردہ سرخی بھی ان کے دعوے کی تردید کر رہی ہے اور پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہاں 'قدح' نہیں بلکہ 'فتح' صحیح اور موزوں قرأت ہے ، ورنہ سومنات کا توڑنا اور منات کا توڑنا نہایت ہی نامناسب تکرار ہوگی ۔

صفحہ ۳۵ ۔ ''گرد حوضِ اندر'' کے معنے :

فراخ پہنا حوضی بہ صد ہزار عمل
ہزار بتکدۂ خرد گرد حوضِ اندر

'فراخ پہنا' کی جگہ شیرانی صاحب نے 'دراز و پہنا' قرأت تجویز کی جسے شمس العلماء نے 'دراز پہنا' بنا کر بدل دیا اور پھر یوں تعریض کرنے لگے :

''پہلی اصلاح جو فرخی کے کلام میں ہے اس کی داد تو اہلِ زبان اساتذہ ہی دے سکتے ہیں ۔''

ہمیں اسی بات کا افسوس ہے کہ شمس العلماء اہل زبان اساتذہ سے کہا حقہ

---

[1] ۔ زین الاخبار ، صفحہ ۸۶ ۔

استفادہ نہیں کرتے ورنہ انہیں اس قسم کی شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔ علی عبدالرسولی نے بڑی محنت اور سلیقے سے دیوان فرخی شائع کیا ہے۔ شمس العلماء دیکھ سکتے ہیں کہ اس ایرانی فاضل نے بھی 'دراز و پہنا'[1] کو بہتر قرأت سمجھتے ہوئے اسے ترجیح دی ہے۔

'ہزار بتکدۂ خرد گرد حوض اندر' میں 'گرد حوض اندر' کا ترجمہ شمس العلماء 'حوض کے اندر' کرتے۔ ہیں شیرانی صاحب کے نزدیک 'گردا گرد' یا 'حوض کے گرد' صحیح ہے۔

شمس العلماء کو شیرانی صاحب کی اصلاح اس بنا پر پسند نہیں کہ اس میں شاعر کے 'اندر' کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ ان کی رائے میں شاعر کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ حوض کے اندر کی جانب چاروں طرف چھوٹے چھوٹے بت تھے۔

شمس العلماء تو ماشاءاللہ بڑے پروفیسر ہیں۔ معمولی استعداد رکھنے والے بھی جانتے ہے کہ پرانے اساتذہ کے یہاں 'اندر' کا لفظ اکثر زائد ہوتا ہے۔ قدما کو تو جانے دیجیے، قاآنی جیسا شاعر، جو قدما کی طرز کو زندہ کرنے والا ہے، 'اندر' کو بطور زائد لفظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتا ہے:

باللہ اگر نگاہ برون آید از دو چشم
چون سنگ بفسرد بمیان رہ اندرا

خود فرخی کے کلام سے اس کی مثالیں دی جا سکتی ہیں:

بوقت شاہجہان گر پیمبری بودی
دویست آیت بودی بشان شاہ اندر

بہ سبزہ درون لالۂ نوشکفتہ
عقیق است گویی بہ پیروزہ اندر

'گرد حوض اندر' میں بھی 'اندر' کالفظ زائد ہے او رشیرانی صاحب کے مجوزہ معنی صحیح اور قرینِ قیاس ہیں۔ اس کے علاوہ فرخی بتوں کا نہیں بلکہ

۱- دیوان فرخی، صفحہ ۷۰۔

چھوٹے چھوٹے بتکدوں کا ذکر کرتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ حوض کے گرد چاروں طرف چھوٹے چھوٹے ہزار بت خانے تھے -

شمس العلماء شاید یہ حجت پیش کریں کہ گرد کے اندر کی مثال تو پیش نہیں کی گئی - ہم ان کی تشفی کے لیے چند مثالیں درج کرتے ہیں :

بزیرش اندر شاخ بنفشہ گشت ز کال
بگردش اندر برگ شکوفہ گشت شرار

(مسعود سعد سلمان)

دو شب گوئی بیک جای‌اند گرد یک بہار اندر
و یا زلفین مشکین است گرد روی یار اندر

(معزی)

مسعود اور معزی سے بھی پیشتر فردوسی نے 'شاہ نامہ' میں جابجا لفظ 'اندر' اور 'اندرون' کو زائد کے طور پر استعمال کیا ہے - ہم یہاں صرف ایک مثال پر قناعت کرتے ہیں جس میں 'گرد' کے بعد 'اندر' استعمال ہوا ہے :

خرامان بہ گرد گل اندر تذرو
خروشیدن بلبل از شاخ سرو

نظم تو ایک طرف رہی بعض اوقات نثر میں بھی 'اندر' بطور زائد استعمال ہوا ہے مثلاً 'زین الاخبار' مرتبہ ڈاکٹر ناظم کے صفحہ ۹۹۸ پر یہ عبارت ملتی ہے "و چندگاہ وزارت کردہ بخوارزم اندر -"

صفحہ ۹۴ - مختاری غزنوی :

غزنی کے مشہور شاعر مختاری کے متعلق شمس العلماء نے مندرجہ ذیل دعوے کیے ہیں :

(۱) مختاری سلطان ابراہیم کے عہد میں ہندوستان آیا اور پنجاب میں آباد ہو گیا -

(۲) ملتان کے نخاس سے اس نے ایک ہندی غلام خریدا -

(۳) دولت شاہ کی سند پر شمس العلماء کا بیان ہے کہ مختاری کے ایک مشہور قصیدے کی تقلید میں ، جس کا مطلع درج ذیل ہے ، اکابر شعرا نے

قصیدے لکھے لیکن مختاری کی سی خوبی پیدا نہ کر سکے :

مسلمانان دلی دارم کہ ضائع می‌شود جانش
در افتادم بدان دردی کہ پیدا نیست درمانش

شیرانی صاحب کو مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر شمس العلماء کے یہ دعوے قابلِ قبول نہیں :

(۱) "اگر سلطان ابراہیم کے عہد میں مختاری ہندوستان آیا ہوتا تو ضرور اس کی مدح میں کوئی نہ کوئی قصیدہ لکھتا ۔ مختاری کا پنجاب میں آ کر آباد ہونا اور لاہور و ملتان میں رہ کر قصائد لکھنا ایک ظنّی معاملہ ہے جو ثبوت کا محتاج ہے ۔ اگر وہ ہندوستان آیا ہے تو چلتا پھرتا آیا ہے ۔"

یہاں شمس العلماء کے دو دعوؤں کے متعلق شک کا اظہار کیا گیا ہے ۔ ایک تو یہ کہ مختاری سلطان ابراہیم کے زمانے میں ہندوستان آیا اور دوسرے یہ کہ وہ پنجاب میں آ کر آباد ہو گیا ۔

شمس العلماء اس شک کا ازالہ کسی معقول توجیہ سے نہیں کر سکے ۔ پہلے تو شیرانی صاحب کی اس دلیل کے متعلق کہ چونکہ مختاری کا کوئی قصیدہ اس کے دیوان میں سلطان ابراہیم کی شان میں موجود نہیں ہے ، اس لیے مختاری ابراہیم کے عہد میں نہیں آ سکتا ، شمس العلماء ایک غیر متعلق بحث چھیڑ دیتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شاعر بھی ہندوستان آئے وہ بادشاہ کی شان میں ضرور قصیدہ کہے لیکن یہ دلیل مختاری کے بارے میں کیوں کر تسلیم کی جا سکتی ہے ۔ جب خود شمس العلماء دولت شاہ اور رضا قلی ہدایت کی تقلید میں یہ دعوے کرتے ہیں کہ مختاری نے برسوں تک سلطان ابراہیم کی مدح میں قصائد کہے ہیں ۔ کیا شمس العلماء کے یہ دونوں قول ایک دوسرے کی تردید نہیں کرتے ؟ اگر مختاری سلطان ابراہیم کا مداح تھا تو وہ تمام قصیدے کہاں گئے جو اس نے سلطان کی مدح میں کہے تھے ؟ واقعہ یہ ہے کہ مختاری کی شاعری کا زمانہ ، جیسا کہ شیرانی صاحب نے لکھا ہے ، سلطان ابراہیم کے بیٹے سلطان مسعود کا عہد ہے ۔ سلطان ابراہیم کا عہد ۴۵۱ سے ۴۹۲ ہجری تک ہے اور اس کا بیٹا مسعود ۴۹۲ سے ۵۰۹ ہجری تک سریرِ حکومت پر ممتکن رہتا ہے ۔ ادھر مختاری ۵۵۴ ہجری

میں غزنی میں انتقال[1] کرتا ہے (بعض کے نزدیک اس کی تاریخ وفات ۵۴۴ ہجری ہے) ، اگر یہ سنہ وفات درست ہو تو مختاری کے سلسلے میں یہ فرض کرنا بہت ضروری ہوگا کہ وہ کم از کم ۴۷۲ ہجری میں پیدا ہو چکا ہو تا کہ بیس برس کی عمر میں اس نے سلطان ابراہیم کی مدح میں قصیدے لکھے ہوں ، لیکن چونکہ اس کے دیوان میں کوئی قصیدہ سلطان ابراہیم کی مدح میں نہیں ہے اس لیے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ وہ سلطان ابراہیم کی وفات کے وقت کم عمری کی بنا پر کسی شاعرانہ شہرت کا مالک نہ ہو ۔ اس کے برعکس سلطان مسعود (از ۴۹۲ تا ۵۰۹ ہجری) کی مدح میں اس کے کئی قصیدے ملتے ہیں ۔ نیز اس نے 'شہریار نامہ' میں بھی مسعود کا نام لیا ہے ۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس سلطان کے نام پر یہ مثنوی لکھی گئی ہو :

گل باغ و بستان محمود شاہ
جہانجوی بخشندہ مسعود شاہ

پنجاب میں آ کر مختاری کے آباد ہونے کو شیرانی صاحب نے ایک ظنی معاملہ بتایا تھا جس پر شمس العلماء نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"وہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کی تائید 'مجمع الفصحا' کے مذکورہ بالا بیان سے بھی ہوتی ہے ۔"

شمس العلماء کے اس غلط بیان میں سچائی کا شائبہ تک نہیں ۔ ہم یہاں 'مجمع الفصحا' کے الفاظ تک نقل کیے دیتے ہیں :

"و سالہا در خدمت ملک ارسلان سلجوقی و سلطان ابراہیم غزنوی نیز مداحی نمودہ ۔"

اب شمس العلماء خود ہی فرمائیں کہ کس جگہ صاحب 'مجمع الفصحا' مختاری کا پنجاب میں آباد ہونا بیان کرتا ہے ۔ شاید شمس العلماء اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ چونکہ سلطان ابراہیم غزنوی کا مستقل قیام لاہور میں تھا اس لیے مختاری نے لاہور میں رہ کر سلطان ابراہیم کی مدح میں قصیدے کہے ہوں گے ۔ اگر وہ تاریخی ماخذ کی طرف رجوع کریں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ سلطان ابراہیم کا

۱۔ تاریخ ادبیات ایران ، از رضا زادہ شفق ، صفحہ ۲۰۱ ۔

پایۂ تخت غزنین تھا اور پنجاب میں اس کے مقرر کردہ نائب حکومت کرتے تھے ۔ فرشتہ[1] ، سلطان ابراہیم کی آمد ہند ۴۷۲ ہجری میں لکھتا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سلطان ابراہیم کی مدح میں مختاری کا کوئی قصیدہ نہیں ملتا ۔

شیرانی صاحب کا یہ آسان فقرہ کہ 'اگر مختاری ہندوستان آیا ہے تو چلتا پھرتا آیا ہے' شمس العلماء کے لیے ایک ناقابلِ فہم معمہ بن گیا ہے ۔ اس اردو جملے کے بارے میں ان کا رویہ حد درجہ افسوس ناک اور مضحکہ خیز ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

''مصنّف نے اپنے بیان میں کسی جگہ یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مختاری بغیر چلے پھرے یا بیٹھے بیٹھے ہندوستان وارد ہو گیا ہے اس لیے معترّ کے اعتراض کا یہ ٹکڑا بے محل ہے ۔''

ملاحظہ کی آپ نے شمس العلماء کی سنجیدہ نگاری اور متانت کہ ایک سیدھی بات کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں ، گویا وہ ''چلتے پھرتے'' کے مفہوم سے ابھی تک نا آشنا ہیں ۔

(۲) اسی طرح شمس العلماء یہ ثابت کرنے سے بھی قاصر رہے ہیں کہ مختاری نے ملتان کے بازار سے ایک ہندی غلام خریدا تھا ۔ لیکن جو دلیل انھوں نے اپنے دعوے کے اثبات میں پیش کی ہے وہ ضرور دلچسپ ہے ۔ فرماتے ہیں :

''نیز مختاری کا ملتان کے بازار سے ایک غلام خریدنا اور اس کی خریداری میں اپنے ایک مربیؒ امیر عثمان بن عبداللہ بن اسماعیل کی امداد سے کامیاب ہونا مختاری ہی کے اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے ، چنانچہ وہ اپنے قصیدے میں غلام کی زبان سے کہتا ہے :

گفت رو تدبیر زر کن جان مدہ زیرا کہ ہست

چون ترا از جان خداوند و مرا شد در گزیر (کذا)[2]

۱۔ تاریخ فرشتہ ، جلد اول ، صفحہ ۴۸ ۔

۲۔ چون ترا از جان خداوند و مرا از زر گزیر (دیوان مختاری ، طبع ایران ، سنہ ۱۳۳۶ع ، صفحہ ۱۰۴) ۔

گرت باید آستین از بهر[1] من پر زر کنی
دامن عثمان عبداللہ اسماعیل گیر"

مندرجہ بالا اشعار میں تو غلام شاعر کو ابھار رہا ہے کہ تو مجھے عثمان عبداللہ اسماعیل کی امداد سے خرید سکتا ہے ۔ یہاں ملتان کے بازار کا ذکر کہیں موجود نہیں ۔ یہ کہیں بہتر ہے کہ آدمی اپنی غلطی تسلیم کر لے ، نہ یہ کہ اس کی حمایت میں مزید غلطی اس سے سرزد ہو ۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم شمس العلماء کی اضطراری کیفیت کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں ؛ جس قصیدے کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ مختاری نے اس میں ملتان کے بازار سے ہندی غلام کا خریدنا بیان کیا ہے ، اس کا مطلع خود انھوں نے یہ نقل کیا ہے (اصل کتاب صفحہ ۱۸۵) :

یکی غلامک هندی خریدم از بازار
بدان بہا کہ ز گفتار آنم آید عار

لیکن اپنی صفائی پیش کرتے وقت بحر اور قافیہ سب کو خیر باد کہتے ہوئے ایک دوسرے قصیدے کا حوالہ دیتے ہیں جس کا مطلع یہ ہے :

دی غلامی دیدم اندر راه چون مہر منیر
کز برون گل بود و مشک و از درون می بود و شیر

اس پر طرّہ یہ ہے کہ اس دوسرے قصیدے میں بھی ملتان کے بازار کا ذکر سرے سے غائب ہے ۔ کون صاحبِ ذوق ایسی عالمانہ نکتہ سنجی کی داد نہ دے گا ؟

(۳) شمش العلما نے دولت شاہ کی سند پر ایک قصیدے کا یہ مطلع مختاری کی طرف منسوب کیا ہے :

مسلمانان دلی دارم کہ ضائع می شود جانش
در افتادم بدان دردی کہ پیدا نیست درمانش

اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اکابر شعرا مثلاً خاقانی ، انوری ، سلمان ، امیر خسرو اور عرفی نے اس قصیدے کی تقلید میں قصائد لکھے لیکن بہترین قصیدہ مختاری ہی کا ہے ۔

۱۔ طبع ایران میں 'مہر من' ۔ (مرتب)

شمس العلماء کے اس بیان پر شیرانی صاحب نے تین اعتراض کیے :
(اول) یہ مطلع مختاری کے قصیدے کا نہیں ہے بلکہ دولت شاہ نے دو مختلف مصرعوں کو ملا کر ایک مطلع تیار کر دیا ہے ۔ دوسرا مصرع ادیب صابر کے مطلع کا دوسرا مصرع ہے ۔ ادیب صابر کا مطلع یہ ہے :

دلم عاشق شدن فرمود و من بر حکم فرمانش
در افتادم در آن دردی کہ پیدا نیست درمانش

(دوم) شمس العلماء کا یہ دعویٰ کہ اس قصیدے کا جواب خاقانی ، انوری وغیرہ نے دیا ہے ، اصولاً صحیح نہیں ، اس لیے جیسا کہ ادیب صابر کی اس تلمیح سے معلوم ہوتا ہے ، اس زمین میں سب سے پہلا قصیدہ مسعود سعد سلمان کا ہونا چاہیے :

گر این طرز سخن در شاعری مسعود را بودی
بجان صد آفرین کردی روان سعد سلمانش

شیرانی صاحب کا قیاس درست ہے ۔ دیوان مسعود سعد سلمان ، مرتبہ رشید یاسمی کے صفحہ ۶۰۶ پر ہم ایک ناتمام قصیدہ پاتے ہیں جس کا پہلا شعر یہ ہے :

سخا زریست کز ہمت زند رای تو بر منگش
سخن نظمیست کز معنی دہد رای تو سامانش

(سوم) اس زمین میں بہترین اور مشہور ترین قصیدہ خاقانی کا ہے ، نہ کہ مختاری کا ۔

پہلے اعتراض کے جواب میں شمس العلماء فرماتے ہے کہ مطلع بلا شبہہ مختاری کا ہے اور اس کے دیوان میں موجود ہے اور اگر مطلع مذکور کا دوسرا مصرع ادیب صابر کے دیوان میں نکل آیا تو یہ امر ان کے نظریے کے ثبوت میں ایک اور زبردست دلیل ہے ۔

شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں نہ صرف مختاری کا مطلع نقل کیا ہے بلکہ دو شعر اور بھی درج کر دیے ہیں ۔ مطلع یہ ہے :

مسلمان کشتن آئین کرد چشم نامسلمانش
بنوک ناوک مژگان کہ پر زہر است پیکانش

نیز یہ قصیدہ سلطان ابراہیم کی مدح میں نہیں جیسا کہ شمس العلما ہمیں یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں ، بلکہ محمود روباہی کی تعریف میں ہے ۔ مادح اور ممدوح کے

نام شعر ذیل میں آئے ہیں :

کہ گر عثمان مختاری بدرد از داد درماند
بجز محمود روباہی کہ داند کرد درمانش

اس قصیدے کا یہ مطلع 'مجمع الفصحا'[1] میں بھی اسی صورت میں دیا گیا ہے۔ شمس العلماء کو چاہیے کہ اپنے خاص مخطوطے میں سے اس قصیدے کے وہ اشعار کر نقل دیں جن میں سلطان ابراہیم کی تعریف کی گئی ہے تاکہ بقول ان کے حق اور باطل میں امتیاز ہو جائے۔

دوسرے اعتراض کے متعلق شمس العلماء بالکل خاموش ہیں اور انھوں نے دیوان مسعود سعد سلمان کی ورق گردانی کو غیر ضروری سمجھا ہے حالانکہ ادیب صابر کی تلمیح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مسعود سعد کا جواب لکھ رہا ہے ، نہ کہ مختاری کا۔

جہاں تک اس سرزمین میں بہترین قصیدے کا تعلق ہے ، شاید شمس العلماء بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ بہترین قصیدہ خاقانی کا ہے۔ البتہ وہ مختاری کو شرف اولیت کا مالک بتاتے ہیں جو ادیب صابر کی تصریح کے پیش نظر بہت حد تک ظنی رہ جاتا ہے۔

دولت شاہ کے نامور ہم عصر مولانا جامی نے بھی اس زمین میں ۱۳۰ شعر کا قصیدہ لکھا ہے جس کا نام انھوں نے 'جلاء الروح' رکھا ہے۔ اس میں وہ خاقانی اور امیر خسرو کے قصیدوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

بخاقانی ازان بحر ار رسد رشحی بر انگیزد
چو سوسن تر زبان تحسین کنان از خاک شروانش

وگر خسرو سقاک اللہ ہمی یابد ازان رشحہ
شود سیراب فیض عین عرفان جان عطشانش

اس زمین میں عرفی کا قصیدہ بھی مشہور ہے۔ وہ بھی خاقانی کی طرف اشارہ کرتا ہے :

دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ بر خیزد
بہ امداد صبا اینک فرستادم بشروانش

۱- مجمع الفصحا ، جلد اول ، صفحہ ۶۰۳ -

شمس العلماء ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ جامی اور عرفی کہیں مختاری کا نام تک نہیں لیتے ہیں ۔

صفحہ ۹۴ : (۱) غزنین کے مقابلے میں لاہور کا دارالسلطنت بنایا جانا :
(۲) سبکتگین کے عہد میں اہلِ ہند کا فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہونا :

شمس العلماء کا کہنا ہے کہ محمودی دور میں پنجاب کے الحاق کے بعد لاہور میں پہلا دربار منعقد ہوتا ہے ۔ اہلِ ہند سبکتگین کے زمانے ہی سے فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہو چکے تھے ۔ جب محمود کا فاتحانہ داخلہ ہندوستان میں ہوا ، فارسی علوم کو ماضی کے مقابلے میں بے مثال فروغ ملا ۔ اس بنا پر وہ فارسی زبان اور فارسی طریقِ زندگی سے کامل طور پر واقف ہوگئے اور محمود کی وفات سے فوراً بعد لاہور فی الواقعہ غزنی کے مقابلے میں ترجیحاً دارالسلطنت بنا دیا گیا ہے (اصل کتاب ، صفحہ ۱۹۰) ۔

شمس العلماء کے اس ارشاد میں امور ذیل تنقیح طلب ہیں :

(۱) اگر کوئی دربار محمودی عہد میں پنجاب کے الحاق کے بعد لاہور میں منعقد ہوا تو اس کے علمی اور ادبی اثرات کتنے دور رس ہو سکتے ہیں ؟
(۲) کیا اہلِ ہند سبکتگین کے زمانے ہی سے فارسی جذبات سے آشنا ہو چکے تھے ؟
(۳) کیا محمود کی وفات سے فوراً بعد لاہور فی الواقع غزنی کے مقابلے میں ترجیحاً دارالسلطنت بنا دیا گیا ؟

شیرانی صاحب کو ان تینوں امور کی صحت میں اس بنا پر شک ہے کہ محمود کے لاہور میں دربار منعقد کرنے اور اس کو بحیثیت دارالحکومت غزنی پر ترجیح دینے کے سلسلے میں تفصیلی اطلاع کسی مستند تاریخ میں نہیں ملتی ، اور اس کے علاوہ محمودی سیاست کی رو سے بھی یہ ناقابلِ عمل ہے ، اس لیے کہ ہندوستان سے زیادہ محمود کو ایران و توران کے ساتھ دلچسپی تھی ۔ شیرانی صاحب ، شمس العلماء کے اس نظریے کو کہ سبکتگین کے عہد سے اہلِ ہند فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہو چکے تھے ، فرضی اور بے بنیاد قرار دیتے ہیں ۔

چونکہ شمس العلماء کے اکثر دعوے شرمندۂ دلیل و برہان نہیں ہوتے ، انھیں

ناچار غیر متعلق چیزوں میں پناہ لینی پڑتی ہے ۔ کہنے کو تو کہہ گئے کہ محمود کے عہد میں لاہور میں دربار منعقد ہوتا ہے لیکن اس بیان کے لیے ماخذ کہاں سے لائیں ؟ اپنے کو مجبور پا کر یوں عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں :

''مصنف کے یہ بیانات کسی ایک تاریخ کے صفحات میں مسطور نہیں ملیں گے اور نہ ان کا کسی ایک جگہ مجتمع ہونا متصور ہے کہ مبصّر چند سطریں پڑھ کر بطور سند اپنے پاس رکھیں ۔''

یہ تو تھی شمس العلماء کی مجبوری اور بے بسی ، اب ان کی مدافعت کا دوسرا حربہ شیرانی صاحب پر انگریزی نہ سمجھنے اور بد دیانتی کا وہی پرانا الزام ہے جس کی حقیقت ابھی منکشف کی جائے گی ۔

غزنین کے مقابلے میں لاہور کے دارالسلطنت بننے کے حق میں انھوں نے ''ثقات مؤرخین'' میں سے دو کے حوالے دیے ہیں ۔ ایک تو فرشتہ کی شہادت ہے :

''گویند غزنین را در آن سال از بلاد هند می شمردند ۔''

اور دوسری شہادت ایک گمنام تذکرۂ سلاطین آل غزنین کی ہے :

''مستقر سلطان گاہ غزنین بوده و گاه لاہور و ہر دو را از یک خطہ می دانند و سلطان بیشتر اوقات بہ لاہور پرداخت ۔''

فرشتہ کی عبارت سباق و سیاق سے علیحدہ کرکے شمس العلماء نے قاری کے دل میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ، حالانکہ فرشتہ کا مفہوم بالکل جدا ہے ۔ تھانیسر کے خلاف محمود کی کامیاب مہم کا ذکر کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے کہ اس مہم میں اتنے ہندوستانی غلام محمود کے لشکریوں کے ہاتھ آئے کہ ہر ایک لشکری کے پاس کئی غلام تھے ۔ غزنی میں یہ ہندوستانی غلام اتنی بڑی تعداد میں موجود تھے کہ لوگ غزنی کو ہندوستان کا ایک ٹکڑا سمجھتے تھے ۔ فرشتہ کے اصلی الفاظ یہ ہیں :

''قریب دویست هزار بنده و برده از آن ولایت بغزنی برد ، گویند غزنی را در آن سال از بلاد هندوستان می شمردند ، چه که هر یک از آحاد الناس لشکر سلطان مالک چندین کنیز و غلام شده بودند ۔''

شمس العلماء کی یہ قطع و برید کہاں تک علمی دیانت کے اصول کے موافق ہے ، اس کا فیصلہ قارئین کرام خود کر سکتے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ شمس العلماء کی عالمانہ تحقیق مستحق تحسین و ستایش ہے ۔

یہاں ذکر ہے لاہور کے دارالسلطنت بنائے جانے کا جو بقول شمس العلماء ۴۱۲ھ میں فتح ہوتا ہے ۔ حالانکہ فرشتہ تھانیسر پر محمود کی فوج کشی کا ذکر کرتا ہے جو گردیزی[1] اور فرشتہ[2] کے قول کے مطابق ۴۰۲ھ میں فتح ہوتا ہے (ڈاکٹر ناظم فتح تھانیسر کی تاریخ ۴۰۵ھ دیتے ہیں) ۔ تاریخ فرشتہ کا جو اقتباس شمس العلماء نے دیا ہے وہ فتح تھانیسر کے متعلق ہے جب کہ ابھی لاہور فتح بھی نہ ہوا تھا ۔ غالباً شمس العلماء نے مسئلے کے اس پہلو پر غور فرمانے کی کوشش نہیں کی ورنہ وہ یہ دعویٰ نہ کرتے کہ :

''ثقات مؤرخین کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان محمود کے عہد میں غزنی کوئی مستقل علیحدہ دارالحکومت نہیں رہا بلکہ اس کو ہندوستان کا ایک شہر قرار دے کر غزنی تک پورے خطے کو ایک قلمرو اور ہندوستان کا ایک قطعہ شمار کیا جاتا تھا ۔''

یہ تو تھی فرشتہ کی شہادت کی اہمیت ، باقی رہی شمس العلماء کے گمنام تذکرے کی شہادت ؛ اول تو اس میں عبارت سباق و سیاق سے الگ کر کے پیش کی گئی ہے ، دوم سلطان کا نام تک موجود نہیں ۔ آیا یہ سلطان محمود ہے یا اس کا کوئی جانشین ؟ سوم اگر یہاں سلطان سے مراد محمود ہی ہو جب بھی قدیم اور مستند تاریخوں کے بیانات کی موجودگی میں اس گمنام اور متاخر تذکرے کی شہادت ناقابلِ قبول رہتی ہے ۔ فتح پنجاب کے بعد لاہور البتہ صوبائی حکومت کا پایۂ تخت یا صدر مقام مقرر کیا جاتا ہے ۔ غزنی سے ہمیشہ نائب مقرر ہو کر یہاں آتے رہے ، یہاں تک کہ ۵۵۰ ہجری کے بعد غز ، غزنی پر قبضہ کر لیتے ہیں اور غزنوی سلطان خسرو شاہ خود مجبور ہو کر لاہور میں پناہ لیتا ہے اور وہیں ۵۵۵ھ میں اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے ۔

شمس العلماء کا ارشاد ہے کہ محمود کی وفات سے فوراً بعد لاہور غزنی کے مقابلے میں ترجیحاً دارالسلطنت بنایا جاتا ہے ، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ واقعات ان کے بیان کی تائید نہیں کرتے ۔ اس قسم کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے

۱- زین الاخبار ، صفحہ ۷۰ ، ۷۱ ۔

۲- تاریخ فرشتہ ، جلد اول ، صفحہ ۲۷ ۔

جس نے سلاطین غزنہ کی تاریخ کا بہت ہی سرسری مطالعہ کیا ہو ۔ محمود کی وفات کے وقت ہندوستان کا سالار حاجب ارباق تھا ، جس کے دماغ میں بقول بیہقی بادِ نخوت بھری ہوئی تھی اور جس کو خواجہ احمد حسن میمندی بڑی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ راضی کر کے اپنے ساتھ لے گئے ۔ چونکہ اس کی سرکشی اور نخوت خطرے سے خالی نہ تھی ، اسے بلخ میں ۱۹- ربیع الاول[1] ۴۲۲ھ میں گرفتار کر کے گوشۂ گمنامی میں پھینک دیا گیا اور اس کی جگہ احمد نیالتگین (یا نیالتگین) کو ہندوستان کا سالار مقرر کیا گیا ۔ جب نئے سالار نے سرکشی کی ٹھانی تو اس کی سرکوبی کے لیے تلک کو بھیجا گیا ۔ لیکن دارالسلطنت غزنی ہی رہتا ہے ۔ جب امیر مسعود نے سپاہان (اصفہان) میں سلطان محمود کی وفات اور اپنے بھائی امیر محمد کی تخت نشینی کی خبر سنی تو اس نے بہت رنج و ملال کا اظہار کیا ۔ اسی اثنا میں اس کی عمۃ حرۃ ختلی کا ایک خط ملتا ہے ، جس میں وہ تمام واقعات بیان کرتے ہوئے مسعود کو غزنی پہنچنے کے لیے تاکید کرتی ہے ۔ چونکہ اس کے نزدیک ''اصل غزنین است و آنگاہ خراسان و دیگر ہمہ فرعست'' ۴۲۲ھ میں جمادی الاخریٰ کی آٹھویں تاریخ کو مسعود غزنی میں داخل ہوتا ہے ، جسے بیہقی ، 'حضرۃ[2] دارالملک' کہہ کر پکارتا ہے ۔ اس مختصر سے بیان میں غزنی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

۴۲۷ھ میں امیر مسعود اپنے بیٹے مجدود کو ہندوستان کا والی مقرر کرتا ہے ، چنانچہ اس سال کے تحت بیہقی لکھتا ہے :

''روز شنبہ سوم ذی قعدہ امیر مجدود خلعت پوشید بہ امیری ہندوستان تا سوی الھور رود ۔''

اسی طرح گردیزی ۴۲۷ ہجری کے تحت سلطان مسعود کی ہندوستان پر فوج کشی اور ہانسی ، سونی پت اور دیرہ رام میں اس کی کارگزاری بیان کر کے لکھتا[3] ہے :

''امیر شہید (مسعود) عذر او (رام) قبول کرد و نثار پذیرفت و از آنجا

۱- تاریخ بیہقی ، مرتّبہ سعیدؔ نفیسی ، صفحہ ۲۶۹ ۔

۲- تاریخ بیہقی ، مرتّبہ سعیدؔ نفیسی ، صفحہ ۳۰۳ ۔

۳- زین الاخبار ، صفحہ ۱۰۲ ۔

باز گشت و روی بغزنین نہاد پس امیر مجدود بن مسعود را رحمہما اللہ ولایت لاہور داد و طبل و علم داد و او را باحشم و حاشیت سوی لاہور بفرستاد و خود سوی غزنین آمد ۔"

کیا بیہقی اور گردیزی کے صریح اور واضح بیانات کے بعد بھی شمس العلماء یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ محمود کی وفات کے بعد غزنی کے مقابلے میں لاہور کو دارالسلطنت بنا دیا گیا ہے ؟

سلطان ابراہیم غزنوی کا بیٹا سیف الدولہ محمود ، جو مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی کا ممدوح ہے ، ۴۶۹ھ میں ہندوستان کا نائب السلطنت مقرر ہوتا ہے ۔ چنانچہ مسعود اس کی طرف اپنے ایک قصیدے میں یوں اشارہ کرتا ہے :

چو روی چرخ شد از صبح چون صحیفۂ سیم
ز قصر شاہ مرا مژدہ داد باد نسیم
کہ عزّ ملّت محمود سیفِ دولت را
ابوالمظفر سلطان عادل ابراہیم
فزود حشمت و رتبت بدولت عالی
چو کرد مملکت ہند را بدو تسلیم
بنام فرخ او خطبہ کرد در ہمہ ہند
نہاد بر سر اقبالش از شرف دیہیم

سیف الدولہ محمود بڑا اولوالعزم شہزادہ تھا اور اس کی فتوحات نے سلطان محمود کی یاد تازہ کر دی تھی ۔ اس کے فتح نامے اس کے باپ سلطان ابراہیم کے پاس غزنی بھیجے جاتے تھے ، جیسا کہ مسعود سعد ایک قصیدے میں کہتا ہے :

ہزار شہر گشائی ز شہرہای بزرگ
ہزار نامۂ فتحت روذ سوی غزنین

ایک مرتبہ یہی شہزادہ جب اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوتا ہے تو مسعود کہتا ہے :

بنام ایزد بیچون بقصد حضرت سلطان
ز ہندستان برون آمد امیر و شاہ ہندوستان
ملک محمود ابراہیم امیرِ عالم عادل
کہ سیف دولت و دین است و عزّ ملت و ایمان

سلطان ابراہیم کے جانشین سلطان مسعود کے لیے طبقات ناصری[1] میں لکھا ہے :

''امیر عضدالدولہ (شیرزاد) را امارت ہندوستان مسلّم داشت ۔''

اسی مسعود بن ابراہیم کے ذکر کے ضمن میں فرشتہ[2] لکھتا ہے :

''و در عہد او حاجب طغاتگین مقطع لاہور بسبب سالاری ہندوستان فائز گردید ۔''

یہ حوالے اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ غزنی ہی غزنوی سلاطین کا دارالسلطنت تھا اور ہندوستان میں ان کے نائب السلطنت مقرر کیے جاتے تھے جن کا صدر مقام لاہور ہوتا تھا ۔ جب ۵۵۰ھ کے بعد خسرو شاہ غزنی چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو وہ البتہ لاہور کو اپنا دارالسلطنت بناتا ہے ۔

سبکتگین کے عہد میں اہلِ ہند کے فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہونے کے متعلق شمس العلماء کو شکایت ہے کہ شیرانی صاحب اپنے ترجمے میں دو فاحش غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ شمس العلماء کی اصل انگریزی عبارت یہ ہے :

"The Indian people had become familiar with stray expressions and sentiments in Subuktagin's time."

شمس العلماء شکایت کرتے ہیں کہ شیرانی صاحب نے 'stray' کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے اور 'expressions' کا ترجمہ 'جذبات' کیا ہے جو غلط ہے ۔ حضرت شمس العلماء کی خدمت میں مودبانہ گذارش ہے کہ شیرانی صاحب نے جیسا کہ وہ تبصرہ میں لکھتے ہیں 'ترجمہ نما خلاصہ' دیا ہے ، نہ کہ شمس العلماء کی عبارت کا 'لفظی ترجمہ' اس لیے ان کا یہ اظہار غیظ و غضب جائز نہیں ۔ شیرانی صاحب نے 'sentiments' کا مفہوم جذبات و خیالات بتایا ہے جو لغت کے اعتبار سے صحیح ہے ۔ ناراضی ظاہر کرنے کے بعد شمس العلماء نہایت معصومانہ انداز میں فرماتے ہیں :

''المختصر مصنف نے اپنی انگریزی عبارت میں صرف یہ کہا ہے کہ سبکتگین کے عہد میں اہلِ ہند کچھ منتشر فارسی کلمات و خیالات سے

۱۔ طبقات ناصری ، صفحہ ۲۲ ۔

۲۔ فرشتہ ، جلد اول ، صفحہ ۴۹ ۔

آسنا ہوگئے تھے ، جو ایک نہایت راست اور معتدل بیان ہے لیکن مبصّر نے اس میں ناروا تصرف کرکے اس کو قابلِ اعتراض اور محلّ گفت و شنید بنا دیا ، جو تبصرے کی شان سے ایک بعید امر ہے ۔''

شمس العلماء یہاں اس حقیقت کو بھول گئے کہ وہ اپنی کتاب کے صفحات ۷۰ و ۷۱ پر یہ فرما چکے ہیں کہ فارسی شاعری اور ایرانی کاچر کا ذوق سبکتگین کے زمانے میں جڑ پکڑ چکا تھا ۔ ہم ان کے اصل الفاظ نقل کر دیتے ہیں تاکہ قارئین خود اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ شمس العلماء کی یہ برافروختگی کہاں تک مناسب ہے ، جب کہ وہ عہد سبکتگین میں اہلِ ہند کے فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہونے کے دعوے سے بھی بڑھ کر ارشاد کر چکے ہیں :

"If seems probable, however, that the taste for Persian culture and Persian poetry had taken root in India during his (Mahmud's) father's regime, since the latter had visited India several times on his mission of conquest and returned to Ghazni soon after giving battles to Jaipal, the Brahman Raja of the Punjab."

یہ اقتباس شمس العلماء کے اس بیان کی تردید کے لیے کافی ہے کہ شیرانی صاحب نے ایک ایسی بات ان کی طرف منسوب کر دی جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی ۔

شمس العلماء ایک دوسری جگہ سلطان محمود کے زمانے سے بہت پہلے ایران کے علماء اور شعراء کی آمدِ ہند کا ذکر کرتے ہیں :

"Since long before Mahmud, there was a continual procession of scholars and poets from Persia and other countries coming to India." (p. 196)

کاش شمس العلماء اپنے نیازمندوں کو زیادہ نہیں تو کم از کم ایک دو شاعروں کے نام سے مطلع کرتے جو سلطان محمود کے عہد سے بہت پہلے ایران سے ہندوستان آئے اور جن کی بدولت ہندوستان میں فارسی ذوق نے ابتدائی مراحل طے کیے ۔

صفحہ ۵۹۔ مسعود سعد سلمان اور ادیب صابر :

ادیب صابر اپنی شاعری پر فخر کرتے ہوئے مسعود کی قوت کا تصور اپنے ذہن میں لاتا ہے :

گر این طرز سخن در شاعری مسعود را بودی
بجان صد آفرین کردی روان سعد سلمانش

شمس العلماء کے اس بیان پر شیرانی صاحب لکھتے ہیں :

''ہمارے نزدیک یہ شعر ایک شاعرانہ تعلّی ہے ۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ادیب صابر خواجہ مسعود کا معتقد اور مداح تھا جیسا کہ پروفیسر صفحہ ۲۰۵ پر ظاہر کر رہے ہیں ۔ اصل مقصد ذاتی تعریف ہے ۔''

اپنے نقطۂ نظر کی توضیح کے دوران میں شمس العلماء فرماتے ہیں کہ ادیب صابر کے شعر سے انھوں نے کہیں یہ ثابت نہیں کیا کہ وہ خواجہ مسعود کا معتقد اور مداح تھا اور یہ کہ ان کی انگریزی عبارت کا مطلب مبصّر نہیں سمجھ سکے ۔ اگر ان کا یہ بیان صحیح ہے تو پھر ہم ان سے یہ پوچھنے کے مجاز ہیں کہ کیا انھوں نے یہ شعر مسعود کی تنقیص کے لیے نقل کیا ہے ؟ اس سوال کا پُر لطف جواب شمس العلماء سے سنیے ۔ فرماتے ہیں :

''بالفاظ دیگر شعر ھذا سے ، جو مصنّف کے نزدیک ایک شاعرانہ تعلّی ہے ، مسعود کی تنقیص نکلتی ہے ۔''

خدا کا شکر ہے کہ ع :

متفق گردید رای بوعلی با رای من

شمس العلماء کے اس اقرار کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر کس سند پر وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۲ پر ادیب صابر کو مسعود سعد کا محض مقلّد ہی نہیں بتاتے بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ ادیب صابر مسعود کو اپنا اُستاد اور رہبر تسلیم کرتا ہے ۔ اور پھر صفحہ ۲۰۵ پر ادیب صابر کو مسعود کا مداح بتاتے ہیں ۔ چونکہ اس سوال کا جواب دینے سے شمس العلماء قاصر ہیں ، بہت ہی معقول اور پُر لطف انداز میں فرماتے ہیں :

''یہ مصنّف کی رائے ہے جو دیگر روایات و کیفیات پر مبنی ہے جس کے

ماننے یا نہ ماننے کا ہر قاری کو اختیار ہے۔"

(جوابِ تبصرہ ، صفحہ ۵۷)

صفحہ ۵۸۔ محمود غزنوی کے خطابات :

شمس العلماء محمود غزنوی کے خطابات کی ایک فہرست دیتے ہیں جس میں یمین الدولہ وامین الملۃ ، کو جو در اصل ایک خطاب ہے اور جو اس کی تخت نشینی سے ایک سال کے اندر اندر اسے مل چکا تھا ، دو جدا جدا خطاب ظاہر کرتے ہیں اور بعض ایسے خطابات کا ذکر کرتے ہیں مثلاً عضد الدولۃ ، مؤید الملۃ ، شہاب الدولۃ والدین ، جن کا ذکر معتبر تاریخی کتابوں میں نہیں ملتا ۔ اس کے علاوہ خطاب سیف الدولہ کا ذکر نہیں کرتے جو محمود کو سامانیوں کی طرف سے ملا تھا ۔

جوابِ تبصرہ میں شمس العلماء فرماتے ہیں کہ :

"پہلا خطاب یمین الدولہ درجِ کتاب ہے علیٰ ھذا امین الملہ بھی . . . صفحہ ھذا پر موجود ہے ۔ تیسرا خطاب 'سیف الدولہ' ضرور قابلِ ذکر ہے لیکن اس کا حوالہ کسی تذکرے یا تاریخ میں مصنف کی نظر سے نہیں گزرا اس لیے فہرست میں درج نہیں ہو سکا ۔"

یمین الدولہ و امین الملہ ایک خطاب ہے نہ کہ دو الگ الگ ، جیسا کہ شمس العلماء بتا رہے ہیں ۔ تعجب ہے کہ سیف الدولہ جیسا خطاب کیسے شمس العلماء کی نظر سے نہ گزرا ۔ غزنویوں کے متعلق ہر مشہور تاریخی کتاب میں 'سیف الدولہ' کا خطاب ملتا ہے ۔ الیمینی (مطبوعہ لاہور) کے صفحہ ۸۱ و ۸۲ پر یہ عبارت موجود ہے :

"و لقب الامیر الرضی الامیر سبکتکین بناصر الدولۃ و وارث ملکہ السلطان بسیف الدولۃ ۔"

ابوالفتح بستی اسی خطاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے :

بسیف الدولۃ اتسقت امور   رایناھا مبددۃ النظام

زین الاخبار صفحہ ۵۶ پر یہ عبارت ملتی ہے :

"پس او ابوالقاسم محمود بن ناصرالدولہ را سیف الدولہ لقب کرد ۔"

تاریخ بیہقی (مرتبہ سعید نفیسی) کے صفحہ ۲۳۱ پر اس خطاب کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے :

''و سپہ سالاری بامیر محمود دادند و سوی بلخ جملہ باز گشتند و وی را لقب سیف الدولہ کردند۔''

'طبقات ناصری' کے انگریزی ترجمے (جلد اول) کے صفحہ ۷۴ و ۷۵ پر محمود کو خطاب سیف الدولہ عطا کیے جانے کا ذکر موجود ہے ۔ طبقات کے صفحہ ۸ بر یہ عبارت ملتی ہے :

''امیر محمود را سپہ سالاری خراسان دادند و سیف الدولہ لقب شد ۔''

'تاریخ گزیدہ' کے صفحہ ۳۹۳ پر اس کی طرف اشارہ ہے :

''ملک غزنہ سیف الدولہ محمود را مسلّم شد ۔''

'تاریخ فرشتہ' (نولکشور) جلد اول کے صفحہ ۲۱ پر یہ عبارت پڑھی جا سکتی ہے :

''و سلطان محمود ولد او را بلقب سیف الدولہ مشرف ساختہ ۔''

اسی صفحہ پر پانچ مرتبہ سیف الدولہ محمود مذکور ہے اور صفحہ ۲۲ پر چھ مرتبہ یہ خطاب دہرایا گیا ہے ۔

ابن الاثیر کی الکامل (جلد نہم ، صفحہ ۴۲) میں 'سیف الدولہ' کے خطاب کا ذکر موجود ہے ۔ ان بیانات کے ہوتے ہوئے شمس العلماء کیوں کر یہ عذر کر سکتے ہیں کہ اس خطاب کا حوالہ کسی تذکرے یا تاریخ میں ان کی نظر سے نہیں گزرا ۔

شمس العلماء کی فہرست میں یہ خطابات پائے جاتے ہیں : عضدالدولہ ، مؤیدالملہ ، شہاب الدولۃ والدین ، جمال الاسلام والمسلمین ۔

جواب ِ تبصرہ میں بھی شمس العلماء ان ماخذ کا نام نہیں بتاتے جہاں سے انھوں نے عضدالدولہ و شہاب کے خطابات نقل کیے ہیں ۔ گردیزی کے 'زین الاخبار' کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح سومنات کے بعد شوال ۴۱۷ھ میں خلیفہ القادر باللہ ، سلطان محمود اس کے بھائی اور بیٹوں کو یہ خطاب عطا کرتا ہے :

امیر محمود : کہف الدولۃ والاسلام ۔

امیر مسعود : شہاب الدولۃ و جمال الملۃ ۔

امیر محمد : جلال الدولۃ و جمال الملۃ ۔
امیر یوسف : عضد الدولۃ و امیر الملۃ[1] ۔

صفحہ ۵۸ ۔ فتح سومنات اور محمود کی بت شکنی :

شمس العلماء نے فتح سومنات بیان کرتے ہوئے اس واقعے کا بھی ذکر کیا ہے جو 'تاریخ فرشتہ' وغیرہ میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ جب محمود نے بت فروش ہونے کی بدنامی اپنے لیے گوارا کرنے سے انکار کر دیا اور سومنات کے بت کو توڑا تو اس کے جوف میں سے بیش بہار اور قیمتی جواہرات نکلے ۔

شیرانی صاحب نے اس واقعے کو غیر مستند ٹھہراتے ہوئے بتایا کہ اگرچہ یہ متاخرین کی کتابوں میں مذکور ہے لیکن جواہرات کا بت کے پیٹ میں سے برآمد ہونا بالکل غلط ہے صحیح وہی ہے ۔ جو گردیزی نے لکھا ہے :

''گنج بود اندر زیر بتان ، آن گنج را برداشت و مالی عظیم از آنجا بحال کرد ۔'' (زین الاخبار ، صفحہ ۸۷)

بتوں کے ہٹاتے وقت ان کے نیچے سے خزانہ برآمد ہوا ، یعنی جس مقام پر بت نصب تھے ، وہاں سے نکلا ۔ فرخی جو سفرِ سومنات میں محمود کا شریک اور شاہدِ عینی ہے ، تقریباً گردیزی کے بیان کی تصدیق کر رہا ہے :

خدای حکم چنان کرده بود کان بت را
ز جائی برکند آن شہریار دین پرور
بدان نیت کہ مر او را بمکہ باز برد
بکند و اینک با ما همی برد همبر
چو بت بکند از آنجا و مال و زر برداشت
بدست خویش بہ بتخانہ در فگند آذر

ڈاکٹر ناظم کی بلند پایہ کتاب سلطان محمود کے متعلق شمس العلماء کے زیر مطالعہ رہ چکی ہے ، جیسا کہ صفحہ ۲۱۴ کے ذیلی نوٹ میں وہ خود بیان کرتے ہیں ، بلکہ ایک دو مقام پر اس کتاب سے اس کا نام لیے بغیر خوشہ چینی بھی کرتے

---

۱ ۔ زین الاخبار ، مرتبہ محمد خان قزوینی ، طبع ۱۳۲۷ش ، صفحہ ۶۹ میں :
''امیر یوسف را عضد الدولۃ و موید الملۃ'' (مرتب)

ہیں ۔ پھر تعجب ہے کہ اس مشہور افسانے کی تصدیق کے لیے انھوں نے ڈاکٹر ناظم کی کتاب کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں سمجھی ، بلکہ گرمی٘ محفل کے خیال سے اس بے بنیاد روایت کو قند مکرر سمجھ کر اس کا اعادہ کیا ہے ۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان دلائل کا جائزہ لیں جو شمس العلماء نے اپنے بیان کی تائید میں پیش کیے ہیں ، ہم ان کے لب و لہجہ کی طرف قارئین کرام کی توجہ مبذول کرانے کی اجازت چاہتے ہیں :

''مبصّر کا یہ اعتراض بالکل فضول اور رائے مجہول ہے ۔ نہ وہ گردیزی کے بیان کو صحیح سمجھے اور نہ انھوں نے عبارتِ منقول کی ترکیبِ لفظی پر غور کیا ۔ فرخی کے اشعار سے بھی جو مطلب انھوں نے اخذ کیا ہے وہ محض خام خیالی ہے اور دعوی بلا دلیل ہے ۔''

اس بے جا سبّ و شتم کے بعد وہ گردیزی کا صحیح مفہوم پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ پہلا نکتہ جو ان کی دقیقہ سنجی کا بہترین گواہ ہے ، یہ ہے کہ گردیزی چھوٹے چھوٹے بتوں کی بابت کہہ رہا ہے اور بڑے بت کا ، جو زیربحث ہے ، مطلق ذکر نہیں کر رہا ہے ۔ اس کے علاوہ عبارت میں لفظ 'اندر' بھی قابلِ غور ہے ۔ مبصّر کا اخذ کردہ مفہوم اس لفظ 'اندر' کے بغیر یعنی صرف 'زیر بتان' سے بخوبی اور صاف طور پر ادا ہو سکتا تھا ۔ گردیزی کے الفاظ سے تو قریب تر یہ مطلب نکلتا ہے کہ جب بت توڑے گئے تو ان کے اندر نیچے کی طرف سے یعنی شکم کے حصہ٘ زیرین سے خزانہ برآمد ہوا ۔

گردیزی کی عبارت کا جو مفہوم شمس العلماء نے اخذ کیا ہے ، یعنی 'بتوں کے اندر نیچے کی طرف سے' اس کی داد تو اہلِ ذوق ہی دے سکتے ہیں ، اگر وہ زین الاخبار اٹھا کر دیکھتے تو انھیں بڑے بت کا ذکر بھی وہیں مل جاتا ۔ لیکن خدا نخواستہ وہ ایسا کیوں کرنے لگے ۔ ان کی اطلاع کے لیے ذیل کی عبارت نقل کی جاتی ہے :

''آن سنگ منات را از بیخ برکندند و پارہ پارہ کردند و بعض ازو بر اشتر نہادند و بغزنین آوردند و تا بدین غایت (یعنی ۴۴۰ھ) بر در مسجد غزنین افگندہ است و گنجی بود اندر زیر بتان ، آن گنج را برداشت و مالی عظیم از آنجا بحاصل کرد ۔'' (صفحہ ۸۶ و ۸۷)

اب رہ گیا لفظ 'اندر' کا استعمال زیر کے ساتھ ، تو اس کے لیے اپنے مخدوم کی خدمت میں گزارش ہے کہ انھیں لفظ 'اندر' دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہیے - پانچویں صدی ہجری کے وسط تک جیسا کہ ملک الشعرا بہار نے تشریح[1] کی ہے ، فارسی نثر میں 'در' کا لفظ نہیں ملتا بلکہ ان کے نزدیک نثرِ کہنہ اور نثرِ تازہ میں امتیاز کرنے کا ذریعہ اس لفظ کا موجود ہونا ہے - زین الاخبار میں 'اندر' کا لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے - چونکہ 'در' 'اندر' کا مخفّف ہے ، آہستہ آہستہ اس نے 'اندر' کی جگہ لے لی - یہ توضیح ہم اس لیے ضروری سمجھتے ہیں تا کہ شمس العلماء کل کو یہ کہنے نہ لگ جائیں کہ زیر کے پہلے 'در' کا استعمال تو سنا ہے لیکن 'اندر' کا استعمال نہ کہیں سنا ہے ، نہ دیکھا ہے - 'در زیر' کی مثالیں شمس العلماء ملاحظہ فرمائیں :

هزارش مزرعہ در زیر گشت است
کہ زاد رفتن راہ بهشت است

طغیان ناز بین کہ جگرگوشۂ خلیل
در زیر تیغ رفت و شهیدش نمی کنند

تاریخ بیہقی میں کئی جگہ 'در زیر' استعمال ہوا ہے - چنانچہ ملاحظہ ہوں اس کے صفحات ۱۰۵ ، ۱۷۲ ، ۲۳۳ ، ۳۵۲ ، ۵۱۵ وغیرہ - فرخی نے ایک قصیدے میں 'اندر زیر' بھی استعمال کیا ہے :

داغها چون شاخهائی بسّد یاقوت رنگ
هر یکی چون ناردانہ گشتہ اندر زیر نار

شاید فرخی کا یہ شعر شمس العلماء کے لیے اطمینان کا باعث نہ بن سکے ، ہم شیخ علی ہجویری کی 'کشف المحجوب' کا ایک اقتباس[2] پیش کرتے ہیں جس سے تمام شکوک دور ہو جائیں گے :

''و جوانی را دیدم اندر زیر دیوار کوشک ایستادہ با مرقعہ و رکوۂ -''

ان مثالوں کے بعد شمس العلماء 'اندر زیر' کے معنی 'اندر نیچے کی طرف سے'

۱- سبک شناسی ، جلد اول ، صفحہ ۳۰۰ -

۲- کشف المحجوب ، مرتّبہ ژکوفسکی ، صفحہ ۵۳۳ -

یا 'شکم کے حصہ' زیریں' سے نہ کریں گے ۔

فرخی کے متعلق تو شیرانی صاحب صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ وہ تقریباً گردیزی کے بیان کی تصدیق کر رہا ہے ، یعنی محمود سومنات کے بت کو اکھاڑتا ہے اور بت خانے سے بہت سا مال و زر لے جاتا ہے ۔ لیکن شمس العلماء لفظ 'تقریباً' نظرانداز کر جاتے ہیں اور اعتراض کی ٹھان لیتے ہیں ۔

شیرانی صاحب نے تبصرے میں یہ بھی لکھا تھا کہ ہندوؤں کی پوجا کی اشیاء (بت) مجّوف اور جوڑدار نہیں ہوتیں ۔ لیکن شمس العلماء اپنی چشم دید شہادت پیش کرتے ہیں کہ سنہ ۱۹۲۵ء میں بزمانہ' قیام لندن انھوں نے برٹش میوزیم میں متعدد ایسی مورتیاں دیکھیں جو ٹھوس نہ تھیں ۔ شمس العلماء کا یہ بیان اگر درست بھی ہو جب بھی ہم ان کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں سومنات کے بت کا مجّوف ہونا معرض بحث میں ہے ، نہ کہ دوسری مورتیوں کا ۔

شمس العلماء نے شیرانی صاحب کے اس بیان پر بھی غور نہیں کیا کہ قدیم تاریخی کتابوں میں وہ اس افسانے کا سراغ نہیں لگا سکے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر ناظم اور شیرانی صاحب نے بتایا ہے ، سلطان محمود کے متعلق اس قسم کی روایتیں اس کی موت سے بہت عرصے بعد پھیلنا شروع ہوتی ہیں اور سب سے پہلے ان کا ذکر شیخ فرید الدین عطار کی تصنیفات میں ملتا ہے ۔ خود فرشتہ بھی شیخ عطار کی 'منطق الطیر' سے خوشہ چینی کرتا ہے ، جیسا کہ اس کے بیان سے ظاہر ہے ۔

قدیم تاریخی ماخذ کی طرف رجوع کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بت فروش اور بت شکن والے افسانے کا نام و نشان بھی ان میں موجود نہیں ۔ گردیزی اور فرخی کی شہادتوں کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ۔ وہ کہیں اس واقعے کی طرف اشارہ تک بھی نہیں کرتے ۔ البیرونی جو 'کتاب الہند' میں سلطان محمود کو مرحوم کہتا ہے ، سلطان کی اس شاندار مگر مفروضہ عالی حوصلگی کا ذکر نہیں کرتا ۔ سومنات کے بت کے متعلق اس کا معاصرانہ بیان یہ ہے :

''سلطان محمود[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۴۱۶ھ میں اس پتھر کو اکھڑوا دیا اور اوپر کے حصے کو توڑ کر مع اس کے سونے کے جڑاؤ

۱۔ کتاب الہند (انجمن ترقی' اردو) ، جلد دوم ، صفحہ ۱۷۲ ۔

اور چمکیلے غلاف کے اپنے دارالسلطنت غزنی لے گئے ۔ اس کا ایک جز غزنی کے میدان میں چکر سوام ، ایک پیتل کے بت کے ساتھ ، جو تھانیسر سے لایا گیا تھا ، پڑا ہے اور ایک جز وہاں کی جامع مسجد کے دروازے پر ہے جس پر پاؤں کی مٹی اور نمی پونچھی جاتی ہے ۔''

بیرونی یہ بھی بتاتا ہے کہ سومنات کا بت مہادیو کا لنگ تھا اور براسھر کے حوالے سے اس کے بنانے کی ترکیب بھی بتاتا ہے ۔

اگر شمس العلماء کے پیش نظر بیرونی ، گردیزی اور فرخی کے بیانات ہوتے تو وہ فرشتہ کی سند پر بت کے جوف میں سے جواہرات کا برآمد ہونا بیان نہ کرتے ۔

ابن الاثیر نے 'الکامل' میں ، جس کا حوالہ شمس العلماء نے بھی دو تین مقامات پر دیا ہے ، سومنات کے بت اور اس کے توڑے اور جلائے جانے کی کیفیت بیان کی ہے لیکن کہیں وہ اس کے مجوّف ہونے کا ذکر نہیں کرتا ۔ ابن الاثیر کے الفاظ یہ ہیں :

''فاخذہ یمین الدولۃ فکسرہ و احرق بعضہ و اخذ بعضہ معہ الی غزنۃ فجعلہ عتبۃ الجامع ۔'' (الجز التاسع ، صفحہ ۱۴۳)

ابن خلکان کی 'وفیات الاعیان' اور 'طبقات ناصری' میں بھی اس فرضی قصے کا کہیں ذکر نہیں ۔ قدیم تاریخیں تو ایک طرف خود فرشتہ کے ہم عصر نظام الدین مصنّف 'طبقات اکبری' اور 'ملاّ' بدایونی بت فروشی اور بت شکنی کے دل خوش کن مگر فرضی افسانے کو اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دیتے ۔ اگر اس افسانے میں ذرہ برابر بھی حقیقت ہوتی تو یہ مؤرخ ، جو سلطان محمود کے غازی اور مجاہد فی سبیل اللہ ہونے کی داستان بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں ، اس کی زندگی کے اس اہم واقعے کو کیسے نظرانداز کر سکتے تھے ؟

صفحہ ۶۱۔ عرفی کی منّت پذیری :

ابوالفرج رونی کے تذکرے کے ضمن میں شمس العلماء اس منّت پذیری کا ذکر لے آتے ہیں جو عرفی ، ابوالفرج اور انوری کی نسبت ظاہر کرتا ہے اور شہادت کے طور پر عرفی کے اُس قصیدے سے تین اشعار نقل کرتے ہیں جو خانخاناں کی مدح میں ہے ۔

شیرانی صاحب نے یہ بیان دیکھ کر بجا طور پر فرمایا کہ ''ان اشعار میں ہمیں تو عرفی کی ممنونیت یا احسان مندی کی جھلک تک نظر نہیں آتی ۔ وہ جوشِ خودستائی میں اپنے ممدوح پر ان شعرا کے خلاف اپنی فضیلت اور برتری کا سکّہ جمانے کی کوشش میں مصروف ہے ۔''

جونکہ شمس العلماء اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے اس لیے وہ شیرانی صاحب پر حسبِ معمول غلط ترجمہ کرنے کا الزام لگاتے ہیں جو محض بے بنیاد ہے ، اور پھر اپنی طرف سے اس عبارت کا ترجمہ دیتے ہیں۔ ہم شیرانی صاحب کی عبارت اور شمس العلماء کا ترجمہ دونوں قارئین کی خدمت میں اس غرض سے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ خود ہی شمس العلماء کے اس بے بنیاد الزام کی حقیقت سے واقف ہو جائیں ۔ لطف تو یہ ہے کہ شمس العلماء کی رائے میں ''در حقیقت یہ بڑا خراجِ تحسین ہے جو عرفی ابوالفرج کو ادا کرتا ہے ۔''

شیرانی صاحب کی عبارت : ''عرفی جو اپنے آپ کو زمانے کا سب سے بڑا شاعر کہتا ہے ، خانخاناں کے ایک مدحیہ قصیدے میں ابوالفرج اور انوری کے تعلق میں اپنی احسان مندی کا اعتراف کرتا ہے ۔ وہ فخریہ ان کو اس زمین میں اپنا رہبر اور خود کو ان کے وزن اور طرز کا مقلّد کہتا ہے ۔''

شمس العلماء کا ترجمہ :

> ''عرفی جو اپنی خود بینی سے اپنے آپ کو اس وقت کا سبْ سے بڑا شاعر سمجھتا ہے ، اپنے ایک قصیدے میں ، جو اس نے خانخاناں کی مدح میں لکھا تھا ، ابوالفرج اور انوری کی نسبت اپنی منّت پذیری تسلیم کرتا ہے اور مغرورانہ انداز میں ان کو اس قصیدے کی زمین کا پہلا رہ نورد (پیشرو) اور خود کو ان کے طرز اور بحر کا متبع (پس رو) کہتا ہے ۔''

یہ عجیب تماشا ہے کہ شمس العلماء نے اپنے ترجمے میں ''اپنی خود بینی سے'' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے ، جو ان کے لیے کسی طرح زیبا نہیں ۔ پھر انھیں اس بات پر اعتراض ہے کہ شیرانی صاحب نے 'boastfully' کا مفہوم فخریہ کے الفاظ سے کیوں ادا کیا ہے ، جو ان کے نزدیک بالکل غلط اور محلِ اعتراض ہے ۔ اس کا صحیح ترجمہ ان کے نزدیک 'مغرورانہ لہجے یا انداز میں' ہونا چاہیے ۔ اگر ہم نے 'فخریہ' کے درست ہونے کے حق میں انگریزی لغات کے حوالے دیے تو

شاید شمس العلماء انھیں بھی محل اعتراض ٹھہرائیں ۔ بفحوائی ''شھد شاھدؐ من اھلھا'' ہم انھی کی کتاب میں سے ایک انگریزی جملہ ان کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں جہاں خود انھوں نے 'boastfully' فخریہ کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو اصل کتاب کا صفحہ ۲۲۶ جہاں امیر خسرو ، حسن دہلوی کی فخریہ تقلید کرتے ہوئے بتائے گئے ہیں :

> "The latter (Amir Khusraw) himself acknowledged Hasan's excellence in ghazal and boastfully imitated him as is evident from the following verse :
>
> خسروا شعر تو اسرار حدیث است مگر
> کز سخن‌های تو ام بوی حسن می آید''

اب اس بات کا فیصلہ ہم شمس العلماء کے انصاف پر چھوڑتے ہیں کہ یہاں 'boastfully' فخریہ کے معنی میں مستعمل ہے یا ''مغرورانہ لہجے اور انداز میں ۔'' اپنی غلطی پر بے جا اصرار ایک عالم کے شایانِ شان نہیں ۔

شمس العلماء ، عرفی کی خود بینی اور غرور سے انکار نہیں کرتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ عرفی ان دونوں شعرا (یعنی ابوالفرج اور انوری) سے مرعوب اور ان کی استادی کا دل سے معترف تھا ، اگرچہ بظاہر الفاظ اس کا اظہار نہیں کرتا ہے جو عرفی جیسے خوددار کے لیے موزوں ہے ۔

دلوں کے بھید خدا تعالیٰ جانتا ہے ۔ عرفی کا ان شعرا سے مرعوب ہونا اور دل سے ان کی استادی کا قائل ہونا خدا کو معلوم ہو تو ہو ، ہم اہل ظاہر جو کشفِ باطنی سے محروم ہیں ، ظواہر ہی کی بنا پر رائے قائم کیا کرتے ہیں ۔ اسے عرفی کی خودداری کہیں گے یا اس کا ناز و کبر کہ دل سے تو اپنے پیش روؤں کی استادی کا قائل ہے لیکن بظاہر اپنی برتری اور فوقیت کا سکہ جمانے کی کوشش میں ان کی تنقیص کر رہا ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ عرفی نے اپنے پیش روؤں کے قصیدوں پر قصیدے لکھے تاہم ابوالفرج ، خاقانی ، سلمان ، ازرق ، ظہیر اور سعدی جیسے استادوں کو خاطر میں نہیں لاتا ۔ اس کو اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود بینی کا خود بھی احساس ہے : ع

کبر و نازش نہ باندازۂ قدر است و محل

کا تتبّع ۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اس کلیے میں ہم ایک استثنا پاتے ہیں اور وہ خواجہ حافظ ہیں جن کا تتبّع عرفی کے نزدیک اس بنا پر روا ہے : ع

کہ دل بکاود و درد سخنوری داند

صفحہ ۹۳ ۔ آمدن حنا بہ ھند کے معنی :

شمس العلماء نے شاہان ہندوستان کی ادب نوازی اور علمی سرپرستی اور ایران کے علماء و شعرا کی ہندوستان میں آمد کے سلسلے میں صائب کا یہ شعر اور اس کا انگریزی ترجمہ درج کیا ہے :

نیست در ایران زمین سامان تحصیل کمال
تا نیامد سوی هندستان حنا رنگین شد

دوسرے مصرعے کا مفہوم بیان کرنے میں شمس العلماء نے 'آمدن حنا بہند' یا "رفتن حنا بہند' کے محاورے کی پروا نہ کرتے ہوئے لفظی ترجمے پر قناعت کی ہے :

"Until hena (myrtle) come to India it acquired no colour."

شیرانی صاحب نے 'آمدن حنا بہند' کے معنی 'سیاهی زدن حنا' بتانے اور میر رضی دانش کا یہ شعر بھی اپنی تائید میں نقل کیا :

راه دور . هند پابست وطن دارد مرا
چون حنا شب درمیان رفتن بهندستان خوش است

اور یہ بھی لکھا ہے کہ ملک الشعرا بہار نے 'آمدن حنا بہند' کی مثال میں صائب کا یہی شعر نقل کیا ہے اور صائب نے اس محاورے کے استعمال میں صفت ایہام کی رعایت ملحوظ رکھی ہے ۔

جہاں کہیں تحقیق کی بازی ہو ، شمس العلماء فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اصل مسئلے سے اعراض کرکے بعض غیر متعلق چیزوں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں اور بعض اوقات ذاتیات میں بری طرح الجھ جاتے ہیں ۔ یہاں انھوں نے جس بوالعجبی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان کی شان سے بہت گری ہوئی چیز ہے ۔ جب خود ایران کا مشہور شاعر اور ادیب اس محاورے کے معنی تسلیم کرتا ہے اور لغت نویسوں نے بھی یہی معنی بتائے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ شمس‌العلماء اس پر

غور کرنے کے بجائے اپنی تہذیب اور شایستگی کا نمونہ اس طرح پیش کرتے ہیں :

''ایران میں بھی حنا سے مراد سیاہی بمعنی کالک نہیں ہے بلکہ شوخیٔ رنگ مراد ہے لیکن وہ سیاہی جو مبصّر کے ذہن میں سمائی ہے اور جس کے اظہار کی وہ مصنّف کو تاکید فرما رہے ہیں ، وہ حنا سے نہیں بلکہ تارکول سے حاصل ہوتی ہے جس سے مصنّف نے اپنے ترجمے میں خاص طور سے احتراز کیا ہے . . . المختصر مبصّر کی یہ اصلاح اور تشریح سخت ناکارہ اور گمراہ کن ہے ۔''

شمس العلماء کے یہ الفاظ کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں ۔ ان کا غصے میں آپے سے باہر ہونا سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ وہ اپنی زندگی کے شاہکار کو یوں پامالِ تنقید ہونا دیکھ کر بھلا کیوں کر دامانِ صبر سنبھال سکتے تھے ۔

حنا کی شوخیٔ رنگ سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن یہاں سوال اس سیاہی سے ہے جو اس شوخی اور گہرائی کا پیش خیمہ ہے ۔ غضب ہے کہ اتنی سی سیدھی بات بھی شمس العلماء کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ 'بہار عجم' اور 'فرہنگ اندراج' میں اس محاورے کے معنی 'سیاہ شدن حنا' دیے ہیں ۔ ایرانی فضلا اور مستشرقینِ یورپ کی ہندوستانی فرہنگ نویسوں کی نسبت احسان مندی کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے جو شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے کے آخر میں درج کیا ہے اور وہ یہ کہ جب پروفیسر براؤن کے ایرانی دوست 'آمدن حنا بهند' کے معنی بتانے سے قاصر رہ گئے تو انھوں نے پروفیسر محمد شفیع مدظلہ العالی کی طرف رجوع کیا ۔ پروفیسر موصوف نے لغات کے حوالے سے محاورے کے صحیح معنی ، اس کا محلِ استعمال اور اس کے شواہد نقل کر کے براؤن کے پاس بھیج دیے ۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ 'بہارِ عجم' اور 'سروِ آزاد' میں یہ شعر سلیم کے نام پر دیا گیا ہے ، نہ کہ صائب کے ۔

صفحہ ۴۳۔ قرون وسطیٰ میں ایران و ہندوستان میں علمی اور ادبی مساوات :

شمس العلماء کا یہ محبوب نظریہ ہے جس کا اعادہ انھوں نے اپنی کتاب میں بار بار کیا ہے ۔ غزنویوں کے دورِ حکومت میں جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے ، ہندوستان ایران سے بجا طور پر ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔ اس نے ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان جیسے زبردست شاعر پیدا کیے جن کی تقلید

پر شعرائے ایران کو بھی ناز تھا لیکن اس مساوات اور ہمسری کے حق میں جو دلائل شمس العلماء نے پیش کیے ہیں وہ حد درجہ کمزور اور خیالی ہیں اور اس کے علاوہ وقت اور زمانے کی تعیین میں وہ بہت غیر محتاط ہیں۔

ایک سب سے بڑی دلیل جس کی بنیاد پر شمس العلماء اپنی شاندار عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں، یہ ہے کہ ''قبل از اسلام عہد میں لاکھوں خاندان ایران سے ترکِ سکونت کر کے ہندوستان آ کر پنجاب میں بس گئے تھے۔ اس طرح محمودی حملوں سے ایک دراز مدت قبل ہند و ایران میں ایک تمدنی رابطہ اور لسانی یگانگت قائم ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں پنجاب نے فارسی زبان اور فارسی شعر کا ذوق اپنے میں رچا لیا۔ ہندوستان میں ایرانیوں کے اس ازدحام کی مدنی سودمندی اور وہ نفع جو ایرانی تمدن کے ساتھ مستقل اور پائیدار ارتباط پیدا کرنے سے اس کو اپنے تعلیمی اور لسانی ارادوں میں حاصل ہوا، بے حد ہے۔ ان اثرات میں یہاں کے لوگوں کے ادبی مذاق میں اس قدر انقلاب پیدا ہوا کہ پنجاب میں پیہم ایسے شاعر پیدا ہونے لگے جنھوں نے خود اہلِ ایران سے خراجِ تحسین وصول کیا اور جو ہر لحاظ سے ایران کے بہترین اساتذہ کے ہمسر تھے۔''
(اصل کتاب، صفحہ ۲۴۴، ۲۴۸)

شمس العلماء کا یہ بیان عالم حقائق سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ خواب و خیال کی دلفریب دنیا کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ جن وجوہ کی بنا پر شیرانی صاحب اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) قبل از اسلام عہد میں افراسیاب کا لاکھوں ایرانیوں کو ایران سے نکال دینا اور ان کا آ کر پنجاب میں بس جانا تاریخی حیثیت سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو یہ کہ افراسیاب ایران کے کیانی خاندان کا ہم عصر ہے جس کا تاریخی وجود مشتبہ ہے۔ اس طرح افراسیاب کی شخصیت تاریخی نہیں بلکہ اساطیری رہ جاتی ہے۔ اب ایسی اساطیری شخصیت کے لیے آج جب کہ ایرانِ قدیم کے متعلق زمانۂ حال کے محققین کی بصیرت افروز تحقیقات ہمارے سامنے ہیں، شمس العلماء کا سنجیدگی کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا کہ اس نے لاکھوں ایرانیوں کو جلا وطن کر دیا، کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ انھیں اپنے اس دعوے پر اصرار ہے، جس کے لیے وہ بزعم خود

زبردست تاریخی سند پیش کر چکے ہیں ، اس لیے ان کی تاریخی سند کا جائزہ لینا ضروری ہے : اپنے دعوے کی تائید میں انھوں نے تین کتابوں کا ذکر کیا ہے ۔ طبقات اکبری ، "ملا" بدایونی کی منتخب التواریخ اور یاقوت کا بیان جس کا حوالہ شمس العلماء کے محبوب تذکرۂ سلاطین آل غزنین میں موجود ہے ۔ یاقوت ساتویں صدی ہجری میں اور نظام الدین اور بدایونی گیارھویں صدی ہجری میں لکھ رہے ہیں ۔ اب ان متاخرین کا حوالہ ایک ایسے شخص کے لیے ، جو قبل از تاریخ زمانے کا آدمی ہے ، کیوں کر قابل اعتبار ٹھہر سکتا ہے ؟ لیکن شمس العلماء ہیں کہ وہ اس حوالے کو ایک محکم تاریخی شہادت سمجھ رہے ہیں ۔

(۲) "بہت دشوار ہے کہ یہ ایرانی مہاجر ہزاروں سال تک ہندوستان میں رہنے بسنے کے باوجود اپنی قدیم تہذیب اور تمدن پر قائم رہے ہوں ۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ہندوستان کی قدیم آبادی میں گھل مل گئے ہوں ۔ صوبۂ گجرات میں پارسیوں نے اپنی قومیت کو ضرور محفوظ رکھا ہے لیکن ایرانیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ تر ہندوستانی ہیں ، حتٰی کہ ان کی زبان بھی ہندوستانی ہے ۔"

شیرانی صاحب کے اس بیان کے جواب میں شمس العلماء یہاں پھر اقلیتوں کے اپنے تمدن کو محفوظ اور قائم رکھنے پر ایک لمبی چوڑی تقریر شروع کر دیتے ہیں ، لیکن ہندوستان کے پارسیوں کے متعلق بالکل خاموش ہیں اور یہ بتانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ انھوں نے گجرات میں فارسی کا ذوق پھیلانے کے لیے کون سی سازگار فضا پیدا کی ۔

(۳) شمس العلماء کے اس نظریے پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر ایرانی مہاجروں کی جماعت ہندوستان کی قدیم آبادی میں گھل مل جانے سے محفوظ بھی رہ گئی ہو تو یہ لوگ کوئی ایسی زبان بولتے ہوں گے جو قدیم فارسی یا اوستا سے ملتی جلتی ہوگی ۔ اس صورت میں یہ لوگ ادبی مذاق کی شمع کیا روشن کرتے اور شعر و شاعری کی فضا کیا تیار کرتے ۔

چونکہ اس اعتراض کا جواب دینا شمس العلماء کے لیے ازبس مشکل ہے اس لیے وہ اپنے بچاؤ کی یہ صورت نکالتے ہیں :

''مصنف کے بیان میں زبان کا قدیم یا جدید ہونا زیر بحث نہیں ہے ۔ اس نے تو اپنی کتاب میں مسلّمہ اصول کے ماتحت صرف اس امر کو واضح کیا ہے کہ ان مہاجرین کا اثر ، جو بزمانۂ قبل اسلام پنجاب کے مرکزی شہر لاہور کے مضافات میں آ کر آباد ہو گئے تھے ، اس خطے کے باشندوں کی زبان اور معاشرت پر پڑ رہا تھا اور علیٰ ھذا القیاس خطۂ لاہور کی زبان و معاشرت ان مہاجرین پر اپنا رنگ جما رہی تھی ۔''

اگر شمس العلماء کا بیان محض اتنا ہی ہوتا تو ہمیں ان سے تعرّض کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن وہ ذکر کر رہے ہیں قبل از اسلام کے ایرانی مہاجروں کا اور نظّام معتزلی کے اصول طفرہ پر عمل کرتے ہوئے کئی صدیوں کی چھلانگ لگا کر اس ایران و ہند کے تمدنی ارتباط اور لسانی یگانگت کا اثر پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں بتاتے ہیں ، جب ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان جیسے شاعر فارسی شاعری میں شاندار اضافہ کرتے ہیں ۔ حالانکہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قبل از اسلام عہد کی فارسی زبان اور رونی اور مسعود کی فارسی میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ جب لسانی یگانگت ہی سرے سے مفقود ہے ، پھر اس کا اثر کہاں سے آ داخل ہوا ۔ ایران اور ہندوستان کے درمیان علمی مساوات کی اصل توجیہ وہ ہے جو شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں بیان کی ہے :

''وہ (شمس العلماء) پنجاب میں غزنوی عہد کے دو شاعر ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے کلام کے نمونے دے کر یہ بحث چھیڑتے ہیں کہ ہندوستان کی شاعری ایرانیوں کی شاعری کے بالکل مساوی ہے ۔ اس حد تک ہم ان کے ساتھ متفق ہیں ۔ غزنی اس عہد میں فارسی شاعری کا گہوارہ تھا ۔ پنجاب سلطنتِ غزنہ کا ایک صوبہ بن گیا تھا ۔ بسلسلۂ ملازمت متعدد خاندان پنجاب میں آ کر آباد ہو گئے تھے ۔ ان آبادکاروں نے اپنی زبان و تہذیب اور دیگر روایات کو محفوظ رکھا ، اس لیے ان کی شاعری کا وہی درجہ ہونا چاہیے جو غزنویوں کی شاعری کا تھا اور اس میں کسی فخر اور تعجب کی بات نہیں ۔ وہ فارسی کے اہلِ زبان تھے

اپنے تمدن پر قائم رہے ، لہٰذا دوسرے علاقے میں آباد ہو جانے سے کم از کم ایک دو نسل تک ان کی قومیت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا ۔''

صفحہ ۹۷ - ابوالفرج رونی :

''کئی تصانیف ابوالفرج کی یادگار ہیں لیکن جو آج باقی ہیں ان میں ایک رسالہ عروض پر ہے اور ایک ضخیم دیوان ہے جو اس نے اپنے مربی سلطان ابراہیم کے نام پر معنون کیا ۔''

شمس العلماء کے اس مختصر بیان میں شیرانی صاحب نے تین غلطیاں بتائیں :

(۱) ابوالفرج نے عروض پر کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی ۔

(۲) اس کے دیوان کو ضخیم کہنا تصدیق طلب ہے ۔

(۳) اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ ابوالفرج نے اپنا دیوان سلطان ابراہیم کے نام پر معنون کیا ۔

نمبر (۱) کے متعلق شمس العلماء فرماتے ہیں کہ اس کو غیر ضروری سمجھ کر انھوں نے حوالہ نقل نہیں کیا ۔ ''ان کو اگر ذرا بھی یہ گمان ہوتا کہ زمانہ مستقبل قریب میں ایک ایسے صاحب تبصرہ سے دو چار ہونا پڑے گا جس کا مسلک ہی تنقیص و نکتہ چینی ہوگا تو وہ یقیناً اس عروضی تالیف کا ماخذ مع حوالہ صفحہ و سطر نوٹ کر لیتا ۔''

ایک مصنّف کے لیے یہ اعراض اور پہلوتہی اچھی نہیں ۔ انھیں پہلے کی طرح یہاں بھی سہو نظر یا سہو قلم کا عذر پیش کر دینا چاہیے تھا اور بس ۔

نمبر (۲) کے بارے میں شمس العلماء نے اپنے اسی پرانے حربے سے کام لیا ہے یعنی یہ کہ شیرانی صاحب نے ان کی اس انگریزی عبارت کا ترجمہ درست طریق پر نہیں کیا :

"Abul Faraj left several works of which those extant are . . ."

ان کے نزدیک اس کا درست ترجمہ یہ ہونا چاہیے : ''ابوالفرج نے متعدد تصانیف چھوڑی جو ان میں باقی رہیں ۔ الخ ۔''

وہ فرماتے ہیں کہ مصنّف کی مندرجہ بالا عبارت میں لفظ 'آج' موجود نہیں ہے جو مبصّر کا جعلی مستزاد ہے ۔ حالانکہ شمس العلماء کا ترجمہ ''جو ان میں باقی

رہیں'' صحیح نہیں ۔ لفظ extant کے معنے still existing ہیں ، یعنی جو اب بھی موجود ہیں ۔

واقعہ یہ ہے کہ جب شمس العلماء کے لیے کوئی راہ گریز نہیں رہتی تو وہ یہ کہہ کر بچ نکلنا چاہتے ہیں کہ مبصّر ان کی انگریزی عبارت کا مفہوم نہیں سمجھ سکے ۔

نمبر (۳) کے متعلق شمس العلماء نے سکوت کو گویائی پر ترجیح دی ہے اور بہتر بھی یہی ہے ۔

صفحہ ۹۹۔ سنائی کے ہندی اشعار :

اس عنوان کے تحت شمس العلماء نے سنائی کے دو شعر دیے ہیں جن میں ہندی الفاظ صرف دو ہیں یعنی 'لنگھن' اور 'پانی' ۔ ان اشعار کو کسی طرح بھی ہندی نہیں کہا جا سکتا ۔ لیکن شمس العلماء کی عالمانہ تحقیق ملاحظہ ہو کہ ایک دلفریب عنوان تراش کر دو فارسی اشعار نقل کرتے ہیں اور جب شیرانی صاحب اس بے احتیاطی کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہیں تو اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے مناظرانہ انداز میں لکھتے ہیں کہ :

''نمونے کے لیے تھوڑی ہی چیز پیش کی جاتی ہے کیوں کہ زیادتی مقدار سے نمونے کی صفت قائم نہیں رہتی ۔''

سنائی کے ہندی اشعار کا نمونہ بقول شمس العلماء :

گر ترا لنگھنت کند فربہ
سیر خوردن ترا ز لنگھن بہ

نہ در آن معدہ خدرۂ میدہ
نہ دران دیدہ قطرۂ پانی

صفحہ ۱۰۰۔ بیک واسطہ شاگرد کے معنے :

شمس العلماء نے ''بیک واسطہ شاگرد مسعود سعد سلمان بود'' کا ترجمہ حسبِ ذیل کیا ہے :

''and in a way a pupil of Masud Sad Salman.''

شیرانی صاحب نے بتایا کہ 'بیک واسطہ شاگرد' کے معنے یہ ہیں کہ وہ

مسعود کے شاگرد کا شاگرد ہے ۔ شمس العلماء اس مفہوم سے ناواقف تھے لیکن اپنی ناواقفیت کو چھپانے کے لیے اپنے ترجمے کو بہتر اور پسندیدہ تر بتاتے ہیں حالانکہ "in a way" (یعنی ایک لحاظ سے) ہرگز ہرگز "بیک واسطہ شاگرد" کا مفہوم ادا نہیں کرتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ شمس العلماء 'بیک واسطہ' کا مفہوم نہیں سمجھ سکے ، چنانچہ وہ صفحہ ۲۶۴ پر لکھتے ہیں :

> "He was a pupil of Masud Sad Salman the famous Indian poet already cited."

اسی طرح امام فخرالدین رازی کے متعلق بدایونی کے بیان میں تملّق اور نفاق کا نام شیرانی صاحب نے خوشامد اور نفاق کیا ہے ۔ لیکن شمس العلماء امام رازی کے تقدس کا واسطہ دے کر اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور تملّق کا ترجمہ "دوستی یا سازگار موافقت" اور نفاق کا ترجمہ جھگڑا یا اختلاف بتاتے ہیں ، جو کسی حیثیت سے بھی درست نہیں ۔ تملّق اور نفاق کے معنے ایک ہی رہیں گے ، خواہ وہ کسی عالم اور حاملِ شریعت کے لیے استعمال کیے جائیں ، خواہ کسی رند گنہگار کے لیے ۔

امام رازی کے سلسلے میں شمس‌العلماء فرماتے ہیں کہ انھوں نے بدایونی کی حرف بحرف پیروی اس لیے نہیں کی کہ ان کے پاس بدایونی کے ماخذ اور حوالے کی کوئی سند موجود نہ تھی جس کو وہ عند الطلب اپنی براءت میں پیش کرتے ۔ یہی روایت ابن الاثیر کی 'الکامل' میں ایک دوسری صورت میں پائی جاتی ہے ، جس میں بتایا گیا ہے کہ امام رازی سلطان شہاب الدین کے مکان پر وعظ کہا کرتے تھے ۔ ایک روز حاضر ہوئے اور وعظ کیا اور اپنے وعظ کے آخر میں کہا کہ "اے سلطان! نہ تیری بادشاہت رہے گی اور نہ رازی کی تلبیس ؛ ہم سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے ۔" شہاب الدین اتنا رویا کہ لوگوں کو اس کی گریہ زاری پر ترس آ گیا (الکامل ، بارھویں جلد ، صفحہ ۱۰۰) ۔ شمس العلماء کو چاہیے کہ ابن الاثیر سے بھی باز پُرس کریں کہ اس نے امام رازی کی نسبت تلبیس کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے ۔

صفحہ ۲۷ ۔ شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش :

خواجہ معین الدین اجمیری کے تذکرے کے ضمن میں شمس العلماء نے

شیخ علی ہجویری پر خواجہ صاحب کی برتری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور ذیلی حاشیے میں شیخ علی ہجویری کی مشہور عالم تصنیف ''کشف المحجوب'' کو ان سوالات کا جواب بتایا ہے جو شیخ کے ایک دوست اور رفیقِ طریقت ابو سعید ہجویری نے وقتاً فوقتاً کیے تھے ۔ شمس العلماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب لاہور میں لکھی گئی تھی ۔

شیرانی صاحب کی رائے میں شیخ ہجویری اور خواجہ اجمیری کے درمیان مقابلہ اور موازنہ مناسب نہیں اس لیے کہ شیخ ایک عالی مرتبہ صوفی ہونے کے علاوہ کشف المحجوب جیسی گراں قدر کتاب کے مصنّف ہیں جو فارسی ادب میں ایک امتیازی حیثیت کی مالک ہے ۔ دوسرے یہ کہ کتاب کے بعض مندرجات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب لاہور میں نہیں بلکہ ہندوستان کے باہر کہیں لکھی گئی ہے ۔ تیسرے یہ کہ یہ کتاب سوالات کا جواب نہیں جو وقتاً فوقتاً شیخ کے ایک دوست نے ان سے کیے ، بلکہ صوفی اور صوفیانہ زندگی ، طریق تصوف ، مصطلحاتِ تصوف ، مقاماتِ صوفیہ ، ان کے مذاہب اور مقالات اور رموز و اشارات پر ایک جامع کتاب ہے ۔

جس انوکھے انداز میں شمس العلماء اپنی صفائی پیش کرتے ہیں ، اس کا اندازہ ان کے جواب کے تمہیدی جملوں سے لگایا جا سکتا ہے :

> ''مصنف کو کشف المحجوب اور ایرانی و انگریزی کتبِ تواریخ کے مطالعے سے ، جس میں ڈاکٹر نکلسن کا مقالہ بھی شامل ہے ، جو کچھ مکشوف ہوا ، وہ سپردِ قلم کر دیا گیا ہے ۔ اس میں نہ کوئی غیر معمولی دعویٰ ہے اور نہ کوئی اعلانِ جنگ ۔ اگر مبصّر اس کو تسلیم نہیں کرتے تو نہ سہی ۔ وہ اپنے مخصوص نظریے کے مالک و مختار ہیں ۔''

ہمیں خود بھی اس امر کا افسوس ہے کہ شمس العلماء نے کشف المحجوب اور ڈاکٹر نکلسن کے مقالے پر نہایت سرسری نظر ڈالی ہے ورنہ ان کے قلم سے ایسی باتیں نہ نکلتیں جو تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہ اتر سکیں :

(۱) شمس العلماء فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ ہجویری اور خواجہ صاحب کے درمیان کوئی مقابلہ نہیں کیا بلکہ ہر ایک کے کارناموں کی خصوصیات بتائی ہیں ۔ ہم بسر و چشم شمس العلماء کے اس بیان کو صحیح تسلیم کر لیتے

اگر انھوں نے یہاں پھر تقابل کی کوشش نہ کی ہوتی ۔ بہرحال یہ پسند اور ذوق کا معاملہ ہے ۔ خواجہ صاحب سے شمس العلماء کی زبردست عقیدت خواجہ صاحب کی برتری کا کھلا اعلان ہے اور شمس العلماء اس بات کے کہنے کے پورے مجاز ہیں کہ خواجہ صاحب بے اولادوں کو اولاد عطا کرتے ہیں اور بے مرادوں کی مرادیں بر لاتے ہیں و علیٰ ہذالقیاس ۔

(۲) ڈاکٹر نکلسن ، جنھوں نے کشف المحجوب کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ، خود زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا کچھ حصہ لاہور میں لکھا گیا ہے ، اور ان کا یہ قیاس خود شیخ کے اس بیان پر مبنی ہے کہ :

"کتب من بہ حضرت غزنین مانده بود و من از — اجارۂ لاہور کہ از مضافات ملتان است درمیان ناجنسان گرفتار شده بودم ۔"[۱]

کشف المحجوب ، مرتّبہ ژوکوفسکی (صفحہ ۱۱۰) میں یوں درج ہے :

"اما درین وقت بیش ازین ممکن نگشت حرسها اللہ مانده بود و من اندر دیار ہند اندر میان ناجنسان گرفتار مانده ۔"

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کشف المحجوب غزنی یا کسی اور جگہ انجام کو پہنچی ہے ، نہ کہ لاہور میں ۔ دوسرے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ لاہور میں آنے کے بعد شیخ واپس غزنی چلے جاتے ہیں اور شمس العلماء کا یہ بیان غلط ہے کہ لاہور میں آ کر وہ یہیں مقیم ہو گئے اور پھر کہیں نہیں گئے ۔ شیخ کے یہ جملے بھی جو شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں نقل کیے ہیں ، اسی بات کے موید ہیں کہ کشف المحجوب ہندوستان کے باہر لکھی

۱- "کتب (من) بحضرت غزنین حرسها اللہ مانده بود و من اندر دیار ہند (شکم را موضع در بلدۂ لہانور کہ از مضافات ملتانست) اندر میان ناجنسان گرفتار (شده بودم) ۔"

(کشف المحجوب صفحہ ۱۱۰ مرتّبہ ژوکوفسکی ، طبع ایران ، ۱۳۳۶ ش)

(مرتّب)

گئی ہے :

''وندر ہندوستان مردی دیدم کہ مدعی بود بہ تفسیر و تذکیر و علم ۔ بامن اندرین معنی مناظرہ کرد و در ہندوستان دیدم کہ اندر زہر قاتل کرمی پدید آمدہ بود و زندگی وی بدان زہر بود ۔''

(۳) شمس العلماء اپنے اس بیان سے کہ کشف المحجوب مخدوم کے ایک رفیق طریقت ابوسعید الہجویری کے وقتاً فوقتاً کیے ہوئے سوالات کے جوابات کا مجموعہ ہے ، نہایت ہوشیاری کے ساتھ وقتاً فوقتاً (from time to time) کے الفاظ خارج کر دیتے ہیں جو ان کی اصل کتاب میں موجود ہیں اور جن پر اصلی اعتراض وارد ہوتا ہے ۔ ابوسعید نے شیخ سے وقتاً فوقتاً کوئی سوال نہیں کیے بلکہ شیخ سے ان الفاظ میں درخواست کی ہے :

''بیان کن مرا اندر تحقیق طریقت تصوف و کیفیت مقامات ایشان و بیان مذاہب و مقالات ایشان و اظہار کن مرا رموز و اشارات ایشان و چگونگی محبت خدای عزوجل و کیفیت اظہار آن بردلہا و سبب حجاب عقول از کنہ و ماہیت آن و نفرت نفس از حقیقت آن و آرام روح باصفوت آن و آنچہ بدین تعلق دارد از معاملت آن ۔''[۱]

یہ ہے ابوسعید کی درخوست یا سوال جس پر شیخ نظام تصوف پر ایک جامع کتاب لکھتے ہیں ۔ یہ کتاب ان سوالات کا جواب نہیں جو ابو سعید وقتاً فوقتاً شیخ سے کرتے ہیں جیسا کہ شمس العلماء ظاہر کرنا چاہتے ہیں ۔

شیرانی صاحب کے تبصرے میں کئی جگہ شمس العلماء نے بزعم خود تاریخ کی غلطیاں ڈھونڈھ نکالی ہیں ۔ اس کی ایک مثال کشف المحجوب کی تاریخ تصنیف ہے جس کے متعلق شیرانی صاحب نے لکھا کہ ۴۳۱ ہجری بتائی جاتی ہے ۔ کتابت کی غلطی سے ۳۳۱ ہجری چھپ گیا لیکن اس کی تصحیح جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ، رسالہ اُردو کے شمارۂ جولائی سنہ ۱۹۴۳ع میں کر دی گئی ۔ بھلا شمس العلماء اس تصحیح پر کیوں نظر ڈالنے لگے ۔ انہیں تحقیقِ حق منظور کب ہے ۔

۱۔ کشف المحجوب ، صفحہ ۷ ، طبع ژوکوفسکی ، سنہ ۱۹۲۶ع ۔ (مرتّب)

وہ تو مجلسِ مناظرہ قائم کر کے اپنی فتح مندی کا اعلان کر رہے ہیں ۔ لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ ۔ ع :

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

صفحہ ۴۷ ۔ خواجہ معین الدین سنجری ہیں یا سجزی ؟ اور کیا خواجہ صاحب پہلے صوفی ہیں جو بالائی ہندوستان میں آ کر تصوف کا چراغ روشن کرتے ہیں ؟

شمس العلماء کو اصرار ہے کہ اکثر مؤرخین نے سنجری لکھا ہے ، بعض نے سجزی ، بعض نے ''ہروی از قریۂ چشت'' اور بعض نے اصفہانی وغیرہ ۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر شمس العلماء کسی ایک مؤرخ کا حوالہ نقل کر کے یہ بتاتے کہ وہ خواجہ صاحب کو سنجری لکھتا ہے ۔ وہ یکسر یہ بتانے سے قاصر ہیں لیکن پھر بھی وہ اس کا اظہار واجب سمجھتے ہیں کہ اصل لفظ اکثر تواریخ میں سنجری ہے نہ سجزی ۔ ہم بہت سی تاریخ کی کتابوں کے حوالے ان سے طلب نہیں کرتے ، وہ کسی ایک مؤرخ کی شہادت ہی پیش کر دیں تو ہم آمنا و صدقنا پکار اٹھیں گے ۔

شیرانی صاحب نے سجزی کے حق میں آئین اکبری ، تاریخ فرشتہ اور عصامی کی فتوح السلاطین کے حوالے نقل کیے ۔ اتفاق سے آئین اکبری تک شمس العلماء کی رسائی نہ ہو سکی ۔ تاریخ فرشتہ کا جو نسخہ شمس العلماء کے زیر مطالعہ ہے اس میں ''تولد او در بلدۂ سجستان بودہ'' موجود نہیں ۔ شمس العلماء نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ ان کے پاس فرشتہ کا کون سا نسخہ ہے ؟ نولکشور کا یا بمبئی کا ۔ ممکن ہے کہ ان کے کتاب خانے میں کوئی قلمی نسخہ ہو ۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ دوبارہ نولکشوری ایڈیشن دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو انھیں مندرجہ بالا الفاظ مل جائیں گے ۔ رہی فتوح السلاطین تو اس کے مرتّب ڈاکٹر مہدی حسین نے وہی قرأت پسند کی ہے جس کا حوالہ شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں دیا ہے :

معین الدین آن سجزی دین پناہ
کہ خفتہ است باجمیر آن مرد راہ

شمس العلماء یہاں جلد بازی سے کام لیتے ہوئے پہلے مصرع میں یوں اصلاح

دیتے ہیں :

معین دین آن سنجری دین پناہ

کاش انہیں اس بات کا علم ہوتا کہ ہر سمجھ دار آدمی اسے اسی طرح پڑھے گا ۔ یہاں اصلاح دینے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ وہ فتوح السلاطین کا مطالعہ فرمائیں گے تو انہیں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملیں گی ۔ اصلاح کے بعد بھی اس سند کو مجہول اور ناقابل قبول ٹھہراتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ سجزی اور سنجری دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے ۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ اسی غلط پڑھنے کی بدولت وہ آج اس لفظ کے سنجری ہونے پر مصر ہیں ۔

اکبر نامہ ، جلد دوم کے انگریزی ترجمے کے صفحہ ۲۳۸ پر یہ عبارت ملتی ہے :

"The Khwaja came from sistan and they write him Sijzi which is Arabic for Sigzi."

انڈیا آفس کی فہرست مخطوطات کے مرتّب ایتھے صفحہ ۲٦۴ پر لکھتے ہیں :

"بکسر سین مہملہ و سکون جیم و کسر زای معجمہ ۔"

"Sigzi as explained in marginal glass on folio 5-a."

یہ ایک نہایت ہی معمولی بات ہے کہ سیستان یا سجستان کے رہنے والے کو سکزی یا سجزی کہتے ہیں ۔ شمس العلماء کا اپنا بیان ہے کہ خواجہ صاحب کے بزرگ سیستان میں رہتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ سیستان کے باشندے کو سجزی کہیں گے نہ کہ سنجری ۔ تحفۃ الکرام کا مصنف علی شیر قانع دوسری جلد کے صفحہ ۸۵ پر یوں رقم طراز ہے :

"سیستان ۔ آن را سجستان نیز گویند ، چہ سجستان بن فارس آباد کردہ و بہ زابلستان و شہر نیمروز نیز شہرت دارد و اہل آن دیار را سکزی نیز می خواندند و عرب معرّب ساختہ سجزی نیز کردند ۔"

اور پھر صفحہ ۸٦ پر مشاہیر سیستان میں خواجہ معین الدین سجزی شیخ الشیوخ طریقت کا ذکر بھی کرتا ہے ۔

شمس العلماء کا بیان ہے کہ خواجہ صاحب پہلے صوفی ہیں جو بالائی ہندوستان میں آ کر تصوف کا چراغ روشن کرتے ہیں ۔ اگرچہ شیرانی صاحب نے محض اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی لیکن شمس العلماء کو یہ

اشارہ بھی ناگوار گزرا اور اُنھوں نے اپنے بیان کو سچا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا روز لگا دیا ہے ، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اس جہد بلیغ کے باوجود بھی وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے ۔ شمس العلماء فرماتے ہیں کہ ان کا بیان ''ایرانی مؤرخین اور محققینِ یورپ کے زبردست اسناد پر مبنی ہے ۔'' آئیے ذرا اُن اسناد کا جائزہ لیں ۔ ایرانی مؤرخین میں سے 'مجمع الفصحا' کے مصنّف رضا قلی ہدایت کا بیان ملاحظہ ہو :

''وی در هندوستان مّروج مذهب اسلام شده ۔''

اس بیان میں تصوف کا کہیں ذکر موجود نہیں ، شمس العلماء محض اس بیان کی بنا پر یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب پہلے صوفی ہیں جنھوں نے بالائی ہندوستان میں آ کر تصوف کا چراغ روشن کیا ۔ ایرانی مؤرخ تو یہاں محض ہندوستان میں اسلام کی ترویج و اشاعت کا ذکر کر رہا ہے ، نہ کہ تصوف کے فروغ و ترقی کا اور اس پر لطف یہ ہے کہ اس ایرانی مؤرخ کے مندرجہ بالا بیان میں یہ کہیں نہیں پایا جاتا کہ خواجہ صاحب ہندوستان میں پہلے مبلغِ اسلام ہیں ۔ تبلغِ اسلام کے سلسلے میں خواجہ صاحب کی خدمات ہر لحاظ سے مستحقِ ستائش ہیں لیکن جس طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہندوستان میں اسلام کے پہلے مبلغ ہیں ، اسی طرح یہ دعویٰ بھی بےبنیاد ہے کہ خواجہ صاحب پہلے صوفی ہیں جنھوں نے بالائی ہندوستان میں آ کر تصوف کا چراغ روشن کیا ۔ ان سے بہت پہلے شیخ علی ہجویری جیسے بزرگوار اپنے مبارک وجود سے اس سرزمین کو مشرف کر چکے تھے ۔ ہاں اگر شمس العلماء یہ کہیں کہ چشتیہ سلسلے کو بعض اسباب کی بنا پر بہت فروغ ہوا تو یہ ایک امرِ واقع ہوا ۔

ایرانی مؤرخ کی شہادت تو آپ ملاحظہ فرما چکے ۔ محققین یورپ میں سے ڈاکٹر ریو اور ڈاکٹر نکلسن کا نام لیا گیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ بھی خواجہ صاحب کو ہندوستان کا پہلا صوفی مانتے ہیں ۔ 'کشف المحجوب' کا ترجمہ کرنے کے باوجود ڈاکٹر نکلسن ایسی غلط بات کیوں کر کہہ سکتے ہیں ۔

صفحہ ۸۰ ۔ خواجہ معین الدین اجمیری کا دیوان :

شمس العلماء خواجہ صاحب کی غزلیات پر رائے زنی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خواجہ صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے ۔ اس بات پر قناعت نہ

کرتے ہوئے وہ خواجہ صاحب کا حافظ سے مقابلہ کرکے اول الذکر کی برتری اور تفوق کا اظہار کرتے ہیں ۔

شمس العلماء کے لیے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر علماء کی تحقیقات سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور اگر کبھی استفادہ کریں بھی تو اکثر اصل ماخذ کا ذکر غائب کر جاتے ہیں ۔ رسالہ 'اردو' کے شمارہ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء میں شیرانی صاحب اپنے ایک مفصل مضمون میں اس پر بحث کر چکے ہیں کہ یہ دیوان ، جو خواجہ معین الدین اجمیری کی طرف منسوب ہے ، در اصل مولانا جامی کے ہم عصر مولانا معین الدین کی ملک ہے ۔ اس دیوان کی کئی غزلیں مولانا معین الدین کی کتاب "معارج النبوۃ" میں درج ہیں ، جہاں مصنّف صاف طور پر انھیں اپنی تصنیف بتاتا ہے ۔ اگر شیرانی صاحب کا یہ مضمون شمس العلماء کے پیشِ نظر ہوتا تو وہ خواجہ صاحب کو صاحبِ دیوان قرار نہ دیتے اور حافظ شیریں سخن سے ان کا مقابلہ کرنے کا خیال تک بھی اپنے دل میں نہ لاتے ۔ شمس العلماء کے اس فرضی بیان پر شیرانی صاحب اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "خواجہ صاحب نہایت خوش قسمت ہیں جنھیں شمس العلماء کی ذات میں ایسا جوشیلا معتقد مل گیا ہے جس نے تمام دنیا کے برخلاف نہ صرف خواجہ صاحب کو شاعر ثابت کر دیا بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کی شاعری کے پایے کو حافظ سے بھی بڑھا دیا ۔ لیکن کیا یہ حقیقت ہے یا ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں !"

شیرانی صاحب نے شمس العلماء کے اطمینانِ قلب کے لیے ان کی انتخاب کردہ غزلیات میں سے نمونۃً ان چند غزلوں کی نشان دہی بھی کی جو مولانا معین الدین کی "معارج النبوۃ" میں درج ہیں اور آخر میں یہ بھی لکھا کہ :

> "جب دیوان کے اس قدر ابیات مولانا کے ثابت ہوئے تو کیا وجہ ہے کہ باقی غزلوں کو مولانا کی زادۂ طبع نہ مانیں اور تمام دیوان انھی کی طرف منسوب نہ کریں جس کے فی الحقیقت وہ مالک اور جائز مالک ہیں ۔"

یہ چونکا دینے والی اطلاع شمس العلماء کی خواجہ صاحب سے از حد عقیدت کی بنا پر ان کے لیے نہایت ہی مایوس کن ثابت ہوئی ۔ وہ تو اپنے زعم میں خواجہ صاحب کو حافظ سے بھی بہتر شاعر قرار دے چکے تھے ۔ لیکن اب وہ عالیشان

قصر ، جس کی حقیقت بیت العنکبوت کی سی تھی ، دھم سے آ گرا اور شمس العلماء کی امیدیں خاک میں مل گئیں ۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار دیتا لیکن شمس العلماء ایسی باتوں سے تھوڑے دبنے والے ہیں ، چنانچہ اُنھوں نے خواجہ صاحب کے شاعر و صاحب دیوان ہونے کے حق میں مندرجہ ذیل "زبردست" دلائل پیش کیے :

(۱) ''ایرانی تذکرہ نویسوں کی سند پر خواجہ صاحب کو شاعر قرار دیا گیا ہے ۔ 'مجمع الفصحا' کی جلد اول میں خواجہ صاحب کا تذکرہ شعرائے فارسی کے ماتحت کیا گیا ہے ۔ اس لیے شیرانی صاحب کا یہ الزام کہ شمس العلما نے تمام دنیا کے برخلاف خواجہ صاحب کو شاعر ثابت کر دیا ہے ، بالکل بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہے ، مزید بر آن مجمع الفصحا کے مصنف نے خواجہ صاحب کے منتخب اشعار بھی بطور نمونہ' کلام ان کے دیوان سے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں جو خواجہ صاحب کے نہ صرف شاعر بلکہ صاحب دیوان ہونے کا بھی ڈنکے کی چوٹ اعلان کر رہے ہیں ۔

نولکشور پریس نے پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۸۸ ہجری میں خواجہ صاحب کا دیوان طبع کیا اور ادھر رضا قلی ہدایت سنہ ۱۸۷۲ع میں وفات پا چکے تھے ۔ یقیناً ان کے پاس کوئی دوسرا قدیم ایرانی نسخہ ہوگا ۔ جس سے انھوں نے خواجہ صاحب کے اشعار انتخاب کر کے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں ۔"

یہ ہیں شمس العلماء کے زبردست دلائل ۔ خواجہ صاحب کو شاعر ثابت کرنے کے سلسلے میں 'مجمع الفصحا' کی شہادت چنداں وقیع نہیں اس لیے کہ فحول شعرا کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اس میں بعض ایسے مشاہیر کا ذکر بھی موجود ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں گاہے گاہے طبع آزمائی کی ہے ۔ ان سلاطین اور امرا کے علاوہ جن کے اشعار کے نمونے 'مجمع الفصحا' کے ابتدائی صفحات میں دیے گئے ہیں ، خود فصحا کے زمرے میں ابن سینا ، امام غزالی اور محقق طوسی کے اشعار درج کتاب ہیں ۔ اگر یہ علما چند شعر کہنے کی بنا پر شاعر کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں تو اس صورت میں خواجہ صاحب کو بھی شاعر کہا جا سکتا ہے ۔ 'مجمع الفصحا' میں خواجہ صاحب کے دو شعر اور دو رباعیاں درج ہیں ۔ اس ایرانی تذکرہ نویس نے خواجہ صاحب کی بابت جو تین چار سطریں لکھی ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس بارے میں اس کی معلومات ناقص ہی نہیں بلکہ

غلط بھی ہیں ۔ چونکہ شمس العلماء اس ایرانی محقق کے بہت گرویدہ ہیں ، ہم ذیل میں اس کی عبارت نقل کرتے ہیں :

"معین الدین چشتی ۔ از خواجگان سلسلۂ چشتیہ و از اصحابش سلطان شمس الدین غوری و شہاب الدین غوری بودہ اند و وی در ہندوستان مروج مذہب اسلام شدہ ، اصلش از چشت من تواع ہرات ۔ از آن جناب است . . ."

خواجہ صاحب کے لیے یہ کہنا کہ "اصلش از چشت من توابع ہرات است" کس قدر غلط ہے ۔ پھر شمس الدین کو غوری بتانا کہاں تک صحیح ہے ۔

شمس العلماء کا یہ دعویٰ کہ رضا قلی نے خواجہ صاحب کے اشعار کسی قدیم ایرانی نسخے سے نقل کیے ہوں گے ، حد درجہ کمزور اور فرضی ہے ۔ رضا قلی اپنے تذکرے میں ہرگز ہرگز خواجہ صاحب کو صاحب دیوان نہیں بتاتا ۔ کوئی تعجب نہ ہوگا کہ رضا قلی نے وہی اشعار نقل کیے ہوں جو تقی اوحدی ، والہ داغستانی اور میر حسین دوست سنبھلی یا کسی اور تذکرہ نگار نے خواجہ صاحب کی طرف منسوب کیے ہیں ۔ جو دو رباعیاں 'مجمع الفصحا' میں خواجہ صاحب کے نام سے دی گئی ہیں لطف علی آذر اپنے 'آتش کدہ' میں وہی دو رباعیاں الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ خواجہ صاحب کی طرف منسوب کرتا ہے ۔

(۲) "شیخ علی ہجویری کی شان میں خواجہ صاحب کے قصیدے کا مطلع بھی ، جسے مبصّر نے اپنے تبصرے میں نقل کیا ہے ، خواجہ صاحب کے شاعر ہونے کا ثبوت ہے :

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا
ناقصان را پیر کامل کاملان را رہنما"

عام طور پر صرف یہی ایک شعر نقل کیا جاتا ہے لیکن آج شمس العلماء سے یہ سن رہے ہیں کہ ایک پورا قصیدہ لکھا گیا تھا جس کا مطلع مندرجہ بالا شعر ہے ۔ بفرض محال یہ شعر ایک قصیدے کا مطلع ہے ، پھر بھی اس سے خواجہ صاحب کا صاحب دیوان ہونا کہاں ثابت ہوا ؟ کیا ہر شخص ، جس نے کبھی کبھار چند شعر نظم کیے ہوں ، صاحب دیوان شاعر کہلانے کا مستحق ٹھہرتا ہے ؟

اس کے علاوہ شیرانی صاحب خود اپنے تبصرے میں تقی اوحدی ، والہ اور

میر حسین دوست سنبھلی کا خواجہ صاحب کی طرف اشعار منسوب کرنا بیان کر چکے ہیں -

(۳) شمس العلماء نے دعویٰ کیا ہے کہ بغیر دھوکا کھائے خواجہ صاحب کی جن غزلوں کا انگریزی ترجمہ انھوں نے اپنی کتاب میں دیا ہے ، وہ نولکشور ایڈیشن کی غزلوں سے مختلف ہیں - چنانچہ مقابلہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ دونوں میں کس قدر تفاوت لفظی ہے -

جب شمس العلماء کو خود اس بات کا اقرار ہے کہ دیوان کا وہ نسخہ جس سے انھوں نے استفادہ کیا ہے ، ہندوستان میں سنہ ۱۹۱۰ع میں طبع ہوا ہے ، (یعنی نولکشور پریس کا ایڈیشن) پھر کیا ہم ان سے دریافت کر سکتے ہیں کہ انھوں نے کس مطبوعہ یا قلمی نسخے کی سند پر غزلوں کے الفاظ میں تغیر و تبدل کیا ہے ؟ واقعہ یہ ہے کہ اپنے اس اصول کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے ، کہ کسی قرأت میں کوئی تبدیلی نہ کرنی چاہیے جب تک کہ کلام کے مہمل ہونے کا اندیشہ نہ ہو ، شمس العلماء نے ایک آدھ جگہ اصلاح دینے کی کوشش کی ہے ، لیکن جیسا کہ شیرانی صاحب نے بتایا ہے ، شمس العلماء نے صحیح کلام کو مہمل بنا دیا ہے - مطبوعہ دیوان معین الدین کی ایک غزل کا یہ مطلع ہے :

وقت آنست کہ دل واقف اسرار شود
جای آنست کہ جان طالب دیدار شود

شمس العلماء کی قرأت ملاحظہ ہو :

واقف آنست کہ دل واقف اسرار شود
مرد آنست کہ جان طالب دیدار شود

شمس العلماء کی اصلاح نے شعر کا حسن دوبالا کر دیا ہے -

(۴) چونکہ شمس العلماء اپنی انتخاب کردہ غزلیات اور قصائد میں سے چار غزلوں اور ایک قصیدے کو مولانا معین الدین کی ملک پاتے ہیں ، اس لیے شیرانی صاحب کے اعتراض کو ''بے شبہ اہم'' سمجھتے ہیں لیکن اطمینانِ قلب کے لیے ابھی مزید وقت اور تحقیق کے طالب ہیں اور اسے حق الیقین کے درجے تک پہنچا دینے کے لیے تیار نہیں - ہم شمس العلماء سے درخواست کریں گے کہ اگر وہ مولانا معین الدین کی 'معارج النبوۃ' میں نقل کردہ غزلوں کا مقابلہ دیوان

معین الدین سے کریں تو پندرہ سولہ کے قریب انھیں ایسی غزلیں ملیں گی جو دونوں میں مشترک ہیں ۔

ہمیں شمس العلماء سے یہ شکایت بھی ہے کہ وہ حوالہ تو صرف 'مجمع الفصحا' کا دیتے ہیں لیکن ذکر کرتے ہیں ایرانی تذکروں کا ۔ اس قسم کا مبالغہ کہاں تک درست ہے ؟

صفحہ ۸۵ ۔ کھوکھر اور دمیک :

شمس العلماء لفظ کھوکھر کو کھکر بفتح کاف لکھتے ہیں اور دمیک کو بضم دال ۔ شیرانی صاحب نے تصریح کرکے لکھا ہے اصل لفظ کھوکھر ہے ۔ اس کا قدیم تلفظ بہ تخفیف واو تھا ۔ ہائے مخلوط فارسی لکھی نہیں جاتی اس لیے ککر بضم اول لکھتے ہیں ۔ اور شیرانی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ دمیک بفتح دال ہے نہ بضم ۔

شمس العلماء اپنے جواب میں لین پول کی 'تاریخ ہند قرون وسطیٰ میں' کا حوالہ دے کر اپنے دعوے پر اصرار کرتے ہیں کہ یہ لفظ ککر بفتح کاف معجمہ ہے نہ بالضم ، لہٰذا مبصّر کی تحقیق اور اصلاح غیر مستند اور ناقابلِ قبول ہے ۔

تعجب ہے کہ شمس العلماء نے متقدمین کو نظرانداز کرکے لین پول سے کیوں استناد کیا ۔ میجر راورٹی نے 'طبقات ناصری' کے انگریزی ترجمے میں صفحہ ۴۵۵ پر لفظ کھوکھر پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ کھوکھر اور ککھر بالکل علیحدہ قومیں ہیں ۔ کھوکھر کو بعض اوقات کھکھر بھی لکھا جاتا ہے ۔ لیکن پہلی صورت صحیح ترین ہے ۔ ابن الاثر 'الکامل' کی بارھویں جلد کے صفحہ ۹۶ پر ''ذکر قتال شہاب الدین الغوری بنی کوکر'' لکھتے ہیں ۔ چونکہ عربی میں 'کھ' نہیں اس لیے اسے کاف میں تبدیل کر دیا گیا ہے، لیکن گجرات کی عربی تاریخ 'ظفرالوالہ' کا مصنّف صاف ''عصیان کھوکران'' لکھ رہا ہے (جلد دوم ، صفحہ ۶۸۲) ۔ طبقاتِ ناصری میں کوکھران[1] اور بدایونی[2] کے یہاں طائفہ' کھوکھران ملتا ہے ۔

۱۔ طبقات ناصری ، صفحہ ۱۲۳ ۔
۲۔ منتخب التواریخ ، جلد اول ، صفحہ ۵۲ ۔

یہ دعویٰ کرنے کے بجائے کہ مؤرخ دمیک کو بضم دال بھی لکھتے ہیں ، شمس العلماء کو چاہیے تھا کہ کسی ایک مؤرخ کا حوالہ بھی تو دیتے لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو انھیں ایسا بے بنیاد دعویٰ نہیں کرنا چاہیے ۔

صفحہ ۸۶ ۔ عطارد اور تیر :

شمس العلماء عطارد کا فارسی مرادف 'منشی فلک' یا 'دبیرِ فلک' بتاتے ہیں ۔ اس پر شیرانی صاحب نے لکھا کہ دبیر فلک یا منشیٔ تو کنایہ ہے ، عطارد کی فارسی 'تیر' ہے ۔ شمس العلماء صاحب کی ضد اکثر مضحکہ انگیز ہوتی ہے ۔ اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''مصنف کا بیان صحیح ہے ۔ عطارد سے جو مراد ہے یعنی عموماً جو مفہوم لیا جاتا ہے وہ منشیٔ فلک یا دبیرِ فلک ہے ، تیر دراصل عطارد کا فارسی نام ہے جو خارج از بحث ہے ۔'' حالانکہ جس چیز کو یہاں خارج از بحث کہا جا رہا ہے وہی موضوع بحث ہے لیکن شمس العلماء کو کون سمجھائے ۔

صفحہ ۸۷ ۔ تاج الدین ریزہ :

شمس العلماء لکھتے ہیں کہ تاج الدین دہلوی کا دادا غزنویوں کے آخری تاجدار خسرو بن ملک شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا تھا اور شاہی فوج میں شامل ہو گیا تھا ۔ نوجوان شاعر کا باپ سنہ ۵۸۰ ہجری میں اس خاندان کی آمد کے بہت جلد بعد دہلی میں پیدا ہوا ۔ ان کے اسلاف میں سے کوئی شاعر نہ تھا ۔ اس نے کئی (نظموں) میں التتمش کی فتوحات کا ذکر کیا ہے ۔

صفحہ ۳۲۸ کے ذیلی نوٹ میں شمس العلماء لکھتے ہیں کہ 'سیرالسالکین' کا مصنف اسے ''تاج الدین شمس دبیر'' کہہ کر پکارتا ہے اور وہ حضرت نظام الدین اولیاء کا استاد تھا ۔

شمس العلماء کے بیان میں سے شیرانی صاحب کو ان چیزوں پر اعتراض ہے :

(۱) غزنویوں میں کوئی ملک شاہ نہیں گزرا ۔ خسرو نام کے اس خاندان میں دو بادشاہ ہیں ، معزالدولہ خسرو شاہ بن بہرام شاہ ۔ دوسرا تاج الدولہ خسرو ملک ۔

(۲) دہلی سنہ ۵۸۰ ہجری میں پرتھی راج کے قبضے میں تھی ۔ مسلمانوں

کا قبضہ اس پر سنہ ۵۸۹ ہجری میں ہوتا ہے ۔ یہ فرض کر کے کہ تاج دبیر کے بزرگ فتح دہلی کے فوراً بعد آئے تو بھی سنہ ۵۹۰ ہجری سے قبل نہیں آ سکتے ۔ اگر تاج کا باپ سنہ ۵۹۱ ہجری میں پیدا ہوا اور اس کی عمر کے بیسویں سال یعنی سنہ ۶۱۱ ہجری میں تاج پیدا ہوا ، تب بھی شاعری میں نام پیدا کرنے اور شمس الدین التتمش کا مداح اور دبیر بننے کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے ۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب سنہ ۶۲۶ ہجری میں خلیفہ عباسی المستنصر باللہ کا سفیر التتمش کے واسطے خلعت لے کر آتا ہے ، تاج الدین مبارکباد میں اس موقع پر ایک قصیدہ لکھتا ہے ۔ سنہ ۶۱۱ھ اور سنہ ۶۲۶ھ میں صرف پندرہ سال کا فرق ہے ۔ چودہ سال کی عمر میں وہ نہ دبیر الملک بن سکتا نہ ایسا پختہ مغز شاعر ہو سکتا کہ التتمش کے سامنے قصیدہ خوانی کر سکے ۔

(۳) 'سیرالسالکین' کے مصنف نے دو مختلف شخصوں کو ایک شخص سمجھ لیا ہے ۔ تاج الدین ریزہ اور شمس دبیر دو جداگانہ شخص ہیں ۔ ان میں آخر الذکر شیخ نظام الدین اولیاء کا استاد تھا ۔

نمبر (۱) کے بارے میں شمس العلماء تسلیم کرتے ہیں کہ غزنویوں کے آخری تاجدار کا نام خسرو ملک بن خسرو شاہ ہے ، نہ کہ خسرو بن ملک شاہ ، البتہ وہ شیرانی صاحب کے بیان میں یہ غلطی نکالنا چاہتے ہیں کہ بہرام شاہ کا نام خسرو نہیں تھا ، یہ اس کے لڑکے کا نام تھا ۔ اگر شمس العلماء نے 'اردو' شمارۂ جولائی سنہ ۱۹۴۳ع میں شائع شدہ تصحیح ملاحظہ فرمائی ہوتی تو وہ اس تحقیق کی زحمت سے بچ جاتے ۔

نمبر (۲) چونکہ شمس العلماء یہ نہیں بتا سکتے کہ تاج الدین دبیر کی تاریخ پیدائش کیا ہے اس لیے وہ بر سبیل تنزل خلیفہ عباسی کے سفیر کی دہلی میں آمد کے وقت تاج الدین کی چودہ سال عمر تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے ۔ ابوالفضل نے چودہ سال کی عمر میں آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھی تھی جو اس نے دربار اکبری میں سنائی تھی اور خراج تحسین حاصل کیا تھا ۔

شمس العلماء کے غلط بیانات کی کوئی کہاں تک تردید کرے ۔ ابوالفضل کی تاریخ پیدائش ۹۵۸ ہجری ہے اور سنہ ۹۸۱ ہجری میں تقریباً ۲۳ برس کی عمر میں وہ اکبر کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے ۔ لیکن شمس العلماء ہیں کہ اسے چودہ سال کی عمر میں دربار اکبری میں شرف باریابی حاصل کرتا دیکھتے ہیں ۔ آخر اس درجہ بے احتیاطی کیوں ؟

نمبر (۳) کے متعلق شمس العلماء اپنی براءت یوں پیش کرتے ہیں کہ یہ تو 'سیرالسالکین' کے مصنف کا بیان ہے ، نہ کہ ان کا اپنا ۔ چلیے یونہی سہی لیکن سوال یہ ہے کہ شمس العلماء نے بغیر کسی تذبذب کے اس بیان کو نقل کیوں کر دیا ، جب کہ وہ خود اس کی صحت کے بارے میں مطمئن نہ تھے ۔

صفحہ ۹۰ ۔ شہاب مہمرہ اور عرفی :

شہاب مہمرہ کے ذکر میں ایک موقع پر شمس العلماء کہتے ہیں کہ عرفی نے ہندوستان آنے پر قصائد میں شہاب کی طرز نگارش اور تخییلی رجحان کا تتبّع کیا ہے ۔ شیرانی صاحب کے لیے شمس العلماء کا یہ بیان موجبِ حیرت ہے ۔ شہاب کا انداز ، علمیت ، سنگلاخ زمین اور صنعت لزوم ما لایلزم و دیگر صنائع ہیں ۔ اس کے علاوہ عرفی کے قصائد سے کہیں اس تتبّع کی تصدیق نہیں ہوتی ہے ۔

شمس العلماء تکلف اور کوشش سے شہاب اور عرفی کے کلام میں مماثلت کی صورتیں پیدا کرتے ہیں ، لیکن چونکہ وہ خود بھی اس کوشش سے مطمئن نہیں ہیں اس لیے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ :

"مصنّف کا یہ نظریہ اور مشاہدہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کو راست آئے ۔"

شمس العلماء کا فرض تھا کہ وہ عرفی کے کلام میں شہاب کی طرف کہیں معمولی سا اشارہ بھی ڈھونڈھ نکالتے ۔ بھلا عرفی جو ابوالفرج رونی ، انوری ، خاقانی اور ازرق کو اپنے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتا ، وہ بے چارے شہاب کو کیا خاطر میں لاتا ۔

صفحہ ۹۱ و ۹۲ ۔ عمید سنامی کا قصیدۂ حبسیہ :

شمس العلماء نے عمید سنامی کا قصیدۂ حبسیہ درجِ کتاب کیا ہے اور اس کا

عنوان ''فی التوحید'' دیا ہے حالانکہ عمید نے یہ قصیدہ بحالت قید لکھا ہے اور اس میں صریح اشارے ایک برج میں قید کیے جانے اور پاؤں میں بیڑیاں پڑنے کے متعلق موجود ہیں ، چنانچہ :

ره درین یک برج بی روزن نمودندم ولی
من بهمت ره برون از هفت روزن کرده ام
در گریبان سرفرو برد اژدهای هفت سر
تا من این مار دوسر در زیر دامن کرده ام
بند بیژن می کنندم عرض در چاه ستم
نی منیژه دیدم و نی جرم بیژن کرده ام

شمس العلماء کی نکتہ آفرینی ملاحظہ ہو کہ ''قید خانے میں کوئی قصیدہ لکھے جانے سے اس کی سرخی 'حبسیہ قصیدہ' نہیں ہو جاتی ۔''

اگر ایک شاعر اپنی قید و بند کا ذکر پورے قصیدے میں کرے اور آخر میں خدا تعالیٰ سے کرم و بخشش اور خلعتِ امن کی التجا کرے لیکن چونکہ اس کا مرغ جان خدا کی توحید کے ترانے گاتا ہے ، تو کیا اس پورے قصیدے کو نظرانداز کر کے محض اس کے آخر میں دعائیہ الفاظ سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ یہ قصیدہ 'فی التوحید' ہے ؟

شمس العلماء کو اس بات پر بھی اصرار ہے کہ ''مبصّر کے منقول اشعار میں کسی جگہ بھی 'حبسیہ' یا لفظ 'حبس' کا مذکور تک نہیں ۔'' ہم اس حد تک بدگمان نہیں ہو سکتے کہ شمس العلماء ''برج بےروزن'' اور ''بند بیژن'' کے معانی سے نا آشنا ہیں ۔ بہر حال اگر ان کی تشفی لفظ 'حبس' سے ہی ہو سکتی ہے تو وہ بھی حاضر ہے :

همدمانم هر یکی در شغل و من در بند حبس
حاش لله زین سخن تنها گنه من کرده ام

حبس بر من شیون آورده است و از لطف سخن
شور دیدستی که من در عین شیون کرده ام

اس آخری شعر کے بعد قصیدے کے چار شعر اور رہ جاتے ہیں جن میں شاعر خدا کی بارگاہ میں دعا کرتا ہے ۔ یہ بھی یاد رہے کہ ڈاکٹر اقبال حسین

اپنی کتاب 'ہندوستان کے قدیم شعرا' میں اس قصیدے کا عنوان صحیح طور پر ''حبسیہ'' دیتے ہیں (کتاب مذکور، صفحہ ۲۱۲ اور ۲۱۳) - یہاں شمس العلماء پھر تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں - شیرانی صاحب کے نقل کردہ شعر ــــ همدمانم هر یکی درشغل و من در بند حبس ــــ میں 'من در بند حبس' کی جگہ شمس العلماء ''من در بندگی'' بنا کر فرماتے ہیں ''لفظ حبس کا مذکور تک نہیں -'' تعجب ہے کہ شمس العلماء جنھیں ''الحاج'' ہونے پر ناز ہے، ایسی علمی خیانت کیسے روا رکھتے ہیں، جب کہ خود ان کی کتاب میں ''در بند حبس'' درج ہے -
(صفحہ ۳۷۲)

صفحہ ۹۸ - امیر خسرو اور نستعلیق و شکستہ خط :

شمس العلماء فرماتے ہیں کہ خسرو کے والد نے مشہور خوش نویس مولانا سعد الدین خطاط کو ان کا استاد مقرر کیا جو خسرو کو نستعلیق و شکستہ خطوں کی تعلیم دیتے تھے -

شمس العلماء کا یہ حیرت انگیز بیان پڑھ کر شیرانی صاحب نے لکھا کہ ''سنہ ۶۶۰ ہجری کے قریب خطِ نستعلیق و خطِ شکستہ دنیا کے پردے پر موجود نہیں تھے - امیر خسرو کے عہد میں خطِ شکستہ کا دعویٰ کرنا تاریخ سے بے خبری کا ثبوت دینا ہے -'' انصاف اور سچائی کا تقاضا تو یہی تھا کہ شمس العلماء کشادہ پیشانی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے لیکن ایسی سلامت روی کی توقع ان سے کیوں کر کی جا سکتی ہے - فرماتے ہیں کہ :

> ''الفاظ شکستہ و نستعلیق بمعنی اصطلاحی و بلحاظ تاریخ استعمال نہیں کیے گئے ہیں - نہ ان کا یہ مفہوم مصنّف کے ذہن میں تھا - مصنّف کی مراد اول الذکر سے معمولہ و کاروباری رسم الخط ہے جو بے تکلف و قلم برداشتہ لکھا جائے اور موخرالذکر سے مراد عمدہ اور صاف خط ہے جو قلم روک کر خوش خط لکھا جائے -''

ایسی کھینچا تانی سے تو یہ کہیں بہتر ہوتا کہ شمس العلماء اپنی ناواقفیت کا اقرار کر کے اس غلطی کی اصلاح فرما لیتے -

صفحہ ۹۹ - امیر خسرو اور مثنوی تاج الفتوح یا مفتاح الفتوح :

امیر خسرو کی تصنیفات کے ضمن میں شمس العلماء نے ایک مثنوی کا نام 'تاج الفتوح' بتایا ہے جو جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے جلوس کے سال میں تصنیف ہوتی ہے ۔

شیرانی صاحب نے لکھا کہ اس مثنوی کا نام 'مفتاح الفتوح' ہے اور اسے پروفیسر یٰسین خان نیازی نے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کر دیا ہے ۔

شمس العلماء بھلا اس مشورے کو کیسے منظور کر سکتے تھے ، جب کہ خوش قسمتی سے آسی پریس کے کتب خانے میں ایک قلمی نسخہ 'تاج الفتوح' کے نام سے محفوظ ہے ۔ اس کے علاوہ مولانا شبلی نے 'شعرالعجم' میں اس مثنوی کا نام 'تاج الفتوح' لکھا ہے ۔ اس کے بعد کسی شہادت کی ضرورت ہی نہیں ۔

و لیس وراء عبّادان قریۃ

اس مثنوی کے آخر میں خود امیر خسرو اس کا نام مفتاح الفتوح لکھتے ہیں ۔ ہم خاتمے میں سے چند شعر یہاں نقل کرتے ہیں تا کہ شمس العلماء کو حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہو جائے :

(صفحہ ۴۴ و ۴۵ ، میگزین ، فروری سنہ ۱۹۳۷ع)

زدہ فتحش می اندر جام کردم
کہ مفتاح الفتوحش نام کردم
برآوردم چو فردوس برینش
دوم عشر جمادی آخرینش
بتاریخ آنچہ در سلک عدد بود
ز هجرت سال بر شش صد نود بود

شمس العلماء اپنی تحریر کو بہت جلد بھلا کر تناقض میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ اس مثنوی کا نام خود انھوں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۱۶ پر 'مفتاح الفتوح' دیا ہے ۔ اب شمس العلماء کے کس بیان کو سچا سمجھیں ۔

صفحہ ۱۰۰ - خان شہید کے ساتھ تاتاریوں کی جنگ :

شمس العلماء نے برنی کے حوالے سے لکھا ہے کہ خان شہید کی تاتاریوں کے ساتھ لڑائی دیبال پور اور لاہور کے وسط میں ہوئی اور تاتاریوں کے سردار کا نام

تیمور خان تاتار ہے۔

شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ امیر خسرو اور خواجہ حسن ، جو اس جنگ میں موجود تھے ، صاف بیان دیتے ہیں کہ یہ جنگ دریائے لاہور پر ہوئی ہے ۔ نیز تاتاریوں کے سردار کا نام تیمور نہیں بلکہ ایتمر ہے ۔ برنی نے یہ نام بہ تخفیف یا 'اتمر' قلمبند کیا ہے :

''درمیان لوہور و دیوبال پور باتمر ملعون . . . محاربہ و مقاتلہ افتاد ۔''

شمس العلما اپنی صفائی میں دوبارہ برنی کا حوالہ دیتے ہیں حالانکہ یہی حوالہ معرض بحث میں ہے ۔ چونکہ ایتمر کے نام کے سلسلے میں شیرانی صاحب نے برنی کی عبارت نقل کی ہے ، شمس العلماء فوراً اچھل پڑے اور فرمایا کہ یہ مبصّر کا سہو قلم یا سہو نظر ہے کہ انھوں نے بھی برنی کا وہ اقتباس نقل کیا ہے جس میں لاہور اور دیپال پور کے درمیان جنگ کا واقع ہونا مذکور ہے ۔ حالانکہ ایک معمولی فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ اقتباس ایتمر کے سلسلے میں نقل کیا گیا ہے ، نہ کہ جنگ کا محل وقوع متعین کرنے کے لیے ۔

شمس العلماء بے جا طور پر مغلوں کے سردار کا نام تیمور بتاتے ہیں اور انھیں شیرانی صاحب کی اصلاح سے اتفاق نہیں ، چنانچہ فرماتے ہیں کہ :

> "مبصّر کا برنی کی منقول عبارت میں 'باتمر' کو 'بہ اتمر' یعنی الف کو متحرّک پڑھنا بلا سند ہے ، البتہ اگر مبصّر بھی کوئی خارجی شہادت مصنف کی طرح پیش کرتے تو ان کا عذر قابل تسلیم ہوتا کیونکہ صرف برنی کی عبارت ، جس میں الف متحرک اور ساکن دونوں طرح سے پڑھا جا سکتا ہے ، ان کے حق میں فیصلہ کن نہیں ہے''

شمس العلماء فرشتہ کا حوالہ دے کر ، جس میں غالباً طباعت کی غلطی ہے ، اپنی فتح مندی کا ڈنکا بجاتے ہیں اور اپنے قارئین کو اس مغالطے میں الجھانا چاہتے ہیں کہ شیرانی صاحب نے صرف برنی کی شہادت پیش کی ہے جو بہر حال شک و شبہے سے خالی نہیں ۔ شمس العلماء ہمیں معاف فرمائیں اگر ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ وہ یہاں علمی دیانت سے کام نہیں لے رہے بلکہ صریح غلط بیانی کے مرتکب ہیں ۔ شمس العلماء نے اپنی کتاب میں حسن دہلوی کا مرثیہ منثور بتمام و کمال نقل کیا ہے اور شیرانی صاحب نے اس مرثیے کی اصل عبارت نقل

کر دی جس میں مغل سردار کا نام صراحت کے ساتھ ایتمر لکھا ہوا موجود ہے - لیکن شمس العلماء اسے نظر انداز کر گئے - ان کے پندار کی شکست کی خاطر ہم وہی عبارت دوبارہ نقل کرنے کی اجازت چاہتے ہیں :

"بررای مشکل کشای عرض داشتند کہ ایتمر با تمامی لشکر بہ سہ فرسنگی فرود آمدہ است'' (اصل کتاب ، صفحہ ۳۰۴) - بدایونی کی منتخب التواریخ میں ایتمر ہی درج ہے (جلد اول ، صفحہ ۱۳۱) -

اب شمس العلماء فرمائیں کہ اس واضح خارجی شہادت کے ہوتے ہوئے ان کا کاکل سرکش سبزۂ خط سے دیا ہے یا نہیں اور یہ زمرد ان کے دم افعی کا حریف ہے یا نہیں ؟

صفحہ ۱۰۱ - امیر خسرو اور ان کا مربی" ملک امیر علی خان جہان :

شمس العلماء لکھتے ہیں کہ خان شہید کی وفات کے بعد امیر خسرو کچھ سال تک ملک امیر علی کے پاس رہے جو غیاث‌الدین بلبن کا درباری امیر تھا - وہ عام طور پر حاتم خاں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ شعرا کے حق میں حاتم کی طرح فیّاض تھا - خسرو نے اس کی مدح میں متعدد قصیدے لکھے اور ایک منظوم 'اسپ نامہ' بھی اس واسطے کے تالیف کیا -

شیرانی صاحب کو شمس العلماء کا یہ بیان بوجوہِ ذیل تسلیم نہیں :

(۱) خان شہید جمعہ کے روز غروب آفتاب کے وقت سنہ ۶۸۳ ہجری کے ذوالحجہ کی آخری تاریخ کو شہادت پاتا ہے اور خسرو گرفتار ہوکر دو سال بلخ میں گزارتے ہیں ، جیسا کہ مشہور ہے - یہ مدت ہمیں ۶۸۶ ہجری تک پہنچا دیتی ہے جو معزالدین کیقباد کی تخت نشینی کا سال ہے - کیقباد انہیں بلاتا ہے مگر ملک اختیارالدین (نظام‌الدین) وزیر کے ساتھ اچھے تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے خسرو دربار میں نہیں جاتے اور خان جہان کے ساتھ اودھ چلے جاتے ہیں ، جو اس صوبے کا والی تھا - تعجب یہ ہے کہ خسرو اسی خان جہان کو حاتم کا خطاب دیتے ہیں ، دو سال اس کے ساتھ گزارتے ہیں - اس وقت تک ۶۸۸ ہجری شروع ہوگیا ہے یا ہونے والا ہے - اسی سال ربیع الاول کی کسی تاریخ سے وہ قران‌السعدین کی تصنیف پر بحکم کیقباد مصروف

ہیں ۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ خسرو کو اس ملک کے پاس
کچھ سال گزارنے کا موقع نہیں ملتا ۔

(۲) ملک امیر علی کا نام بھی زمانہ حال کا سا ہے ۔

(۳) شمس العلماء نے خسرو کی قید کا زمانہ محسوب نہیں کیا ۔

شمس العلماء نے شیرانی صاحب کے دوسرے اعتراضات سے قطع نظر کر کے اپنا تمام زور بیان نمبر ۲ پر صرف کر دیا ہے ۔ شیرانی صاحب نے بجا طور پر شک ظاہر کیا تھا کہ ملک امیر علی کا نام زمانہ حال کا سا ہے ۔

شمس العلماء نے اپنے بیان کی صداقت ثابت کرنے کے لیے برنی صاحب کا حسب ذیل بیان پیش کیا ہے :

"چہارم ملکی از نوادر سلوک در عصر سلطان بلبن ملک امیر علی سر جاندار مولا زادۂ سلطان بلبن بود و او را از بسیاری بخشش حاتم خان گفتندی و مدائح او در دیوان امیر خسرو بسیار است و امیر خسرو چاکر او بود و اسپ نامہ بنام او گفتہ است ۔"

شمس العلماء کے نزدیک یہ بیان "شیرانی صاحب کے تمام شکوک اور اعتراضات کا مسکت جواب ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان تاریخی واقعات سے نابلد ہیں اور ملک امیر علی کے نام کے متعلق ان کے تبصرے کی حقیقت کھل جاتی ہے جس سے ان کا علم اللسان سے نابلد ہونا بھی پوری طرح منکشف ہو جاتا ہے ۔"

شمس العلماء اس جواب کو مسکت کہہ کر اپنا دل خوش کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ شمس العلماء خود بھی تسلیم کرتے [۱] ہیں کہ امیر خسرو بلخ میں مغلوں کی قید میں تقریباً دو سال گزارتے ہیں (اس لیے یہ دو سال کی مدت ہمیں ۶۸۶ ہجری تک پہنچا دیتی ہے ، جو معزالدین کیقباد کی تخت نشینی کا سال ہے) ۔ جیسا کہ شمس العلماء اپنی کتاب کے صفحہ ۴۱۴ اور ۴۱۵ پر رقم طراز ہیں ، امیر خسرو ، ملک نظام الدین سے اختلاف کے باعث خان جہان کے پاس چلے جاتے ہیں جو بادشاہ کی طرف سے اودھ کا عامل

۱- شمس العلما کی کتاب ، صفحہ ۴۰۰ ۔

تھا اور وہاں دو سال امن میں گزارنے کے بعد دہلی لوٹتے ہیں ۔ اب شمس العلماء فرمائیں کہ انھوں نے قید کا یہ زمانہ کیوں نظرانداز کردیا ہے ؟ جیسا کہ ہم ابھی عرض کریں گے ، شمس العلماء قبلہ خود اُلجھن کا شکار ہو کر امیر علی اور خان جہان کو دو الگ شخصیتیں مان رہے ہیں ۔

چونکہ برنی کے بیان میں شمس العلماء نے 'ملک امیر علی' لکھا ہوا پایا ، فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور شیرانی صاحب کی علم اللسان سے ناواقفیت کا اعلان کر دیا ۔ اگر وہ ذرا غور و فکر سے کام لیتے ، جس کے وہ عادی نہیں ہیں ، تو انھیں معلوم ہوتا کہ وہ علم اللسان سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کر رہے ہیں ، نہ کہ شیرانی صاحب کی ۔ شیرانی صاحب کا یہ بیان بالکل درست ہے کہ اس ملک کا نام ملک امیر علی نہیں ہو سکتا ۔ ملک اور امیر اس کے خطابات ہیں اور اس کا حقیقی نام علی ہے ۔ 'غرۃ الکمال' میں امیر خسرو کا ایک منظوم خط ملتا ہے جو انھوں نے تاج الدین زاہد کے نام لکھا ہے جس میں اختیار الدین[1] حاتم خان علی بن ایبک عاملِ اودھ کی عنایات کا ذکر کرنے کے بعد عزیزوں اور دوستوں کے فراق کے درد کا اظہار کیا ہے ۔ انھی درد انگیز جذبات کا اظہار امیر خسرو اس خط میں کرتے ہیں جو انھوں نے اودھ سے اپنے دوست شاعر نجم الدین حسن کو لکھا (رسالہ خامسہ ، اعجاز خسروی) ۔ اس میں بھی وہ اس امیر کا نام اختیار الحق و الدین . . . علی ایبک سلطانی دیتے ہیں[2] شمس العلماء نے اپنی کتاب صفحہ ۴۱۴ پر اسپ نامہ کے تین اشعار نقل کیے ہیں ، ان میں بھی اس ملک کا نام صاف طور پر علیٰ دیا گیا ہے :

شاہ عہد اختیار دولت و دین
آفتاب شرف بخانۂ دین

ہم علی نام و ہم بشیر ولی
شیر دلدل سوار ہم چو علی

کیا یہ شواہد شمس العلماء کے اطمینانِ قلب کے لیے کافی ہیں یا نہیں ؟

۱۔ ڈاکٹر وحید مرزا کی ''امیر خسرو'' ، صفحہ ۷۲ ۔

۲۔ قران السعدین ، دیباچہ ، صفحہ ۱۲ ۔

اس سلسلے میں ہم شمس العلماء کی یہ اُلجھن[1] بھی دور کر دینا چاہتے ہیں کہ امیر علی سرجاندار اور خان جہان عاملِ اودھ دو جدا جدا شخصیتیں تھیں ۔ خان شہید کی شہادت کے بعد امیر خسرو کو مغل گرفتار کر کے لے جاتے ہیں لیکن بلخ میں ان کا بحالت قید دو سال گزارنا صحیح نہیں ۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے خود خسرو کے بیان کی رو سے ثابت کیا ہے کہ گرفتاری کے فوراً بعد امیر نجات حاصل کر لیتے ہیں اور دہلی[2] پہنچتے ہیں ۔ اسّی سالہ بادشاہ بلبن اپنے قابل بیٹے کی وفات کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور راہی ملکِ بقا ہوا ۔ چونکہ اس کے جانشین کیقباد کے وزیر نظام الدین سے خسرو کے تعلقات اچھے نہ تھے اس لیے وہ نوجوان کیقباد کی دعوت کو قبول نہیں کرتے اور امیر علی سرجاندار المعروف بہ حاتم خاں کی پناہ میں چلے جاتے ہیں ۔ جب بغرا خاں نے اپنے پایۂ تخت لکھنوتی میں بیٹھ کر کیقباد کی عیاشی اور ملک نظام الدین کے مظالم کی داستان سنی تو وہ اپنے بیٹے کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا ۔ ادھر کیقباد نے بھی باپ سے مقابلہ کرنے کی پوری تیاریاں کر لیں ۔ باپ بیٹا دونوں اودھ میں ایک دوسرے کے مقابل پہنچ گئے لیکن آخر دونوں میں صلح صفائی ہوگئی ۔ بغرا خان واپس لکھنوتی چلا گیا اور کیقباد دہلی کی طرف روانہ ہوا ۔ روانگی کے وقت کیقباد امیر علی سرجاندار کو اودھ کا عامل مقرر کرتا ہے اور چونکہ امیر خسرو پہلے سے اسی امیر کی ملازمت میں تھے ، انھیں اپنی مرضی کے خلاف اودھ میں کچھ مدت کے لیے اور رکنا پڑا ، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں :

با علم فتح دران راہ دور
سایہ نشان شد بجد کنت پور
خان جہان حاتم مفلس نواز
گشت باقطاع اودھ سرفراز

۱۔ شمس العلماء اپنی کتاب کے صفحہ ۳۱۴ پر ملک امیر علی سرجاندار الملقب بہ حاتم خان کا ذکر کرتے ہیں اور صفحہ ۳۱۵ پر خان جہان عامل اودھ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ گویا امیر علی سرجاندار اور خان جہان دو الگ شخص ہیں ۔

۲۔ وحید مرزا ، صفحہ ٦٢ ۔

من کہ بدم چاکر او پیش ازان
کرد کرم زانچہ کہ بد بیش ازان

(قران السعدین ، مطبوعہ علی گڑھ ، صفحہ ۲۲۱)

یہ حقیقت کہ یہ ''خان جہان حاتم مفلس نواز'' امیر علی سرجاندار تھا ، اس منظوم خط سے واضح ہو جاتی ہے جو امیر خسرو نے تاج الدین زاہد کے نام لکھا اور جس کے آغاز میں ہی وہ اختیار الحق والدین . . . علی ایبک سلطانی کی توجہات کا ذکر کرتے ہیں ۔ وہ اس امیر کے عامل اودھ ہو جانے کا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں کرتے ہیں :

''هم در اثنای راہ مخدوم بندہ بمنزلت اقطاع اودہ شرف دست بوسی یافت ۔ بندہ کہ چون عطارد در شعاع آن آفتاب است نتوانست کہ بخانۂ خویش راجع شود ۔ ضرورت بہ استقامت آن طرف رضا داد . . . ۔''

(دیباچہ قران السعدین ، صفحہ ۱۸)

کیقباد کی وفات کے بعد جب جلال الدین فیروز شاہ خلجی سریر آرائے سلطنت ہوتا ہے تو کشلی خان المعروف بہ ملک چھجو علم بغاوت بلند کر دیتا ہے ۔ اس کے حامیوں میں سے ایک امیر علی سرجاندار عامل اودھ بھی ہوتا ہے ۔ برنی کے یہ الفاظ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں :

''و در دویم سال جلوس ملک چھجو برادر زادۂ سلطان بلبن در کڑہ چتر برگرفت و خطبہ بنام خود خووانانید و امیر علی سرجاندار مولا زادۂ سلطان بلبن کہ او را حاتم خان می‌گفتندی و اقطاع اودہ داشت یار او شد ۔'' (تاریخ فیروز شاہی ، صفحہ ۱۸۱)

مندرجہ بالا بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ امیر علی سرجاندار اور خانجہان دو الگ شخصیتیں نہیں ہیں ۔

صفحہ ۱۰۲ ۔ کیا 'خزائن الفتوح' نثر کی کتاب ہے یا مثنوی ہے ؟

شمس العلماء نے لکھا ہے کہ جلال الدین خلجی کی وفات کے بعد امیر خسرو ، علاء الدین کی ملازمت میں آ گئے ۔ انھوں نے اس کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے اور ایک مثنوی جس کا نام 'خزائن الفتوح' ہے ۔

شیرانی صاحب نے 'خزائن الفتوح' کے متعلق بتایا کہ وہ مثنوی نہیں ہے بلکہ نثر کی کتاب ہے - علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب اس کا فارسی متن اور انگریزی ترجمہ شائع کر چکے ہیں -

شمس العلماء اپنی غلطی کا اس دلچسپ طریقے سے اعتراف کرتے ہیں اور وہ بھی نیم دلی کے ساتھ :

"محققینِ یورپ نے اس خاص قسم کی نثر کو نثر منظوم لکھا ہے جس پر نہ خالص نظم کا اطلاق ہوتا ہے نہ نثر کا - اسی نظریے کے مطابق غلط نامے میں اس کی اصلاح ہو چکی ہے -"

اس فاضلانہ نکتہ آفرینی کی داد تو اہلِ علم ہی دے سکتے ہیں - ہم نیازمند صرف اتنا دریافت کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کا وہ کون سا محقق ہے جو ایک نثر کی کتاب کو مثنوی قرار دے گا ؟ شاید شمس العلماء ہی وہ فاضلِ یگانہ ہیں جنھیں اس قسم کی تحقیقات پر ناز ہو سکتا ہے -

صفحہ ۱۰۵ - خواجہ حسن دہلوی سنجری ہیں یا سنجری :

شمس العلماء نے خواجہ حسن دہلوی کو سنجری لکھا تھا جس پر شیرانی صاحب نے انھیں ٹوکا اور بتایا کہ یہ سجزی ہے اور 'سنجری' جاہل کاتبوں کی بدولت مشہور ہو گیا ہے -

لطف یہ ہے کہ کلیات حسن دہلوی کے مرتّب مولانا محوی نے بھی سجزی کو ہی درست قرار دیا ہے - لیکن شمس العلماء نے اپنی کتاب میں ان کی تغلیط کی ہے - اس سے زیادہ 'پر لطف 'مجموعۂ تذکار' کی وہ عبارت ہے جس کی بنا پر شمس العلماء اصرار کرتے ہیں کہ سنجری کی نسبت ہی صحیح ہے - حالانکہ وہ اس عبارت کا صحیح مفہوم سمجھ نہیں سکے - یہ عبارت نہایت سادہ اور واضح ہے اور اس سے ہر شخص وہی مردا لے گا جو شیرانی صاحب لے چکے ہیں - ذیل کی عبارت :

"گویند لقب وی امیر از قدیم است کہ اجدادش در عہد سلطان سنجر سلجوقی ازین نسبت ممتاز بودہ اند -"

نقل کرنے کے بعد شمس العلماء فرماتے ہیں کہ :

"اس بیان سے حسن کا خاندانی تعلق سلطان سنجر کے دربار سے پوری طرح

ظاہر ہے ، چنانچہ انھوں نے اسی خاندانی اعزاز کو برقرار رکھنے کے لیے امتیازی نسبت اپنے نام کے ساتھ لگا کر اپنے کو سنجری لکھا ۔ یہ اکیلی ایک ایسی محکم دلیل ہے جس کے سامنے مبصّر کی تمام عبارت آرائی فضول ہے ۔"

ایک معمولی سمجھ رکھنے والا شخص بھی جان سکتا ہے کہ یہاں حسن کے لقب امیر کی طرف اشارہ ہے ، نہ کہ سنجری کی طرف ۔ کیا شمس العلماء واقعی اتنی سادہ بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں ؟ یا مناظرے کے میدان میں محض اپنے حریف کو شکست دینے کے لیے ہر قسم کے حربے کو روا رکھتے ہیں ؟

تحریف اور غلط بیانی کی بعض مثالیں :

صفحہ ۷ ۔ شمس العلماء کی کتاب کا دوسرا باب ''غزنویوں سے قبل کا زمانہ'' ہے ۔ شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ ''اصل موضوع کا خیال کرتے ہوئے یہ باب بھی اتنا ہی بے محل اور بے موقع معلوم ہوتا ہے جتنا پہلا باب ۔ اس کے علاوہ براون اور لیوی نیز دیگر مغربی مصنفین یہی زمین بار بار طے کر چکے ہیں ۔''

شیرانی صاحب یہاں صاف طور پر غزنویوں سے قبل کے زمانے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ، لیکن شمس العلماء کی زبردستی ملاحظہ ہو کہ وہ اس سے ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ مراد لیتے ہیں اور حیرت انگیز غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''نیز مبصر کا یہ ادعا کہ براون اور دیگر مغربی مصنفین بھی یہی زمین بار بار طے کر چکے ہیں ، کوئی اصلیت نہیں رکھتا ۔ نہ براون نے یہ زمین طے کی ہے ، نہ دیگر مغربی مصنفین نے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کا تبصرہ ہے جس میں صحیح تنقید کے بجائے تنقیص کی فکر اور دھن غالب ہے ، جس کے زیر اثر خیالی براون تراشے گئے ہیں ۔ براون کے حسب فرمائش تو مصنّف نے کیمبرج یونیورسٹی میں رہ کر ''ہندوستان میں فارسی زبان و ادب بعہد مغل'' پر مقالے لکھے تھے ۔ اور عہد قبل مغل کو ایک بہت وسیع اور اہم مضمون سمجھ کر اور

بنا بریں اپنے محدود وقت اور ذرائع سے باہر پا کر آئندہ کے لیے اٹھا رکھا تھا ۔''

شمس العلماء کا ، بیان پڑھ کر ہر شخص حیران رہ جائے گا ۔ شیرانی صاحب تو ذکر کر رہے ہیں ، غزنویوں سے قبل کے زمانے کا اور شمس العلماء صریح غلط بیانی سے کام لے کر ہندوستان میں فارسی زبان اور ادب کی داستان سنا رہے ہیں ۔

صفحہ ۱۶ ۔ سبکتگین کی جے پال سے جنگ :

شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ سبکتگین کی جے پال کے ساتھ صرف دو مرتبہ جنگ ہوئی ۔ شمس العلماء جے پال کی جگہ ہندو لکھ کر تحریف اور غلط بیانی کے مرتکب ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ :

''مبصر کا عدد شمار بھی کہ جنگیں صرف دو ہوئیں ، غلط ہے ۔ فرشتہ نے بروایت حمداللہ مستوفی لکھا ہے کہ سبکتگین نے جب کہ وہ الپتگین کے عہد میں اس کی افواج کا کمانداں اعلیٰ تھا پندرہ برس تک ہندوؤں کے ساتھ متعدد جنگیں کیں اور کامیاب رہا ۔''

شیرانی صاحب کا بیان تو محض اس قدر ہے کہ سبکتگین کی جے پال کے ساتھ دو مرتبہ جنگ ہوئی ۔ شمس العلماء اصل مسئلے سے اعراض کر کے فرشتہ کا ایک غلط بیان پیش کرتے ہیں ۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ یہ ثابت کرتے کہ سبکتگین کی جے پال کے ساتھ دو سے زیادہ جنگیں ہوئیں ، چونکہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اس لیے جے پال کے بجائے ہندو کا لفظ داخل کر دیا ۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ فرشتہ حمداللہ مستوفی کا حوالہ دیتا ہے لیکن یہ حوالہ درست نہیں ۔ حمداللہ کی تاریخ گزیدہ[1] چھپ چکی ہے ۔ اس میں الپتگین کے لیے صرف یہ لکھا ہوا ہے کہ ''با ھندوان غزا کردی'' اور ان الفاظ کے بعد اس کے کمانداں اعلیٰ سبکتگین کی زیرِ قیادت اِن جنگوں کا ہونا مذکور نہیں ، ممکن ہے کہ شمس العلماء یہ کہیں کہ فرشتہ کے پاس تاریخ گزیدہ کا کوئی اور مخطوطہ ہوگا جہاں سے اس نے اپنی تاریخ میں وہ الفاظ نقل کیے ہیں ۔ اس شبہہ کی درستی

۱- تاریخ گزیدہ ، صفحہ ۳۹۳ ۔

کو ایک لمحے کے لیے تسلیم کرتے ہوئے ہم ایک دوسرے پہلو سے اس پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں ۔ کیا یہ تاریخی واقعہ ہے کہ سبکتگین الپتگین کے پاس پندرہ برس رہا ؟ اگر شمس العلماء نے اس مسئلے پر غور کیا ہوتا تو وہ فرشتہ کا ایک غلط بیان بغیر سوچے سمجھے درست نہ مان لیتے ۔ سبکتگین کو الپتگین کے پاس آئے ابھی بہ مشکل چار پانچ سال بھی نہیں ہوتے کہ الپتگین اس[1] دنیا سے چل دیتا ہے ۔ سنہ ۳۴۸ ہجری میں الپتگین سبکتگین کو خرید کرتا[2] ہے اور ۳۵۲ ہجری میں خود وفات پا جاتا ہے ۔

فرشتہ کی عبارت کے ترجمے میں بھی شمس العلماء سے ایک غلطی سرزد ہوتی ہے ۔ اس کی اصل عبارت یہ ہے :

> ''البتگین بروایت حمداللہ مستوفی پانزدہ سال ایام بدولت و اقبال گزرانید و درین مدت چندین کرت سپہ سالار وی سبکتگین باهندوان غزوات کردہ قرین فتح و نصرت گردید ۔''

شمس العلماء مندرجہ بالا عبارت کا یہ مفہوم بتاتے ہیں :

> ''فرشتہ نے بروایت حمداللہ مستوفی لکھا ہے کہ سبکتگین نے جب کہ وہ الپتگین کے عہد میں اس کی افواج کا کمانداں اعلیٰ تھا ، پندرہ برس تک ہندوؤں کے ساتھ متعدد جنگیں کیں اور کامیاب رہا ۔''

حالانکہ فرشتہ 'پندرہ برس کی مدت کے اندر' لکھ رہا ہے نہ کہ پندرہ برس تک جیسا کہ شمس العلماء سمجھ رہے ہیں ۔

صفحہ ۹۲ ۔ تاریخ سیستان کا سنہ تصنیف :

شمس العلماء نے سنہ ۴۴۸ ہجری کے قریب لکھا ہے ۔ شیرانی صاحب نے اس کی تصحیح و توضیح کرتے ہوئے لکھا کہ ''تاریخ سیستان کی تالیف سنہ ۴۴۸ ہجری میں نہیں بلکہ سنہ ۴۴۰ ہجری میں شروع ہوتی ہے ۔'' شمس العلماء 'شروع' کا لفظ اپنے جواب میں غائب کر جاتے ہیں اور بڑی معصومیت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ''سنہ ۴۴۸ ہجری میں اس کی تالیف ہونے کا فیصلہ خود تاریخ سیستان کے

۱۔ ڈاکٹر ناظم کی کتاب ''محمود آف غزنہ'' ، صفحہ ۲۶ ۔
۲۔ ایضاً ، صفحہ ۲۸ ۔

مصحح ملک الشعرا بہار اپنے مقدمے میں کر چکے ہیں ۔''

صفحہ ۳۵ : مسعود سعد سلمان کی تعریف میں حکیم سنائی کے اس شعر کے دوسرے مصرع کا ترجمہ شمس العلماء کے یہاں اس طرح ہے :

چون علوّ (صحیح : ولوع) جہان بشعر تو دید
عقل او گرد طبع جولان کرد

''His wisdom swiftly went round his disposition (desire).

اس پر شیرانی صاحب نے لکھا کہ ''ہمارے خیال میں شاعر کا مقصد ہے کہ اس کی عقل نے اس کی اشاعت کا اقدام کرنا چاہا ۔''

شمس العلماء تحریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ '' . . . ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ طباعت و اشاعت کا مفہوم عہد غزنوی میں موجود تھا حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت طباعت کا مفہوم کتمِ عدم میں تھا ۔''

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ طباعت کا لفظ شمس العلماء کا اضافہ ہے ۔ طباعت کا مفہوم عہد غزنوی میں یقیناً کتمِ عدم میں تھا لیکن اشاعت کا کام خطاطوں کے ذریعے برابر جاری تھا ۔ غالباً شمس العلماء اشاعت کے اصلی مفہوم سے نا آشنا ہیں یا پھر وہی مناظرانہ حربے کا استعمال ہے ۔

صفحہ ۹۷ ۔ خواجہ معین الدین اجمیری کی طرف منسوب کلام :

شمس العلماء کی کتاب میں یہ شعر اس طرح درج ہوا ہے :

بیا و ہر دو جہان را بہ ششدر اندر نہ
درین قمار بیک داد ہر چہ ہست ترا

شیرانی صاحب نے بتایا کہ دوسرے مصرع میں 'داد' کی جگہ داو' چاہیے ۔

شمس العلماء یہاں غلط بیانی سے کام لے کر لکھتے ہیں کہ مبصّر 'بیک داو' کے اصطلاحی مفہوم کو نہیں سمجھے اس لیے غلط اصلاح دے بیٹھے کہ 'داو' کی جگہ 'دار' ہونا چاہیے ۔

کیا غلط بیانی کی اس سے بدتر مثال مل سکتی ہے ۔ سچ ہے : ع

چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد

اس شعر کا ترجمہ شمس العلماء اس طرح کرتے ہیں :

"Come and put both the worlds within the six gates in this gamble stake the whole of existence.

یہ ترجمہ جس قدر غلط ہے اس کا اندازہ ناظرین خود لگا سکتے ہیں۔ شیرانی صاحب کے اعتراض کے بعد شمس العلماء یہ مطلب پیش کرتے ہیں جو تقریباً صحیح ہے :

''اے مخاطب ! تو دونوں جہاں کو ایک ہی داؤ میں جیت لے۔''

شمس العلماء اپنی غلطی پر اصرار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انھوں نے ششدر بمعنی مجازی 'عجز و حیرانی' نہیں لیا ہے بلکہ ششدر بمعنی لغوی (چھ دروازے) لیا ہے جو صوفیا کی اصطلاح میں بمعنی چھ حواس ہے۔

کوئی حضرت سے پوچھے کہ یہاں تو قمار بازی اور دونوں جہان جیت لینے کا ذکر ہے ، پھر یہ صوفیائے کرام کی 'چھ حواس' والی اصطلاح کہاں سے آ نازل ہوئی۔ لیکن شمس العلماء بھی کیا کریں ، غلطی پر اصرار کرنے کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔

صفحہ ۱۰۴ - امیر خسرو کے دیوان 'غرۃ الکمال' کا پندرہ روز میں تصنیف ہونا :

اپنی کتاب کے صفحہ ۳۸۸ اور پھر صفحہ ۴۱۹ پر شمس العلماء نے یہ بیان کیا ہے کہ امیر خسرو نے 'مطلع الانوار' کی طرح اپنے دیوان 'غرۃ الکمال' کو ، جو مجموعۂ قصائد و غزلیات ہے ، صرف پندرہ روز میں تیار کیا تھا۔

شیرانی صاحب نے اس بیان کو ناقابلِ قبول بتاتے ہوئے لکھا کہ ''غرۃ الکمال ایک ضخیم چیز ہے اور اس کے صفحات پانسو سات سو کے قریب ہوں گے۔ کاتب پندرہ روز میں تو اس کی کتابت بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ 'غرۃ الکمال' امیر نے پندرہ روز میں تیار کر لیا ، ہمارے اعتقاد کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہے''۔

تعجب ہے کہ شمس العلماء کی علمی دیانت نے انھیں کس طرح اس بات کی اجازت دی کہ شیرانی صاحب کے اس سادہ بیان میں ، جسے ایک عامی بھی سمجھ سکتا ہے ، تحریف اور غلط بیانی کو روا رکھیں۔ اوپر والی عبارت میں

شیرانی صاحب محض 'غرۃ الکمال' کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ دیوان پندرہ روز میں تیار نہیں ہو سکتا ، اس لیے کہ خود امیر خسرو[1] اس کے دیباچے میں صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ مجموعے میں وہ تمام کلام شامل ہے جو انھوں نے ۳۴ برس سے لے کر ۴۳ برس کی عمر تک یعنی ۶۸۵ ہجری سے لے کر ۶۹۳ ہجری تک کہا ہے ، لیکن بعد میں اور کلام بھی اس میں شامل کر لیا گیا ۔ اب اس صریح بیان کی موجودگی میں شمس العلماء کے ارشاد کی کوئی حقیقت نہیں رہتی ۔ لیکن شمس العلماء ، جو فن ِ مناظرہ کے امام ہیں ، نہایت خوبی کے ساتھ 'مطلع الانوار' کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور پورا زور اس بات کے ثابت کرنے پر صرف کر دیتے ہیں کہ 'مطلع الانوار' پندرہ دن میں لکھی گئی ۔ ہم صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے شیرانی صاحب نے کب انکار کیا ۔ ان کا اعتراض تو 'غرۃ الکمال' کے متعلق شمس العلماء کے بیان پر تھا ۔ اگر شمس العلماء چاہتے تھے کہ ''کھوٹا کھرا سامنے آ جائے'' تو انھیں چاہیے تھا کہ وہ 'غرۃ الکمال' کا پندرہ روز میں تصنیف ہونا ثابت کرتے ، اور اگر وہ اس پر قادر نہ تھے تو ان کے لیے اپنے قارئین کو یوں غلط فہمی میں مبتلا کرنا زیبا نہ تھا ۔

صفحہ ۱۰۶ ۔ امیر خسرو ، خواجہ حسن اور ضیا برنی کے باہمی تعلقات :

شمس العلماء فرماتے ہیں کہ ضیا برنی کے تعلقات امیر خسرو اور خواجہ حسن کے ساتھ نہایت دوستانہ تھے اور آخر تک پائدار رہے ، بلکہ یہ برنی ہے جو دونوں بزرگوں میں دوستی کا سبب بنا ۔

اگرچہ شمس العلماء کا یہ بیان بڑی حد تک برنی کے اپنے بیان پر مبنی ہے ، شیرانی صاحب کے خیال میں بوجوہ ِ ذیل محل ِ نظر ہے :

(۱) برنی کے ساتھ خسرو اور حسن کے روابط ان کی عمروں کا فرق دیکھتے ہوئے اتنے گہرے نہیں ہو سکتے ۔ جب برنی پیدا ہوتا ہے ، دونوں بزرگ بتیس تینتیس سال اپنی عمر گزار چکے ہیں ۔

(۲) برنی کا بیان بھی مشتبہ ہے کہ وہ ان دونوں بزرگوں میں دوستی کا باعث بنا ہے ۔ کیا یہ بلند پایہ شاعر ، جن کی عمر کا اکثر حصہ دہلی

۱- وحید مرزا کی امیر خسرو ، صفحہ ۱۵۹ ۔

میں بسر ہوتا ہے ، جہاں انھیں سیکڑوں مواقع ملنے جلنے کے میسر
ہو سکتے تھے اور دونوں خان شہید کی خدمت میں برسوں ملازم بھی
رہے ، برنی کے زمانے تک ایک دوسرے سے نا واقف رہے ؟

اگرچہ برنی کا بیان شیرانی صاحب کے سامنے نہ تھا ، تاہم اس کا مطلب جو وہ سمجھے درست تھا یعنی برنی کے ذریعے سے ان میں یگانگت یا رشتہ داری کا سلسلہ قائم ہوا ہے ورنہ ان بزرگوں کے سامنے برنی کی حیثیت خورد اور شاگرد کی سی ہو سکتی تھی۔

اپنے جواب میں یہاں پھر شمس العلماء ، شیرانی صاحب کی عبارت میں ایک ناروا تصرّف روا رکھتے ہیں جو ایک عالم کے لیے کسی صورت میں بھی زیبا نہیں ؛ اور وہ یہ کہ ''برنی کے ذریعے سے ان میں یگانگت یا رشتہ داری کا سلسلہ قائم ہوا ہے'' کو ''یگانگت یا رشتہ داری کا سلسلہ قائم نہیں ہوا ہے'' بنا دیتے ہیں۔ اس 'نہیں' کے اضافے کے بعد وہ حسبِ عادت طعن و طنز کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں کہ ''مبصّر کی حیرت انگیز بصیرت اور کرامت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ برنی کی عبارت بن دیکھے ہی وہ برنی کا مفہوم سمجھ گئے۔ ان کا یہ تبصرہ گویا تبصرۂ غیبی ہے جس پر ایمان لانا ہر مومن کلمہ گو کا فرض ہے۔''

برنی کے اصلی الفاظ یہ ہیں :

''و از صحت من میان ایشان هر دو استاد قرابتی شد و در خانهای یک دیگر
آمد و شد کردن گرفتند۔''

شمس العلماء نے اپنی کتاب (صفحہ ۵۷۴) میں 'قرابت' سے دوستی مراد لی ہے اور شیرانی صاحب اس سے رشتہ داری مراد لیتے ہیں۔ اگرچہ لغت اور قرینہ دونوں سے شیرانی صاحب کے خیال کی تائید ہوتی ہے لیکن شمس العلماء اپنے کو بے بس پا کر شیرانی صاحب کی عبارت میں تحریف کر کے مناظرے میں سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔

شمس العلماء کے اپنے قول کے بموجب ضیا برنی ۶۸۴ اور ۶۸۵ ہجری کے درمیان پیدا ہونا ہے۔ ادھر 'اعجاز خسروی'[1] میں امیر خسرو کا وہ محبت آمیز خط

۱۔ دیباچہ قران السعدین ، صفحہ ۱۳ - ۲۰ ۔

موجود ہے جو انہوں نے یکم ماہ رجب ۶۸۷ ہجری میں اودھ سے خواجہ حسن کے نام بھیجا ہے۔ اس خط میں شمس دبیر اور قاضی اثیرالدین محمد سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کس حسرت سے لکھتے ہیں:

''تمامی روز درین تحیر می بودم کہ یارب اگر در مجلس شمسی آن نجم علا بچشم آمدی نوراً علیٰ نور بودی۔''

یہ برادرانہ اور دوستانہ روابط، جن کا ذکر امیر خسرو اپنے خط میں کر رہے ہیں، شمس العلماء کے اس بیان کی تردید کے لیے کافی ہیں کہ ضیا برنی، جو ۶۸۷ ہجری میں ابھی دو تین سال کا بچہ تھا، امیر خسرو اور خواجہ حسن میں دوستی کا باعث بنا۔

شمس العلماء بہ حیثیت ایک ناقل اور مقلد کے:

اگرچہ پچھلے صفحات میں شمس العلماء کی علمی تحقیق کے جو نمونے ہم پیش کر چکے ہیں ان سے شمس العلماء کے محض ناقل اور مقلّد ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، تاہم قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لیے چند اور مثالیں حاضر ہیں۔ بار بار اپنے جواب میں شمس العلماء اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ان کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے اس لیے انہیں رد و بدل کرنے کا کوئی حق نہیں۔

صفحہ ۹۵ - آئین بزرگی ازدادبہ پارسی المعروف بہ عبداللہ ابن المقفع، تالیف ۲۳۷ ہجری:

شمس العلماء کے بیان پر شیرانی صاحب نے دو اعتراض کیے:

(۱) سنہ تالیف غلط ہے اس لیے کہ ابن المقفع ۱۴۰ - ۱۴۱ ہجری میں مارا جاتا ہے اور شمس العلماء سنہ تالیف ۲۳۷ ہجری بتاتے ہیں۔

(۲) ابن المقفع کا نام دادبہ نہیں بلکہ روزبہ ہے اور اس کے باپ کا نام دازویہ ہے، اور اس قول کی تائید میں شیرانی صاحب نے رسالہ کاوہ کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے۔

بظاہر ایسی صاف اور واضح بات ماننے میں شمس العلماء کو کوئی عذر نہ ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ بھی مجبور ہیں، کیا کریں، آقا بہروز مرتّب آئین بزرگی

نے سرورق پر دادبہ لکھ دیا ہے ۔ اگرچہ اپنے دیباچے میں بہروز اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ :

"برخی نام او را روزبہ نوشتہ اند ۔"

یہ 'برخی' کون ہیں ، اس پر شمس العلماء بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اکثر کے نزدیک ابن المقفع کا نام روزبہ ہے ، مثلاً نکلسن (تاریخ ادبیات عرب) ، کلیمان ہوار (ادبیات عرب) ، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ، جلد دوم (ابن المقفع کے تحت) ، براکلمن ۱ : ۱۵۱ سلیمینٹ ۱ : ۲۳۳ ، رضا زادہ شفق (تاریخ ادبیات ایران ، صفحہ ۳۰ ۔ طبع یورپ ، ص ۱۱۸) احمد امین (ضحی الاسلام ، الجزء الاول) ۔ سب سے قدیم سند ابن ندیم کی ہے جو کتاب الفہرست (مطبوعہ مصر) کے صفحہ ۱۷۲ پر لکھتا ہے :

"اخبار عبداللہ بن مقفع و اسمہ بالفارسیة روزبہ[1] و ہو عبداللہ بن المقفع ۔"

اب اس مشہور قول کو چھوڑ کر شمس العلماء کا محض آقاے بہروز کی سند پر اصرار کرنا مناسب نہیں ۔ آقائے عباس اقبال بھی ، جنھوں نے عبداللہ ابن المقفع کے سوانح و حالات پر ایک مختصر رسالہ لکھا ہے ، روزبہ نام کے بعد صاحب قاموس کی روایت کے مطابق دادبہ بھی لائے ہیں ۔

سنہ تالیف ۲۳۷ ہجری کے بارے میں شمس العلماء بالکل خاموش ہیں اور اپنی غلطی کا اعتراف تک نہیں کرتے لیکن اس سے زیادہ دلچسپ شمس العلماء کا یہ حیرت انگیز بیان ہے کہ "نامہ آئین بزرگی" فارسی نثر کی قدیم ترین کتاب ہے ، حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے ۔ اس کتاب میں ابن القفع کی کتاب 'الادب الکبیر' کے مضامین کا خلاصہ فارسی میں دیا گیا ہے ۔ جونکہ ہم اپنے

۱۔ فنوگل مصحح کتاب الفہرست نے اپنے حواشی (ص ۵۲) میں طبع وستنفلد 'وفیات الاعیان' سے روزبہ کی قرأت ذازویہ دی ہے مگر 'وفیات' طبع قاہرہ ۱ : ۱۵۱ پر ہے :

"و المقفع بضم المیم و فتح القاف و تشدید الفاء و فتحہا و بعدہا عین مہملة و اسمہ دازویہ ۔"

ظاہر ہے کہ مقفع کا نام دازویہ ہے ، نہ ابن المقفع کا ۔

مضمون (رسالہ 'اُردو' جولائی سنہ ۱۹۳۳ء) میں اس پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں اس لیے اس کا یہاں اعادہ نہیں کرتے لیکن یہ بات موجبِ حیرت ہے کہ شمس العلماء جیسا تجربہ کار پروفیسر قدیم اور جدید فارسی میں امتیاز نہیں کر سکا -

صفحہ ۲۸ - ترجمان البلاغہ از فرخی :

شمس العلماء کے نزدیک اس کی تاریخ تصنیف ۳۹۵ ہجری اور مقامِ تالیف غزنین ہے - شیرانی صاحب کے اس قول پر کہ فرخی اس تاریخ سے کئی سال بعد غزنین آیا ہے ، شمس العلماء فرماتے ہیں کہ :

''مصنف نے اپنے بیانِ واقعہ میں کسی قیاس اور خیال آرائی کی گنجائش نہیں رکھی اور اپنا تاریخی ماخذ تحریر کر دیا ہے (دیکھو حاجی خلیفہ اور تذکرہ دولت شاہ) -''

شمس العلماء نے حاجی خلیفہ اور دولت شاہ کا نام تو لے لیا لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ لکھتے کیا ہیں - یہ دونوں فرخی کی 'ترجمان البلاغۃ' کا ضرور ذکر کرتے ہیں لیکن تاریخ و محلِ تصنیف کے متعلق کچھ نہیں لکھتے - دولت شاہ کے الفاظ یہ ہیں :

''و کتاب ترجمان البلاغۃ در صنائع شعر از جملہ مولفات اوست و سخن او را فضلا بہ استشہاد می آوردند -''

حاجی خلیفہ کے اصل الفاظ ملاحظہ کیجیے :

''و کتاب ترجمان البلاغۃ فارسی بفرخی الشاعر جمع فیہ الصنائع البدیعۃ (کشف الظنون ، الجزء الاول ، صفحہ ۲۷۹) -''

ان تاریخی ماخذوں میں کہیں بھی 'ترجمان البلاغۃ' کے سنہ تالیف کی طرف اشارہ تک موجود نہیں -

صفحہ ۵۳- مسعود سعد سلمان کے حبسیہ قصیدے :

نظامی عروضی 'چہار مقالہ' میں مسعود کی حبسیات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

''و ارباب خرد و انصاف دانند کہ حبسیات مسعود در علو بچہ درجہ است -''

اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ میرزا محمد قزوینی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے چہار مقالہ ایڈٹ کیا ہے اور آنجہانی براؤن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ

بھی شائع کر دیا ہے ۔ قزوینی کے ایڈیشن کی کئی نقلیں ہندوستان میں چھپ چکی ہیں ۔ خدا جانے شمس العلماء کے پاس وہ کون سا نسخہ تھا کہ انھوں نے 'حبسیات' کی جگہ 'حسیات' لکھ کر اس کا ترجمہ Poetic touches کیا ، جسے شیرانی صاحب نے غلط بتایا اور صحیح قرأت 'حبسیات' کی طرف شمس العلماء کی توجہ مبذول کرائی ، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ خواجہ مسعود اپنی حبسیات کے لیے مشہور عالم ہیں ۔

شمس العلماء کا عذر لنگ ملاحظہ ہو ؛ فرماتے ہیں کہ جس نسخہ' کتاب سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے اس میں 'حسیات' ہی تحریر ہے ، بنابریں مصنف کو اس میں اصلاح دے کر 'حبسیات' کرنے کا کوئی حق نہ تھا ۔

کیا شمس العلماء ہمیں بتائیں گے کہ چہار مقالہ کا جو نسخہ ان کے زیر مطالعہ تھا کیا وہ صحیفہ' آسمانی تھا جس میں کسی قسم کے رد و بدل کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی ؟ ایک عالم کے لیے ایسی اندھی تقلید کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتی اور پھر خود چہار مقالہ کی عبارت کا سباق و سیاق شمس العلماء کی تردید کر رہا ہے ۔

نیز شمس العلماء کو شیرانی صاحب کا یہ بیان کہ "خواجہ مسعود اپنی حبسیات کے لیے مشہور عالم ہیں" ناقابل تسلیم ہے ۔ ان کے نزدیک حبسیات کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ مسعود اپنے اقسام کلام کے لیے مشہور عالم ہیں ۔ ہم شمس العلماء کی خدمت میں رشید وطواط کی رائے پیش کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے :

"و بیشتر اشعار مسعود سعد سلمان کلام جامع است خاصہ آنچ در حبس گفتہ است و ہیچ کس از شعرای عجم بگرد او نہ رسند ، نہ در حسن معانی و نہ در لطف الفاظ ۔" (حدائق السحر ، صفحہ ۸۲)

اسی طرح نظامی عروضی وغیرہ اس کی حبسیات کی تعریف کرتے ہیں ۔ آقائے رشید یاسمی نے حال ہی میں مسعود سعد سلمان کا دیوان بہت صحت اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے ۔ دیباچے کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں :

"میں مدرسہ میں تھا کہ مسعود سعد سلمان کی حبسیات نے پہلی بار مجھے

متاثر کیا اور اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ پرانے اور نئے قصیدہ گو
شاعروں میں سے ایک ایسا شخص بھی ہے جس نے ممدوح کی تعریف ،
جلبِ مال اور کسبِ جاہ کے علاوہ بھی کبھی قصیدے سے کام لیا ہے
اور کلام کو صحیح معنے میں اپنے احساسات کا ترجمان بنایا ہے ۔''

رضا زادہ شفق ، مسعود کی ''حبسیات'' کا اس طرح ذکر کرتے ہیں : ''ظاہر ہے کہ مسعود سعد کا خاص طرز جس کی وجہ سے وہ ہمارے بلند مرتبت شعرا کی صف میں بلند مقام کا مالک ہے ، اس کی ''حبسیات'' میں جلوہ گر ہے ۔ اس قسم کے اشعار ہمارے ادبیات میں کمیاب ہیں . . . یہ بات بلاوجہ نہیں کہ نظامی عروضی جیسا مصنف ، جو کم و بیش مسعود کا ہم عصر تھا لکھتا ہے :

''وقت باشد کہ من از اشعار او ہمی خوانم سوی براندام من برپای خیزد و
جای آن بود کہ آب از چشم من برود ۔''

(تاریخ ادبیات ایران ، صفحہ ۱۵۶)

صفحہ ۳۷ ۔ ابوشکور بلخی کا ایک شعر شمس العلماء اس طرح نقل کرتے ہیں :

چنین داستان کس نگفت از خیال
ابرسی صد و سی و سہ بود سال

جب شیرانی صاحب نے بتایا کہ 'خیال' کی جگہ 'فیال' چاہیے تو شمس العلماء فرماتے ہیں کہ ''ماخذ میں 'خیال' تحریر تھا اس لیے نقل میں اس کی پابندی کی گئی ۔ اصلاح دے کر رد و بدل کرنا مصنف کی حد نظر نہیں ۔''

ہمیں نیک گمان سے کام لینا چاہیے ورنہ شبہ ہوتا ہے کہ ابو شکور کے کلام میں یہ اصلاح شمس العلماء کی طبع زاد ہے ۔ سعید نفیسی نے رودکی کی تیسری[1] جلد میں یہ شعر اس طرح نقل کیا ہے :

برین داستان کس نگفت از فیال
ابر سی صد و سی و شش بود سال

۱- رودکی کی تیسری جلد ، صفحہ ۱۲۳۷ ۔

اور حاشیے میں قیال کے یہ معنے دیتے ہیں :

"قیال بلغت بلخ آغاز باشد ۔"

صفحہ ۹۳۔ عمید سنامی :

''شمس العلماء اس شاعر کی نسبت تونکی بیان کرتے ہیں مگر اس نام کا کوئی قصبہ معلوم نہیں ۔ اس کی دوسری شکل 'لومک' ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ تولک ہو جس کا ذکر طبقاتِ ناصری میں آتا ہے اور غور میں ایک قصبے کا نام ہے ۔ اس سے تولکی نسبت بنے گی لیکن پروفیسر اس کو سنامی کیوں نہیں کہتے ۔''

شمس العلماء کو 'تولکی' اس بنا پر تسلیم نہیں کہ اس کا ذکر بدایونی اور رضا قلی ہدایت نے نہیں کیا ۔ عمید کو وہ اس لیے سنامی کہنے کے لیے تیار نہیں کہ ان کی تحقیق میں سنام عمید کا مولد نہیں بلکہ منشأ و جائے تربیت ہے ۔

اول تو ڈاکٹر اقبال حسین[1] نے 'عرفات العاشقین' کی سند پر عمید کا مولد سنام بتایا ہے لیکن اگر سنام کو محض جائے تربیت ہونے کا فخر حاصل ہو ، پھر بھی سنامی کی نسبت غیر معلوم تونکی اور لومکی سے تو بہتر ہوگی ۔ شمس العلماء یہ کہہ کر اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں کہ ''مصنف محض ناقلِ کلام ہے'' اب نقل میں بے چاری عقل کی گنجائش کہاں ؟

ہندوستان میں ایرانی ادیبوں اور شاعروں کی آمد :

''ہندوستان میں موقع بموقع وقتاً فوقتاً اور شاعروں کی آمد یا ہجرت کا ذکر پروفیسر (شمس العلماء) کی تالیف کی نمایاں خصوصیت ہے لیکن ان ہجرتوں کی تفصیل یا ان کے اثرات واضح طور پر نہیں دکھائے . . . ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اطلاعیں تاریخی نہیں ہیں بلکہ مفروضہ ہیں ۔''

شیرانی صاحب نے مندرجہ بالا الفاظ میں شمس العلماء کے اس دعوے پر

۱۔ ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا ، صفحہ ۲۰۰

اعتراض کیا کہ:

''معزالدین کے عہد میں فارسی ادب کی ترقی کے حق میں ایک اہم محرّک خراسان سے اس کے لشکروں کے ساتھ ادیبوں کی آمد تھی۔ ایرانی ادیبوں کی یہ ہجرت ہندوستان اور ایران کے مابین تمدنی سنگھم قائم کرنے میں درمیان کی کڑی ثابت ہوئی۔''

(اصل کتاب، صفحہ ۲۷۰)

شمس العلماء نے اپنے جواب کے خاتمے میں بعض ایرانیوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے (ان کے اس بیان کو ہم ابھی تحقیق کی کسوٹی پر رکھیں گے) لیکن وہ معزالدین غوری کے زمانے میں ایرانی ادیبوں کی آمد کا کوئی تاریخی ثبوت بہم نہیں پہنچا سکے۔ لے دے کے ایک امام فخرالدین رازی ہیں جن کا ذکر انھوں نے بدایونی کی سند پر بیان کیا ہے۔ اگرچہ وہ خود بدایونی کے بیان سے مطمئن نہیں ہیں، اس لیے کہ اس کے ماخذ کا شمس العلماء کو کوئی پتا نہیں۔ تاہم انھوں نے اس تصدیق طلب بیان کی بنا پر ایک شاندار عمارت کھڑی کر دی ہے۔ وہ امام رازی کا معزالدین غوری کے لشکر کے ساتھ ہندوستان میں آنا یقینی تصور فرماتے ہیں اور ان کو افسوس ہے کہ ''امام رازی کی اس ہفتہ وار مجلس وعظ کی حقیقی اہمیت کے تمام پہلوؤں کو، جس میں شاہی لشکریوں کے علاوہ ہندوستان کے لوگ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے تھے، ایرانی مؤرخ پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ بلاشبہہ اس کا اثر دور رس تھا، یہاں تک کہ اس نے لوگوں کے ادبی مذاق میں انقلاب پیدا کر دیا اور شایستہ اور موزوں طبع گروہ کو فارسی زبان میں لکھنے پر اکسایا۔''

شمس العلماء کا یہ بیان حد درجہ کمزور بنیاد پر مبنی ہے اور محض ان کے تخیل کی بلند پروازی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، ابن الاثیر، جو ساتویں صدی ہجری کے نصف اول میں اپنی 'الکامل' تالیف کرتا ہے، امام رازی کا شہاب الدین غوری کے مکان پر وعظ کہنا اور ایک موقع پر شہاب الدین کا وعظ سے متاثر ہو کر زار زار رونا بیان کرتا ہے۔ جب شمس العلماء کے بیان کی بنیاد ہی اس درجے کمزور ہو تو ظاہر ہے کہ جو عمارت بھی اس پر کھڑی کی جائے گی وہ کتنی کمزور ہوگی۔

شمس العلماء ہمت ہارنے والے انسان نہیں ۔ اگرچہ وہ معزالدین غوری کے لشکر کے ساتھ ایرانی ادیبوں کی آمد ثابت نہیں کر سکے ، پھر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے جواب کے آخر میں بعض مثالیں پیش کی ہیں ۔ چونکہ ان میں سے بعض غیر صحیح اور بعض غیر متعلق ہیں ، ہم ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں ۔

(۱) شمس العلماء کے نزدیک سب سے پہلی ہجرت ان ایرانیوں کی ہے جن کو زمانۂ قبل اسلام میں افراسیاب نے جلا وطن کر دیا تھا اور جو آ کر پنجاب میں آباد ہوگئے تھے ۔ اس تحقیق اور انکشاف پر شمس العلماء کو اتنا ناز ہے کہ ان کی اس بے جا تعلی اور خودستائی کا کھوکھلا پن ظاہر کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اصلی الفاظ پیش کر دیے جائیں تاکہ قارئین بھی ان کی اس خوشی اور مسرت میں شریک ہو سکیں :

”یہ در حقیقت اپنی اپنی جستجو اور مطالعے کا ثمرہ ہے جس کو ہم فرق بصیرت و بصارت کہہ سکتے ہیں ۔ بے شبہہ جن تاریخوں کے صفحات مبصّر اور دیگر محققین اُلٹ چکے تھے وہی تاریخیں مصنّف کے بھی پیش نظر تھیں لیکن کسی کی نظر اس نکتے تک پہنچ گئی ، کسی کی نہ پہنچی :

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے“

ہمیں شمس العلماء کے ساتھ پورا اتفاق ہے کہ واقعی یہ بصیرت اور بصارت کا فرق ہے کہ جس افسانہ اور سراب کو دوسرے محققوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا ، شمس العلماء نے فقط اسے غیرمعمولی اہمیت ہی نہیں دی بلکہ اس کے مفروضہ دور رس اثرات کو بڑے مزے لے لے کو دہرایا ۔ آئیے ذرا دیکھیں کہ یہ کون سی تاریخ کی کتابیں ہیں جن کی طرف شمس العلماء اشارہ کر رہے ہیں ۔ یہ مشہور کتابیں بدایونی کی 'منتخب التواریخ' اور نظام الدین کی 'طبقات اکبری' ہیں ۔ ان کے علاوہ تاریخ فرشتہ میں بھی اس واقعے کا ذکر ملتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ مصنف جنھوں نے زمانۂ حال میں ہندوستان کی تاریخیں لکھی ہیں ان کے سامنے یہ بیان موجود ہوگا لیکن اُنھوں نے اس کے غیر معقول اور نادرست ہونے کے باعث اسے کسی توجہ کا مستحق نہیں سمجھا ۔

سر ولسلی ہیگ نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی تیسری جلد میں اس مقام کو جہاں سے سلطان ابراہیم غزنوی کا ایک لاکھ ایرانیوں کو اپنے ساتھ غزنین لے جانا بیان کیا جاتا ہے ، نوساری فرض کیا ہے جو سورت کے پاس ہے ، لیکن اس تاویل کا غیر موجہّہ ہونا بالکل واضح ہے ۔ شمس العلماء کی ایک اور سند یاقوت کی 'معجم' ہے جس کا حوالہ ایک گمنام تذکرۂ سلاطین آل غزنیں میں دیا گیا ہے ، جس کا ایک نسخہ خوش قسمتی سے شمس العلماء کے پاس ہے ۔ اس گمنام تذکرے کے مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ 'معجم' سے مراد کون سی کتاب ہے ، معجم البلدان یا معجم الادباء ۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ ان میں سے کسی ایک کتاب میں محولہ بالا واقعے کا ذکر سچ مچ موجود ہے ۔ پھر یاقوت ، جو ساتویں صدی ہجری میں اپنی کتابیں تالیف کرتا ہے ، افراسیاب کے زمانے کے لیے ، جو غیر تاریخی ہے ، سند کیوں کر مانا جا سکتا ہے ۔ مرحوم پروفیسر شاہ پور شاہ ہوڈی والا ، جنھوں نے ایلیٹ اور ڈاؤسن کی تاریخ ہند کی آٹھ جلدوں پر ایک ضخیم ناقدانہ[1] تبصرہ شائع کیا ہے ، اس تبصرے میں ایرانیوں کی ہجرت پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کرتے ہیں ۔ ہم ان کی تحقیق کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں :

> ”ہندوستان میں سلطان ابراہیم غزنوی کے حملوں کے بیانات اس قدر مبہم اور پیچیدہ ہیں اور جن مقامات پر اس کے لشکروں نے حملے کیے ان کے ناموں کے اس قدر مختلف ہجّے دیے گئے ہیں کہ ان کی بنا پر اس وقت یا اس کے بعد شمالی ہند میں زردشتیوں کی وسیع بستیوں کے موجود ہونے کے بارے میں نظریے قائم کرنا میرے نزدیک بے سود ہے ۔“

ہم عصر شاعر مسعود سعد سلمان ان حملوں کا ذکر کرتا ہے لیکن اس کے قصیدوں میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ ایک لاکھ خراسانیوں کو ، جنھیں افراسیاب نے ہندوستان کو جلاوطن کر دیا تھا ، غزنین بھیجا گیا ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس افسانے کی قدیم ترین سند 'روضۃ الصفا' معلوم ہوتی ہے ، جو پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھی گئی ۔ افراسیاب کا وجود اور اس کا خراسان پر مفروضہ حملہ

۱۔ ”ناقدانہ تبصرہ“ ، صفحہ ۵۶۳ ۔

اساطیری اور غیر تاریخی ہے ۔ اور چونکہ خراسانیوں کا غزنیں لے جایا جانا اس افسانے کا شاخسانہ ہے اس لیے دونوں کسی اعتبار کے مستحق نہیں ۔ سر ولسلی ہیگ نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی تیسری جلد (صفحہ ۳۴ و ۳۵) میں اس افسانے کو حقیقت میں بدلنے کی یوں ناکام کوشش کی ہے :

''سلطان ابراہیم (غزنوی) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۰۷۹ عیسوی میں اس نے ایک شہر روپال نام فتح کیا ۔ شاید اسی نام کا ایک شہر بھی کانٹھا میں ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان مغربی ساحل کی طرف بڑھا اور پارسیوں کی ایک نوآبادی پر جا پہنچا ، جو گجرات میں نوساری ہو سکتی ہے ۔ یہی ایک فرضی صورت ہے جس کے ذریعے ایک مسلم مورخ کے اس غلط بیان کی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ایسے شہر میں پہنچا جہاں وہ خراسانی رہتے تھے ، جنھیں افراسیاب نے ہندوستان جلاوطن کر دیا تھا ۔''

ہیگ کے یہ الفاظ نقل کرنے کے بعد پروفیسر ہوڈی والا استفسار کرتے ہیں کہ ''ایسے صریح غلط بیان کو ماننے کی کیا ضرورت ہے جب کہ مفروضہ صورت بھی اس درجے کمزور ہے ۔''

اس سلسلۂ ہجرت کی مزید شہادت ، جو بزسانۂ اسلام برنی کی تاریخ 'فیروز شاہی' میں شمس العلماء کی نظر سے گزری ہے ، یہ ہے کہ اس کثرت سے ایران و دیگر ممالک اسلامی سے ادبا ، علماء ، شعرا . . . دہلی میں جمع ہوگئے تھے کہ دہلی رشک بغداد و ایران و مصر بن گیا تھا ۔ برنی صرف اس قدر کہتا ہے کہ ''ہر قوم کے بزرگوں ، ہر علم کے اُستادوں اور ہر ہنر کے ماہروں کا اجتماع تخت گاہِ دہلی میں دیکھا گیا کہ دہلی رشکِ بغداد ، غیرتِ مصر ، قسطنطنیہ کی ہم سر اور بیت المقدس کے مقابل ہوگئی ۔''

برنی یہاں کہیں ایران اور دیگر ممالک کے علماء اور شعرا کا ذکر نہیں کرتا ۔ تاریخ برنی سے ذیل کا اقتباس بھی دیا گیا ہے :

''در تمامی عصر علائی در دارالملک دہلی علماء می بودند کہ آن چنان اُستادان کہ یکی علامۂ وقت و در بخارا و سمرقند و بغداد و مصر . . . و در ربع مسکون نہ باشند ۔''

برنی یہاں علمائے دہلی کی تعریف کرتا ہوا کہتا ہے کہ ان جیسے علماء بخارا ، سمرقند ، بغداد اور مصر میں موجود نہ تھے ۔ یہاں ایرانی علماء اور شعرا کی ہجرت کا کہاں ذکر ہے ؟

تیسرا اقتباس تاریخ فرشتہ سے لیا گیا ہے ، جس میں وہ یہ کہتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں جب کبھی 'پادشاهزادهای ولایات و بزرگان وقت' آتے تھے تو سلطان خندہ پیشانی کا اظہار کرتا اور شکر الٰہی بجا لاتا اور ہر ایک کے لیے ایک علیٰحدہ محلہ متعین کر دیتا ۔ چنانچہ اس طرح دہلی میں پندرہ محلے بن گئے ۔ ان محلوں کے نام یہ تھے : عباسی ، سنجری ، خوارزم شاہی ، دیلمی ، علوی ، اتابکی ، غوری ، چنگیزی ، رومی ، سنقری ، یمنی ، موصلی ، سمرقندی ، کاشغری ، خطائی ۔

کیا شمس العلماء یہ بتا سکتے ہیں کہ ان 'پادشازادہ ھای ولایات و بزرگان وقت' میں سے کتنے ایرانی علماء و شعرا تھے اور ان کے نام کیا تھے ؟

چوتھا اقتباس پھر برنی سے نقل کیا گیا ہے اور اس کی بنا پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ :

"برنی نے ایک موقع پر چھیالیس نام ایسے ملکی اور غیر ملکی علماء و فضلا و ادباء کے گنائے ہیں جن کے فیضِ صحبت سے وہ مستفید ہوا تھا یا اس کو ان سے تلمّذ حاصل تھا ۔ کہتا ہے 'و این چهل و شش استاد مذکور کہ من القاب (و) اسامی ایشان نوشتہ ام آنانند کہ من درپیش بعضی تلمّذ کردہ ام و بخدمت بعضی رسیدہ و بیشتری را در مسند افادت دیدہ ام ۔' " (صفحہ ۳۵۴)

برنی بلاشبہہ چھیالیس استادوں کا ذکر کرتا ہے لیکن ملکی اور غیر ملکی کا کہیں نام نہیں لیتا ۔ یہ اضافہ شمس العلماء قبلہ کا اپنا ہے ۔ اصل میں یہ عبارت برنی کے 'در تمامی عصر علائی در دارالملک دہلی علمای بودند' والی عبارت کے ساتھ متعلق ہے جس کا مفہوم حضرت شمس العلماء نہ سمجھ سکے اور یہ لکھ دیا (ملاحظہ ہو اصل کتاب ، صفحہ ۳۷۱) کہ "برنی کے تمام استاد ، بلا استثنا ، بڑے متبحّر عالم تھے جو منگولوں کے حملوں اور تباہی کے ڈر کے مارے بخارا ، سمرقند ، خراسان اور بحر خزر پار کے علاقوں سے ہندوستان چلے آئے تھے ۔"

حالانکہ برنی اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ علمائے دہلی کی نظیر اسلامی ممالک اور ربع مسکون میں ملنا مشکل ہے : ع

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بعض غیر متعلق اور غیر ضروری مباحث :

شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں اس بات کی شکایت کی تھی کہ ''کتاب کا پہلا باب ، جو تمہیدی ہے ، اگرچہ مفید معلومات کا حامل ہے لیکن موضوعِ زیر بحث کا خیال کرتے ہوئے بہت کچھ غیر ضروری اور غیر متعلق کہا جا سکتا ہے . . . پروفیسر لکھنے بیٹھے تھے قبل از مغل فارسی ادبیاتِ ہند کی داستان مگر مقدمے میں ایسے مضامین چھیڑ بیٹھے جن سے نفسِ مضمون کو دور کا بھی تعلق نہیں ، مثلاً عربوں کی فتحِ ایران کے بعد عربی اور فارسی کے روابط ، فتح سندھ از عرب . . . وغیرہ ۔

طفیلی جمع شد چندان کہ جای میہمان گم شد ۔''

دوسرا باب — غزنویوں سے قبل کا زمانہ . . . ''اصل موضوع کا خیال کرتے ہوئے یہ باب بھی اتنا ہی بے محل اور بے موقع معلوم ہوتا ہے جتنا پہلا باب ۔''

شمس العلماء اس شکایت کی تاب نہ لا سکے اور سخت برہم ہوئے اور اس برافروختگی کے عالم میں انھوں نے براؤن کی ''ایران کی ادبی تاریخ'' کی مثال پیش کی : ''اس کتاب کا موضوع اگرچہ ایران کی ادبی تاریخ ہے لیکن اس میں خلفائے راشدین ، اموی اور عباسی خلفا کا تذکرہ بھی موجود ہے اس لیے مبصّر کو پہلے براؤن پر اعتراض کرنا چاہیے ۔''

اگر شمس العلماء خفا نہ ہوں تو پہلے ہم یہ عرض کرنے کی جرأت کریں کہ اگرچہ براؤن کی کتاب کا نام ''ایران کی ادبی تاریخ'' ہے لیکن حقیقت میں یہ ایران کی ذہنی و عقلی تاریخ ہے ، اس کے تمدن و ثقافت کی تاریخ ہے اور ایرانیوں کے علمی کارناموں کی تاریخ ہے ، خواہ ان کی زبان عربی ہو یا فارسی ۔ براؤن اپنے مقصد کی توضیح اس طرح کرتے ہیں :

(ایران کی ادبی تاریخ ، جلد اول ، دیباچہ ، صفحہ ۸)

''اس لیے کہ میں ایرانیوں کی عقلی تاریخ لکھنا چاہتا تھا ، نہ کہ صرف

ان شعرا اور مصنفین کی تاریخ جنھوں نے بذریعہ فارسی زبان اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ مذہب ، فلسفہ اور علم کے میدانوں میں (ایران کی) قومی روح کے تمام مظاہر میرے لیے اتنے ہی دلچسپ تھے جتنے کہ وہ مظاہر جن کا تعلق ایک محدود تر معنی میں اقلیم ادب کے ساتھ ہے ، اور میرے نقطۂ نظر سے یہ بات غیر اہم تھی کہ خیالات کے اظہار کے لیے کون سی زبان اختیار کی گئی ہے ۔"

شمس العلماء کے لیے یہ کسی طرح درست نہیں کہ اپنی تالیف کا براؤن کی بلند پایہ اور قابلِ قدر کتاب سے مقابلہ کریں ۔

اس بحث کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ شمس العلماء نے اپنا تمام زور حشو اور زواید پر صرف کر دیا ہے اور اصل موضوع پر بہت کم لکھا ہے ۔ شعرا میں سے مسعود سعد سلمان ، ابوالفرج رونی ، عمید سنامی ، تاج الدین دبیر ، خواجہ معین الدین اجمیری ، امیر خسرو اور امیر حسن وغیرہ کے سوانح و کلام پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے ، اور نثر نگاروں میں لے دے کے منہاج سراج اور ضیا برنی کے کارناموں کی داد دی گئی ہے ۔ بدرچاچ اور قاضی ظہیر کو شمس العلماء نے اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ "ان کے احوال کی فراہمی اور کلام پر تبصرے کے لیے کم از کم دو سال کا وقت اور دو سو صفحات درکار ہوتے ۔" اس کے علاوہ یہ امر بھی ملحوظ رکھا گیا کہ "کتاب کا حجم ناخوشگوار حد تک بڑھنے نہ پائے ۔"

اگر شمس العلماء کے پیشِ نظر یہ امر تھا تو انھیں پہلے دو ابواب پر اتنی تفصیل اور اطناب کے ساتھ نہ لکھنا چاہیے تھا ۔ ضروری مباحث کو وہ اختصار کے ساتھ بھی بیان کر سکتے تھے ۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ افتتاحی باب اور دوسرے باب کو وہ اپنا شاہکار سمجھتے ہیں حالانکہ اصل موضوع سے ان کا کوئی تعلق نہیں ۔ شمس العلماء کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ محمود کے حملوں کے ساتھ ہندوستان میں فارسی شعر کے ذوق کا آغاز ہوتا ہے ۔ افتتاحی باب کا خاتمہ شمس العلماء اس طریق پر کرتے ہیں :

"در حقیقت ابھی فارسی زبان کے لیے ہندوستانیوں کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع کم تھا لیکن ایک عظیم الشان واقعہ رونما ہونے والا تھا ،

جس سے ہندوستان کی کلچرل تاریخ میں ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہوتا ہے - یہ واقعہ ہندوستان کے سین (منظر) پر غزنویوں کا ظہور تھا -''

اس اعتراف کے باوجود شمس العلماء کا یہ اصرار کہ پہلے دو باب بہت ضروری ہیں ، ہماری سمجھ میں نہیں آتا - یہ بتانے کے لیے کہ ''جس قدر کام شمس العلماء نے کیا ہے ، اس سے کہیں زیادہ وہ چھوڑ گئے ہیں'' (شمس العلماء بھی اس قول کو حقیقت پر مبنی مانتے ہیں) شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے کے تتمے میں بہت سے مصنفین اور شعراء کا ذکر کیا ہے ، اور اگر شمس العلماء کی برہمی کا ہمیں ڈر نہ ہو تو ہم یہ کہنے کی جرأت کریں کہ اصل موضوع سے متعلق جتنا ضروری مواد شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں بہم پہنچایا ہے وہ شمس العلماء کی فراہم کردہ معلومات سے ہر حیثیت سے زیادہ قیمتی ہے - شمس العلماء نے نثری تالیفات سے ایک گونہ اپنی بے نیازی اور بے خبری کا ثبوت دیا ہے - امید ہے کہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں شمس العلماء شیرانی صاحب کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر نثر کی طرف بھی توجہ مبذول فرمائیں گے -

رسم الخط کے متعلق شمس العلماء کا ارشاد :

شمس العلماء جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر شیرانی صاحب کے رسم الخط پر بھی معترض ہیں ، حالانکہ انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ یہ رسم الخط شیرانی صاحب کا ذاتی خط نہیں بلکہ انجمن ترقیٔ اُردو کا تجویز کردہ ہے اور رسالہ 'اُردو' میں جتنے مقالے بھی شائع ہوتے ہیں ، ان میں اسی رسم الخط کی پابندی کی جاتی ہے - شیرانی صاحب کا تبصرہ لیتھو میں نہیں بلکہ ٹائپ میں چھپا تھا اس لیے اس میں ہر جگہ ''ہندوستان'' کو ''ہندستان'' لکھا گیا ہے - شمس العلماء خود اپنی کتاب کی ورق گردانی فرمائیں تو اس میں بھی ''ها'' کو یوں ہی لکھا گیا ہے - ہندوستان کو بہ تخفیف واو لکھنے کی مثالیں خود شمس العلماء کی کتاب میں موجود ہیں - ملاحظہ ہو ، صفحہ ۱۹۸ ، ۱۹۹ ، ۲۳۶ -

ہم عصر علما کی تحقیقات سے فائدہ اُٹھانا اور اس کا اعتراف نہ کرنا :

شمس العلماء کی کتاب کا ایک تاریک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے

ہم عصر علما کی تحقیقات سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس علمی استفادے کا اعتراف تو درکنار وہ بعض ان علماء کا نام تک بھی اپنی کتاب میں ذکر نہیں کرتے ، اور اس عدمِ اعتراف کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی اصل ماخذ کا غلط حوالہ درج کر دیتے ہیں اور اس طرح ان کی خوشہ چینی کا راز فاش ہو جاتا ہے ۔ ہم ذیل میں چند مثالیں پیش کرتے ہیں :

(۱) **فارسی کا قدیم ترین شعر :** علامہ قزوینی پہلے شخص ہیں جنھوں نے عربی ماخذ سے بعض فارسی اشعار کا سراغ لگایا ہے ۔ اس موضوع پر ان کا مضمون بیست مقالہ قزوینی ، جلد اول میں چھپ چکا ہے ۔ ایک ہندوستانی عالم ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ اپنی ذاتی تحقیق و تفتیش سے وہی معلومات فراہم کرتے ہیں لیکن جب ان کی توجہ 'بیست مقالہ' کی طرف مبذول کرائی گئی تو انھوں نے فوراً اس بات کا اعتراف کیا کہ ان سے پہلے میرزا قزوینی یہی زمین طے کر چکے ہیں ۔ لیکن اس کے برعکس شمس العلماء اسی اطلاع کو اپنی کتاب میں درج کرتے ہیں اور اپنے فاضل پیش رو کا کہیں نام تک نہیں لیتے ۔ اس عدمِ اعتراف کی وجہ یہ نہیں کہ وہ میرزا قزوینی کی تحقیقات سے واقف نہیں ہیں بلکہ خلیفہ مامون کی مدح میں ابو العباس مروزی کے قصیدے کے متعلق جو شکوک میرزا قزوینی اور براؤن نے ظاہر کیے ہیں ، شمس العلماء نے نہایت قابلیت کے ساتھ ان شکوک کا جواب دینے کی کوشش کی ہے ۔ ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں شمس العلماء اپنے دلائل کے لیے آقای جلال ہمائی کے ممنون ہیں ، اگرچہ وہ ہمائی یا ان کی کتاب کا ذکر نہیں کرتے ۔ جلال ہمائی نے اپنی 'تاریخ ادبیات ایران' ، جلد دوم (صفحہ ۳۴۱ - ۳۴۶) میں میرزا قزوینی کے ان دلائل کا جواب دیا ہے جو میرزا نے اس تاریخی واقعے کی عدمِ صحت کے متعلق پیش کیے ہیں ۔ شمس العلماء شاید توارد کا عذر پیش کریں ۔ اسی طرح ابن مناذر اور ماسر جویہ طبیب کا واقعہ بھی غالباً کتاب الاغانی سے براہ راست نہیں بلکہ ہمائی کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے ۔ ہمائی نے اسے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (جلد دوم ، صفحہ ۲۸۶ - ۲۸۹) ۔

(۲) مولانا سید سلیمان ندوی کی 'عرب و ہند کے تعلقات' سے شمس العلماء نے دو تین مقامات پر خوشہ چینی کی ہے اور پوری کتاب میں سید صاحب کا نام تک نہیں آنے دیا ۔ ترمذی کے ابواب الامثال اور بشاری کے متعلق ہم اپنے مضمون (اردو ، جولائی سنہ ۱۹۴۴ع) میں وضاحت کے ساتھ لکھ چکے ہیں ۔ یہاں ہم صرف کھنبایت کی مسجد کے متعلق عوفی کے نقل کردہ بیان کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں ۔ سید صاحب نے اس واقعے کو عوفی کی 'جوامع الحکایات' سے اپنی کتاب 'عرب و ہند کے تعلقات' میں نقل کیا ہے ۔ شمس العلماء ہندو راجاؤں کی مسلم نوازی کے نمونے کے طور پر اسے پیش کرتے ہیں لیکن اپنے اصل ماخذ کو چھوڑ کر فٹ نوٹ میں 'باب دوم (ذکر ملوک طوائف و احوال ایشان)' درج کرتے ہیں ۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ، 'جوامع الحکایات' ابھی تک زیور طبع سے عاری ہے ۔ ہاں ڈاکٹر نظام الدین نے اس کے مطالب کا انڈکس تیار کیا ہے ۔ لیکن شمس العلماء نہ سید صاحب کا حوالہ دیتے ہیں نہ ڈاکٹر نظام الدین کا ۔

(۳) **ڈاکٹر ناظم کی کتاب 'سلطان محمود آف غزنہ'** : شمس العلماء نے سلطان محمود کو ایک مجاہد اور غازیِ اسلام کی حیثیت سے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے اور ان کی رائے میں سلطان کی فتحِ سومنات کلمۂ توحید کا اعلان اور صنم پرستی کی شکست ہے ۔ حالاں کہ کتاب کے ابتدائی حصے میں وہ ہندو حکمرانوں کی رواداری اور فیاضی کی داستان کو تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں اور پچھلے بیان کے پیش نظر ان کا یہ اظہار فخر و مسرت بہت حد تک غیر موزوں معلوم ہوتا ہے ۔ پھر بھی ہمیں ان کے اس خاص نظریے سے یہاں تعرض کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔ ہمیں جس چیز سے یہاں سروکار ہے وہ شمس العلماء کا ڈاکٹر ناظم کے محققانہ مقالے سے بغیر کسی اعتراف کے استفادہ کرنا ہے ۔ شمس العلماء نے تین چار جگہ ابن الاثیر کی 'الکامل' کے حوالے دیے ہیں

لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے ۔ شمس العلماء نے بذاتِ خود الکامل کی ورق گردانی کی زحمت گوارا نہیں کی اور انہوں نے ڈاکٹر ناظم کے بھروسے پر فٹ نوٹ میں 'الکامل' کی جلد اور صفحہ درج کر دیا ہے ۔ قارئین کرام کے سامنے ہم شمس العلماء کے ایسے دو بیان پیش کرنا چاہتے ہیں جو ڈاکٹر ناظم سے ماخوذ ہیں ۔ ان میں سے ایک میں تو ڈاکٹر ناظم کے غلط بیان کو نقل کر لیا گیا ہے اور دوسرا بیان نامکمل ہے ۔ اگرچہ ڈاکٹر ناظم نے ایک دوسرے مقام پر اس کو مکمل صورت میں بھی پیش کیا ہے :

(۱) **فتحِ سومنات** : شمس العلماء ابن الاثیر کی سند پر کہتے ہیں کہ جب ۱۵ ۔ ذوی العقدہ ۴۱۶ھ ہجری کو مسلمان قلعے کی دیواروں پر قابض ہو گئے تو انہوں نے شعار اسلامی کا اعلان کیا ۔ ادھر ہزاروں ہندوؤں نے گڑگڑا کر بت سے مدد کی التجا کی اور اس زور کا حملہ کیا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور غروب آفتاب سے پہلے ہندو پھر ان اہم جگہوں پر قابض ہو گئے ۔''

(اصل کتاب ، صفحہ ۲۱۸)

تقریباً یہی بیان ڈاکٹر ناظم کی کتاب[1] میں ملتا ہے ۔ اس بیان کا آخری حصّہ یعنی ہندوؤں کا مسلمانوں کو پیچھے دھکیلنا اور قلعے کی دیواروں پر قبضہ کر لینا ڈاکٹر ناظم اور شمس العلماء دونوں کے یہاں ابن الاثیر کی سند پر دیا گیا ہے لیکن 'الکامل' میں اس واقعے کا کہیں ذکر نہیں ملتا ۔ اگر خود شمس العلماء نے 'الکامل' کو ملاحظہ فرمایا ہوتا تو وہ اس غلطی کا شکار نہ ہوتے جو ڈاکٹر ناظم کی تقلید میں ان سے سرزد ہوئی ہے ۔ ہم یہاں شمس العلماء کی غلطی

۱۔ ناظم کی 'محمود آف غزنہ' ، صفحہ ۱۱۷ ۔

واضح کرنے کے لیے 'الکامل' کی اصل عبارت درج کرتے ہیں :

''فحینئذٍ اشتد القتال و عظم الخطب و تقدم جماعة الھنود الی سومنات فعفروا له خدودھم و سألوه النصر و ادرکھم اللیل فکف بعضھم عن بعض ۔''

اس عبارت میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور ہندوؤں نے بہت زاری اور نیاز مندی کے ساتھ سومنات سے فتح و نصرت کی درخواست کی ، اور جب رات کی تاریکی چھا گئی تو جنگی کارروائی رک گئی ۔

اس عبارت کا غلط مفہوم ڈاکٹر ناظم کی کتاب میں جگہ پاتا ہے اور ہمارے شمس العلماء ان کی تقلید میں اس غلط مفہوم کو اپنی کتاب میں ڈاکٹر ناظم کا نام لیے بغیر درج کر لیتے ہیں ۔ اگر انھوں نے ڈاکٹر ناظم کا حوالہ دیا ہوتا تو اس غلطی کی ذمہ داری سے بچ جاتے ۔

(۲) سلطان محمود کا دوسرے شہروں کے کتب خانوں سے کتابیں غزنین میں لانا : ڈاکٹر ناظم[1] ، ابن جوزی اور ابن الاثیر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب کبھی محمود کوئی شہر فتح کرتا تھا تو وہاں کے کتب خانوں کے نوادر غزنین کے کتب خانے میں اضافہ کرنے کے لیے لے جاتا تھا ۔ تقریباً یہی بیان شمس العلماء کی کتاب (صفحہ ۲۳۲) میں ملتا ہے ۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ڈاکٹر ناظم ''غزنین کے جمع کردہ علمی ذخیرے'' کا ذکر کرتے ہیں اور شمس العلماء کو ''شاہی اکیڈمی'' لکھنا زیادہ پسند ہے ۔ شمس العلماء کی سند محض ابن الاثیر کی 'کامل' ہے جو انھوں نے بذاتِ خود

۱۔ ایضاً ، صفحہ ۱۵۸ ۔

ملاحظہ نہیں فرمائی ورنہ ان کے بیان میں یہ تعمیم نہیں ہوتی ۔ چونکہ ڈاکٹر ناظم کے سامنے 'الکامل' موجود ہے ، اس لیے انھوں نے مندرجہ بالا بیان کی توضیح الگ دو جگہ کر دی ہے لیکن شمس العلماء جن کی حیثیت ناقلِ محض کی سی ہے ، بغیر تحقیق و تفتیش کے ڈاکٹر ناظم کا بیان نقل کر لیتے ہیں ۔ اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ جب سلطان محمود نے اسے فتح کیا تو وہاں کے شاندار کتب خانے کی کتابیں ، جن کا تعلق فلسفہ ، اعتزال اور نجوم سے تھا جلادیں ۔ ان کے سوا اور بہت سی کتابیں غزنین پہنچائی گئیں ۔ 'الکامل' کی اصل عبارت ملاحظہ ہو :

''و لما ملک محمود الری . . . نفی المعتزلۃ الی خراسان و احرق کتب النجوم و اخذ من الکتب ماسوی ذالک مائۃ حمل ۔''

(نویں جلد ، صفحہ ۱۵۴)

ڈاکٹر ناظم فتح رے کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ معتزلہ[1] اور باطنیوں کے مکانوں کی تلاشی لی گئی اور ملحدانہ عقائد سے متعلق تمام کتابیں نذر آتش کر دی گئیں اور وہ کتابیں ، جو سلطان کے دین دارانہ عقائد کے مطابق تھیں ، غزنین بھیج دی گئیں ۔

ایک اور جگہ ڈاکٹر ناظم لکھتے ہیں کہ :

''جب[2] شہر رے مسخّر کیا گیا تو محمودی حکم سے وہ تمام کتابیں جلا دی گئیں جن کا تعلق قرمطی عقائد سے تھا یا جن سے الحاد کی بو آتی تھی ۔ اس طرح ایک بیش بہا علمی ذخیرہ ، جو کئی سالوں میں بنی بویہ کی فیاضانہ حکمتِ عملی اور علمی ذوق سے جمع ہو چکا تھا ، ایک دیندار مجاہد کے جوش کی تسکین کی خاطر نذر آتش کر دیا گیا ۔''

۱۔ ایضاً ، صفحہ ۸۳ ۔

۲۔ ایضاً ، صفحہ ۱۶۰ ۔

ڈاکٹر ناظم کے ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر الکامل کا پورا بیان موجود ہے لیکن شمس العلماء کا بیان ڈاکٹر ناظم کے ناتمام بیان کی محض نقل ہے۔ اپنے ہم عصر علماء کی خوشہ چینی کرنا اور پھر ان کا اعتراف نہ کرنا ایک عالم کی شان کے مناسب نہیں۔

بعض ایسی غلطیاں جن کی طرف پہلے اشارہ نہیں کیا گیا :

شمس العلماء اپنی معلومات کو پیش کرنے میں بڑے غیر محتاط واقع ہوئے ہیں۔ ایک[1] جگہ عرب علماء کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "انھوں نے خاص طور پر فارسی کا اچھا خاصا علم حاصل کر لیا تھا۔ بعض عربی ادب فارسی زبان کے ذریعہ سے سکھاتے تھے۔ اس قسم کی ایک مثال موسیٰ اسواری کی ہے، جو عام مجلسوں میں قرآنی آیات کا مطلب فارسی زبان میں سمجھاتا تھا۔"

شمس العلماء نے بیک جنبش قلم موسیٰ اسواری کو عرب بنا دیا۔ حالانکہ اگر انھوں نے لفظ 'اسواری' پر غور کیا ہوتا تو انھیں اس کے ایرانی ہونے میں کوئی شبہہ نہ رہتا۔ موسیٰ بن سیار الاسواری تو ان ایرانی علما کا نمونہ ہیں، جو ایرانی اور عربی ثقافت کے پورے ماہر تھے۔ اسواری کا یہ حال تھا کہ وہ ایک ہی مجلس میں عربوں کے سامنے عربی میں مطلب سمجھاتا تھا اور ایرانیوں کے سامنے فارسی میں (ضحی الاسلام، جلد اول، صفحہ ۱۷۹)۔

عبداللہ طاہر بن حسین :

شمس العلماء یہاں بیان یہ کرنا چاہتے ہیں کہ طاہر بن حسین کو مامون نے خراسان کا گورنر بنا کر بھیجا لیکن اس کا پورا نام صفحہ ۸۹ پر عبداللہ طاہر بن حسین لکھتے ہیں۔ حالانکہ عبداللہ طاہر کا بیٹا ہے اور اپنے بھائی طلحہ[2] بن طاہر کی

۱- شمس العلماء کی کتاب، صفحہ ۳۳۔

۲- زین الاخبار، صفحہ ٦۔

وفات کے بعد خراسان کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے ۔

سامانی حکومت کا آغاز و انجام :

صفحہ ۱۱۵ پر شمس العلماء لکھتے ہیں کہ : ''۳۹۵ ہجری میں سامانیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ۔ اس حکومت کا آغاز ۲۶۱ ہجری میں ہوا تھا ، جب کہ خلیفہ معتضد باللہ نے اسد بن سامان کے بیٹوں کو ایران اور وسط ایشیا کے علاقوں کا گورنر مقرر کیا ۔''

اتنے سے مختصر بیان میں شمس العلماء اپنی لاپروائی سے دو غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں :

(۱) اسد بن سامان کے بیٹوں کو خلیفہ معتضد نے مقرر نہیں کیا بلکہ وہ مامون کے عہد خلافت میں مقرر کیے گئے اور یہ تیسری صدی ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے ، نہ کہ ۲۶۱ ہجری کا ۔

(۲) معتضد ۲۶۱ ہجری میں خلیفہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ۲۷۹ ہجری میں سریر خلافت پر جلوہ افروز ہوتا ہے ۔

سلطان محمود کا خطاب یمین الدولہ ولی امیرالمؤمنین :

شمس العلما تذکرۂ دولت شاہ اور اپنے گمنام تذکرۂ سلاطین آل غزنین[۱] کی سند پر رقمطراز ہیں کہ امام ابو منصور ثعالبی نیشا پوری کی سفارش پر خلیفہ القادر باللہ نے سلطان محمود کو ''یمین الدولہ ولی امیرالمؤمنین'' کا خطاب عطا کیا اور یہ خطاب ہند میں اس کی شاندار فتوحات کے صلے میں دیا گیا تھا ۔ لیکن محمود کی ذہانت لفظ 'ولی' کو گوارا نہ کر سکی ، جس کے معنی دوست کے بھی ہیں اور غلام کے بھی ، چنانچہ اس نے اپنے سفیر بغداد کی معرفت ایک لاکھ دینار خلیفہ کی خدمت میں بھیجے اور 'ولی' کو 'والی' میں مبدّل کرا لیا ۔

یہ سچ ہے کہ دولت شاہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن شمس العلماء کا بحیثیت ایک محقق کے یہ فرض تھا کہ وہ اسے نقد و درایت کی کسوٹی پر پرکھتے ۔

۱۔ شمس العلماء کی کتاب ، صفحہ ۲۱۵ ۔

انھیں چاہیے تھا کہ تاریخ کی کتابوں کی طرف رجوع کرکے دیکھتے کہ اس گپ میں سچائی کس قدر ہے - یمین الدولہ و امین الملۃ ولی امیرالمؤمنین کا خطاب محمود کو ۳۸۹ھ میں[1] ہی مل جاتا ہے - چنانچہ ملاحظہ ہو -[2]

۱- فرشتہ کا بیان ہے :

"چون طنطنۂ دولتش باطراف و اکناف عالم رسید ، خلیفۂ بغداد القادر باللہ عباسی خلعتی گرانمایہ کہ پیش ازان ہیچ خلیفہ بہ ہیچ پادشاہی نفرستادہ بود ارسال داشتہ امین الملۃ یمین الدولہ لقب داد ، و در اواخر ذیقعدہ سنہ تسعین و ثلثمائہ از بلخ بہ ہرات شتافتہ و از ہرات بہ سیستان رفتہ و حنیف بن احمد حاکم آن‌جا را مطیع ساختہ بہ غزنین آمد و در ہمان متوجہ ہندوستان شدہ قلعہ چند بگرفت -"

(تاریخ فرشتہ ، جلد اول ، صفحہ ۲۳ ، طبع نولکشور ، ۱۲۸۱ھ) - (مرتّب)

حمداللہ مستوفی کا کہنا ہے :

"چون در سنہ تسعین و ثلاثمایہ دولت بنی سامان سپری شد ، در خراسان و غزنہ ، نام پادشاہی برو اطلاق رفت و از دارالخلافہ ، القادر باللہ او را منشور سلطنت و تشریف فرستاد و لقب امین الدولہ [مقرر فرمود] بعد از مدتی یمین الملۃ بر آن افزود . . . -"

(تاریخ گزیدہ ، صفحہ ۳۹۱ ، ڈاکٹر عبدالحسین نوائی)

۲- مضمون کی ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۹ع کی قسط یہاں ختم ہوتی ہے - ظاہر ہے کہ مضمون نامکمل ہے - یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا پروفیسر ڈار صاحب مضمون کی تکمیل نہ کر پائے یا بقایا حصہ کسی سبب سے اورینٹل کالج میگزین میں شائع نہ ہو سکا - (مرتّب)

☆ ☆ ☆

دیوان خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

از پروفیسر محمد ابراہیم ڈار ، یوسف اسمٰعیل کالج ، الدھیری

(مطبوعہ رسالہ 'اردو' کراچی ، بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۵۰ع)

علم و ادب کی دنیا میں بعض اوقات عجیب عجیب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں ۔ انھی عجائبات میں سے بعض کتابوں کا غلط انتساب ہے ۔ شیخ فرید الدین عطار کے نام چند ایسی کتابیں منسوب کر دی گئیں جن کا مصنّف کوئی فرضی عطار ہے یا اصلی مصنّف کے بجائے ان کتابوں کو شیخ عطار کی تصنیفات ٹھہرایا گیا ۔ میرزا قزوینی اور مولانا شبلی ایسے متبحّر عالم اس حقیقت نما دروغ کو سچ تسلیم کرتے رہے یہاں تک کہ مرحوم پروفیسر محمود خاں شیرانی نے پوری جامعیت و استقصا کے ساتھ اس فریب کا پردہ چاک کیا ۔ ان کی تحقیقات سے یہ بات ثبوت کو پہنچ گئی کہ ان کتابوں میں سے کئی ایک کا مصنف کوئی جعلی عطار ہے اور بعض کا انتساب غلط طور پر عطار کے نام کر دیا گیا ہے ۔ شیرانی صاحب کے مضمون شائع ہونے کے کئی سال بعد ایران کے پروفیسر سعید نفیسی ، شیخ عطار کے احوال و تصانیف کے متعلق اپنی کتاب میں ، شیرانی صاحب کے نظریے کی تائید کرتے ہوئے ، ان کتابوں کو جعلی عطار کا صدقہ بتاتے ہیں ۔ جب آقائے سعید نفیسی کی کتاب کا ایک نسخہ شیرانی صاحب کی خدمت میں ارسال کیا گیا تو وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ایک ایرانی محقق بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے جہاں وہ کئی سال پہلے پہنچ چکے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی دقّتِ نظر نے آقائے سعید نفیسی کی تحقیقات میں یہ خامی محسوس کی کہ وہ ان تمام کتابوں کو جعلی عطار کی ملک ٹھہراتے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض کے حقیقی مالک موجود ہیں ۔

اسی قسم کے غلط انتساب کی ایک بیّن مثال حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کا دیوان ہے جسے مطبع نولکشور کے مہتمم کئی بار شائع کر چکے ہیں ۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں حضرت خواجہ صاحب کی جلیل القدر شخصیت کو جو اہمیت حاصل ہے ، اس کی بنا پر یہ دیوان خواص و عوام میں بہت مقبول ہوا اور عقیدت مندوں کے حلقے میں اس کی بڑی قدر ہوئی ، لیکن اہلِ علم کو اس امر کی تحقیق کا خیال نہ آیا کہ یہ دیوان ، جسے وہ ہر قسم کے احترام کا مستحق سمجھتے ہیں ، خواجہ صاحب کی تصنیف ہے یا اس کا جائز مالک کوئی اور شاعر ہے ۔ سب سے پہلے رسالہ 'اُردو' کی اشاعت جولائی سنہ ۱۹۲۴ع میں شیرانی صاحب نے اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ۔ ان جیسے محقق کے لیے یہ باور کرنا دشوار تھا کہ اگر یہ دیوان واقعی خواجہ صاحب کا تھا تو اتنی صدیوں تک یہ ایک گنج مخفی کی طرح اہلِ علم کی نظروں سے کس طرح پوشیدہ رہا ۔ کئی ایسی کتابوں کے نام ہمیں معلوم ہیں جو آج تقریباً ناپید ہیں لیکن ان کے نام کم از کم کتابوں میں محفوظ ہیں ۔ ادھر خواجہ صاحب کے دیوان کا یہ حال ہے کہ خواجہ صاحب کی وفات سے صدیوں بعد تک اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا ۔ یہ سچ ہے کہ بعض تذکرہ نویس مثلاً تقی اوحدی ، والہ داغستانی ، میر حسین دوست سنبھلی ، لطف علی آذر اور رضا قلی ہدایت خواجہ صاحب کی طرف بعض اشعار منسوب کرتے ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی خواجہ صاحب کے صاحبِ دیوان ہونے کا ذکر نہیں کرتا ۔ مولوی خدا بخش خان کی بانکی پور لائبریری میں اس دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے لیکن کیٹیلاگ مرتّب کرنے والے صاحب صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں :

> ''اس اعتقاد کے تسلیم کرنے کا کہ یہ دیوان مشہور و معروف خواجہ معین الدین چشتی سے علاقہ رکھتا ہے ، ہمارے پاس صرف یہی ذریعہ ہے کہ تقی اوحدی 'عرفات' میں اور والہ 'ریاض الشعرا' میں اس دیوان کے بعض اشعار نقل کر کے ان کو حضرت خواجہ کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن نہ یہ دونوں مؤلف اور نہ کوئی اور مصنف صاف طور پر یہ ذکر کرتا ہے کہ خواجہ کی یادگار کوئی دیوان بھی ہے ۔''

اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے شیرانی صاحب نے اپنی تحقیقات کا آغاز کیا اور آخر تلاش و جستجو کے بعد انھیں ایک ایسے مصنف کا سراغ مل گیا

جسے اس دیوان کا حقیقی مالک تسلیم کیا جا سکے ۔ یہ مصنّف 'ملا' معین واعظ فراہی ہیں جنھیں مولانا جامی کے ہم عصر ہونے کا شرف حاصل ہے ۔ ملا معین اپنے زمانے کے ایک مشہور واعظ تھے ۔ وہ محض ایک شعلہ بیان مقرر ہی نہ تھے بلکہ تحریر و انشا کے میدان کے بھی مرد تھے ، چنانچہ وہ کئی کتابوں کے مصنّف ہیں ۔ ان ہی میں سے ایک کتاب 'معارج النبوۃ' ہے ۔ اس کتاب کے مطالعے نے شیرانی صاحب کو یقین دلا دیا کہ خواجہ صاحب کی طرف منسوب کیے ہوئے دیوان کے مالک 'ملا' معین ہیں ۔ 'ملا کی یہ عام عادت ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں جابجا اپنے اشعار بلکہ بعض اوقات پوری کی پوری غزلیں نقل کرتے جاتے ہیں اور پھر اس بات کی صراحت بھی کر دیتے ہیں کہ یہ اشعار ان کے اپنے نتائجِ افکار ہیں ۔ شیرانی صاحب کو پندرہ سولہ غزلیں ایسی مل گئیں جنھیں 'ملا' معین نے 'معارج النبوۃ' میں اپنے نام کی صراحت کے ساتھ درج کیا ہے اور وہی خواجہ صاحب کے دیوان میں بھی ملتی ہیں ۔ یہ ایک ایسی صاف اور واضح حقیقت ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی انصاف پسند کو کوئی عذر نہیں ہو سکتا ۔ لیکن سنہ ۱۹۴۰ع کے لگ بھگ شمس العلماء پروفیسر محمد عبدالغنی نے اپنی کتاب ''مغلوں سے پہلے ہندوستان میں فارسی ادب'' میں خواجہ صاحب کی طرف دیوان کے انتساب کو درست تسلیم کرتے ہوئے اس کی بعض چیدہ غزلوں کو مع انگریزی ترجمے کے درج کیا ۔ اس قسم کے اندراج کی غالباً یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ شیرانی صاحب کا مضمون شمس العلماء کے ملاحظے سے نہیں گزرا تھا ۔ تاہم جب شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں شمس العلماء کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی تو شمس العلماء کو بادل ناخواستہ یہ بات تسلیم کرنی پڑی ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دینا چاہی کہ ان غزلوں کے علاوہ ، جن کی نشان دہی شیرانی صاحب نے کی ہے ، باقی غزلیں خواجہ صاحب کی تصنیف ہو سکتی ہیں ۔ اتفاق سے بمبئی کی کریمی لائبریری میں ، جو آج کل اُردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے زیر اہتمام ہے ، ہمیں 'ملا' معین کی ایک دوسری کتاب سورۃ الفاتحہ کی فارسی تفسیر مل گئی ہے ۔ حسب عادت اس میں بھی 'ملا معین جابجا اپنے اشعار نقل کرتے ہیں ۔ ہم چند ایسی غزلیں ڈھونڈھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو 'معارج النبوہ' میں درج کی ہوئی غزلوں کے علاوہ ہیں ۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان غزلوں کو قارئین کی خدمت میں پیش

کریں ، ہم 'ملا' معین سے متعلق وہ اطلاع نقل کرنا چاہتے ہیں جو امیر علی شیر نوائی کی 'مجالس النفائس' کے فارسی ترجمے میں قزوینی نے ہم پہنچائی ہے ۔ 'ملا' کے متعلق شیرانی صاحب کی معلومات کا سب سے بڑا ماخذ 'حبیب السیر' ہے ۔

علما و شعرا کی سرپرستی میں امیر علی شیر ، سلطان حسین سے بھی گوے سبقت لے گیا تھا ۔ وہ محض ایک وزیر با تدبیر ہی نہیں تھا بلکہ اقلیم سخن میں بھی ایک بلند مرتبے پر فائز تھا ۔ ترکی زبان میں اس کا خمسہ ترکی دانوں سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے ۔ فارسی میں بھی اسے شعر گوئی پر وہی قدرت حاصل تھی جس کا ثبوت اس کے ترکی کلام میں ملتا ہے ۔ اس نے اپنے ہم عصر شعرا کا ایک تذکرہ ترکی میں سنہ ۸۹۶ھ میں 'مجالس النفائس' کے نام سے مرتب کیا ۔ اپنی بیش بہا معلومات کی بنا پر یہ کتاب بڑی مقبولیت کی مستحق ٹھہری چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی افادی حیثیت کے پیش نظر تقریباً ایک ہی وقت میں اس کے دو فارسی ترجمے تیار کئے جاتے ہیں ۔ ایک ہرات میں سنہ ۹۲۸ھ کے قریب اور دوسرا سنہ ۹۲۹ھ میں اسلامبول میں ۔ پہلے کا مصنف فخری ہے جو اپنے ترجمے کو 'لطائف نامہ' کے نام سے موسوم کرتا ہے ۔ یہ وہی فخری ہے جو دو دیوانوں 'بوستان خیال' اور 'تحفۃ الحبیب' کا مالک ہے اور جس نے سندھ کے والی عیسیٰ خاں ترخان کے لیے سخن ور عورتوں کا تذکرہ بنام 'جواہر العجائب' مرتب کیا ۔ 'لطائف نامہ' کے دیباچے میں شاہ اسماعیل صفوی ، اس کے بیٹے سام میرزا اور امیر الامرا درمش خاں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد یہ کتاب وزیر خراسان خواجہ حبیب‌اللہ کی مجلس میں ہدیۃً پیش کی جاتی ہے ۔ خاتمۂ کتاب میں ایک پوری فصل شاہ اسماعیل کے وزیر میرزا شاہ حسین کے لیے وقف کی گئی ہے ۔

دوسرا ترجمہ اسلامبول میں محمد بن‌المبارک القزوینی ، اسماعیل صفوی کے رقیب سلطان سلیم کے نام سے معنون کرتا ہے ۔ چونکہ شاہی دربار میں قزوینی طبیب کے فرائض سرانجام دیتا تھا اس لیے وہ حکیم شاہ کے نام سے مشہور ہے ۔ قزوینی نے سات مجالسوں کا ترجمہ ''سات بہشتوں'' میں کیا ہے ۔ آخر میں ایک فصل کا اضافہ بنام بہشت ہشتم کیا گیا ہے ۔ آٹھویں بہشت دو ''روضوں'' میں منقسم ہے ۔ روضۂ اول میں ان شعرا کا ذکر ہے جو سلطان سلیم سے پہلے گزر چکے ہیں اور

روضۂ دوم میں سلطان سلیم اور اس کے درباری شاعروں کا بیان ہے ۔ اس ترجمے میں بھی کئی ایسے اضافے ہیں جو بہت مفید اور قیمتی ہیں ۔ آج سے تقریباً بیس سال پہلے برادر عزیز ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (پروفیسر اورینٹنل کالج لاہور) فخری کا ترجمہ بالاقساط اورینٹنل کالج میگزین میں شائع کر چکے ہیں ۔ حال ہی میں ایران کے نامور فاضل اور سابق وزیر تعلیم آقائے علی اصغر حکمت نے فخری اور قزوینی کے دونوں ترجموں کو یک جا کر کے اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے ۔ غالباً آقائے حکمت کو سید صاحب کے شائع کردہ نسخے کا علم نہیں ورنہ وہ ضرور ان کی محنت اور تحقیق کا اعتراف کرتے ۔ فخری اور قزوینی کے سلسلے میں ہماری معلومات کا ماخذ آقائے حکمت کا فاضلانہ مقدمہ ہے ۔ فخری[1] کا بیان 'ملا' معین کے متعلق بہت مختصر ہے :

''سولانا معین واعظ مولانا حاجی محمد فرہی (فراہی) کا بیٹا مشاہیر میں سے ہے ۔ فی‌الحال شہر کا مقرر کردہ واعظ ہے ۔ یہ مطلع اس کا ہے :

مگر فصل بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد
مگر وصل نگار آمد کہ دل با وصل ہمدم شد''

قزوینی 'ملا' معین سے زیادہ خوش نظر نہیں آتا ۔ وہ امیر علی شیر کے بیان پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اپنی طرف سے اضافہ کرتا ہے کہ 'ملا' پر دیوانگی غالب تھی ۔ اس جنون کی تہمت کی ذمہ دار شاید 'ملا' کی خودداری اور آزادہ روی ہو ۔ ذیل میں ہم قزوینی کے بیان کا مطلب اردو میں پیش کرتے ہیں :

''مولانا معین واعظ مولانا محمد فرہی (فراہی) کا بیٹا ہے ۔ یہ بھی اچھا واعظ ہے اور تمام خراسان میں اس کا وعظ خاص و عام میں مقبول ہے لیکن یہ دیوانہ سا ہے اور اس کے مرید بھی ایسے ہی ہیں ۔ چونکہ لوگ اسے دیوانہ سمجھتے ہیں اس لیے جو جی میں آتا ہے منبر پر کہہ دیتا ہے اور کوئی اس سے باز پرس نہیں کرتا ۔ اور کرے بھی کیوں جب کہ دیوانہ اور عاشق مواخذے سے بری ہیں ۔ ایک روز منبر پر اس نے یہ کہہ دیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ، کا ایمان تقلیدی ہے اور اس کی وجہ

۱- مجالس النفائس ، مرتبہ علی اصغر حکمت ، صفحہ ۹۴ ۔

غالباً یہ ہے کہ وہ حضرت امیر کے اس قول 'لو کشف الغطاء' ما از دوت یقیناً' (اگر پردہ ہٹا دیا جائے تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا) کا مفہوم درست طور پر نہیں سمجھا ۔ دیوانگی کے عذر کی بنا پر لوگوں کے مواخذے سے تو بچا رہا لیکن خدا تعالیٰ نے اسے معذور نہ سمجھا اور ایسے شکنجے میں گرفتار کیا کہ لوگ دیکھ کر دم بخود رہ گئے اور کہنے لگے کہ اگرچہ انھوں نے کوئی گرفت نہیں کی لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو اس گستاخی کی سزا دی ۔ مولانا نظام الدین کہا کرتے تھے کہ 'ملا' معین ایک قابل جوان ہے لیکن منبر کے تختے نے اس کی قابلیت کو ضائع کر دیا ہے ۔ یہ مطلع 'ملا' کا ہے :

مگر فصل بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد
مگر وصل نگار آمد کہ دل با وصل[1] ہمدم شد[2]''

'ملا' معین کی جس غزل کا مطلع فخری اور قزوینی نے نقل کیا ہے ، وہ دیوان خواجہ معین اجمیری مطبوعہ نولکشور سنہ ۱۸۹۳ع کے صفحہ ۲۲ و ۲۳ پر موجود ہے ۔ اس غزل کے آٹھ شعر مع مطلع 'معارج النبوۃ' میں ملتے ہیں ۔ مطلع بالا مخزن الغرائب[3] میں بھی معین فراہی کے نام سے دیا گیا ہے ۔

اس تمہید کے بعد ہم 'ملا' معین کی تفسیر 'اسرار الفاتحہ' کا مطالعہ شروع کرتے ہیں ۔ یہ تفسیر ۵۳۳ صفحات پر محیط ہے اور سنہ ۱۳۰۷ھ میں مطبع نول کشور میں حلیہ' طبع سے آراستہ ہوتی ہے ۔ سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اخوند 'ملا' خیر محمد پشاوری کی تحریک پر چھاپی گئی ہے اور افغانستان میں مروج رہی ہے ۔ کتاب کے دیباچے میں معین اپنی ضخیم کتابوں مثلاً تفسیر بحرالدرر ، اربعین فی احادیث سید المرسلین ، معارج النبوۃ اور قصص التنزیل کا ذکر کرتے ہیں ۔ بعض دوستوں کی فرمائش پر وہ اپنی تفسیر بحرالدرر میں سے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر علاحدہ مرتب کرنے پر رضا مند ہو جاتے ہیں ۔ 'ملا' معین بڑے طومار نویس

۱- نولشکور ایڈیشن میں ''وصل'' کی جگہ ''عیش'' ہے ۔
۲- مجالس النفائس ، صفحہ ۲۶۹ ۔
۳- ملاحظہ ہو شیرانی صاحب کا مضمون ۔

ہیں ۔ ان کی تفسیر فاتحہ ایک مقدمے اور پندرہ مجلسوں پر مشتمل ہے اور ہر مجلس میں کئی کئی فصلیں اور باب ہیں ۔ "ملا" کا انداز خطیبانہ اور واعظانہ ہے ، وہ اپنی تحریر کو دل کش بنانے کے لیے نادر حکایات اور عمدہ اشعار جا بجا لاتے ہیں ۔ انھیں عربی اور فارسی شعر و ادب کے ساتھ بڑی دل بستگی ہے ۔ فارسی شعرا میں سے رشید وطواط ، نظامی ، کمال اسمٰعیل ، عطّار ، مولانا روم ، سعدی ، امیر خسرو ، عراقی اور حافظ کے اشعار اس تفسیر میں جگہ پاتے ہیں ۔ "ملا" معین اپنے والد اور استاد "ملا" محمد فراہی کے اشعار بھی درج کرتے ہیں لیکن بے شمار عربی اور فارسی اشعار کے علاوہ "ملا" معین نے حسبِ عادت اپنے اشعار سے تفسیر کے صفحات کو مزیّن کیا ہے ۔ 'معارج النبوۃ' کی طرح یہاں بھی بعض اوقات وہ پوری کی پوری غزلیں درج کر دیتے ہیں ۔ ان میں سے کئی غزلیں تو ایسی ہیں جو 'معارج النبوۃ' میں بھی موجود ہیں ۔ ہم ایسی تمام غزلوں سے اعراض کر کے صرف ان اشعار اور غزلوں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائیں گے جن کی طرف شیرانی صاحب نے اشارہ نہیں کیا اور اس کے ساتھ ہی جو دیوانِ خواجہ معین الدین میں بھی ملتی ہے ۔

"ملا" کے یہاں کافی تنوع پایا جاتا ہے ۔ اشعار کے سلسلے میں وہ اپنا حق تصنیف جتانے کے لیے مختلف 'پیرایہ' بیان اختیار کرتے ہیں : ''لفقیر معین المسکین'' ''قال العبد الضعیف مؤلف ھذا الکتاب'' ، '' کما قلت فی شعر لی'' عربی اسلوب کی چند مثالیں ہیں لیکن فارسی میں بعض اوقات بڑے 'پر تاثیر طریقے پر اپنی دیوانگی و بے خودی کی کیفیت بیان کرتے ہیں : ''چنانچہ فقیر تو گوید'' ، ''چنانچہ فقر تو گفتہ است'' ، ''چنانچہ فقیر حقیر گوید'' ، ''چنانچہ فقیر ترا سرّی درین معنی بخاطری می گذشت'' ، ''چنانچہ معین دیوانہ گفتہ است ۔''

ذیل میں ہم ان غزلوں اور اشعار کی نشان دہی کرتے ہیں جن کو "ملا" معین نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے اور جو دیوان خواجہ معین الدین میں بھی موجود ہیں :

(۱) صفحہ ۵۲۶ ، لمؤلفہ ختم لہٗ بالخیر :

خزینہاست مرا پر ز نقد علم و ادب
کجاست آہ سحرگاہ و نالۂ دل شب

اس غزل کے نو اشعار دیے گئے ہیں - مقطع میں "ملا" کا نام معین موجود ہے - دیوان کے صفحہ ۷ و ۸ پر یہ غزل درج ہے اور اس کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے -

(۲) صفحہ ۲۷۵ ، لمؤلفہ :

دلا بحلقۂ رندان بزم عشق درآ
کہ از شراب بقا جرعۂ دھند ترا

اس غزل کے سات اشعار مع مقطع ہیں - صفحہ ۴۲۸ پر بھی اس غزل کے سات اشعار نقل کیے گئے ہیں ، یہی غزل دیوان کے صفحہ ۳ و ۴ پر درج ہے اور اس میں کل اشعار تیرہ ہیں -

(۳) صفحہ ۱۲۸ ، قال العبد الضعیف مؤلف الکتاب فی ھذا الخطاب :

نام او می بردم اول تا چنان شد عاقبت
کو چو شیر اندر رگ و جانم روان شد عاقبت

مع مقطع اس غزل کے نو اشعار درج ہیں - مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۱۴ و ۱۵ پر اس غزل کے اشعار کی تعداد سات ہے -

(۴) روزی کہ یار جام صفا پر ز می کند
عاشق دران وفا ز جفا یاد چون کند

اس غزل کے پانچ اشعار صفحہ ۲۵۲ پر درج ہیں اور مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۳۲ و ۳۳ پر اس غزل کے کل اشعار سات ہیں - تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۴۳۵ پر اس غزل کے پانچ شعر دوبارہ نقل کیے گئے ہیں اور اس کے پہلے "لمؤلفہ" لکھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ملا معین اس کے مالک ہیں -

(۵) ای تو سلطان وار ملک وجود
همہ عالم طفیل تو مقصود

اس غزل کے نو اشعار تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۸۷ پر نقل کیے گئے ہیں - مقطع سے پہلے شعر میں ملا معین اپنا نام یوں لاتے ہیں :

می فرستد معین بخدمت تو
صد هزاران درود نامعدود

اور آخری شعر اس طرح ہے:

دارم امید از شفاعت تو
شود از من خدای من خوشنود

یہی غزل مطبوعہ دیوان کے صفحات ۲۰ اور ۲۱ پر موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد دس ہے لیکن اس میں مقطع اس طرح دیا گیا ہے:

می فرستد معین درود بتو
حق تعالیٰ ز من شود خوشنود

---

(۶) روز قیامت می رسد تا گفتگو یک سو شود
اسرار پنہان از ازل از پردہ ها بیرون شود

یہ پوری غزل جس میں بارہ اشعار ہیں تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۶۱ پر درج ہے اور اس کے پہلے 'لمؤلفہ' لکھا ہے۔ اسی غزل کے تین اشعار صفحہ ۳۵۲ پر بھی دیے گئے ہیں۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۳۱ و ۳۲ پر یہ غزل موجود ہے لیکن وہاں اس کا مطلع یوں نقل کیا گیا ہے:

گر پردهای آب و گل از جان و دل یک سو شود
از کسوت هر ذرۂ مهر دگر بیرون شود

جہاں تک باقی اشعار کا تعلق ہے، کوئی فرق نہیں۔ مقطع دونوں میں ایک جیسا ہے:

مسکین معینی تا کنون در شام غم مانده زبون
ای ماه اگر آئی برون استاده اش میمون شود

---

(۷) سخن بشنو معینی غم مخور از آتش دوزخ
که موسیٰ را جمال یار اندر نار می‌تابد

ایک غزل کا یہ مقطع تفسیر سورۃ الفاتحہ کے صفحہ ۳۹۶ پر نقل کیا گیا ہے اور اس کے پہلے یہ الفاظ ہیں: 'چنانچہ فقیر تو گفتہ است'۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل مُلا معین کی ہے۔ مطبوعہ دیوان میں یہ غزل صفحہ ۳۵ و ۳۶ پر درج ہے اور اس کا مقطع تفسیر الفاتحہ کے مقطع کے مطابق ہے۔ اس غزل کا مطلع مدارج النبوۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو پروفیسر شیرانی کا مضمون)

(۸) مگر صبا ز سر کوی دوست می آید
که از زمین و زمان بوی دوست می آید

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۹۷ پر اس غزل کے پانچ اشعار درج ہیں - یہی غزل مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۲۶ پر موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد سات ہے -

(۹) گفتمش عکس جمالش چون مرا موجود کرد
تا بمانم زندہ زان قوتم بباید داد باز

اس غزل کے تین اشعار تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۵۰۵ پر نقل کیے گئے ہیں اور ان سے پہلے "ملا" معین لکھتے ہیں : 'چنانکہ فقیر تو گوید' "ملا" کے اس اظہار کے بعد کوئی شبہہ وارد نہیں ہو سکتا - جب ہم مطبوعہ دیوان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس کے صفحہ ۴۰ و ۴۱ پر یہ غزل درج ہے اور اس کے کل اشعار گیارہ ہیں -

(۱۰) مرا بہر دو جہان دولت وصال تو بس
وصال چیست کہ آمد شد خیال تو بس

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۹۶ پر اس غزل کے چھ اشعار بشمول مقطع درج ہیں اور پھر صفحہ ۲۹۴ پر اسی غزل کے پانچ اشعار پائے جاتے ہیں - مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۴۱ و ۴۲ پر یہی غزل درج ہے اور اس کے اشعار کی تعداد سات ہے -

(۱۱) تا من باو پیوستہ ام از غیر او ببریدہ ام
من حل و عقد عقل را در یکدگر پیچیدہ ام

یہ پوری کی پوری غزل تفسیرالفاتحہ کے صفحہ ۲۸۸ پر درج ہے اور مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۲ و ۵۳ پر موجود ہے اور اس کے کل اشعار بارہ ہیں -

(۱۲) لمؤلفہ : جام دیدار خدا کرد چنان مخمورم
کہ خمارش نہ نشیند بہ بہشت و حورم

یہ ۱۴ اشعار کی غزل تفسیرالفاتحہ کے صفحہ ۳۳۶ پر درج ہے اور 'لمؤلفہ' کے پہلے "ملا" معین لکھتے ہیں : "چنانکہ فقیر تو می گوید -" مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۶۱ و ۶۲ پر یہی غزل موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد پندرہ ہے -

(۱۳) ما بہر وصال از دل و جان نیز گذشتیم
ور وصل نخواہی تو ازان نیز گذشتیم

تفسیرالفاتحہ کے صفحہ ۳۳۷ پر اس غزل کے نو شعر نقل کیے گئے ہیں جن میں مقطع

بھی شامل ہے ۔ ان اشعار کے پہلے 'چنانکہ فقیر تو گوید' کے الفاظ موجود ہیں ۔
اس غزل کے تین اشعار تفسیر کے صفحہ ۸۷ پر بھی درج ہیں ۔ مطبوعہ دیوان کے
صفحہ ۵۹ پر یہ غزل موجود ہے اور اس کے کل اشعار گیارہ ہیں ۔

(۱۴) ای تو رعشقت تافتہ اندر سویدای دلم
بگرفتہ نور عشق تو پنہان و پیدای دلم

گیارہ اشعار کی یہ غزل تفسیرالفاتحہ کے صفحہ ۸۰ پر درج ہے اور اس کے پہلے
مُلا" معین لکھتے ہیں : 'قال الفقیر الضعیف معین المسکین' ۔مطبوعہ دیوان کے صفحہ
۵۱ و ۵۲ پر یہ غزل موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے ۔

(۱۵) گر ز د ودنفس ظلمت ناک بودم سوختہ
ز امتزاج آتش عشق تو نورانی شدم
من چنان بیرون شدم از ظلمت هستیِ خویش
تا ز نور هستیِ او آنکہ می‌دانی شدم

تفسیرالفاتحہ کے صفحہ ۲۵۱ پر اس غزل کے دو شعر نقل کیے گئے ہیں اور ان کے
پہلے مُلا معین لکھتے ہیں : 'کما قلت فی شعر لی' ۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۶
پر یہ سات اشعار کی غزل موجود ہے ۔ اس کا مقطع احمدی حضرات میرزا غلام احمد
صاحب کے دعوے کی حمایت میں نقل کیا کرتے ہیں :

دمبدم روح القدس اندر معینی می دمد
من نمی دانم مگر من عیسیِ ثانی شدم

وہ اس شعر کو حضرت خواجہ صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔

(۱۶) لمؤلفہ : سوی من آ کہ ترا یار وفادار منم
هر چہ داری بمن آور کہ خریدار منم

دس اشعار کی یہ غزل تفسیرالفاتحہ کے صفحہ ۱۴۷ پر درج ہے ۔ مطبوعہ دیوان
کے صفحہ ۹۴ پر یہی غزل موجود ہے لیکن وہاں اشعار کی تعداد گیارہ ہے ۔

(۱۷) معین کہ دست تہی می رود بدرگہ دوست
مگر کہ هم کرم او شود وشیلۂ من

غزل کا یہ مقطع تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۹۳ پر نقل کیا گیا ہے ۔ مطبوعہ دیوان

کے صفحہ ۶۷ پر یہ آٹھ اشعار کی غزل موجود ہے ۔

(۱۸) ای صدای بلبلان در صحن بستان حمد تو
وی نوای مرغ جان در باغ ایمان حمد تو

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۱۹ پر اس غزل کے چھ اشعار بشمول مقطع درج ہیں ۔ تفسیر کے صفحہ ۲۰۰ پر 'ملا' معین اس کا ایک شعر نقل کرتے ہوئے 'لذا قلت' لکھتے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ غزل ان کی مِلک ہے :

حامدان کو عرش را در مدح فرش رہ کنند
زاوج عزت پایۂ ناید بپایان حمد تو[1]

(۱۹) تفسیرالفاتحہ کے صفحہ ۳۴۷ پر گیارہ اشعار کی پوری غزل درج ہے جس کا مطلع یہ ہے :

چو از جمال نقاب بطون بر اندازی
دران ظہور وجود مرا عدم سازی

یہی غزل مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۸۶ و ۸۷ پر موجود ہے ۔

(۲۰) بخدا غیر خدا در دو جہان نیست کسی
صد دلیل است ولی واقف ازان نیست کسی

یہ پوری غزل مع مقطع تفسیرالفاتحہ کے صفحہ ۵۱۴ پر درج ہے ۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۸۹ پر یہی غزل موجود ہے اور اس کے کل اشعار نو ہیں ۔

مندرجہ بالا شواہد سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین کے نام سے شائع کردہ دیوان آپ کی ملکیت نہیں بلکہ 'ملا' معین فراہی

۱۔ یہ غزل دیوان معین الدین ، طبع نولکشور ، اشاعت جنوری سنہ ۱۸۷۵ع کے صفحہ ۷۶ پر موجود ہے اور اس کے کل اشعار سات ہیں ۔ مقطع یہ ہے :

گنگ شد مسکین معین ہم خود ثنای خود مگو
بہتر آن باشد کہ من گویم بدینسان حمد تو

(مرتب)

اس کے مالک ہیں ۔ مرحوم شیرانی صاحب کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے :

''ممدوح (مُلاّ معین) کثیر التعداد تصنیفات کے مالک ہیں ۔ اگر ان کی تالیفات میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین واثق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا اس میں پتا لگ جائے گا بلکہ اس کے علاوہ سینکڑوں نئی غزلیں ہاتھ آئیں گی جو دیوان کے حجم کو المضاعف کر دیں گی ۔''

☆ ☆ ☆
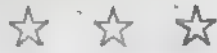
اشاریہ

مرتبہ

وارث سرہندی

اشخاص و اقوام

الف

خ

د

ڈ

ر

ش

ص

ض

ط

ظ

ع

ق

ک

ن

☆ ☆ ☆

مقامات و ادارہ جات

م

ن

☆ ☆ ☆

کتب و رسائل

غ

ک

گ

ل

م

☆ ☆ ☆

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۳	۳	کو	کہ
۳۸	۱۴	بلانیہ	بلابنہ
۵۷	۲۰	'قیس العجم'	قیس 'المعجم'
۵۹	۷	مہلاً	مہلتہ
۸٦	۳	درد	داد
۹۴	۸	جسیات	حبسیات
۹۴	۹	جسیات	حبسیات
۱۰۴	۳ (حاشیہ)	قلم	قلم را
۱۲۷	۱۴	نعت	نعمت
۱۳۳	۲۰	مولا	مولد
۱۵۲	۱۷	میسوہ	میوہ
۱۵۲	۱۸	نسہ	نہ
۱۹٦	۲۳	کی	کسی
۲۲۹	٦	بسبائل	بسائل
۲۴۲	۳	دربیدی	دربندی
۲۴۴	۹	خیز زانی	خیز رانی
۲۴۷	۱۲	برنزند	برنزند
۲۵٦	۲۱	درشت	داشت
۲۵۷	۱۵	ارزان	ازان
۲٦۳	۳	دورونہ	درونہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۶۳	۷	بقیہ	تعبیہ
۲۶۳	۸	Jumma	Jumna
۲۶۷	۲۳	bold	bald
۲۶۹	۲	پرواز	پرداز
۲۷۳	۱۱	شپہر	سپہر
۲۸۳	۲۳	'بتر'	'تیر'
۲۸۵	۱۱	گزر	گرز
۲۸۵	۱۲	میدردیدند	میدزدیدند
۲۸۶	۲۰	نیت خیرّ	نیّت خیر
۲۸۶	۲۰	پادشاہ خیرّ	پادشاہ مخیرّ
۲۹۶	۲۳	نغانی	نعانی
۲۹۹	۱۸	ارزیر	ارزیز
۳۰۰	۱۳	درد دست	در دست
۳۰۷	۵	ہرآمدہ	برآمدہ
۳۱۱	۸	احداللہ	احد الاّ
۳۱۱	۱۰	قاسم	فاسلم
۳۱۱	۱۰	یامرنی اللہ	یامرنی الاّ
۳۱۳	۱۶	۱۳۱۰۵	۱۳۱۰۵
۳۱۸	۸	لقب	تعب
۳۲۶	۵	tront	front
۳۲۶	۱۹	داہ	داء
۳۲۸	۱۲	جتہی	جہتی
۳۲۹	۱۰	سیامی	سیاہی
۳۲۹	۱۳	کنند	گنبد
۳۳۱	۱۳	cutered	entered
۳۳۳	۲۳	مائیان	مالبان

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۳۵	۱۱	خریف	حریف
۳۳۵	۱۲	تضیف	تضعیف
۳۳۸	۵	innumberable	innumerable
۳۵۲	۲۲	طلاق	طاق
۳۵۲	۲۳	طلاق	طاق
۳۵۹	۲	کاروانی	کاردانی
۳۶۲	۲۲	ارزیر	ارزیز
۳۶۳	۸	باشد	باشند
۳۷۳	۱۳	منحوق	منجوق
۳۸۲	۲۳	غیبت	غیبست
۴۱۹	۲۶	طفان شاہ	طغان شاہ
۴۲۰	۱۸	تصوف	تصرّف
۴۳۳	۲۲	زحبر	زجر
۴۴۳	۱۹	شود	کشود
۴۸۴	۹	العجم	المعجم
۴۹۲	۱۸	ھل	مل
۵۰۰	۱	متنفّر	متاثّر
۵۰۹	۶	کر نقل دیں	نقل کر دیں
۵۱۳	۶	(یا نیالتگین)	(یاینالتگین)
۵۵۵	۲۲	ولی	دلی
۵۷۵	۲۶	کہ یکی	کہ ہریکی
۵۸۳	۳	نعفروا	تحفروا
۵۹۳	۲	ازدوت	ازددت
۵۹۸	۲۵	وشیلۂ من	وسیلۂ من

حاشیہ بابت صفحہ ۱۸۴ ، مضمون ”دیوانِ معین الدین“

خطّاطوں کے مختلف تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا معین الدین فراہی ، صاحب دیوان ہذا ، اپنے دور کے ماہر خطّاط تھے ۔ چنانچہ رسالہ ”قوانین خطوط“ میں آیا ہے :

”و از خوش نویسان خراسان مولانا معین الدین فراہی است کہ اکثر خطوط را در غایت جودت بر صفحۂ تحریر می نگاشت و در فضائل و کمالات درجہ علیا داشت ۔ از آثار اقلام او معارج النبوۃ و تفسیر فاتحہ و سورۂ یوسف است ۔ در شہور سنہ سابع و تسع مأیۃ در ہرات وفات نمود و در مزار خواجہ عبداللہ انصاری مدفون گشت“ ۔

(رسالہ ”قوانینِ خطوط“ صفحہ ۳۹ ، مرتّبہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ، لاہور ، سنہ ۱۹۶۹ع)

اقتباس بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ رسالہ نے فقرہ ”اکثر خطوط . . . می نگاشت“ غالباً ”حبیب السیر“ ہی سے لیا ہے ۔ رسالہ محوّلہ بالا کا سنہ تالیف معلوم نہیں ۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے قیاس کے مطابق سنہ ۹۶۹ھ کی تالیف ہے ۔

رسالہ ”ریحان نستعیلق“ مؤلفہ سنہ ۹۸۹ھ کا بیان بھی ”قوانین خطوط“ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے و ھو ھذا :

”و از خوش نویسان خراسان مولانا معین فراہی است و معارج النبوۃ و تفسیر فاتحہ و سورۂ یوسف و قصۂ موسیٰ از آثار اقلام اوست ۔ در شہور سنہ ۹۰۷ در ہرات وفات نمود ۔ در مزار خواجہ عبداللہ مدفون است“ ۔

(صفحہ ۱۷ ، رسالہ ”ریحان نستلیق“ مرتّبہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ، لاہور ، سنہ ۱۹۴۱ع)

حوالۂ بالا میں ''قصۂ موسیٰ'' سے مراد مولانا معین الدین کی کتاب ''اعجاز موسوی'' ہے ۔ مولانا فنِ خطاطی میں استاد کا درجہ رکھتے تھے ۔ ان کے ایک شاگرد کا تذکرہ رسالہ ''حالات ہنروران'' مؤلفہ سنہ ۹۵۲ھ میں بدین الفاظ ملتا ہے :

''. . . جناب فضائل مآبی تقوی شعاری مولانا سلطان محمد نور شاگرد حضرت افادت پناہی مولانا معین الدین واعظ بودہ اند'' ۔

(''حالات ہنروران'' ، صفحہ ۱۶ ، مرتّبہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ، لاہور ، سنہ ۱۹۳۶ع)

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ متذکرہ بالا رسائل میں ہم تین ایسے خوش نویسوں سے متعارف ہوتے ہیں ، جن کا نام معین الدین ہے ۔ ایک تو یہی معین الدین واعظ فراہی ، دوسرے معین الدین اسفرازی مصنّفِ تاریخ ہرات ، جو کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے ۔ ''ریحان نستعلیق'' میں ان کا ذکر اس طرح آتا ہے :

''و از جملۂ فضلاً خوش نویس مولانا معین الدین اسفرازی است ۔ عمدہ منشیان زمان خود بود و از خط تعلیق بہرۂ تمام داشت ۔ وی مصنّف تاریخ بلدہ ھرات و ترسلی مشتمل بر منشآت مناشیر و مکتوبات است ۔ از واردات طبع اوست :

نہ سرمہ است آنکہ می بینی بچشم آن پری پیکر
کہ از غوغای چشمش می کند خاک سیہ بر سر

(صفحہ ۲۰)

''حالات ہنروران'' میں صفحہ ۱۴ پر ان کا تذکرہ ملتا ہے :

''دیگر مولانا معین الدین اسفرازی از شاگردان نیک مولانا عبدالحیٰ بود و خط و انشای مشارالیہ نیز در چشم اعیان روزگار دور از کار نمی نماید ۔ و مولانا درویش عبداللہ منشی شاگرد اوست ۔ و در اسلوب خط نستعلیق بر استاد خود بلکہ بر اکثر اہل این خط در روزگار فائق شدہ ۔''

تیسرے مولانا معین الدین تبریزی ہیں ، جو خواجہ عبداللہ صیرفی استاد سلطان ابو سعید خدا بندہ کے شاگرد رشید حاجی محمد بندگیر کے شاگرد تھے ۔

"ریحان نستعلیق'' میں حاجی محمد بندگیر کے بعد ان کا ذکر یوں آیا ہے :

''مولانا معین الدین تبریزی شاگرد حاجی محمد مذکور است''۔ (صفحہ ١٦)

انھی معین الدین تبریزی کا نام ''قوانین خطوط'' میں غلطی سے معین الدین ہروی لکھ دیا گیا ہے ، یعنی :

''مولانا معین الدین ہروی کہ از مشاہیر خوش نویسان است ، شاگرد حاجی محمد پندگیر است . . .'' (صفحہ ٣٧ ، ٣٨) ۔ (مرتّب)

☆ ☆ ☆